تاریخ

# تمدنِ اندونیشیا

جلد اوّل


مصنّف

نور احمد قادری

ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، ایچ۔ پی، ایچ۔ یو۔ (پنجاب) ایم۔ کے، ایل۔ ٹی۔ اے۔ یو (الٰہ آباد)





شائع کردہ: شعبۂ اطلاعات سفارت خانہ جمہوریہ اندونیشیا کراچی (پاکستان)

۱۹۵۶ء

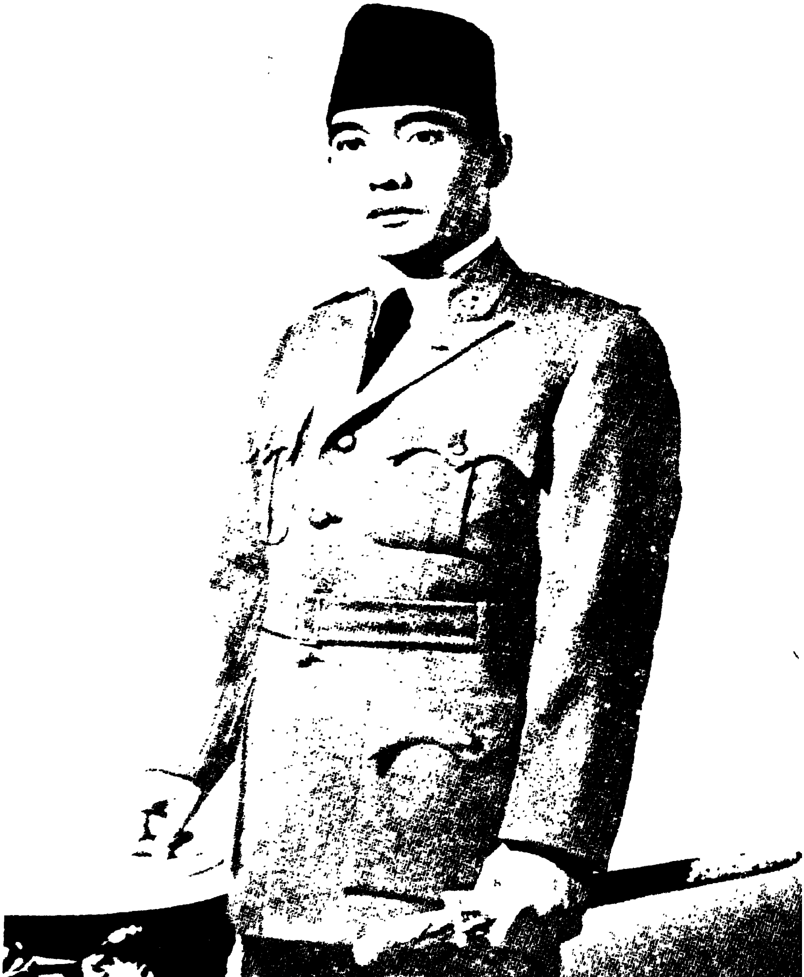
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تہدیہ

میں اپنی اس ناچیز اور حقیر علمی کوشش کو بطور ارمغانِ پاکستان ،
”انڈونیشیا“ کی اس اولوالعزم ، اور بہادر قوم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ،
کہ جس نے باوجود کئی سو سال تک غیر ملکی استعمار کے پُر فریب شکنجوں میں ہر گونہ مجبوری
کے ساتھ پھنسے رہنے کے جہادِ فی سبیل اللہ کی زرّین روایات اور اپنے مجاہدانہ کردار کی
اعلیٰ خوبیوں کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ اور بزمانۂ جدوجہد ہولناک قسم کے
سیاسی طوفان میں گھر کر بھی اپنی آزادی کے سفینہ کو خود مختاری کے
ساحل تک پہنچا دیا ۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ
لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

نور احمد قادری ( مصنف )
ایم۔اے ، ایم۔او۔ایل ، ایچ۔پی ، ایچ۔یو (پنجاب) ایم۔کے ،
ایل۔ٹی۔اے۔یو ( الٰہ آباد )۔

کراچی (پاکستان)
اپریل ۱۹۵۳ء



ڈاکٹر سوکارنو

صدر جمہوریہ اندونیشیا



ہز ایکسیلنسی محمود - ایل - لاچوبا

(سابق وزیر خارجہ و ناظم الامور جمہوریہ انڈونیشیا متعینہ پاکستان و حال سفیر انڈونیشیا متعینہ)

# تمہید

(ترجمہ)

اردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلی کتاب ہے یعنی ایک ایسی زبان میں جو برصغیر ہند و پاکستان میں عمومی طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے، لہٰذا بشیونِ اخلاص توقع کرتا ہوں کہ اس برصغیر کے لوگ اس کارنامہ کو بنظرِ استحسان دیکھیں گے۔

جناب مصنف نور احمد صاحب قادری نے اس کتاب کو تیار کرنے میں پانچ سال صرف کئے ہیں گویا یوں کہنا چاہئے کہ موصوف نے اس کی تصنیف کا کام اس وقت ہی سے شروع کر دیا تھا جبکہ انڈونیشیا کے باشندے اپنے ملک کی خود مختاری کے حصول کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان میں بیٹھ کر ایسی کتاب کے لکھنے میں جس کے لئے مواد کی فراہمی کے ذرائع بھی محدود ہیں مصنف کو کسقدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن بہرحال جس خلوص و استقلال کے ساتھ ایک طویل زمانہ تک آپ نے اس کتاب کو لکھا ہے درحقیقت اِن جذباتِ اخلاص و محبت کی دلیل ہیں جو انڈونیشیا کی نسبت جناب موصوف کے دل میں موجزن ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ایک طویل محنت و کوشش کے بعد آج آپ اس قابل ہیں کہ اس برصغیر کے اردو داں طبقہ کے سامنے ایک ایسے ملک کی تاریخ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر پیش کر رہے ہیں جو اپنے قدرتی وسائل اور انسانی آبادی کے لحاظ سے بفضلہ تعالیٰ گروہِ اقوامِ عالم میں ایک اہم حیثیت کا حامل ہے۔

مصنف کے محدود وسائل اور تاریخ کا نقشِ اوّل ہونے کے پیشِ نظر یہ دعویٰ کرنا تو فضول ہوگا کہ یہ کتاب مسامحات سے پاک ہے، ان مسامحات کو آئندہ کے ریسرچ اسکالر ہی سمجھ سکیں گے اور دور کر سکیں گے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ مصنف نے نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اس ملک کی مکمل تصویر پیش کی ہے جو دنیا کے استوائی خطہ کے گرد "زمردِ مرصّع کمرپٹی" کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں جناب مصنف نور احمد صاحب قادری کی خدمت میں جنھوں نے محض انڈونیشیا اور اس کے باشندوں کی محبت کے جذبہ میں یہ کارنامہ انجام دیا ہے اپنا ہدیۂ اخلاص ہدیۂ تحسین و تشکر پیش کرتا ہوں۔

جمعہ ۱۰/اپریل ۱۹۵۲ء
سفارت خانہ جمہوریہ انڈونیشیا
کراچی (پاکستان)

(محمود ایل - لاجوبا)
وزیر مختار و ناظم امور حکومت جمہوریہ انڈونیشیا
(متعینہ در پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# استعراض

کتاب ہٰذا اگرچہ لباسِ کتابت سے اپریل ۱۹۵۳ء ہی میں آراستہ ہوچکی تھی مگر کاغذ پر اچانک طور سے کنٹرول ہوجانیکے باعث مطبعِ متعلقہ نے فراہمیٔ کاغذ سے معذور ہوجانیکے باعث طباعت کا کام مجبوراً روک دیا اور اس طرح کتابت شدہ نسخہ ایک عرصہ تک کیلئے معرضِ التوا میں پڑ گیا، سفارت خانہ نے حکومتِ پاکستان کے کنٹرول کے محکمہ سے سفارش کی کہ اس کتاب کیلئے کاغذ کی فراہمی میں سہولتیں بہم پہنچائے، مگر اسمیں بھی تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ بالآخر کاغذ فراہم ہوا، مگر چونکہ کتابت "آفسیٹ سسٹم" پر ہوئی تھی لہٰذا وہ کاغذ اس نوع طباعت کے لئے موزوں اور مناسب نہونے کے باعث پھر بیکار رہا اور مجبوراً دفترِ سفارت خانہ کے دیگر کاموں میں صرف کرنا پڑا۔ اب جبکہ مناسب قسم کا کاغذ بلا کنٹرول کے بھی دستیاب ہونے لگا تو مطبع نے طباعت کا کام از سرِ نو شروع کرنے کی ذمہ داری لی اور جون ۱۹۵۶ء سے طباعت شروع کردی چنانچہ خداوند عالم کا بڑا احسان ہے کہ اب یہ کتاب ڈھائی تین سال کے انتظارِ شدید کے بعد ناظرین کی خدمت میں پیش کیجا رہی ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے حبیبِ پاک، صاحبِ لولاک، فخرِ موجودات، رحمتِ عالمیاں، نبیٔ آخر الزماں سرورِ کون ومکاں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ سے کہ جو تمام عالم کے سرچشمہ ہائے علوم کا منبع اور انوارِ تجلیاتِ الٰہی کا آفتاب ہیں، اس ناچیز اور حقیر علمی کوشش کو اہلِ علم وفن کے طبقات میں قبولیت کی تنویر سے مجلّٰی فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

احقر العباد

نور احمد قادری (مصنف)

جون ۱۹۵۶ء

۳ - کانتی بلڈنگ مہاراسٹر روڈ
نزد جوبلی سینما، کراچی۔ پاکستان۔



نور احمد قادری (پاکستانی)

مصنف "تاریخ تمدن اندونیشیا"

# فہرست مضامین

## فہرست نقشہ جات وتصاویر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

دوسری جنگ عظیم کے دوران ولندیزیوں کو شکست دے کر انڈونیشیا پر قابض ہو جانے والی محوری طاقت "جاپان" نے جب اگست ۱۹۴۵ء میں اتحادیوں کے مقابلہ پر ہتھیار ڈال کر راہ فرار اختیار کی اور اس کے کچھ ہی روز بعد انڈونیشیا کے مجاہدین اسلام نے اعلان آزادی کیا تو اس وقت میں اپنے پرانے وطن "جے پور" ہی میں مقیم تھا جو برصغیر ہند میں قدیم سلاطین اسلام کے مرکز سیاسی "دہلی" اور صوفیائے عظام کے مامن روحانی "اجمیر شریف" کے درمیان واقع ہونے کے باعث سینکڑوں برس سے علم و ادب، تاریخ و فلسفہ اور اخلاق و تصوف کا گہوارہ رہا ہے اور اپنے حسن شعریت کے ساتھ ساتھ حسن شہریت میں بھی شہرۂ آفاق ہے جہاں اس وقت کی حکومت نے جنگ کی خبروں کو نشر کرنے کے لئے جگہ جگہ ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر نصب کر رکھے تھے چنانچہ ۱۸ اگست کی صبح کو جبکہ آفتاب مشرق کو طلوع کئے ہوئے ابھی کچھ زیادہ وقفہ نہ گذرا تھا کہ اچانک اسی نوع کے ایک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ آل انڈیا ریڈیو سے انڈونیشیا کے آفتاب آزادی کے طلوع کرنے کی خبر نشر ہوئی جس کو ہر طرف دلچسپی کے ساتھ سُنا گیا مگر چونکہ ولندیزی عہد کی ظالمانہ سیاسی پالیسی کے باعث 'انڈونیشیا' کا نام عام طور پر جانا پہچانا نہ جاتا تھا اس لئے فی الوقت یہ سمجھنا محال تھا کہ آخر اس نام کا ایشیا میں کونسا ملک ہے کہ جہاں حریت پسند اور محب وطن باشندوں نے آزادی کا اعلان کر کے غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے۔ سر زمین ہند میں اس وقت تک یہ ملک یا تو 'شرق الہند' کے نام سے مشہور تھا یا پھر اسے 'ڈچ ایسٹ انڈیز' کہتے تھے جس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جغرافیہ کی درسی کتابوں کے ایک ایسے مختصر سے باب تک محدود تھی جو بمشکل دس یا پندرہ صفحات پر ختم ہو جاتا تھا اور بس۔ اخبارات کے ذریعہ بھی جو معلومات اس وقت ہم پہنچتی تھی وہ بھی کوائف سیاسی کے اضافہ کے ساتھ بس جغرافیہ کی درسی کتابوں ہی کی حد تک محدود ہوتی تھی، البتہ اب لوگ اتنا ضرور سمجھ چکے تھے کہ یہ ملک بھی ان اماکن انسانی میں سے ہے جہاں دنیا کی سب سے بڑی مسلم قوم آباد ہے اور جو مشرق بعید میں چین کے بعد سب سے بڑا آباد ملک ہے۔

چنانچہ ابھی اعلان آزادی کو بمشکل تین چار ماہ ہی گذرے ہوں گے کہ اخبارات میں وہ وحشت اثر خبریں بھی شائع ہونے لگیں جو ترمنی اور جاپان کی محوری قوتوں کی شکست کے بعد ہالینڈ میں دوبارہ بحال ہو جانے والے ولندیزی اقتدار کے برطانیہ اور دیگر اتحادیوں کی مدد سے آزاد انڈونیشیا میں عود کر آنے اور قتل و نہب اور غارت گری کا بازار گرم کرنے پر مشتمل تھیں، تو میں اس وقت مشرقی پنجاب کی ایک اسلامی ریاست 'پاٹودی' کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں سینئر انگلش اور تاریخ جغرافیہ ٹیچر اور سیکنڈ ماسٹر کی حیثیت سے مامور تھا اور طلباء کو ہر روز یہ اخباری خبریں بھی سُناتا تھا۔ جب ولندیزیوں کی سفاکی اور انڈونیشیوں کی بے محابہ بربادی کی خبریں پڑھتا اور سناتا تھا تو خود بھی درد و کرب محسوس کرتا اور طلباء پر بھی یہی کیفیت مستولی پاتا تھا، اور دیگر افراد میں بھی اس کے متعلق مجھے کافی دلچسپی نظر آتی تھی، چنانچہ خیال گزرا کہ اس ملک کے متعلق قدیم سفرناموں کے مطالعہ کی مدد سے ایک تفصیلی جغرافیہ اردو زبان میں ترتیب دیا جائے مگر ظاہر ہے کہ پاٹودی جیسی چھوٹی جگہ میں رہ کر کہ جہاں نواب صاحب کے ذاتی کتب خانہ کے علاوہ کوئی باقاعدہ لائبریری نہ تھی، اتنے بڑے کام کو انجام دینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا پھر دوسری طرف پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کے امتحان میں بھی شرکت کرنے کا خیال دامن گیر تھا، لہذا سفرنامۂ ابن بطوطہ کے مطالعہ کے بعد یہ ارادہ کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا۔

مگر جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر ہند کی تقسیم سے آزاد پاکستان اور آزاد ہندوستان معرض وجود میں آئے اور ہندو مسلم فسادات کے باعث مشرقی پنجاب کی مسلم آبادی پاکستان کی طرف ہجرت کر آئی اور ریاست پاٹودی بھی قانون انضمام کی رو سے ختم ہو گئی۔ تو مجھ کو بھی ہجرت کر کے بمعہ اہل و عیال پاکستان آنا پڑا اور آنے کے بعد دارالحکومت کراچی میں مقیم ہوا جو دنیائے اسلام کا سب سے

بڑا مرکز سیاسی ہے اور ایک عظیم شہر ہے۔ چنانچہ اس نئے ماحول میں وارد ہونے کے بعد بھی میں نے اپنا وہی قدیم پیشہ درس وتدریس اختیار کیا، کچھ طلبا گھر پر آتے تھے اور کچھ متمول طلبا کو خود انہی کے ہاں جاکر پڑھاتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب وا پس لوٹتے ہوئے سفاک ولندیزی سامراج کے مظالم نے کمزور اندونیشیا کو ہر طرف سے گھیر کر مشق ستم بنا رکھا تھا، اور مجاہدین اندونیشیا کا نعرۂ جہاد فی سبیل اللہ ہر اخباری خبر کے ساتھ روزانہ سننے میں آتا تھا اور ان کے جانی و مالی نقصانات کی تفصیلات ہر ذی حس مسلمان کے دل میں درد کی ٹیس پیدا کرتی تھیں اس طرح پاکستان کا ہر مسلمان اپنے اندونیشی مسلمان بھائیوں کے غم میں بے قرار نظر آتا تھا اور اس بے قراری کے آثار علی الخصوص طلبا پر زیادہ نمایاں تھے۔ چنانچہ محبت و واقفیت رکھنے والے طلبا مجھ پر زور دیا کرتے کہ میں کوئی کتاب لکھوں اور اہل اندونیشیا کو پاکستانی بھائیوں کے قریب تر لانے اور ان کا ان کے ساتھ ثقافتی تعارف کرانے کا خوشگوار فریضۂ اسلامی انجام دوں۔ قدرت کو بھی پھر کچھ ایسا ہی منظور تھا کہ یہ کار گراں بار میرے ہی ناتواں ہاتھوں سے انجام پذیر ہو۔ چنانچہ میں نے کمر ہمت باندھ لی اور اپنے ایک پرانے منصوبہ کو توفیق الٰہی کے سہارے پر عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ مگر بقول حافظ رحؒ "عشق اول نمود آساں ولے افتاد مشکل ہا"، راہ کی دشواری، اور منزل کی طوالت، بایں نادانی و باآں ناداری، قلت اسباب اور فقدان وسائل کے پیش نظر جب غور کرتا تھا تو اس عالم امکان میں سوائے ناممکنات کے کچھ بھی نہ سوجھتا تھا۔ مواد کے بہم پہنچانے کے لئے بھی جب طلب کا دامن یمین و یسار پھیلاتا تھا تو سوائے "کوہ کندن وکاہ بر آوردن" کے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔ قدیم کتب خانہ فیئر ہال اور دیگر چھوٹی بڑی فرنگی لائبریریوں کے ذخیرہ ہائے کتب سفرنامہ کی مدد سے جغرافیہ کا باب ایک بڑی حد تک تیار ہوگیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں جب میں انجمن ترقی اردو کے کالج میں شعبۂ علوم مشرقی کے سینیئر طلبا کو تاریخ اسلام اور تمدن اسلام پڑھانے پر مامور ہوا تو اندونیشیا سے متعلق طلبا کی استفسارات کو اور بھی شدید پایا، گستاؤلی بیبان کی لکھی ہوئی کتاب "تمدن عرب" اکثر حوالہ کے لئے سامنے آتی رہتی تھی جس کا انداز بیان اگرچہ مختلف ہے، مگر اسی کو دیکھ کر میرا ذہن اس طرف کو منتقل ہوا کہ "تمدن اندونیشیا" کی تاریخ ایک جدید پیرایہ میں لکھی جائے جس کا پہلا باب اسی جغرافیائی حال سے تعارف کے ساتھ شروع ہو اور پھر آگے کے ابواب تاریخ ریسرچ کے اصول پر بالاستیعاب ترتیب دئے جائیں۔

غرض خاکہ تو بنا لیا مگر اب اس میں رنگ آمیزی کرنے کے لئے ضرورت کے مطابق مسالہ کہاں سے آئے، اور اگر مسالہ بھی دانہ دانہ جمع کر کے بہم پہنچا یا جائے تو پھر خامۂ بیگانہ کو کس سمت اور کس انداز میں جنبش دے کر پیکر تاریخ کی صورت گری کی جائے۔ دماغ ان مشاکل کے تصور سے متوحش تھا اس لئے کہ ایک ایسے ملک کی تاریخ تمدن کو ترتیب دینا اور اس کے کردار کو سمجھانا کہ جو سیاست افرنگ کے باعث اب تک پردۂ اخفا میں رہا اور جس پر بالتفصیل کوئی کتاب مثالی حیثیت سے اس موضوع پر کسی زبان میں بھی ترتیب نہ دی گئی ہو۔ جسقدر مشکل مرحلہ ہے اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل پہلے خود اس کا سمجھنا ہے اور دوست و دشمن کی تحریر کے انداز انحرافی اور غیر انحرافی کے امتیاز کو پہچاننا ہے چنانچہ ایک معتدبہ زمانہ تک بقول علامہ اقبال "میری زندگی کی راتیں اسی کشمکش میں گذریں"۔ لیکن اگر فی الحقیقت تائید الٰہی نے رہنمائی نہ کی ہوتی تو خاک بھی سمجھ میں نہ آتا اور عقل و علم دونوں اس تاریک رہگذر کی صعب ناکیوں میں گم ہو کر رہ جاتے، منزل تو منزل راہ مستقیم پر لگنا بھی دشوار ہو جاتا۔ بالآخر بسم اللہ کر کے کام شروع کر دیا اور بقول شبلی نعمانی دانہ دانہ جمع کر کے خرمن تیار کیا، مالی مشکلات کا کشامنا اسی درمیان میں محبوب اہلیہ اور بچہ کا بحکم ربی داعی اجل کو لبیک کہنا میرے پیش نظر محالات و مصائب کے ڈھیر کا ایک کوہ گراں بنجانے کے مترادف تھا مگر بقول شیخ "بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد ؛ اگر خارے بود گلدستہ گردد" بنت چونکہ لوم و لائم سے پاک اور مبنی بر اخلاص تھی لہذا کارکنان قضا و قدر نے بھی ہر گام پر مجھ بے کس و مجبور کی پورے طور سے راہنمائی کی اور منزل خود بخود آتی چلی گئی ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم  زہر خرمنے خوشۂ یافتم  (حضرت سعدیؒ)

ایک عرصہ کے بعد وطن عزیز کراچی میں "بین الاقوامی نمائش" کا انعقاد ہوا، اندونیشیا نے بھی جس کا سفارتخانہ ابتدائی صورت میں قائم ہوا ہی تھا اس نمائش میں اپنا اسٹال بھی لگایا، مجھے بھی دیکھنے جانے کا اتفاق ہوا، وہیں ان کی اسٹال پر ان کے

پہلے سفیر ہزاکسیلنسی جنرل شمس الدین سے بھی ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران میں میں نے اپنی مساعی کا ذکر کیا، سُنکر خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ تم پہلے آدمی ہو جس نے یہاں رہتے ہوئے ایسے کام کا اقدام کیا ہے، اب اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے، اندونیشیا کے لوگ اس کو ہمیشہ سراہتے رہیں گے، پھر انھوں نے مجھے قدیم ہندو عہد کی چند تصاویر بھی دیں اور ان کے متعلق کچھ سمجھایا بھی، گفتگو ختم ہوگئی اور میں چلا آیا اور اپنا کام بدستور کرتا رہا، کچھ عرصہ کے بعد پھر سُنا کہ موصوف اندونیشیا جاکر فوت ہوگئے۔ یہ سُنکر دل کو رنج ہوا، آخر ایک روز بیک کرشمہ دو کار تعزیت کے ساتھ ساتھ تعارف حاصل کرنے کے لئے اپنے زمانۂ طالب علمی کے ایک پرانے ہموطن دوست عزیز مسٹر احسان الحق فاروقی کو ساتھ لے کر سفیر موصوف کے قریبی دوست اور پریس اتاشی مسٹر رٹدن سومار تو کی خدمت میں معہ اپنے نامکمل مسودہ کے حاضر ہوا اور جابجا مقامات سے انھیں بذریعہ زبانی ترجمہ سُنایا بھی چنانچہ وہ سنکر بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم اسے مکمل کرتے رہو اگر کتاب پایۂ تکمیل پر پہنچ گئی تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تم کو اس کی طباعت کی طرف سے فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہ ہوگی۔ سفارتخانہ اس کو چھپوالے گا۔ پھر میں چلا آیا اور پھر کبھی کبھی جاکر ان کے کتب خانہ سے بھی مستفید ہوتا رہا اور کام کرتا رہا۔

ایک عرصہ کے بعد جب اندونیشیا کے مشہور محب وطن ہزاکسیلنسی مسٹر محمود ایل۔ لا جو با وزیر مختار کی حیثیت سے مقرر ہو کر کراچی آئے تو مسٹر سومار تو نے مجھے ایک روز ان کی خدمت میں پیش کیا اور میرا مسودہ اُنھیں دکھلایا، موصوف بھی اُسے دیکھکر بہت خوش ہوئے اور انھیں یہ سنکر بہت ہی مسرت ہوئی کہ یہ علمی خدمت محض اسلام کے جذبۂ اخوت کے ماتحت بلا کسی فرد و جماعت کی تحریص و ترہیب اور استعانت و امداد کے انجام دی گئی ہے اور مصنف نے دو بڑی مسلم اقوام کو قریب تر لانے کے مطمح نظر سے لکھکر اپنے اہل وطن (پاکستانیوں) کی طرف سے اہل اندونیشیا کی خدمت میں بلا کسی معاوضہ کے پیش کی ہے۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے اپنے پرانے کرم فرما اور دوست جناب ڈاکٹر ولی احمد مرزا صاحب کو جو ہندوستان سے چند ماہ قبل ہی کراچی ہجرت کر کے پہنچے تھے اور ایک زمانہ میں اندونیشیا میں بھی کافی عرصہ تک رہ چکے تھے بلایا اور مجھے بھی طلب فرمایا، ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف کرانے کے بعد مسودہ انھیں دکھلایا اور ان سے بھی رائے طلب کی، تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے بے انتہا داد دی اور فرمایا کہ اس نے اپنی اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں اسلوب کے لحاظ سے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اپنی ندرت اور دقت نظر کے لحاظ سے لائق صد آفریں ہے، میری رائے میں یہ کتاب ضرور چھپوائی جائے، یہ ایک بہترین علمی خدمت ہے، میں ڈاکٹر صاحب کی نوازشوں کا بے حد ممنون ہوں۔ بہرکیف سفیر موصوف نے اپنی حکومت سے مصارف طباعت کی منظوری حاصل کر کے مسودہ سپرد مطبع کر دیا، اور اس طرح کتابت کا آغاز ہوگیا۔ اب یہ کتاب زیر کتابت و طباعت ہے۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب مسٹر سمار تو کی جگہ مسٹر ... سہبری مقرر ہو کر آئے تو انھوں نے بھی مجھ پر اسی طرح لطف و کرم فرمایا۔ ان کا بھی میں بڑا ممنون ہوں۔ یہ بھی اندونیشیا کے نہایت ہی مخلص محب وطن ہیں۔

اب امید ہے کہ بہت جلد یہ کتاب منصۂ شہود پر آکر میرے ان پاکستانی بھائیوں، اہل علم و ادب اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبا کو اندونیشیا سے متعارف ہونے میں ضرور مفید ثابت ہوگی۔ جنکی طرف سے بطور ارمغان محبت اور جذبۂ اخوت اسلام اس ناچیز نے پانچ سال چار ماہ آٹھ یوم کے ۱۹۵۲ دن رات مسلسل لکھکر ۱۹۵۳ء میں انڈونیشی بھائیوں کی خدمت میں پیش کی ہے۔

آخر میں اُن مصنفین کا بھی کہ جن کی خرمن ہائے تصانیف سے اس گلدستہ کو سجاتے وقت خوشہ چینی کی ہے شکریہ ادا کرنے سے قبل ارباب علم و ادب کی خدمت میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ باوجود محتاط تخلیل اور تحقیقاتی کاوش کے غلطیوں کے امکان سے برأت کا دعویٰ نہیں، حالانکہ کام چلانے کی حد تک انڈونیشی زبان بھی میں نے سیکھی ہے اور بحد امکان ہر ذریعہ سے استفادہ بھی کیا ہے مگر پھر بھی اگر خامیاں پائیں تو میری کم علمی اور کتاب ہذا کو نقش اول تصور کر کے معاف فرمائیں کہ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔

کراچی (پاکستان) اپریل ۱۹۵۳ء

ناچیز
نور احمد قادری (مصنف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مُقدّمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

## علوم اور انکی قسمیں

علوم کی دو قسمیں ہیں ایک مذہبی اور دوسرے غیر مذہبی۔ علوم مذہبی کا تعلق خدا کی اس آسمانی ہدایت کے ساتھ ہے جو کتب آسمانی کی صورت میں اس کے برگزیدہ انبیاء پر نازل ہو کر انسان کی پوری زندگی کو بنانے، سنوارنے اور اس کی اقدار حیات کو کائنات خلق کی ہر چیز پر بطور شرف و تفوق برقرار رکھنے کے لئے پہنچی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید جو کتب آسمانی میں سب سے آخری ہے اور اصل صورت میں آجتک موجود ہے جس کو سمجھانے کے لئے احادیث نبویہ، ایک مستقل علم ہے جس کی مدد سے ائمہ، تابعین اور تبع تابعین نے دیگر انواع علمی کو اخذ کیا ہے اور فروغ دیا ہے مثلاً علم فقہ، علم تفسیر، علم قرأت، علم الرجال، فلسفہ، منطق، اخلاق، تصوف، جفر، علم الکلام اور علم مناظرہ وغیرہ۔

## علوم طبعی

دوسری قسم کے علوم وہ ہیں جو خود انسان کے اپنے وسیع و عریض مشاہدات و تجربات کے ارتقا سے بطور نتیجہ پیدا ہو کر معرض وجود میں آئے ہیں اور وہ دو خاص قسموں پر مشتمل ہیں یعنی ایک طبعی اور دوسرے غیر طبعی۔ طبعی علوم کو مشاہدات نظری نے اور غیر طبعی کو تجربات عملی نے فروغ دیا ہے جن کی روح ان قیاسات و اقدار اور تخیلات و تمثیلات پر محتوی ہے جو انسان کی ہستی کو خارجی طور پر متاثر کرتے رہے اور کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ طبعی علوم میں جن چیزوں نے انسانی ہستی کو خارجی طور پر متاثر کیا ہے وہ فلکیات و ارضیات ہیں جن میں چاند اور سورج، ستارے اور سیارے، باد و باراں سردی و گرمی، کوہ و دشت، دریا و صحرا، نباتات و جمادات، حیوانات و معدنیات وغیرہ سب شامل ہیں۔ جو حیات انسانی کے خاطر اسباب راحت بہم پہنچانے کے لئے شب و روز سرگرم عمل ہیں اور انسان کے نشو و نمائے ظاہری کے سلسلہ میں ایک مخصوص ماحول اور ایک خاص مقامیت کو پیش کرتے ہیں جسے علوم طبعی کی اصطلاح خاص میں جغرافیائی حدود یا مقام یا ملک کہتے ہیں۔

## علوم غیر طبعی

اسی طرح غیر طبعی علوم میں وہ تمام انواع علمی شامل ہیں جنھیں انسان کے سینکڑوں سال کے تجربات عملی نے فروغ دیا ہے۔ اور جن میں سے کسی کا تعلق ادائے مطلب یعنی زبان و ادب سے ہے اور کسی کا تعلق رسم و رواج سے ہے جن کا مجموعہ غیر آسمانی تعلیمات کے حامل گروہ میں مذہب سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی علم کا تعلق لین دین اور کار و بار سے ہے جو اب معاشیات اور تجارت کی صورت میں مستقل فن سمجھے جاتے ہیں۔ اور کوئی صحت انسانی کی تمام انواع خصوص پر مشتمل ہے جسے مشرق میں طب کہتے ہیں اور مغرب میں ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کے ناموں سے معنون کرتے ہیں۔ کوئی علم ادراک انسانی سے بحث کرتا ہے جیسے منطق اور کوئی حرفتوں اور صنعتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ جیسے سائنس اور کوئی زندگی کی ساری کارکردگیوں کو بقید ہر خد و خال منصۂ شہود پر پیش کرتا ہے جو ایک فرد یا شخصیت کی صورت میں سوانح یا سیرت اور ملک کی صورت میں تاریخ کہلاتا ہے۔ جس میں حکومت و سلطنت، نظم و ضبط، آئین و قوانین، حدود و اقتدار اور کردار سیاست وغیرہ تمام امور کو ماضی اور حال کے آئینہ میں حاکم و محکوم کے ہر گونہ تعلق و کردار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور بطور نتیجہ یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ عصر حاضر کس طریقہ سے ماضی سے نکلا ہے اور اب زمانہ مستقبل کے زمانہ

حال سے کس نہج پر معرض وجود میں آنے کا امکان ہے۔

### مدنیت

مگر یہ سب امور ایک ملک اور ایک سرزمین پر بسنے والوں کی وحدت ظاہری کے خارجی پہلوئے حیات پر مجموعی طور سے روشنی ڈالتے ہیں جبکہ داخلی پہلوئے حیات بالکلیہ سچی آسمانی تعلیمات مذہبی کے اخلاق حسنہ اور عبادت الٰہی سے متشکل ہے جو انسانی زندگی کے ہر فعل اور ہر عمل کو کائنات خلق کی تہرشت سے ممتاز رکھنے میں ممد و معاون ہے۔ اسی سے امن بھی قائم ہے اور عدل و انصاف بھی، اور اسی سے شائستگی اور شرافت انسانی بھی زندہ ہے اور یہی دونوں امور مزاج حیات کے تمام اخلاط میں اعتدال کو برقرار رکھ کر امن و سلامتی کو قائم رکھتے ہیں اور انسان کو ترقی کی شاہراہ دکھاتے ہیں اور اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرتے یا پہنے سینے، کھانے کمانے، مرنے جینے، تا اینکہ تمام کی زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھاتے ہیں حتیٰ کہ شائستگی اور بوسعت معنیٰ " مدنیت " انہی امور سے معرض ظہور میں آتی ہے۔

### تمدن

چنانچہ " تمدن " کی علمی اصطلاح اسی ' مدنیت ' سے نکلی ہے جو ایک ملک میں بسنے والے انسانوں کی زندگی کے تمام امور ظاہری اور باطنی خارجی اور داخلی ہر گونہ عمل حیات پر محتوی ہے اور ظاہر ہے کہ حیات انسانی کا ہر عمل جہاں طبعی طور پر فلکیات و ارضیات سے متاثر ہے وہاں غیر طبعی طور سے زبان و ادب، معاشیات، سیاسیات، تاریخ و سائنس سے بھی بے حد متاثر ہے۔ جن میں داخلی حیثیت سے انسانی ہستی کی اقدار شرافت کو فی المثل روح کے سوائے سچے مذہب آسمانی کے کوئی اور چیز تندرست و توانا نہیں رکھ سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کبھی کسی ملک کی ' تاریخ تمدن ' پر قلم اُٹھایا جائے گا تو اس ملک کی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام امور علمیہ یعنی جغرافیہ، نسلیات، لسانیات، معاشیات، طبعیات، عمرانیات، تاریخ و فلسفہ اور مذہب و اخلاق پر بالاستیعاب روشنی ڈالنی پڑے گی تاکہ ہر وہ پہلو جس سے وہاں کی مدنیت ظہور میں آئی یا آتی رہی اور ادوار تاریخ کے ہر تاریخی ارتقاء سے متاثر ہوتی رہی ہے واضح ہو سکے اسی شعور کی صراحت دراصل کسی ملک کی تاریخ کا اصل ماحصل ہے ورنہ محض حکمرانوں کے کردار کو بیان کرنا نہ صحیح تاریخ ہے اور نہ اسکا کوئی ملکی افادہ ہے، بلکہ فنی حیثیت سے اس کو ' تاریخ ' محض کہنا بھی غلطی ہے کیونکہ اس قبیل کی سعی کسی ملک کی سیاست کو متاثر کرنے والے ایک گروہ کی سوانح ہوگی جس کے ہاتھ میں کبھی حکومت رہی ہے وہ پورے ملک کی تاریخ نہ ہوگی۔ پورے ملک کی تاریخ میں طبعئی اور غیر طبعئی، داخلی اور خارجی ہر گونہ انداز زندگی کو بھی بیان کرنا پڑے گا اور اس کے نتائج کو بھی بروئے کار لانا ہوگا۔ پھر یہی مجموعہ ' الف " تاریخ تمدن " کہلائے گا۔

### غیر جمہوری تاریخیں

مگر دیار مشرق میں سو دو سو سال سے غیر جمہوری یا غیر ملکی اقتدار کے زمانۂ عروج میں اتفاق سے حکمرانوں کے تذکروں کو (جو دراصل ان کی تاریخ سیاست تھی) عہد گزشتہ کے سیاسی تجربات سے استفادہ کرنے کی غرض سے ' تاریخ ' کے عنوان سے لکھا یا لکھوایا جاتا رہا جو صریحاً غلط تھا اور جمہور کو خود ذہنی کے دام میں لا کر احساس کمتری کا شکار کرنے کی چال بازی پر مشتمل تھا، چنانچہ ایک زمانہ کی طویل طویل ممارست نے بالآخر اسی نام کو رائج کر کے مسلّم کر دیا اور اس مسلّمہ کا نام ' تاریخ ' رکھ دیا جو حالانکہ تاریخ نہ تھی بلکہ تذکرہ، یا سوانح اہل اقتدار تھی۔ کیونکہ لفظ " تاریخ " معنیٰ کے اعتبار سے نہایت ہی وسیع ہے جس کی ہزاروں قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً " تاریخ سیاست "، تاریخ جغرافیائی، تاریخ فنون لطیفہ، تاریخ نسلیات، تاریخ اثریات، تاریخ لسانیات، تاریخ ادبیات، تاریخ شعر و شاعری، تاریخ مذاہب، تاریخ اخلاق، تاریخ تصوّف، تاریخ انبیاء، تاریخ اولیاء، تاریخ سلاطین، تاریخ اسلام تاریخ نصاریٰ، تاریخ اقوام، تاریخ آئین سازی، تاریخ اکتشافات سائنس، تاریخ علم طب، تاریخ فلسفہ وغیرہ وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک مخصوص دائرہ تک بحث کرے گی۔ اور اس کی بحث کا انداز اور زبان

کا اسلوب بھی اس کے موضوع کے لحاظ سے جداگانہ ہوگا جو حالانکہ روایات کے ساتھ ساتھ درایات پر بھی مملو ہوگا۔ فنون میں اصطلاحات کا اور انبیاء اور اولیاء کے حالات میں ان کے مقدس مراتب کا خاص خیال رکھا جائے گا یعنی بیان اور زبان دونوں میں ادب اور تعظیم کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ شعر و شاعری اور ادبیات کی تاریخ میں زبان زیادہ رسیلی اور مجاہدین کی تاریخ میں جوشیلی اور اخلاق و تصوف میں سنجیدہ اور رواں قسم کی زبان ہوگی جبکہ کہانیوں کی زبان سلیس و سادہ اور داستانوں کی رنگین ہوگی اور تاریخی ناولوں میں عام بول چال کی زبان سے کام لیا جائے گا۔ مگر خشک قسم کا اسلوب بیان سوائے عروض، قانون، طب اور سائنس کے کہیں بھی زیبا نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخ کے اسلوب بیان میں خشک اور غیر رواں زبان کا استعمال، صاحب تصنیف کی استعمال زبان کے فن میں ناواقفیت اور نفسیاتی حیثیت سے تاثر سے بے بہرہ ہونے پر دلالت کرے گی نیز خود اس کے مزاج اور ذوق کی خشکی کا آئینہ دار ہوگی۔ لہذا ضروری ہے کہ تاریخ کی عبارت میں روانی ہے اور خشکی بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ مگر تاریخوں کے اسلوب میں خشکی اور اس کے ساتھ ساتھ تحریف دانستہ پیدا کرنے کا رواج سب سے پہلے مغرب کے سامراجیوں نے ڈالا جو اکثر اس فن عظیم میں ناکام رہے ہیں۔ اور نامصنف بھی کیونکہ ممالک اسلام کی تاریخوں میں انھوں نے اپنے سیاسی اغراض اور متعصبانہ ذہنیت کے پیش نظر کافی سے زیادہ کبر و نخوت کیا ہے اور حق و صداقت پر اپنے بطلانِ طبع کے بڑے بڑے تاریک حجاب ڈالے ہیں اور ماخذ اصلی کے خلاف جس رخ چاہا، قلم کو گھومایا ہے حتیٰ کہ پھر انہی سے بطور توریث یہ رسم ناز یبا ہمارے دیار کے ان مصنفین میں بھی بڑھ گئی جو ان کے دبستان ذہنیت کے پروردہ ہیں۔ اور بجز ان کے انہی کوتاہیوں کے باعث ان متقدمین کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے جو دراصل ماخذ اصلی کا مقام رکھتے ہیں اور زیادہ ثقہ اور واجب الاعتنا رہیں۔ ورنہ قرون وسطیٰ سے لیکر اٹھارہویں صدی عیسوی تک جبکہ مغرب کے سامراجیوں کا قدم اس فن کے میدان میں پورے طور سے نہ آیا تھا قدما کی تاریخیں جن کے ننانوے فیصدی مصنفین مسلمان ہیں حزم و احتیاط اور دیانت و صیانت کے معیار پر سونے کی طرح کھری اترتی ہیں۔ جنھوں نے اپنے کمال فن کے ذریعہ ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ فن کے مرتبہ تک فائز کر دیا اور یہ انہی کا حق بھی تھا اس لئے کہ وہی دنیا میں سب سے پہلے مورخ بھی تھے۔

## دنیا کے سب سے پہلے باقاعدہ مورّخ

چنانچہ آج اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ظہور اسلام سے پہلے دنیا میں کہیں بھی تاریخ نویسی بقید اصول فن موجود نہ تھی، اس کو فن کا مقام دینے والے سب سے پہلے لوگ مسلمان ہیں، جنھوں نے اس کے اصول اور اسالیب پر بھی الگ الگ باقاعدہ کتابیں لکھیں، اور اس کی جدا جدا قسمیں مقرر کر دیں۔ پھر انہی نے ہر ملک کی تاریخ پر ثقاہت سچائی اور دیانت کے ساتھ قلم اٹھایا اور ان کے حالات قدیمہ کو گمنامیوں کے ڈھیر سے کرید کرید کر اور نکال نکال کر تاریخ کی حسین عمارت کے آثار علمی میں جڑ دیا اور زندہ و جاوید بنا دیا۔ ورنہ کوئی آج ان کا جاننے والا بھی نہ ہوتا۔ مثال کے طور پر ان ممالک مثلاً چین، عراق و ایران، مصر و شام، روما و یونان، انڈونیشیا اور ہندوستان ہی کو لے لیجئے کہ جو بہر حال ظہور اسلام کے وقت کسی نہ کسی طور پر تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ عرب تو علم سے بھی بے بہرہ تھا۔ اس کا تو ذکر ہی کیا ہے، مگر ان دیگر ممالک میں بھی باوجود فن تحریر اور ان کے مخصوص علوم کے رواج کے تاریخ کا فن من حیث الفن مفقود تھا، اس وقت یورپ کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا، ان سب متذکرہ ممالک میں تاریخ یا تو کتبوں تک محدود تھی یا کہیں زبانی یادداشت یا کہیں مذہبی کہانیوں اور داستانوں پر مملو تھی، مگر اسلام نے اپنے ظہور کے بعد جہاں عرب اور تمام دنیا کو پر امن تمدن دے کر اعلیٰ قسم کی روحانیت و اخلاق شعاری اور شائستگی اور جمہوری

نظام حکومت دیا وہاں علم وفن سے بھی دامن انسانی کو مالامال کر دیا اس کے بعد مسلمانوں نے ایجاد و اختراع کے ذریعہ نئے نئے علوم وفنون کی تربیت کی، سائنس، فلسفہ، طب، علم جغرافیہ، علم ریاضی جو اگرچہ نامکمل صورت میں اُن تک پہنچے تھے مگر ان کو باقاعدہ فن قرار دے کر مدارج تکمیل تک پہنچانے والے مسلمان ہی تھے جن سے آج اہل یورپ نے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

## مسلمانوں کی تاریخیں

اسی طرح تاریخ نویسی کا بھی آغاز کیا اور اس کو بھی ایک اعلیٰ قسم کا فن بنا کر دنیا کو سکھلا دیا کہ آداب تاریخی نویسی یہ ہیں اور قصہ طرازی کے طریقے یہ ہیں چنانچہ دنیا میں سب سے پہلے باقاعدہ تاریخ بعہد بنی امیہ شام میں لکھی گئی اور سب سے پہلا مورخ عُبید بن شریہ المتوفی سنہ ۶۰ھ ہے جس نے زمانۂ جاہلیت کے عرب اور اسلام کے بعد کے عرب پر تاریخ کو ترتیب دیا۔ چین کی بھی سب سے پہلی باقاعدہ تاریخ ایک مسلمان ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ جن کا نام حضرت سلیط بن عبداللہ بن حنفی ہے جو حضرت عمر ابن عبدالعزیز (المتوفی سنہ ۱۰۱ھ) کے عہد میں بسلسلۂ تبلیغ اسلام چین گئے تھے اور پھر وہیں مقیم ہو گئے۔ اس وقت چین کے لوگ بھی محض قصے کہانیاں لکھتے تھے، تاریخ کے فن سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ یہ فن چینیوں نے انہی سے سیکھا اور اپنے ہاں رائج کیا۔

اسی طرح ایران کو لیجیے، کون نہیں جانتا کہ ایران اسلام سے پہلے دنیا کی عظیم الشان آتش پرست حکومت کا مرکز نہ تھا اور اپنی ایک مخصوص تہذیب، زبان اور تمدن کے لحاظ سے بھی مشرق میں کم شہرت نہ رکھتا تھا مگر فن تاریخ وہاں بھی رائج نہ تھا، لمبے لمبے قصے پوستین پر لکھے جاتے تھے جنھیں اساطیر کہتے تھے، چنانچہ ان کے طرز اور اسلوب کی جھلک آج بھی فردوسی کے شاہنامے میں ملتی ہے جو اس عہد کی ایک مشہور اساطیر کے ماخذ پر فردوسی نے ترتیب دیا تھا۔ جو ایک داستان ہے تاریخ نہیں ہے۔ اس ملک کی سب سے پہلی باقاعدہ تاریخ دمشق کے مشہور حکمران ہشام بن عبدالملک نے سنہ ۱۱۷ھ میں لکھوائی پھر اس کے بعد سنہ ۳۱۰ھ میں ایک ضخیم تاریخ ایران طبری نے لکھی جو خود ایک مسلمان مصنف تھا اور ایران کا بڑا مورخ مانا جاتا ہے۔ ایران کے تمام قبل از اسلام کے حکمران خاندان مثلاً اشکانیہ، ساسانیہ سب اسی مورخ کی وجہ سے آج تک تاریخوں میں زندہ ہیں، ورنہ ان کو بھی دنیا کبھی کا بھول گئی ہوتی۔

سنہ ۳۴۶ھ تک ابوالحسن علی بن مسعودی نے جو دنیا کی قوموں کی تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا ماہر مانا جاتا ہے، مصر و شام، اور عراق و یونان کی قدیم تہذیب اور قدیم تمدن پر بڑی بڑی تاریخیں لکھیں۔

اسی کی تحریروں سے فراعنۂ مصر، اور اہل یونان اور صابئین بابل و عراق کے تمدن کی تفصیلات آج دنیا کو معلوم ہیں ورنہ مصر میں تصاویر اور یونان میں منظوم داستانیں رائج تھیں جیسے ایلیڈ اور ادب کو تاریخ کہا جاتا تھا۔ مگر اب اُس کی تصانیف میں صرف کتاب الاشراف اور مروج الذہب باقی رہ گئیں ہیں۔ یورپ کے قدیم رومیوں اور اسپین کے آس پاس کے نصرانیوں کی تاریخ کے لکھنے والے بھی سب سے پہلے اسپین کے وہ علمائے اسلام ہیں جنھوں نے اسپین کے اسلامی عہد عروج میں بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ تاریخ نویسی پر صرف کیا اور یورپ کو زندہ و جاوید بنا دیا۔ انہی کے اقتباسات سے آج یورپ کی ہر نوع تاریخ زندہ اور موجود ہے۔

اسی طرح شمالی مغربی پاکستان کی تاریخ کو بھی سب سے پہلی بار منضبط کرنے والا مصنف (احمد بن یحییٰ البلاذری المتوفی ۲۷۹ھ) بھی مسلمان ہی تھا جس نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں اس علاقہ کے اس وقت کے حالات تاریخ اور تمدن پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

خود ہندوستان ہی کو لے لیجیے جہاں سلطان محمود غزنوی کے آخری حملۂ سومنات (سنہ ۱۰۲۶ء) تک ہندو عہد کی کوئی

باقاعدہ تاریخ سوائے دیومالائی داستانوں، قصّوں اور ڈراماؤں کے مطلق نہ تھی۔ اس ملک کے ہندو عہد کی باقاعدہ تاریخ کو بھی سب سے پہلی بار ایک مسلمان مصنف ہی نے ترتیب دیا اور یہ سلطان محمود کا مشہور درباری عالم علّامہ البیرونی (۹۷۳-۱۰۴۸ء) تھا جس نے "کتاب الہند" کے عنوان سے ہندوستان کے قبل از اسلام کے عہد کی تاریخ کو دو جلدوں میں ترتیب دیا۔ پھر اس کے بعد ہندوستان کے باقاعدہ ہند و تمدن پر بھی اپنے چشم دید مشاہدات کی بنیاد پر جس مصنف نے سب سے پہلی بار باقاعدگی کے ساتھ قلم اٹھایا وہ بھی مسلمان ہی تھا جو اس ملک کا ایک بڑا فاتح اور نئی مغل تہذیب کا لانے والا گذرا ہے جو محمد ظہیر الدین بابر (متوفی سنہ ۱۵۳۰ء) کے نام سے مشہور ہے "تزک بابری" اس باب میں اس کی باقاعدہ تصنیف ہے۔ جس میں ہند و تہذیب و تمدن کی صحیح اور سچی کیفیت نہایت ہی ثقاہت کے ساتھ پیش کی ہے۔

بہرکیف اسی طرح اندونیشیا میں بھی کہ جہاں اسلام کے ظہور سے قبل اگرچہ ہندوؤں کی چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی سلطنتوں کے دور گذرے ہیں۔ فن تاریخ اپنی تمام باقاعدگیوں کے ساتھ موجود نہ تھا صرف مذہبی کتابوں اور راجاؤں کے حالات قصّے کہانیوں کے طور پر لکھنے کا رواج تھا یا پھر کتبوں کی کھدائی اور ان کے نصب کرنے کا چنانچہ اس ملک نے بھی "فن تاریخ" اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمان ہی سے سیکھا۔ اس سلسلہ میں سب سے مشہور کتاب بستان السلاطین ہے جو ہندوستان کی ریاست بیکانیر کے علاقہ رانیر سے گئے ہوئے ایک مبلغ اسلام علامہ نورالدین کی تصنیف ہے۔ جنھوں نے آچیہ (سماترا) کے دربار شاہی میں سنہ ۱۶۴۰ء میں لکھکر پیش کی تھی جس میں اس عہد کے مسلمان سلاطین کا پورا تذکرہ کیا ہے اور ان کے نظام حکومت اور سوشیل لائف پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں بھی جو ولندیزیوں کا ترتیب دیا ہوا ہے اسی کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا معلوم ہوتا ہے ان کے بعد تو پھر ولندیزیوں نے اپنی تاریخیں لکھیں۔ جن میں نہ ہندوؤں کی زیادہ تفصیلات ہیں اور نہ عہد اسلام ہی کا پورا نقشہ ہے سوائے اپنے ذکر اور اپنے مقصد تک کام دینے والی پچھلی باتوں کے سب کو حذف کر دیا۔ تمدن پر بھی کوئی مستقل کتاب نہ لکھی۔ البتہ کلچر پر کچھ لکھا ہے سو اس سے اس ملک کو مناسب فائدہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انھوں نے تمدن کے بجائے کلچر کو بیان کیا ہے جن میں ناچ رنگ گانا اور دیگر لہو و لعب کو زیادہ سراہا ہے اور بس۔

## اب مغرب کے سامراجی اس فن میں لائق تقلید نہیں

لہٰذا اب مغرب کے سامراجی اہل مشرق کے لئے ہرگز اس فن میں تقلید کے لائق نہیں، انھوں نے تاریخ کے اصول کو اپنے مقاصد کے پیش نظر بالکل بدل ڈالا، طرز تحریر کو بھی خشکی کا سبق سکھا کر تراوت سے محروم کر دیا جو سوائے تاریخ کے اور کہاں مل سکتا تھا، انھوں نے تاریخ کا دائرہ سیاست تک محدود کر کے تنگ کر دیا، لڑائیوں کے سوائے کچھ بیان نہ کیا، کیونکہ لڑانے ہی رہنا ان کی غرض تھی محض حکمرانوں کی سوانح اور تذکروں کو تاریخ لکھکر متعلقہ ممالک کے افراد کو فرد نذر کر دیا اس لئے کہ غیر ملکی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی اپنے تذکرے اسی نہج پر پیش کرنا چاہتے تھے، چنانچہ وہ پیش کرتے رہے، اور اس کا سبق اپنے مدارس میں بھی دیتے رہے اس طرح انھوں نے افراد کو نظر انداز کر کے انھیں منارۂ سربلندی سے ڈھکیل کر سمک پستی میں پہنچا دیا، ریسرچ بھی کیا تو ان امور پر جو یا تو خود ان کے سامراجی مقاصد کو پورا کرتے تھے یا پھر ایسے امور تھے کہ جن سے اس ملک کی اکثریت کو تمدنی حیثیت سے سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ تھا، پھر کذب و افترا اور بہتان سے بھی کام لیا گیا تھا جو سراسر فن تاریخ کی اہانت ہے۔ مورخ کو ہمیشہ منصف مزاج اور بے لاگ ہونا چاہئے، اس کا مسلک حالات و واقعات پر حق و صداقت کے ساتھ روشنی ڈالنا ہوتا ہے، وہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہتا ہے اور روایات کو مسخ کر کے پیش

نہیں کرتا، البتہ یہ ضرور کرتا ہے جو اصل بیان سے الگ چیز ہے، اور جس کے بغیر واقعات سے نتائج کا استنباط مضمر رہ جاتا ہے، چنانچہ قدما جن سے میری مراد وہ مسلمان مورخین ہیں۔ جن کا کچھ مختصر سا تذکرہ تعارف کے طور پر اوپر گزر چکا ہے، تاریخ نویسی کے وقت ہر امر احتیاطی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ لہذا ثقاہت، دیانت، امانت، متانت اور حق گوئی وانصاف میں آج تک ان کی تصانیف تاریخ دنیا میں مشہور ہیں، حتیٰ کہ اب تک ان کی سند کا سکہ چلتا ہے۔ اور ہر ملک کے لوگ عہد قدیم کے باب میں انہی سے اقتباس کرتے ہیں۔ تاریخیں دراصل انہی کے اصول کے مطابق لکھی جانی چاہئیں نہ اہل مغرب کے طریقے اب جبکہ ان کا سامراجی اقتدار مشرق سے اٹھ کر عالم عدم میں جا چکا۔ کالعدم ہو جانے چاہئیں۔ اب تاریخ کو دراصل "تاریخ محض" ہونی چاہئے۔ ایک جزو، یا ایک چھوٹے سے حصہ پر مشتمل نہیں ہونا چاہئے ورنہ وہ پھر تذکرہ یا سوانح ہو کر رہ جائے گی۔ پورے ملک کی تاریخ نہ ہوگی، کسی ملک کی پوری تاریخ وہی کہلائے گی جو "تمدن" کے ہر دور ارتقاء پر روشنی ڈالے گی جس میں واقعات کو ضبط تحریر میں لانے کے ساتھ ساتھ بیان کے خاص ادبی اسلوب کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، ثقاہت بھی ہوگی اور دیانت وصداقت بھی، روانی بھی اور استنباط نتائج کے انداز بھی تاکہ جہاں ایک طرف متعلقہ ملک کے لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے اور دیگر ممالک کے لوگ بھی ان سے متعارف ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ اور اس تاریخ کو بیان کرنے والی زبان بھی اپنی عظمت ادبی کا مقام اعلیٰ پانے سے محروم نہ رہے۔

## تاریخ تمدن انڈونیشیا

چنانچہ انہی تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی اس کتاب "تاریخ تمدن انڈونیشیا" کو ارباب علم کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ جس میں ملک کے تعارف سے لے کر طبعی حالات یعنی جغرافیہ، نباتات، جمادات، حیوانات، وسائل معاشی، کردار قوم، تاریخ نسلیات، تاریخ لسانیات، تاریخ دور حجری، وغیرہ پھر تاریخ مذاہب، مثلاً ہندوؤں کا زمانہ، بدھوں کا زمانہ، اسلام کا ظہور، پھر ہر دور کا تمدن، اقوام مغرب کے حملے۔ ان کا آنا اور یہاں چھا جانا۔ پھر اپنی لوٹ کھسوٹ کی متنوع حکمتوں سے اس ملک کے دامن دولت کو خالی کر دینا۔ پھر نشاۃ ثانیہ کا آغاز اور اہل ملک کی سیاست کے میدان میں قدم، سیاسی وغیرہ امور کو جنگ عظیم دوم کے آغاز تک بیان کیا ہے۔ اور یہ بیان کو اس کی نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص فصل کے ماتحت چند ابواب کے ذیل میں ترتیب دیا ہے۔ البتہ حکمرانوں کی سوانح کہ جو تذکروں سے تعلق رکھتی ہیں غیر ضروری جان کر قصداً حذف کر دی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں صرف انہی حکمرانوں کا حال بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اس ملک کے تمدن کو اپنے عہد میں کسی بھی حیثیت سے متاثر کیا ہے۔

لہذا ہر بیان کو سلسلہ وار آگے کے اوراق میں ملاحظہ فرمایا جائے۔ فقط


۳۔ کاسی مینشن، مہاراسٹر روڈ
نزد جوبلی سینما، کراچی
(پاکستان)
اپریل ۱۹۵۳ء

عالم اسلام کا خادم
**نور احمد قادری**
"مصنف" تاریخ تمدن انڈونیشیا

# فصل اوّل
# باب اوّل
# تعارف

**اندونیشیا**

یہ ملک ''اندونیشیا'' کہلاتا ہے چین کے بعد مشرق بعید کا سب سے بڑا اور دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں ساتواں بڑا ممالک ہے جو بحر ہند اور بحر الکاہل کے درمیان پانچ ہزار کلومیٹر لمبے اور دو ہزار کلومیٹر چوڑے رقبہ میں پھیلے ہوئے تین ہزار بڑے اور چھوٹے بہرسائز کے جزائر پر مشتمل ہے جس کی کل آبادی سات کروڑ اور اسی لاکھ ہے جن میں سات کروڑ اور ۳۵ لاکھ مسلمان اور بقیہ ۴۵ لاکھ دیگر مذاہب کے لوگ مثلاً ہندو، عیسائی، مظاہر پرست اور چینی وغیرہ ہیں۔ اس طرح مسلمان کل آبادی کا ۹۶٫۹ فیصد ہیں جبکہ دیگر مذاہب کے لوگ بمشکل ۳٫۱ فیصد ہوتے ہیں۔ اسی لئے ''اندونیشیا'' دنیائے اسلام میں سب سے بڑی اسلامی آبادی کا ملک ہے۔

**نام کی وجہ تسمیہ**

اس ملک کا نام ''اندونیشیا'' جیسا کہ بعض لوگ اپنی عدم معلومات کی وجہ سے ''ہند ایشیا'' سے بگڑ کر ''اندونیشیا'' کا بنا ہوا تصور کرتے ہیں، کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''ہند وایشیا'' اس ملک کا کبھی نام نہ تھا اور از روئے اشتقاق بھی ''اندونیشیا'' کا لفظ ''ہند وایشیا'' سے نہ بنا ہے اور نہ بگڑا ہے۔ یہ ایک جغرافیائی نام ہے جس کا تعلق ہندو یا بدھ مت سے نہیں بلکہ اس کی اس جائے وقوع سے ہے جو قدرتی طور پر بحر ہند کے سمندر سے شروع ہو کر بحر الکاہل تک محتوی ہے اور اس کے خوبصورت، دلفریب، اور زرخیز و زرریز ہزارہا جزائر کی ایک نسل، ایک قوم اور ایک ملک کی معنوی اصطلاح پر منطبق ہے۔ اب یہ اندونیشیا ہے اور اسلام کی ایک عظیم اور اولو العزم قوم کا وطن ہے۔

ممالک ایشیا میں جس طرح اس کی زرخیزی اور زرریزی، اس کی نباتات اور معدنیات، اس کی وحشیات اور حیوانات، اس کے پہاڑی دفینوں اور بحری خزینوں میں انعام ہائے قدرت بے مثل ہیں۔ اسی طرح اس کے ناموران اسلام کی سرگذشت بھی دینداری، عدل پروری، کرم گستری، جانبازی، شجاعت اور مردانگی کی تاریخ میں مشرق بعید کے دور افتادہ ممالک میں اپنا جواب نہیں رکھتی ان کے کارناموں نے اس کے نام کو روشن کر دیا۔

**نام کی فلالوجیکل یا لسانی اصل**

اب جہاں تک کہ اس نام کے متعلق فلالوجی کے علمی نظریہ کا تعلق ہے۔ یہ لفظ یعنی ''اندونیشیا'' ایک یونانی لفظ مرکب سے اندونیشی زبان میں وارد ہوا ہے جو اپنی اصل میں (Indus-Nesus) اندوس نےسوس، تھا اور ''جزائر ہند یہ شرقیہ'' کے معنی میں استعمال کیا گیا تھا جو بحر ہند سے شروع ہو کر بحر الکاہل کے دور و دراز رقبہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لفظ کے پہلی بار استعمال کرنے والے بھی عموماً وہ محققین سائنس ہیں جنھوں نے اس نواح مشرق میں انسانیات، نسلیات، نباتیات، حیوانیات، معدنیات، ارضیات اور اثریات کی تحقیق میں کتابیں لکھ کر واضح کیا ہے کہ یہ ہزارہا جزائر کا عظیم الشان مجموعہ سدا سے ایک قوم اور ایک ملک ہے اور ''اندونیشیا'' اس کا نام ہے چنانچہ اب یہ لفظ ''اندونیشیا''، جس کا اشتقاق ''اندوس نےسوس'' سے ہوا ہے۔ اندونیشی زبان کا خاص لفظ ہے اور قوم اور ملک اور حکومت اور زبان کے لئے عام اصطلاحی معنوں

میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا اسم مشتق ہے۔

## نام کے قدیم تاریخی قرینے

اب ذیل میں ان مختلف ناموں کا تاریخی قرینہ بھی ملاحظہ ہو۔ جن کے ساتھ یہ ملک عہد قبل از تاریخ میں پھر ہندوؤں، بدھوں کے زمانہ میں اس کے بعد ظہور اسلام اور اقوام مغرب کے قبل و بعد کے دور میں، نیز اصطلاحات اہل چین اور اہل عرب اور پھر اہل یورپ میں معنون ہوتا رہا ہے اور اب "انڈونیشیا" ہے۔

زمانۂ قبل مسیح سے پہلے کا وہ دور جو ہزارہا سال کے ایک طویل امتداد پر محتوی ہے اور جسے اس ملک کی تاریخ تمدن میں "عہد قبل از تاریخ" سمجھنا چاہیئے، اس عہد میں یہ ملک "نوسنتارا" کہلاتا تھا۔ چنانچہ جب سن عیسوی کی شروع صدیوں میں ہندو اور بدھ اس ملک میں وارد ہوئے تو اس وقت بھی یہاں کی عام جزائری بولی "ملایو" میں یہی لفظ رائج تھا جیسا کہ آج بھی اس کے ثبوت میں ہر جزیرہ کی علاقائی زبان میں یہ لفظ اس قدامت کے ساتھ ملتا ہے، چنانچہ ہندوؤں نے بھی شروع شروع میں اسی لفظ کے استعمال سے اپنا کام نکالا تھا جیسا کہ ان کے بعض کتبوں پر کندہ ملا ہے۔

سن عیسوی کے آغاز میں جب ہندو کبھی پناہ گیروں کی حیثیت سے اور کبھی کاروبار کرنے کی غرض سے آس پاس کے ممالک خصوصاً چمپا، کمبوڈیا اور ہندوستان سے چل کر اس ملک میں وارد ہوئے اور بستے چلے گئے۔ زاں بعد وہ مقامی باشندوں سے میل جول پیدا کر کے اور انھیں اپنے اثر میں لا کر ان کی املاک پر بھی متصرف ہو گئے تو وہ اس ملک کو اپنے افادی نقطۂ نظر کے ماتحت مختلف ناموں کے ساتھ پکارنے لگے اور اس طرح اور دوسرے نام بھی وضع ہو گئے۔ شروع شروع میں انھوں نے اس ملک کا نام "سُوَرنا دِیپا" یعنی "سُونا اُگلنے والے جزائر" رکھا جو "نوسنتارا" کی قدیم اصطلاح نام پر معنوی حیثیت سے منطبق ہوتا تھا۔

چنانچہ اس سلسلہ میں ہندوستان کا ایک بنگالی ہندو مصنف "ڈاکٹر بیجن راج چیٹرجی" اپنی کتاب (India and Java) مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۳ء کے صفحہ ۵۵ پر) قدیم ہندوستانی ہندوؤں کی کتاب "رامائن" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"بدھوں سے پہلے جب ہندو اس ملک (انڈونیشیا) میں پہنچے تو انھوں نے اس ملک کا نام "سورنادیپا" (Swarnadvipa) یعنی "سونے کے جزائر" رکھا جو اب بھی رامائن میں ملتا ہے۔

ایک اور مصنف لکھتا ہے کہ ہندوؤں کی آمد سے قبل یا اس کے بعد تک جب یہ ملک "نوسنتارا" کہلاتا تھا تو اس کے اس نام کی اصطلاح کا اطلاق ملایا، سماترا اور جاوا سے لے کر نیوگنی اور شمال میں بورنیو، سلاویسی اور مالوکو سے فلپائن، اور فارموسا اور دیگر جزائر میڈاگاسکر اور سیلون پر ہوتا تھا جو اس وقت کی تہذیب، زبان، نسل اور عقائد کے لحاظ سے ایک ہی قوم کے اماکن تھے۔

غرض پیش نظر امور پر تحقیقات کرتے وقت ابھی حال ہی میں مجھے ایک انڈونیشی رسالہ کے ذریعہ ایک اور قیمتی معلومات بہم پہنچی ہے جس سے پتہ چلا ہے کہ جاوا کے قدیم ہندو آثار کے ایک دفینہ سے اور دیگر چیزوں کے ساتھ ایک قدیم قلمی کتاب بھی بزبان جاوا برآمد ہوئی ہے جو انڈونیشیائے قدیم کی آخری ہندو سلطنت "مجاپاہت" کے وزیر اعظم "گجامدٗ" کے ایک درباری اہل قلم "پراپنچا" کی تصنیف ہے۔ اس کتاب سے اخذ کر کے معلومات مشتہر کرنے والوں نے واضح کیا ہے کہ اس کتاب میں ملک کے دو نام تحریر کئے گئے ہیں۔ ایک مغربی

حصہ کا نام ۔۔۔ مشرقی حصہ کا نام مغربی حصہ کو وانن (Wanin) اور مشرقی حصہ کو سارن (Saran) کہا گیا ہے۔

اسی طرح اہل چین کی کتابوں اور تحریروں میں بھی مختلف ناموں کا سراغ لگایا گیا ہے جو کہیں پورے ملک کے لئے اور کہیں کسی خاص رقبہ حکومت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

## اہل عرب اور اہل یوروپ کا نام کے ساتھ اعتنا

اہل عرب نے بھی اہل چین کی طرح مختلف دور میں مختلف نام استعمال کئے ہیں جس کا قرینہ چینیوں سے بہت زیادہ مماثل ہے البتہ عہد ظہور اسلام کے بعد جہاں جہاں بھی تصانیف اہل اسلام میں اس ملک کا نام ۔۔۔ یا ۔۔۔ فیہ ہندیہ ہے اور یا جزائر شرق الہند ہے جو قدیم نام نوسنتارا ہی کا عربی ترجمہ معلوم ہوتا ہے اسی طرح ہندوؤں کے عہد میں سماترا کا نام سمدرا اور ملایا کا نام سمنان جونگ تھا جو بعد میں اہل عرب نے ایک حسین تلفظ میں وضع کر کے سماترا اور راسے ملایا کہا۔

اہل یوروپ میں انگریز جغرافیہ داں سب سے پہلے لوگ ہیں جنھوں نے اپنے سفر نامہ میں ہر جزیرہ کا جغرافیائی حال لکھا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر ولیس ہے جس کی کتابیں میں نے خود مطالعہ کی ہیں۔ یہ سب سے پہلا انگریز ہے جس نے جغرافیہ کی غرض سے سفر نامہ لکھا جس کا عنوان (Eastern Archipelago) ہے اور ۱۸۶۹ء کا مطبوعہ ہے۔ اس کا دیا ہوا نام "مجمع الجزائر شرقیہ" ہی کی عربی ترکیب کا ترجمہ ہے۔ کسی انگریز مصنف نے "نیدرلینڈز انڈیا" بھی لکھا ہے۔ جبکہ ان کے مورخین "ڈچ ایسٹ انڈیز" لکھتے رہے ہیں اور جو ولندیزیوں کی خود قائم کردہ سرکاری اصطلاح نام "نیدرلینڈشے ڈچ ایسٹ انڈی" کا انگریزی ترجمہ ہے۔

ایک ولندیزی مستشرق "ام ے فنڈن لوش" اپنی کتاب "ڈچ ایسٹ انڈیز" (زبان انگریزی) مطبوعہ ۱۹۴۲ء کے صفحہ ۱ پر اسی موضوع پر مختصر سی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

تقریباً ۸۰ سال کا عرصہ ہوا ایک جرمن ماہر نسلیات ڈاکٹر باسٹن (Dr.Bastin) نے جزائر کے اس پورے ملک کے لیے "اندونیشیا" کی اصطلاح استعمال کی تھی اور اپنی اصطلاح میں اس نے خود اندونیشیا کے علاوہ دیگر جزائر مثلاً فلیپائن، فارموسا، برٹش ملایا اور میڈاغاسکر پر بھی اپنے اس نظریہ کی معنویت کا اطلاق کیا تھا۔

اسی طرح ایک مشہور علمی مقالہ میں جو دی اتھینالوجی آف اندونیشیا کے عنوان سے (The Journal of the Indian Archipelago And Eastern Asia) کی جلد چہارم مطبوعہ ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا تھا اس کے صفحہ ۳۳۴ پر ان الفاظ میں تحریر کیا گیا تھا کہ:۔

"مجمع الجزائر کی اصطلاح خواہ برقرار رہے مگر "اندونیشیا" کا مختصر لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے"

اس کے علاوہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری" میں بھی (اندونیشیا) "Indonesia" کا لفظ آیا ہے جس کا ذکر نیچر کی بحث میں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۱ء کی مطبوعہ ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر باسٹن نے ۱۸۸۴ء میں اپنی ایک اور عبارت میں "اندونیشین" کا لفظ اس طرح استعمال

کیا ہے۔ "Indonesian oder die Inselin des Malaychen Archipel"

## نام کے ساتھ اہل ملک کا اعتنا

مگر عصر حاضر میں اس نام کو اہل اندونیشیا نے فروغ دیا ہے اور یہ فروغ دینے والے وہ چند جوشیلے اندونیشی نوجوان طلباء تھے جنھوں نے ہالینڈ جا کر تحصیل علم کی تھی۔ اس واقعہ کی تاریخی حیثیت عہد حاضر کی کتب سیاسی سے جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب ان طلباء اندونیشی نے "مسٹرڈم یونیورسٹی"۔ (واقع ہالینڈ) میں "پرہم پونان اندونیشیا" (یعنی انجمن اندونیشیا) ۱۹۱۴ء میں مشہور اندونیشی طالب علم۔ "احمد سوبارجو" کی قیادت میں قائم کی تو اس کی پہلی نشست میں جہاں اور بہت سی نئی تجاویز زیر بحث لائی گئیں وہاں ایک تجویز ملک کے نام کے متعلق بھی تھی یعنی یہ کہ ولندیزیوں کے سرکاری طور پر رکھے ہوئے سامراجی نام "ڈچ ایسٹ انڈیز" کے برعکس اس کا قومی نام "اندونیشیا" ہونا چاہئے اور چنانچہ اسی مناسبت سے انھوں نے اپنی انجمن کے نام کے ساتھ بھی "اندونیشیا" کا لفظ لکھا تھا جو غالباً اندونیشیا کی تحریکات سیاسی کی موجودہ صدی کی تاریخ میں پہلی بار ایک جماعت نے اختیار کیا۔

اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں جیسا کہ بعض رسائل اندونیشیا سے معلوم ہوا ہے کہ جب اندونیشیا میں بعہد نشاۃ ثانیہ، طالب علموں نے مشہور و معروف انقلابی طالب علم سوکارنو، (جو اب صدر جمہوریہ ہیں) کی قیادت میں "ایک ملک، ایک قوم، ایک زبان" کا نعرہ بلند کیا تو ان تینوں باتوں کے لئے اصطلاحی طور پر "اندونیشیا اور اندونیشی" ہی اختیار کیا گیا جس پر ولندیزیوں کی ظالمانہ ترین حکومت نے تشدد کا دروازہ کھول کر اپنے من مانے کالے قوانین کی آڑ میں بڑے بڑے ظلم کئے اور جگہ جگہ فائرنگ کر کے ہزارہا حریت پسند مسلمان طلباء کو ہلاک کر ڈالا اس لئے کہ ان کے نصب العین کے مطابق "اندونیشیا" کی اصطلاح کا استعمال "ڈچ ایسٹ انڈیز" کے مقابلہ پر قابل تعزیر تھا۔

## نام کا سرکاری طور پر اعلان

مگر ۱۹۴۲ء میں جب جاپان نے حملہ کیا اور ولندیزی دم دبا کر یہاں سے بھاگ گئے تو اس نئی آنے والی قوم نے بھی اہل ملک کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے سرکاری طور پر "اندونیشیا" ہی استعمال کرنا شروع کیا تھا چنانچہ ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو (جاپان کی شکست کے بعد) اندونیشیا کے حریت پسند اور دلیر رہنماؤں نے اپنی قوم کے ساتھ اعلان آزادی کیا تو اندونیشیا ہی استعمال کیا تھا مشرق و مغرب کے تمام ممالک نے حتیٰ کہ اس وقت کے متحدہ ہندوستان نے بھی جہاں مسلم لیگ اور کانگریس کی عبوری حکومت قائم تھی اپنے ریڈیو سے "اندونیشیا" ہی کے نام کے ساتھ اعلان آزادی کی خبر کو نشر کیا تھا۔ اس وقت اندونیشیا کا نام ولندیزیوں کی چال بازیوں کے باعث عام طور پر پہچانا نہ جانے کے باعث ایک نیا سا نام معلوم ہوتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ پھر لوگ اخبارات کے ذریعہ واقف ہوتے چلے گئے اور سمجھ گئے کہ "اندونیشیا" اس ملک کا نام ہے جو ہزارہا جزائر کی ایک نوادر نواز اور عجائب آفرین وہ مسلم سرزمین ہے جس کو دست قدرت نے حسن فطرت سے کافی نوازا ہے اور ایک ایسا دلفریب مرقع بنا دیا ہے کہ جس پر علم جغرافیہ بھی ناز کرتا ہے۔ اب یہ جغرافیائی حالات آگے کے ابواب میں بیان کئے جائیں گے۔

# باب دوم

# ملک کے عام جغرافیائی حالات

## دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر

اس ملک (انڈونیشیا) کے عام جغرافیائی حالات پر غور کرنے سے قبل یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ ملک (انڈونیشیا) دنیا میں سب سے بڑا مجمع الجزائر ہے جس میں دنیا کے سب سے بڑے اور چھوٹے ہر حیثیت کے جزیرے شامل ہیں جو بلحاظ تعداد تین ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔

## ملک کی جائے وقوع اور رقبہ

اس طرح یہ پورا مجمع الجزائر (انڈونیشیا) کافی وسیع و عریض ہے اور بحر الکاہل پر جنوبی مشرقی ایشیا اور برِاعظم آسٹریلیا کے درمیان ۹۵ تا ۱۴۱ درجات[۱] طول البلد مشرقی اور ۷ درجات عرض البلد شمالی سے ۱۱ درجات عرض البلد جنوبی تک پھیلا ہوا ہے جس کا طول غرب تا شرق ۵۰۰۰ ہزار کلومیٹر اور عرض شمال تا جنوب دو ہزار کلومیٹر ہے جبکہ کل رقبہ تقریباً دو ملین[۲] مربع کلومیٹر کے برابر ہوتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا عرض البلد (خط استوا) اس ملک کے بالکل وسط سے ہوکر گذرتا ہے۔ اس طرح اس کے وسطی حصّوں میں واقع ہونے والے جزائر ۵ درجات عرض البلد شمالی اور جنوبی تک منطقہ حارہ میں واقع ہیں جہاں خوب بارش ہوتی ہے اور خوب گرمی پڑتی ہے اس طرح چھوٹے بڑے تمام جزائر کا یہی عالم ہے جن کی جغرافیائی کیفیات پر آگے چل کر غور کیا جائے گا اب پہلے یہاں مختصر طور پر بڑے بڑے جزائر کے رقبہ اور آبادی پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

## انڈونیشیا کے بڑے بڑے جزائر یوروپ کے بڑے بڑے ممالک سے بھی رقبہ میں بڑے ہیں

چنانچہ اگر انڈونیشیا کے سب سے بڑے جزائر مثلاً سماترا، جاوا، کالیمنتان (بورنیو) سلاویسی (سلیبیس) اور ایریان برات،

---

۱؎ یہ تفصیلات "ٹریڈ ڈائرکٹری آف انڈونیشیا"، مطبوعہ جکارتا ۱۹۴۹ء کے صفحہ ۷ سے ماخوذ ہیں، قادری

۲؎ یہی رقبہ ۱۹۵۲ء کی "بزنس ڈائرکٹری آف انڈونیشیا" کے صفحہ ۱ پر ۱،۹۰۴،۳۴۵ مربع کلومیٹر دیا ہوا ہے۔

نوٹ:۔ واضح رہے کہ ایک کلومیٹر = ½ ۱ میل ۔ قادری

(مغربی نیوگنی) ہی کی محض جغرافیائی کیفیات پر انفرادی حیثیت سے غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان جزائر میں سے ہر جزیرہ دنیا کے کسی نہ کسی مشہور ملک سے رقبہ میں بہت بڑا ہے۔ چنانچہ یوروپ کے بعض وہ ممالک جو دنیائے سیاست میں اپنی بعض مخصوص باتوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں وہ بھی مقابلتاً بلحاظ رقبہ اور وسائل قدرت، انڈونیشیا کے ان متذکرہ بڑے بڑے جزائر سے بہت چھوٹے ہیں مثلاً سماترا، جو دنیا میں دوسرا بڑا جزیرہ ہے، گریٹ برٹین (برطانیہ) کے پورے مجموعہ سے تین گنا بڑا ہے۔ اسی طرح کالیمنتان (بورنیو) جو انڈونیشیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے (باخراج اس حصۂ شمالی کے جو اس جزیرہ کے کل رقبہ کا صرف ۱/۳ کے برابر ہے اور جس پر برطانیہ نے قبضہ کر رکھا ہے) ملک فرانس کے پورے رقبہ سے دو گنا بڑا ہے اور اسی طرح جزیرہ جاوا بمعہ مدورا رقبہ کے لحاظ سے نیویارک اسٹیٹ (واقع ممالک متحدہ امریکہ) سے چار گنا بڑا ہے اور سلاویسی مجمع الجزائر رقبہ میں جرمنی کے کل رقبہ سے بھی ڈیڑھ گنا زیادہ ہوتا ہے اور ایریان برات (مغربی نیوگنی) اتنا بڑا ہے کہ اس میں اسپین، پرتگال بمعہ ہالینڈ اور بلجیم کے سما جائیں اور پھر بھی تھوڑا خلا باقی رہے۔

اس سے اندازہ ہوا کہ اگر انڈونیشیا کے تمام جزائر کو یوروپ کے پورے نقشہ پر ترکیب اور ہوشیاری کے ساتھ منطبق کیا جائے تو باخراج اشتراکی روس کے اسلامی دنیا کا یہ قابل فخر ملک (انڈونیشیا) یوروپ کے برابر ہوگا، حالانکہ باعتبار زراعتی اور معدنی اور حیوانی دولت کے یوروپ کے ممالک مجموعی طور سے اتنے انعامات دست قدرت سے محروم ہیں جتنے اکیلے انڈونیشیا کو ملے ہیں۔ خدا اس کو موجودہ صنعتوں اور ترقیاتی منصوبوں میں سرفراز فرمائے کہ یہ بھی ہمارے عزیز وطن پاکستان کی طرح عالم اسلام کا مضبوط ترین بازو ہے اور پورے عالم انسانی کے لئے قیام امن کی دولت کا قیمتی سرچشمہ ہے۔ جس کی افرادی قوت کا اندازہ بڑے بڑے جزائر کی ذیل میں دی ہوئی جدول[1] سے کیا جا سکتا ہے۔

| نام جزیرہ | رقبہ | | آبادی |
|---|---|---|---|
| جاوا بمعہ مدورا | ۱۳۲،۱۷۴ | مربع کلومیٹر | ۵۲،۰۰۰،۰۰۰ |
| سماترا بمعہ گروپ | ۴۷۳،۶۰۵ | " | ۱۰،۷۵۰،۰۰۰ |
| کالیمنتان (باخراج علاقہ برطانیہ) | ۵۳۹،۴۶۰ | " | ۳،۸۰۰،۰۰۰ |
| سلاویسی (سلیبس) | ۱۸۹،۰۳۵ | " | ۵،۴۵۰،۰۰۰ |
| بالی[2] اور لمبوک | ۱۰،۲۹۰ | " | ۲،۳۰۰،۰۰۰ |

[1] یہ اعداد شمار (Business Directory of indonesia) مطبوعہ جکارتا ۱۹۵۳ء کے صفحات سے ماخوذ ہیں۔ قادری

[2] انڈونیشیا کے کل ہندو اسی جزیرہ بالی میں رہتے ہیں۔ جن میں ۲۵ فیصدی مسلمان اور پھر کچھ دیگر مذاہب کے لوگ بھی ہیں۔ قادری

| نام جزیرہ | رقبہ | آبادی |
|---|---|---|
| تمور اور دیگر جزائر | ۶۳۰۳۲۵ مربع کلومیٹر | ۲۰،۰۰۰،۰۰۰ |
| ملوکے تمام گروپ معہ ایریان برات | ۴۹۰۴۵۰ | ۲،۲۰۰،۰۰۰ |

## دنیا کا گنجان ترین آباد علاقہ

ان متذکرہ جداول کے ملاحظہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انڈونیشیا کتنی بڑی آبادی کا ملک ہے۔

پھر جاوا تو خصوصاً نہایت ہی گنجان ہے۔ جس کے متعلق اہل جغرافیہ کا خیال ہے کہ یہ دنیا کا گنجان ترین آباد علاقہ ہے یوں تو دنیا میں چین، پھر ہندوستان، پھر امریکہ، پھر روس اور پھر پاکستان بہت ہی بڑی آبادی کے ممالک ہیں مگر رقبہ کے تناسب سے آبادی کی حیثیت پر جب غور کیا جاتا ہے تو وہ انڈونیشیا ہی ان ممالک میں سب سے زیادہ گنجان نظر آتا ہے مثلاً سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہونے والی مردم شماری کی عالمی رپورٹ کے اعتبار سے چین میں ۲۰۰ افراد، ہندوستان متحدہ میں ۱۹۶ افراد، ممالک متحدہ امریکہ میں ۳۲ افراد، انگلستان اور ویلز میں ۶۸۵، بلجیم ۶۵۴ افراد اور جاوا میں ۹۰۰ افراد فی مربع میل بستے ہیں۔ اس طرح جاوا دنیا کا گنجان ترین آبادی کا حصہ ہے جو جزائر انڈونیشیا میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

## طبعی ساخت

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں پیداوار کس قدر افراط سے ہے کیونکہ انسان ہمیشہ انہی مقامات پر زیادہ آباد ہوا کرتا ہے جہاں کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور زندگی کو آرام کے ساتھ بسر کرنے کے اسباب کافی میسر آ سکیں، کاروبار مل سکے۔ چنانچہ انڈونیشیا کے جزائر طبعی ساخت کے لحاظ سے بھی نہایت زرعی ہیں، سنگلاخ نہیں ہیں انڈونیشیا کے لئے یہ امر کس قدر موجب خوش بختی ہے کہ قدرت نے اسے بحری اور بری دونوں حیثیتوں سے نوازا ہے، اس کے ساحل بھی طوفانوں سے محفوظ و مامون ہیں۔ اس لئے کہ جابجا کھاڑیاں ہیں، خلیجیں ہیں اور جزائر کی آڑ ہے پھر ساحل بھی ہر طرف سے کٹا پھٹا ہے۔ جہاں جہازرانی خوب ہو سکتی ہے اور ماہیگیری کے بھی امکانات بڑے ہیں، بری حیثیت سے بھی پہاڑ ہواؤں کے رُخ پر ہیں اور بارش کا موجب ہیں جن سے کافی دریا نکلتے ہیں اور زرخیز میدان بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک ہمیشہ سے وافر پیداوار کا ملک رہا ہے۔ بقول ماہرین جغرافیہ ہر طرف شادابی ہے، سبزہ لہلہاتا ہے، اور اہل نظر کو صانع مطلق کے جلوہ ہائے بے مثال دکھاتا ہے۔

چنانچہ طبعی ساخت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ڈڈلے اسٹامپ (مصنف کتاب ایشیا) نے لکھا ہے کہ "اگرچہ یہ سب جزائر پہاڑی ہیں مگر ان کے پہاڑ اس نوعیت کے نہیں جو ہواؤں کو بارش برسانے سے روکیں یا دریاؤں کے مخالف سمت والے سیلابوں کا موجب بنیں، البتہ بعض سلسلے ان میں سے آتش فشاں ہیں مگر نہ تو وہ جاپان کے فیجی یاما پہاڑ کی طرح بہت زیادہ اونچے ہیں اور نہ اطالیہ کے جنوب کے جزیرہ سسلی کے ویسو ویس کی طرح خطرناک ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ اوسط اونچائی دس ہزار فٹ ہے۔ لیکن جاوا کا مشہور آتش فشاں پہاڑ بورو زیادہ متحرک ہے

اور زیادہ زلزلہ انگیز ہے۔

طبعی ساخت کے سلسلہ میں "وزارت اطلاعات"، اندونیشیا کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات یہ[۱۵] ہے کہ پورے ملک کا نصف سے زیادہ حصہ پہاڑی ہے اور جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے، ۱/۷ حصہ میں دریا بہتے ہیں اور بڑی بڑی جھیلیں ہیں۔ ۱/۴ رقبہ میں مزروعہ زمینیں ہیں۔ جن کی حیثیت یہ ہے کہ ۱/۲ ۷ میلیون ایکڑ تو صرف جاوا اور مدورا کے جزائر ہی میں واقع ہیں۔ اور تین میلیون ایکڑ ان زراعتی جائیدادوں (Estates) پر مشتمل ہے جو یوروپ سے آئے ہوئے غیر ملکی باشندوں کی ملکیت میں ہیں اور برآمدی اشیاء مثلاً ربڑ، شکر، چار، تمباکو، ریشہ، اور ناریل وغیرہ پیدا کرتی ہیں۔ بقیہ زمینوں میں اہل ملک کی غذا کا سلسلۂ پیداوار ہے۔ اس سلسلہ کی خاص خاص چیزیں چاول، مکئی، اروی، آلو، اور سنگھاڑا ہیں جو تقریباً ۴ میلیون ایکڑ زمینوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔

اس بری کیفیت زمین کے علاوہ ہزارہا جزائر کے وہ بحری حصے ہیں ۔۔ جو عمدہ ترین قسم کی کثیر التعداد مچھلیوں کے بڑے اماکن ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ جزائر امبون Ambon اور منہاسہ (Minahasa) کے سواحل ہیں اسی طرح شمالی سلاویسی میں "ارتم باگا" (Airtambaga) شمالی جاوا کا ساحل اور سماترا میں "باگان سی آپی" (Bagan-si-api) ہیں جہاں ہزارہا قسم کی رنگ برنگ مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔

بہرحال جاوا کے باب میں آگے چل کر پروفیسر ڈیڈلے اسٹامپ لکھتا ہے کہ:-

---

[۱۵] اندونیشیا تو ڈے" باب "زراعت اور ماہیگیری" صفحہ امطبوعہ وزارت اطلاعات اندونیشیا ۱۹۵۰ء

" اس جزیرہ کا شمالی حصہ نہایت زرخیز ہے۔ جس میں سرخی مائل زرد مٹی پائی جاتی ہے جو غیر معمولی طور پر زرخیز ہے اور جاپان کی طرح پیداوار کرتی ہے۔ وہ حصے جہاں آتش فشاں بارہ بارہ اور بیس بیس کے سلسلوں میں پھیلتے چلے گئے ہیں وہاں البتہ زمین پیداوار کے لائق نہیں رہی ہے۔ مگر پھر بھی ان کی وادیوں میں جہاں پانی کافی مقدار میں بہم پہنچ جاتا ہے پیداوار خوب ہوتی ہے اور مختلف اجناس میں ہوتی ہے۔

غالباً جزیرہ "کیوبا" کے بعد جاوا ہی دنیا میں سب سے زیادہ شکر پیدا کرنے والا علاقہ ہے۔ جس کے متعلق ہندوستان کا ایک ماہر معاشیات "مینومسانی" اپنی کتاب (Our India) کے صفحہ ۴۲ پر رقمطراز ہے۔

" جاوا میں ہر ایکڑ زمین پر چالیس ٹن شکر پیدا ہوتی ہے جبکہ ہندوستان ایک ایکڑ زمین میں صرف دس ٹن شکر پیدا کرتا ہے "

**مختصر جائزہ**

اسی طرح سماترا، بورنیو، اور سلاویسی (سیلیبس) وغیرہ جزائر ہیں جن کے تمام وسطی حصے متوازی پہاڑوں کے سلسلے ہیں۔ اور بقیہ حصوں میں جہاں جہاں میدان آگیا ہے۔ سنکونا، گرم مصالحہ، اور چاول وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ تمام قسم کے قدرتی وسائل بھی پورے ملک میں نہایت اعلیٰ اور شاندار ہیں۔ جن کا ذکر کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم "محمد حتیٰ" نے ایک بار فرمایا تھا کہ: [1]

**قدرتی وسائل**

" اندونیشیا کے وسائل حربی نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہیں۔ ان کی افزائش اور ترقی نہ صرف اہل اندونیشیا ہی کے لئے

---

[1] ۱۹۴۹ء میں موصوف نے کراچی کی راہ یورپ جاتے ہوئے پاکستان میں کچھ دیر قیام کیا تھا اور

کارآمد ہوگی بلکہ دنیا کے قیام امن کے لئے بھی نہایت مفید ثابت ہوگی ۔ اس ملک میں خاص خاص برآمدی اشیاء ربڑ، گرم مصالحہ، ٹین، سنکونا، شکر، چوب، پیٹرول، تمباکو اور قہوہ ہیں۔"

اس اختصارہ سے اس مقام پر صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ یہ ملک قدرتی طور سے کس قدر افراط کا ملک ہے ۔ اور اس افراط کے ساتھ ساتھ مصنوعات کے لئے بھی اس کا مستقبل کس قدر شاندار ہے ۔ زمین بقول کسے لعل اگلتی ہے، اور مٹی اپنے تہ خاک چھپے ہوئے دفینے منصہ شہود پر پیش کرتی ہے ۔ اور اس ملک کا دامن مالا مال ہے، دولت کی فراوانی ہے، اور وسائل کی ارزانی ہے ۔

## آب و ہوا

اسی طرح آب و ہوا بھی ایک عجیب قسم کی معلومات بہم پہنچاتی ہے جہاں تک کہ عالمی نقشہ کا تعلق ہے بڑے بڑے جزائر جن میں خواہ سماٹرا ہو، یا سلاویسی، مالوکو ہو یا کالیمنتان دنیا کے خط تنصیف پر واقع ہیں اور اسی لئے منطقۂ حارہ کے علاقے ہیں ۔ جہاں گرمی کی شدت کے ساتھ ساتھ بارش کی بھی فراوانی ہے اکثر و بیشتر موسم یکساں طور پر گرم اور مرطوب رہتا ہے ۔ ہر وقت تھوڑے تھوڑے وقفہ سے حبس دم ہوکر ترشح ہوتا رہتا ہے ۔ چنانچہ ہر جزیرہ کی سالانہ بارش کے اوسط کا اندازہ ذیل کی جدول سے کیا جا سکتا ہے ۔

سماٹرا جزیرہ میں یہ اوسط ۱۲۰ انچ سالانہ[۱] ہے ۔

---

اس مختصر قیام کے دوران میں آپ نے صحافیان پاکستان کی پریس کانفرنس میں یہ الفاظ (کراچی میں) ادا فرمائے تھے ۔ ان کی زیادہ تفصیلات آگے آپ کے حالات میں دی گئی ہیں ۔ ملاحظہ ہو جلد دوم ۔

[۱] ماخوذ از انڈیکس آکسفورڈ اٹلس مطبوعہ لندن کلاں سائز ۱۹۴۷ء ۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| کالیمنتان۔ (بورنیو) میں اوسط | ۱۶۶ | سالانہ ہے | |
| سلاویسی (سیلبس) " | ۱۴۵ | " | " |
| مالوکو (ملوکس) " | ۱۱۵ | " | " |
| جاوا اور نوائی " | ۸۰ اور ۹۰ | " | " |

معلوم ہوا کہ جاوا میں بارش نسبتاً کم ہے کیونکہ یہ جزیرہ ۶ اور ۹ درجہ الرض البلد جنوبی کے درمیان واقع ہے۔ اس کی آب و ہوا کی عام کیفیت کے متعلق پروفیسر ڈیڈلے اسٹامپ کا بیان ہے کہ:۔ [۱۵]

"جاوا میں جنوری کا مہینہ قدرے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جبکہ مئی میں گرمی کافی پڑتی ہے۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ اس جزیرہ میں دو موسم ہوتے ہیں۔ ایک خشک اور ایک مرطوب، خشک موسم میں یہ جزیرہ مشرقی یا جنوبی مشرقی مانسون ہواؤں سے متاثر رہتا ہے جو جولائی، اگست، اور ستمبر تک برابر چلتی رہتی ہیں۔ اور وسطی حصوں تک خوب پانی برساتی ہیں۔ حالانکہ یہ موسم اور جزائر کی بہ نسبت اس جزیرہ میں خشک موسم ہوتا ہے۔ مرطوب ترین موسم ماہ دسمبر ہے جو جنوری اور کبھی کبھی فروری تک برابر جاری رہتا ہے۔ اس موسم میں مغربی یا جنوبی مانسون ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ اور کبھی کبھی ایک خاص قسم کے طوفان بھی ساتھ لاتی ہیں جو "ہریکین" قسم کے طوفانوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ ان سے اکثر کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں اور کہیں کہیں مکانات بھی گر پڑتے ہیں۔ ان طوفانوں کے غیظ و غضب سے دریاؤں کی طغیانی بھی بڑھ جاتی ہے اور سخت ترین سیلاب بھی آجاتے ہیں جو اکثر گاؤں کے گاؤں بھا کر

---

[۱۵] "ایشیا" کلاں سائز مصنفہ پروفیسر ڈیڈلے اسٹامپ صفحہ ۴ مطبوعہ لندن۔



اندونیشا کے ساحل کا ایک نظارہ



جھیل طوبی (سماٹرا) کا ایک دلفریب منظر

لے جاتے ہیں ۔ ان سے بچنے کے لئے ملک میں جا بجا بڑے بڑے بند بھی باندھ دئے گئے ہیں جو کاشت میں بھی مدد دیتے ہیں اور آبادیوں کو سیلابوں سے بھی بچاتے ہیں ان بندوں کی بدولت تقریباً ۰۰۰۰،۲ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے۔[1]

بہر حال صرف جاوا ہی ایک ایسا جزیرہ ہے جس کی آب و ہوا بقیہ جزائر کی بہ نسبت خوشگوار ہے ورنہ کالیمنتان (بورنیو) اور رسلاویسی (سیلبس) وغیرہ میں برسات کے دنوں میں موسمی بخار عام طور سے پھیلتا ہے ۔ مگر چونکہ ان جزائر میں اسکونا، (جس سے بخار کی مشہور دوا کونین تیار کی جاتی ہے) اور کالی مرچ وغیرہ چیزیں قدرت نے کچھ اسقدر افراط سے بہم پہنچائی ہیں کہ دفاعی تدابیر بروقت اختیار کرلی جاتی ہیں ورنہ شرح اموات اس ملک میں اسقدر زیادہ ہوتی کہ جس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ۔

**مناظر قدرت**

بہر حال یہ ملک نہایت ہی سرسبز اور شاداب ہے ۔ اس کے مناظر اس کے سبزہ زار، ان کی دلفریبیاں اور ان کی دلکشیاں سیاحانِ عالم کے لئے جاذب نظر ہیں، قدیم سے لے کر آج تک قریب قریب ہر مسافر نے ان کے گیت گائے ہیں، اور ان کی مدح میں ترانے سنائے ہیں۔ شاید اسی حسن فطرت کے باعث یہاں کے باشندے بھی انھیں "جزائرستان" ( KABUN PULAU PULAU ) کہکر پکارتے ہیں، انکے حسن چشم افروز کی دلفریبی کا مشاہدہ ایک فرنگی بصر "مسٹر فرینک" (FRANK OWEN) مقیم جکارتا ان الفاظ میں پیش کرتا ہے[2] :-

---

[1] حوالہ کیلئے ملاحظہ "اے ہینڈ بک آف نیدرلینڈ ایسٹ انڈیز"، مطبوعہ کلکتہ۔

[2] روزنامہ "ڈان" کراچی مورخہ ۲۶ راگست سنہ ۱۹۵۰ء میں (Wiseman of the East)

پھر بھی اندونیشیا کے ان نباتاتی جزائر کی سرزمین طرح طرح کی جڑی بوٹیاں گل، اور گلعذار پیش کرتی ہے۔ فطرت کی نوادر نوازی کا یہ عالم ہے کہ انسان انھیں دیکھ کر ازخود گم رہ جاتا ہے۔

ایک اندونیشی مصنف مسٹر "این۔اے ڈاؤس ڈیکر" لکھتا ہے کہ:[1]

"بہت سے انسانوں کو شاید" زمردیں کمرپیٹی" (Emerald Girdle)

کا لقب اس ملک کی نسبت حیرت افزا سا معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر حقیقتاً وہ لوگ جنھوں نے اس کے جنگلوں کے کناروں پر کھڑے ہو کر کبھی اُن دلوصفت اونچے درختوں پر نظر ڈالی ہو جو اپنے گھنے پتوں سے سورج کی شعاعوں کو زمین پر نہیں بکھرنے دیتے اور چاروں طرف چھائی ہوئی حسین اور نرم و نازک بیلوں سے سرسبز نیلگوں پہاڑوں پر ایک مخملی غلاف سا ڈالے ہوئے ہیں کوئی حیرت افزا نہیں ہے۔" بیرن من ہاؤسین" (Baron Munchhausen) نے اپنے تذکرہ میں ایک مقام پر لکھا تھا۔ کہ جنگل کی بوٹیاں بھی اُسے غرّاتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ اے کاش! اُس نے یہ الفاظ اندونیشیا جیسے سرسبز اور شاداب ملک کے لئے کہے ہوتے تو یقیناً یہ بلاکم و کاست درست ہوتا۔ کیونکہ اندونیشیا کے خود رو اور پرفضا جنگلوں میں حقیقتاً گھاس اور بوٹیاں غراتی ہوئی ہی معلوم ہوتی ہیں۔ بھینی بھینی نکہت گل اڑتی ہے مشک و عنبر کا مزا آتا ہے، انسان ان مناظر کو دیکھ کر محو حیرت رہ جاتا ہے۔ ہزارہا جزائر

---

کے عنوان سے "حاجی آگو سلیم" پرفرنیک کا مقالہ شائع ہوا، یہ عبارت اسی سے ماخوذ ہے۔

[1] ملاحظہ (N.A. Douwes Dekker) کتاب یعنی "ہمارا وطن" (Tanah Air Kita) بزبانِ اندونیشی صفحہ ۱۲-۱۰ مطبوعہ بانڈونگ (اندونیشیا) ۱۹۵۰ء۔

کا یہ حسین اور دل آویز مرقع جس نے اسے ایک ملک بنایا ہے آج ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ نوسنتارا (Nausantara) یعنی جزائر کا ملک کہلاتا تھا

اس باب میں ایک اور مصنّف لکھتا ہے:[۵]

"باوجود حزن وملال کی پچھلی داستانوں اور رنج والم کی موجودہ وارداتوں کے اندونیشیا کو اس کے گھنے سبزہ زار، نیلگوں پہاڑ، لطیف مناظر، دلکش جھرنے اور حسین حسین وادیاں ہر طرف اور ہر گوشہ میں صناعیٔ قدرت کے انمول نمونے پیش کرتی ہیں۔ اس کے روپہلے رنگ کے چشمے وادیوں کے گرد بل کھاتے ہوئے جب دھان کے کھیتوں میں مچلتے ہوئے چلتے ہیں تو ایک عجیب سا سماں نظر آتا ہے۔

بہر حال یہ اس ملک کے مناظر قدرت کا بیان تھا جو یہاں سے گذرنے والے سیاحوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے اب مختصر مگر جامع طور سے بڑے جزائر کی جغرافیائی کیفیات بھی اگلے باب میں ملاحظہ ہوں۔

[۵] ماخوذ از کتاب (Javanese Panorama) مصنّفہ بونڈر۔

# باب سویم

## بڑے بڑے جزائر کے عام جغرافیائی حالات

**جزیروں کی جغرافیائی تقسیم** اس مجمع الجزائر" (اندونیشیا) کے تمام جزیروں کو ماہرین جغرافیہ نے ان خاص سلسلوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ان سلسلوں کو اس طرح سے ترتیب دیا ہے[1]: ـــ

---

[1] مگر مشہور انگریز سیاح اور ماہر جغرافیہ ا ے۔ آر۔ ویلس، نے جو ان جزائر میں جغرافیائی تحقیقات کے سلسلہ میں ۱۸۶۰ء میں آیا تھا اپنے سفر نامہ (Malay Archipelago) جلد اول باب دیباچہ، صفحہ IX مطبوعہ لندن ۱۸۶۹ء میں ان سلسلہ ہائے جزائر کو اس طرح ترتیب دیا ہے:

(۱) انڈو ملایا جزائر: ـ جس میں ملایا جزیرہ نما، سینگا پور، بورنیو، جاوا اور سماترا، بالی، سمبا وغیرہ۔

(۲) تیمور گروپ: ـ جس میں تیمور، فلورس، سمباوا، اور لمبوک اور آس پاس کے دیگر جزائر۔

(۳) سلیبس: ـ جس میں بوتن، اور سولا جزائر ہیں (سلیبس ہی کا اندونیشی نام "سلاویسی" ہے) (قادری)

(۴) ملوکان (ملوکس): ـ برو، سیرام، باچین، جی لولو، مورتی، ترناتے، تیدورے، ماکیان، کائنا، امبون، بندا، گورام اور ماتا بیلو کے ہیں۔

(۱) جاوا اور مدورا۔ (۲) سماترا بمعہ جزائری گروپ۔ (۳) کالیمنتان یا بورنیو۔ (۴) سلاویسی (جس میں سانگھی اور تلاؤ گروپ بھی شامل ہے)۔ (۵) نُوسا تُنگارا (جس میں بالی، لمبوک، سمبا، سمباوا، فلورس، سولور، سومبلن، پنتار، آلور، ویتار، تمور، ساوؤ، اور روٹی جزائر شامل ہیں ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے جزائر اور بھی ہیں۔ (۶) مالوکو یا ملوکس (جس میں ہزارہا جزائر کے لاتعداد گروپ ہیں جو سمندر میں ہزارہا میل تک پھیلے ہوئے ہیں مگر آگے کے اوراق میں ان میں سے محض ان چند گروپ کو بیان کیا گیا ہے جن کا ذکر واقعات تاریخ میں جا بجا آگیا ہے۔ مثلاً بندا گروپ، تمبار، ہلماہیرا، تدورے، ترناتے، امبون، سیرام اور بورو وغیرہ ورنہ پورے سلسلہ کی تفصیلات جغرافیائی کے بیان کے لئے ایک طویل باب درکار ہے اس لئے کہ یہ سلسلہ اندونیشیا کے جزائر کا سب سے بڑا سلسلہ ہے)۔ (۷) ایریان بَراٹ (مغربی نیوگنی)۔

اب ذیل میں انہی سلسلوں کے صرف بڑے بڑے جزائر کا حال بیان کیا جاتا ہے اور چھوٹے جزائر کو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اب جاوا کا حال ملاحظہ ہو:۔

---

(۵) پاپوا گروپ:۔ میں نیوگنی، آرد۔ مائیل، سلوائی، وائیگو وغیرہ کو شمار کیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ تقسیم اب بہت پُرانی ہو چکی ہے۔ موجودہ تقسیم وہی ہے جو اوپر کی سطور میں سات سلسلوں میں بیان کی گئی ہے۔

**نوٹ**:۔ چونکہ یہ صفحہ نئے گروپنگ کے مطابق اب بعد میں کتابت ہو رہا ہے اس لئے آگے کے صفحات میں جہاں کہیں بھی پچھلے گروپنگ کی وجہ سے ترتیب میں فرق آگیا ہے۔ ذیل میں اس کے اشارات واضح کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً مدورا کا بیان جاوا کے بعد ہی ہونا چاہیئے تھا مگر وہ بالی کے بعد بیان میں آیا، اسی طرح بنکا اور بلیتون کو بھی سماترا کے ساتھ ہی بیان ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وہ بھی بعد میں بیان کئے گئے ہیں۔ اسی طرح تمبار اور بندا جزائر کے گروپ مالوکو کی سرخی کے ماتحت بیان ہونے چاہئیں تھے وہ پہلے ہی بیان کر دیئے گئے، اور اسی طرح صفحہ ۷۰ کی سطر ۴ میں سنڈا کلاں کا نام بھی کہ جو اس گروپ کا پرانا نام ہے نئے گروپنگ کی اطلاع سے قبل ہی کا کتابت شدہ ہے۔ نئی ترتیب میں اب اس کی جگہ "سلاویسی اور سانگھی تلاؤ گروپ" لکھا جاتا ہے۔

لہٰذا آگے کے اوراق میں جغرافیہ پر غور کرتے وقت ان امور متذکرہ کا خیال رکھا جائے۔

قادری

**جزیرہ جاوا**

یہ جزیرہ انڈونیشیا کی تاریخ تمدن میں ہمیشہ مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے حالانکہ رقبہ کے اعتبار سے یہ جزیرہ پورے ملک (انڈونیشیا) کے مجموعی رقبہ کا صرف ایک چوتھائی ہے مگر آبادی کل انڈونیشیا کی مجموعی آبادی کا ۶۰ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ اس کا مجموعی طول غرب تا شرق ۶۰۰ میل ہے۔ اور کل رقبہ علاوہ جزیرۂ مدورا کے ۴۸،۵۰۴ مربع میل ہے۔

اب جہاں تک اس کے نام کی وجہ تسمیہ کا تعلق ہے یہ جزیرہ بڑی تاریخی روایات کا حامل ہے۔ چنانچہ "کلکتہ (ہندوستان) یونیورسٹی" کے پروفیسر مسٹر کالیداس ناگ" (ماہر اثریات) کی رائے ہے کہ لفظ 'جاوا' کی تشخیص بھی یونانی فکر ونظر ہی کا نتیجہ ہے موجودہ تلفظ قدیم یونانی آواز ہی سے مشتق ہے۔ ڈاکٹر ناگ کی عبارت یہ ہے:-[۵۱]

"دوسری صدی عیسوی میں ایک یونانی جغرافیہ داں "ٹولمی" (Ptolemy) نے جاوا کو اپنی عبارت میں "جابادیو" (Jabadiou) لکھا ہے جس کے معنی 'جو کے جزیرہ' کے ہیں۔

مگر ڈاکٹر "بیجن راج چیٹرجی" کا خیال ہے کہ قدیم زمانہ میں اس جزیرہ کا نام وہی تھا جو کئی بار کے تواتر کے ساتھ "رامائن" میں آیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ [۵۲]

"قدیم ہندوؤں نے اپنی سنسکرت زبان میں اس جزیرہ کا نام "یاوادیپا" (Yawadipa) لکھا ہے۔ اور غالباً موجودہ لفظ جاوا 'یاوا' ہی سے بنا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں عصر حاضر کے ایک انڈونیشی مورخ "سنوسی پانے" کا بیان[۵۳] ہے کہ یہ حصہ رامائن میں غالباً پہلی صدی عیسوی میں شامل کیا گیا تھا۔ کیونکہ 'یاوادیپا' کا لفظ شادی کے جس سین میں استعمال کیا گیا ہے وہ ان حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہے

---

۵۱ "انڈیا اینڈ دی پیسفک ورلڈ"، مصنفہ ڈاکٹر کالیداس صفحہ ۱۳۷ مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۴۱ء۔

۵۲ "انڈیا اینڈ جاوا"، مصنفہ بیجن راج چیٹرجی مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۳۳ء۔

۵۳ "سنوسی پانے" کی کتاب "سجارا انڈونیسیا" صفحہ ۲۲ مطبوعہ جکارتا (بزبان انڈونیشی)۔

جو اسی صدی میں یاوادیپا (جاوا) میں برسر اقتدار تھے مگر قدیم چینی اس کو "یی - پو - تی"
(Ye-Po-ti) کہتے تھے۔

**قدرتی ساخت**

بہرحال یہ تو اس جزیرہ کے نام کا تاریخی قرینہ تھا۔ اب جہانتک کہ اس کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے وہ بھی نہایت پرانی ہے چنانچہ (The Races of Java) جاوا کی نسلوں) کا مصنف مسٹر ڈی۔ جے۔ ایچ۔ نائس" لکھتا ہے کہ:۔ جاوا ہزاروں سال سے مشرق بعید کے ان جزائر میں بسنے والی انسانی نسل کا گہوارہ تمدن رہا ہے جس کے آتش فشاں پہاڑوں نے زرخیز میدانوں اور زرریز کانوں نے معاشیات و سیاسیات کی تاریخ میں نت نئے اوراق اُلٹے ہیں۔"

اس جزیرہ کے پہاڑوں اور قدرتی ساخت پر روشنی ڈالتے ہوئے "جاوا نیز پنورا ما" کا مصنف "ایچ۔ ڈبلیو۔ پونڈر" رقمطراز ہے کہ "غالباً دنیا میں کہیں بھی ایک ہی مقام پر ایک ہی سلسلہ سے اسقدر آتش فشاں پہاڑ نہ ہوں گے۔ جتنے کہ اس جزیرہ کی آغوش میں خوابیدہ ہیں۔ اگر ان کا صحیح شمار کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے صرف ۳۵ تو ایسے ہیں جو ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور اثرات کے اعتبار سے کبھی کبھی خطرناک بھی ہیں۔ چنانچہ کوہ "سومیرو" ان میں خطرناک تر ہے جس کی بلندی ۱۲،۰۶۰ فٹ ہے۔"

اس ضمن میں "ڈاؤس ڈیکر" نے لکھا ہے کہ[1] (Tjibadas) چی باڈاس۔

---

[1] (TanaAir Kita) (ہمارا وطن) صفحہ ۲۷ مصنفہ (Duwes Dekker) مطبوعہ بانڈونگ (انڈونیشیا) ۱۹۵۰ء۔ (بزبانِ انڈونیشی)

جاوا کے خوبصورت ترین پہاڑ ہیں ۔ جن کے قریب بڑے ہی شاندار باغ لگائے گئے ہیں اور ایک خوبصورت ترین آبشار ہے جو ۲۵۰ فٹ کی بلندی سے زمین پر گرتا ہے ۔ اس سے ملحقہ "کوہ گدھے" (Gedah) کا دس ہزار فٹ اونچا سلسلہ ہے جو "کوہ پانگ رانگو" (Pangranggo) تک چلا گیا ہے ۔ یہ حصہ جاوا بھر میں قدرتی مناظر کے لئے مشہور ہے ۔ جنوب کی طرف چونے کے پہاڑ ہیں اور وسط میں "کیدو" کی سرسبز وادی ہے جاوا کا یہی وہ حصہ ہے جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ گنجان آباد ہے ۔"

ان پہاڑوں کے علاوہ جاوا میں زرخیز میدان بھی ہیں ۔ جو تمام انڈونیشیا میں سب سے زیادہ زرخیز خیال کئے جاتے ہیں چنانچہ ان کے بارے میں پروفیسر ڈڈلے اسٹامپ لکھتا ہے[۵]:-

یہ میدان نہایت زرخیز ہیں اور سرخ قسم کی زرد ریت سے بنے ہیں ۔ اور زیادہ تر مشرقی حصہ کے شمال میں واقع ہیں ۔ اور "جے پارا" کہلاتے ہیں اسی طرح اور بھی دوسرے میدان ہیں جو "جوانا" اور "رمبانگ" کے نام سے مشہور ہیں ۔ مگر یہ چکنی قسم کی مٹی کے میدان ہیں ۔ جن میں چاول اور کپاس کی پیداوار خوب ہوتی ہے ۔ وسطی اور اندرونی حصوں کے زیادہ تر میدان آتش فشاں پہاڑوں کے لاوے سے بنے ہیں اور جنوبی ساحل کے میدانوں سے مل گئے ہیں جن میں دلدل ہی دلدل پائی جاتی ہے لیکن مغربی جاوا کے میدان نسبتاً زیادہ زرخیز ہیں ۔

---

[۵] "ایشیا" مصنفہ ڈڈلے اسٹامپ صفحہ ۵۱۲ مطبوعہ لندن ۔

نقشہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دریا بھی عموماً شمال ہی کی طرف زیادہ بہتے ہیں - جبکہ جنوب کی طرف بہنے والے دریاؤں کی تعداد بہت کم ہے - سب سے بڑے دریا 'سولو' اور 'برانطاس' ہیں - یہ دریا مشرقی حصے میں بہتے ہیں - دریائے 'سولو' ۳۴۳ میل اور برانطاس ۱۰۵ میل لمبا ہے مغربی جاوا میں بہنے والے دریائے چی تارم اور چی مانک ہیں - جو جہازرانی اور آب پاشی دونوں کے لئے مفید ہیں۔

جائے وقوع کے اعتبار سے جاوا اگرچہ استوائی حصوں کے ذیلی علاقوں میں واقع ہے مگر پھر بھی آب و ہوا بہت زیادہ گرم ہے - عام طور سے مانسون ہوائیں شمال مغرب کی طرف سے آتی ہیں اور دسمبر سے مارچ تک پانی برساتی ہیں - اسی طرح مانسون ہواؤں کی دوسری شاخ جنوب مشرق کی طرف چلتی ہے جو عموماً اپریل سے چلنا شروع ہوتی ہے اور اکتوبر تک چلتی رہتی ہے - اگست سب سے گرم مہینہ ہے - جس میں شدید ہوائیں چلتی ہیں اور طوفان بھی آتے ہیں -

اس جزیرہ میں نباتات بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہے - سبزہ زاروں میں خود رو طور پر پیدا ہونے والی بوٹیاں (بقول پروفیسر فرینول) تقریباً ۵۰۰۰ ہیں - چنانچہ جس قدر شاندار بوٹانیکل گارڈن اس جزیرہ میں پایا جاتا ہے دنیا کے کسی ملک میں بھی شاید نہ ہوگا مصنف مذکور لکھتا ہے کہ "بائیتین سارخ[1]" (بوگور) باغ اس خصوص میں دنیا کا سب سے بڑا اور خوبصورت باغ ہے -

زمینوں پر کی جانے والی کاشت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاؤس ڈیکر، لکھتا ہے کہ:[۵۲] -

---

[1] بائیتین سارخ ، ولندیزی زبان کا لفظ ہے جس کے بجائے اب انڈونیشی اسے 'بوگور' کہتے ہیں -

[۵۲] (Douwes Dekker) کی کتاب (TanahAir Kita) صفحہ ۲۷ مطبوعہ جکارتا انڈونیشا سنہ ۱۹۵۵ء

"جاوا میں تیس لاکھ ایکڑ زمین پر چاول پیدا کیا جاتا ہے۔ اور مغربی جاوا میں ۴۵۰۰۰۰ ایکڑ زمینیں چار کی پیداوار کرتی ہیں۔ آب پاشی کے شاندار وسائل رکھنے والی زمین صرف مغربی جاوا میں ۵ر۳ ملین ایکڑ ہے۔ دوسرے علاقوں کی ایسی زمینیں اس کے علاوہ ہیں" اس جزیرہ میں چاول، شکر، تمباکو۔ ربڑ۔ سنکونا، میدانوں کی خاص پیداوار ہیں جبکہ پہاڑوں پر گرم مصالحہ، چار اور قہوہ خوب پیدا ہوتے ہیں۔

جنگلات کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس جزیرہ میں عموماً مغرب کی طرف پائے جاتے ہیں جن میں بقول مصنف جاوا نیز ینورامامجیب وغریب قسم کے بڑے بڑے اور اونچے درخت پائے جاتے ہیں "راسامالا" سب سے اونچا درخت ہے۔ اس کی لکڑی نہایت مضبوط اور دیکھنے میں نظر فریب ہوتی ہے۔ اور بقول اسی مصنف کے آم اس جزیرہ کا نہایت ہی مرغوب پھل ہے، جسے یہاں کے باشندے "منگا" کہتے ہیں۔ اسی طرح کیلا، بھی یہاں کا خاص پھل ہے زیادہ لمبا اور زیادہ گودیدار ہوتا ہے۔ مشرقی ساحلوں پر میلوں تک اسی کی کاشت ہوتی ہے ساحلوں سے اندرون ملک کی طرف ناریل اور بانس کے درخت شروع ہوتے ہیں۔ اور ساگوان کے بہترین جنگلات ہیں۔ خاص خاص[1] ترکاریاں سفید گوبی، چینی گوبی، کرم کلا، گاجر، مولی، چقندر، وغیرہ ہیں" اسی طرح بڑی شکر قندی، آلو، سویابین اور مونگ پھلی بھی خوب پیدا ہوتی ہے۔ ان تمام ترکاریوں کی پیداوار کے بڑے بڑے مرکز پاچت، بانڈونگ، دونوسوبو، مسلاتیکا اور مالنگ وغیرہ شہروں کے قریب کی دیہاتیں ہیں۔ خاص خاص پھلوں میں پپیتا (پپیہ) نارنگی۔ رام بوتان (کٹھل جیسا ہوتا ہے) ذریان اور ڈوکوہی (جو اس ملک ہی کے خاص پھل) ہیں۔

---

[1] "اندونیشا لوڈے" مطبوعہ وزارت اطلاعات جمہوریہ اندونیشیا مطبوعہ جکارتا ۱۹۵۰ء۔

اس جزیرہ کی حیوانی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اے۔ آر۔ ولیس نے اپنی کتاب "دی ملایا آرچیپلیگو" میں وحشی جانوروں کی ایک بڑی طویل فہرست لکھی ہے اور ان جانوروں کے طبائع اور خواص بھی گناتے ہیں جو مصنف مذکور کی نظر سے جاوا کے جنگلوں میں گذرے ہیں۔ ان میں سے بخوف طوالت محض خاص خاص جانوروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محقق مذکور کے بیان کے مطابق "گینڈا" اس جزیرہ کے جنگلات میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ جس کی پیشانی پر صرف ایک سینگ ہوتا ہے اطوار کے اعتبار سے بڑا خطرناک اور جسامت اور قامت دونوں اعتبار سے نہایت مہیب سا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگلی شیر بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ایک خاص قسم کا بیل بھی ہوتا ہے جسے "بانتنگ" کہتے ہیں۔ یہ شیروں اور گینڈوں سے بھی لڑنے میں نہیں چوکتا اور اس جزیرہ میں شکار کا خاص جانور خیال کیا جاتا ہے۔ ملک کے قومی نشان "گروڈا" میں بھی اس کے سر کی تصویر دی ہوئی ہے۔ خنزیر بھی بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہرن بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ "مشکی نافہ والا ہرن" "کاریوس منت جاکر" کھلاتا ہے۔ اور مشرقی جاوا کے جنگلات میں عام طور پر پایا جاتا ہے اڑتا ہوا مینڈک یا بڑی چمگادڑ ان جنگلات کے عام جانور ہیں۔ اسی طرح بندروں کی، پہاڑی چوہوں کی اور خرگوشوں کی بھی ہزار ہا قسمیں ہیں اور ایک خاص قسم کی گلہری بھی ہوتی ہے جو پرندوں کی طرح پرواز کرتی ہے اسی طرح اڑتی ہوئی چھپکلی بھی بڑی خطرناک ہے گھریلو جانوروں میں گائے، بیل، بکرا، بکری، بھیڑیں، مرغیاں، بطخیں اور گھوڑے وغیرہ ہیں۔

غرض جاوا ایک اچھا خاصہ قدرتی باغ ہے جس میں صانعِ قدرت نے

عجیب قسم کا چڑیا خانہ بھی اس کے دشت دہا مون میں بنا دیا ہے۔ جنھیں دیکھ کر انسان نیرنگیٔ کائنات سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اور صانع مطلق کی حیرت افزائیوں کا پتہ چلا سکتا ہے۔ اب انسانی فطنت و ذکاوت اور اس کی تاریخ کے ارتقا کا پتہ چلانے کے لئے اس جزیرہ کے خاص خاص شہروں کا حال بھی ذیل میں ملاحظہ ہو۔

**شہر جکارتا (Djakarta**

"اندونیشیا" کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اور جمہوریہ کا دارالحکومت ہے۔ ولندیزیوں کے عہد حکومت میں "بٹاویہ (Batavia) کے نام سے مشہور تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں "سُنڈا کلاپا" کے بندرگاہ پر آباد کیا گیا تھا۔ "سُنڈا کلاپا" "پجا جاران" کی سلطنت کا خاص بندرگاہ تھا۔ اہل پرتگال کے ساتھ بھی اسی بندرگاہ کے ذریعہ تجارت ہوتی تھی۔ اقوام مغرب کے داخل ہونے کا پہلا دروازہ بھی یہی تھا۔ خود ولندیزی بھی جزیرۂ جاوا میں سب سے پہلی بار اسی کے راستہ سے آئے تھے۔ اس زمانہ میں یہ شہر سلطان بانتن کے زیر اقتدار رہتا چنانچہ اسی سلطان نے اس کا نام "سُنڈا کلاپا" سے بدل کر "جکارتا" کیا تھا جس کے معنی مقامی زبان میں "شاندار قلعہ" کے ہیں۔

سولھویں صدی عیسوی میں جب ولندیزیوں نے اس شہر میں تجارتی کوٹھیاں بنا کر اپنی رہائش اختیار کی اور رفتہ رفتہ حکومت کرنے کا منصوبہ باندھا تو سلطان نے اپنی مدد کے لئے انگریزوں کی طرف رجوع کیا، انگریز آئے اور ولندیزیوں سے نبرد آزما ہوئے۔ شہر کو اس لڑائی سے کافی صدمات پہنچے بلکہ یوں کہنا چاہئے



بوگور کا حسین بوٹانیکل گارڈن



شہر جکارتا کا ایک نظارہ

کہ یہ شہر قریب قریب برباد ہوگیا مگر صلح ہوجانے کے بعد جب انگریز چلے گئے اور ولندیزیوں کا قبضہ بحال ہوگیا تو اس کے بعد وہ اس شہر کو "بتاویہ" کہنے لگے چنانچہ موجودہ جمہوریت کے اعلانِ آزادی کے ساتھ ساتھ اس کا پرانا نام "جکارتا" (Djakarta) بھی اختیار کیا جانے کا اعلان کیا گیا۔ چنانچہ عصرِ حاضر کی تاریخ میں اب یہ شہر "جکارتا" ہی لکھا جائے گا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ولندیزیوں کے عہدِ حکومت میں اس شہر نے کافی ترقی حاصل کی۔ چونکہ یورپین لوگ کافی تعداد میں یہاں لاکر بسا دیے گئے تھے لہٰذا تعمیرات بھی انہی کے اپنے انداز پر ہونی شروع ہوگئی۔ اور رفتہ رفتہ یہ شہر بالکل یورپین سانچہ میں ڈھل گیا۔ مشرق کے شہروں میں بقول "مسٹر ایچ۔ پارمنیٹر" (مصنف کتاب "کمبوڈیا، چمپا اینڈ جاوا") یہی شہر سب سے زیادہ مغربی وضع رکھتا ہے یہی مصنف آگے لکھتا ہے کہ ۱۷۳۲ء میں اس شہر میں خطرناک وبا پھیلی تھی چنانچہ لوگ جان بچانے کے خوف سے شہر کو چھوڑ چھوڑ کر دور دراز دیہات میں جا بسے تھے اور اس نئی بستی کا نام "بوگور" (Bogor) رکھا تھا۔ پھر سرکاری دفاتر بھی سب اسی مقام پر منتقل کر دیے گئے تھے چنانچہ سرکاری آبادی آجتک اسی مقام پر واقع ہے اور "بوگور" بھی شہری حیثیت سے یک ممتاز درجہ رکھتا ہے اور "جکارتا" سے چند ہی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جاوا کا مشہور باغ بھی اسی شہر کے قریب ہے۔

بہر حال موجودہ شہر "جکارتا" نہایت ہی شاندار ہے، راستے کشادہ، سڑکیں

---

لے (Indonesia Today) صفحہ ۲۳۔۲۴ مطبوعہ جکارتا۔

صاف، اور عمارات خوبصورت و عالی ہیں۔ اسی طرح حوائی شہر بھی نہایت خوبصورت ہے۔ پانچ میل کے فاصلہ پر ایک جدید شہر "کبایوران" کے نام سے آباد ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح شہر سے متصل "تان جونگ پریوک" (Tandjung Priok) کی جدید بندرگاہ کھل جانے سے پرانی بندرگاہ بھی اب ختم ہو چکی ہے یہ بندرگاہ کل چھ لاکھ مربع فٹ کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس کے اور شہر کے مابین ملک کا سب سے بڑا ہوائی مستقر ہے جو کمایوران" کے نام سے مشہور ہے۔

غرض[1] شہر جکارتا ڈاکخانوں، شفاخانوں، ریلوے اسٹیشن، باغات، مدارس کالج اور یونیورسٹی کا بڑا مرکز ہے" ری پبلک آف انڈونیشیا یونیورسٹی" تعلیم کی عظیم الشان درس گاہ ہے جو ابھی حال ہی میں قائم کی گئی ہے، گرجا گھر، مسجدیں اور عجائب خانہ بہترین اور خوبصورت ترین عمارتیں سمجھی جاتی ہیں۔ شہر سے کچھ فاصلہ پر ایک عظیم الشان ریڈیو اسٹیشن ہے، جس سے تقریباً ۹ گھنٹے نشر ہوتا ہے ملک کے سب سے بڑے شفاخانہ سینٹرل ہسپتال کے بالکل قریب واقع ہے۔ موجودہ آبادی تقریباً ۲۰ لاکھ ہے۔ چین، جاپان، امریکہ، اور مشرق کے دیگر بلاد کی تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے"۔

**باندونگ[2]** | یہ شہر بھی جزیرہ جاوا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ ملک کا بہت ہی خوبصورت اور حسین ترین شہر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض مبصرین نے اس شہر کو انڈونیشیا کا "پیرس" کہا ہے۔ خوشگوار (Bandoeng)

---

[1] "وزارت اطلاعات"، حکومت جمہوریہ انڈونیشیا ۱۹۵۵ء۔

[2] "انڈونیشیا ٹوڈے" مطبوعہ وزارت اطلاعات جمہوریہ انڈونیشیا مطبوعہ جکارتا ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۷

آب و ہوا دلکش مناظر، پہاڑ، وادیاں اور سبزہ زار پورے انڈونیشیا میں اس شہر کے مقابلہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ یہ انجینیری کی تعلیم کا بھی بڑا مرکز ہے۔ کسی زمانہ میں موجودہ صدر "سوکارنو" نے بھی اپنی تکمیلِ علم اسی شہر میں کی تھی ۔

**سمارانگ**[1] **(Semarang)** جاوا کے شمالی ساحل پر آباد ہے۔ وسطی جاوا کے صوبہ کا صدر مقام ہے۔ تجارتی نقطۂ نظر سے ایک بڑا اور اہم مرکز ہے۔ یہ شہر کسی وقت خاندان ماترم کے سلطان کی قلمرو میں شامل تھا ۔ مگر سلطان نے ایک خاص تجارتی عہدنامہ کے ماتحت سنہ ۱۶۷۸ء میں ولندیزیوں کے حوالے کر دیا تھا چنانچہ اسی زمانہ سے ولندیزی اعلان آزادی کے وقت تک اس شہر پر مسلط تھے ۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ولندیزیوں نے اس شہر کو خاص رونق بخشی ۔ طرح طرح کے کارخانے قائم کئے ۔ اور اس طرح اس شہر کو انھوں نے ایک بڑا صنعتی شہر بنا دیا ۔ یہ شہر سنہ ۱۹۴۳ء میں پہلی بار صوبائی مرکز قرار دیا گیا تھا چنانچہ جب ہی سے یہ صوبہ کا صدر مقام چلا آتا ہے اور گورنر صوبہ کی رہایش کا خاص مقام ہے ۔

یہ شہر[2] دریائے برانطاس کے کنارے آباد ہے ۔ اور سمندر سے بھی بہت زیادہ نزدیک ہے ۔ اسی لئے اس کی تجارتی اہمیت بھی کافی بڑھ گئی ہے شہر کا تجارتی حلقہ ساحل کے پاس پاس تقریباً تین میل تک چلا گیا ہے مگر آبادی کے حلقے اس سے دور ہیں ۔ جو ایک مشہور پہاڑ کے دامن میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ یہ پہاڑ "چانڈی" (Tjandi) کہلاتا ہے ۔

---

[1] "انڈونیشیا ٹوڈے" مطبوعہ وزارت اطلاعات جمہوریہ انڈونیشیا مطبوعہ جکارتا سنہ ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۷ ۔ [2] ملاحظہ ہو سر آرچی بالڈ کی کتاب "پورٹس آف دی ورلڈ" صفحہ ۹۹۳ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۵۰ء

"بہر حال وسطی[۵۱] جاوا کے شہروں اور قصبوں کے لئے یہ سب سے زیادہ نزدیک بندرگاہ ہے اسی لئے وسطی جاوا کی تمام پیداوار خصوصاً ربڑ، قہوہ، گرم مصالحہ، چاے، چاول، کپاس[۵۲] اور دیگر جنگلی پیداواریں اور عمارتی لکڑیاں سب اسی شہر میں جمع کی جاتی ہیں۔ اور پھر یہیں سے باہر دوسرے ممالک کو بھیجی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں مچھلیوں کا بھی بڑا کاروبار ہوتا ہے سائنٹفک اصولوں پر مچھلیوں کی پرورش کے لئے بھی یہاں بڑے بڑے تالاب ہیں جو رقبہ کے اعتبار سے شہری آبادی کے رقبہ سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔"

شہر میں دلچسپی[۵۳] اور سیر و تفریح کے بھی بڑے سامان ہیں۔ سینما گھر اور رقص گاہیں۔ ہوٹلیں، اور باغات بھی بڑے شاندار ہیں۔ ان کے علاوہ صنعتی کارخانے خاص طور پر قابل دید ہیں۔ سگریٹ کا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے اور یہ انڈونیشیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کا سب سے اہم کاروبار ہتیل کے آلات موسیقی اور ساز تیار کرنا اور کونین (بخار کی دوا) بنانا ہے۔ شہر سے جنوب کی طرف "انگاروں" ایک مشہور کوئلہ کی کان ہے کچھ فاصلہ پر جانب غرب "لوڈو" نام کے کنوؤں سے نمک بھی حاصل کیا جاتا ہے۔

---

۵۱ "پورٹس آف دی ورلڈ"، صفحہ ۱۹۹ مرتبہ (Sir Archibald Hurd) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۵۰ء۔

۵۲ یہ انڈونیشیا کی ایک خاص قسم کی ریشمی روئی ہوتی ہے جو پاکستانی اور ہندوستانی کپاس کی طرح نہیں ہوتی۔

۵۳ "انڈونیشیا ٹوڈے"، صفحہ ۲۶ - ۲۷۔

شہر سے کچھ فاصلہ پر جپارا[1]، ایک مشہور تاریخی شہر ہے۔ جہاں لکڑی پر کھدائی کا نہایت اعلیٰ کام ہوتا ہے۔ فرنیچر بھی نہایت عمدہ تیار کیا جاتا ہے قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر عہد "مجا پاہت" میں بھی فرنیچر کے کاروبار ہی کے لئے مشہور تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے آثار اب تک بھی پائے جاتے ہیں۔

**جوگ جکارتا** (Djogjakarta)

یہ بھی جاوا کا بہت ہی پرانہ اور تاریخی شہر ہے۔ زمانۂ جدو جہد میں جمہوریہ اندونیشیا کا پہلا دارالحکومت بھی یہی شہر تھا۔ جنگ آزادی کے تمام پروگرام اسی شہر میں مرتب ہوتے تھے محبان وطن کی فوجیں بھی اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لئے اسی شہر سے بھیجی جاتی تھیں، ویسے بھی یہ شہر "سلطان ہمنگ کوبو ونو" کی خاص سلطنت کا مرکز تھا اور ہمیشہ سے تہذیب و زبان، اور تعلیم و ثقافت کا بھی خاص مکتب خیال تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اور اس خصوص میں اس شہر کو وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو ایران میں شیراز کو اور ہندوستان میں لکھنو کو حاصل ہے۔ قدیم سلاطین[2] اسلام اور ہندو راجگان کی بڑی بڑی اور تاریخی یادگاریں بھی زیادہ تر اسی شہر میں پائی جاتی ہیں۔ پرانے اور تاریخی آثار جسقدر اس شہر کی مضافات میں ملتے ہیں اندونیشیا کے کسی اور شہر میں نہیں ملتے۔ کراطون، (قصر اسلاطین اسلامیہ کی ایک بہت شاندار یادگار ہے۔ جسے عام طور پر اندونیشی آرٹ کا ایک عمدہ شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ بادشاہان وقت اسی قصر میں رہتے تھے۔ یہ قصر گویا اس ملک کا "تاج،

---

[1] یاد رہے جاوا میں اسی نام کے میدان بھی ہیں۔

[2] "اندونیشیا ٹوڈے"، صفحہ ۲۸ مطبوعہ ۱۹۵۰ء۔

سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک اس شہر کی تاریخی عظمت کا تعلق ہے یہ کہدینا ہی کافی ہوگا کہ یہ شہر "سلطنت مجاپاہت" کا سینکڑوں برس دارالحکومت رہا ہے۔ قدیم جاوائی ہندو راجاؤں کے بڑے بڑے دور اس شہر میں گذرے ہیں اسی طرح ماترم خاندان کے مسلمان سلاطین بھی مدتوں اس کے وارث رہے ہیں۔ یہ سلاطین "سلاطین جوگ جکارتا" کہلاتے تھے۔

جیسا کہ اندونیشیا ٹوڈے کے (صفحہ ۴۸) پر تحریر ہے شہر کی آبادی مثلث نما ہے اور سمندر سے قریب ہے۔ مشہور آتش فشاں "مراپی" سے بھی متصل ہے۔ جس کی بلندی ۹۵۰۰ فٹ ہے۔ اسی سے ملحقہ 'دریائے پروگو' (Progo) بہتا ہے جو مغرب کی طرف نکل کر سمندر میں گرجاتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے وقت اس کی آبادی تقریباً ۵۰۰۰۰۰ تھی مگر زمانۂ جنگ برباد شدہ علاقوں کے مہاجرین کی کثیر آمد و رفت کے باعث اضافہ ہوکر سات لاکھ ہوگئی ہے ولندیزیوں نے جب دوسرا "پولس ایکشن" شروع کیا تو لوگ دوسرے مقامات سے بڑی تعداد میں گھر بار چھوڑ کر سلطان کے مراحم خسروانہ کے باعث یہاں آبسے تھے۔

"اندونیشیا ٹوڈے" ہی کے مطالعہ سے مزید تفصیلات کے سلسلہ میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر بہت ہی خوبصورت اور قابل دید ہے، "گجامدا" یونیورسٹی کی عمارات، ہوائی بندر (Maguwo) سگریٹ کی فیکٹری، چاول اور شکر کے کارخانے، باٹک کپڑے کے کارخانے، دیکھنے کے قابل ہیں، لکڑی پر منبت کاری کا کام اور زیورات سازی اور برتن بنانے کا کام اور چمڑے کی دیگر صنعتیں

مشرق بعید میں اس شہر کے ساتھ ایک خاص شہرت اور اختصاص رکھتی ہیں۔

**سولو** (Solo) قدیم کلچر، اور تمدن کا سب سے پرانہ مرکز خیال کیا جاتا ہے۔ پروفیسر کالیداس ناگ نے بھی اپنی کتاب "انڈیا اینڈوی پیسفک ورلڈ" میں عہد قبل تاریخ کا اس نواح میں سب سے پہلا انسانی مسکن اسی شہر کو قرار دیا ہے۔ مشہور ولندیزی ماہر اثریات ڈاکٹر "دیوبس" کو بھی کھدائی کرتے وقت سب سے پرانے آثار اسی شہر کی مضافات میں ملے ہیں۔ جس طرح ایران میں ہمدان، عراق میں بابل، ہندوستان میں پٹنہ، اور پاکستان میں ٹکسلہ اور موئن جی دارو مشہور ہیں۔ انڈونیشیا کی تاریخ میں سولو بھی اسی طرح شہرت رکھتا ہے۔ اور بہت قدیم خیال کیا جاتا ہے۔

آزادی سے پہلے بھی یہ شہر اسی نام کی ایک سلطانی ریاست کا صدر مقام تھا مگر یہاں کے سلطان سلطان نہیں کہلاتے تھے بلکہ انھیں "سوسوہونان" کہا جاتا تھا۔ جو لسانی حیثیت سے سلطان ہی کا دوسرا مترادف ہے۔ گانے۔ ناچنے، اور مزامیر کو فن کارانہ طور پر استعمال کرنے میں جو کمال اس شہر کے ماہرین فن رکھتے ہیں۔ مشرق کے کسی اور ملک میں اس کا جواب نہیں ہے۔ اس کی وجہ باشندوں کی قدامت پسندی ہے۔

جہاں تک جدید تاریخ کے نقطۂ نظر سے اس شہر کی اہمیت کا تعلق ہے ولندیزی اس شہر پر اٹھارہویں صدی میں اثر انداز ہوئے تھے۔ اور انھوں نے سوسوہونان کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے بڑے بڑے قلعے بھی تعمیر کئے تھے۔

۱۹۴۸ء میں مشہور اشتراکی راہنما ''موسو'' کی موجودہ جمہوریت کے خلاف بغاوت بھی اسی شہر سے اٹھی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ولندیزی استبداد کے ستائے ہوئے اندونیشی، مہاجرین کی بازگشت کا بھی سب سے بڑا مرکز یہی شہر تھا۔

اب یہ شہر تجارت کا بڑا مرکز ہے۔ سائنس کی تعلیمات اور تجربات کا بڑا دانش کدہ ہے۔ چمڑے کی صنعتوں، زرگری، لباس سازی، اور سینگوں کی دستکاریوں کا بھی بہت بڑا دارالمصانع ہے۔ ان کے علاوہ چینی کے خوشنما برتن، ہاتھی دانت کے کھلونے، چوب کاری، منبت کاری، اور کارچوبی وغیرہ بھی یہاں کی عوامی حرفتیں ہیں۔ مشرق بعید میں جاپان اور چین کے خاص خاص شہروں کے بعد اتنی کچھ صنعتیں کسی اور ملک کے ایک ہی شہر میں نہیں پائی جاتیں۔ یہاں کے کاریگر بلاد مشرق میں بہت پرانی تہذیب اور قدیم کلچر کی یادگار مانے جاتے ہیں جنھیں مصوری اور پینٹنگ میں بھی بڑا کمال حاصل ہے۔

ان سب[۱] باتوں کے علاوہ یہ شہر اس لئے بھی مشہور ہے کہ اس کے نزدیک سے اندونیشیا کا مشہور دریا ''بنگا وان سولو'' بھی ہو کر گزرتا ہے۔ جس میں جہازرانی بھی خوب ہوتی ہے اور کناروں پر بڑی بڑی شکارگاہیں بھی ہیں۔ یہ دریا شہر کے بالکل پاس سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس کی وادی میں چاول، شکر، قہوہ، ساگودانہ، و نیسلیا[۲]، چاول، تمباکو اور سنکونا وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ نیل اور کالی مرچیں بھی بہت زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ غرض یہ بہت مشہور شہر ہے اور سرابایا کی طرح اندونیشیا کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور نقشوں میں سراکرتا کے نام سے بھی لکھا جاتا ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو اندونیشین ریویو کی اشاعت ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء۔ [۲] ایک قسم کی خوشبودار جڑ ہوتی ہے۔

## سُرابایاؔ[۵]
(Surabaya)

مشرقی جاوا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے۔ مشرق بعید کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے۔ اس خصوص میں ہندوستان کا کلکتہ، سیام کا بندرگاہ بینکاک، چین کا شنگھائی، اور جاپان کا یکوہا بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ زمانہ جنگ کے ایک فوجی مبصر نے مجھے بتایا کہ یہ شہر دنیا کے چند چیدہ بحری مرکزوں میں سے ایک ہے اس کا بحری مستقر (Naval Base) مشرق کے ساحلی شہروں میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کی تعمیر میں چار ترقی یافتہ اور بحری ماہر اقوام کی مساعی مشکور ہیں مثلاً ابتدا میں ولندیزیوں نے اس کی تعمیر کی تھی۔ پھر جاپان نے بھی اپنے استحکامات کے سلسلہ میں ۱۹۴۳ء میں اس کو مضبوط کیا تھا۔ ان کے ہار جانے کے بعد جب انگریز اور امریکن اپنی "جنوبی مشرقی کمان" کے ساتھ یہاں اترے تو انھوں نے بھی اپنی ساری دانش فرنگ اس پر صرف کر ڈالی۔ اور اس طرح اس کو مضبوط ترین بحری مرکز بنا دیا۔ مگر دوبارہ ولندیزیوں نے آن کر اپنی فوجی لڑائیوں میں اسے کافی نقصانات پہنچائے لیکن جیسا کہ اخبارات کی اطلاعات سے ظاہر ہے اب موجودہ حکومت اس کی درستی میں خاص طور سے مصروف ہے۔ چونکہ دریائے 'برانطاس' کے دہانہ پر واقع ہے اس لئے اس کی قدرتی اہمیت اور بھی دوبالا ہوگئی ہے۔

"سر آرچی بالڈ"، کا بیان[۲] ہے کہ "یہاں پر جہازوں کے ڈاکس نہایت شاندار ہیں اور سامان اٹھانے والی کرینیں بھی سب بجلی سے کام کرتی ہیں۔ ساحل

---

۵ سرابایا کے لغوی معنی بہادری کے ساتھ خطرہ کا مقابلہ کرنے والے کے ہیں یہ انڈونیشی لفظ ہے۔

۲ سر آرچی بالڈ کی کتاب 'پورٹس آف دی ورلڈ'، صفحہ ۹۹۲ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۵۰ء۔

کے قریب پانی بھی کافی گہرا ہے بڑے بڑے جہاز آسانی کے ساتھ آسکتے ہیں۔

دریائے برانطاس سے ایک خوبصورت نہر بھی کھود کر نکالی گئی ہے۔ اسی نہر کے مشرق میں 'نیول بیس' ہے اسی کے قریب قرنطین ہیضہ کی غور و پرداخت کا ایک بڑا مرکز ہے، 'ڈاکس کا احاطہ ہے، تارپیڈو کشتیوں کا بندر ہے۔"

جہاں تک اس شہر کی تاریخی عظمت کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ بندرگاہ صرف اسی دور ترقی کی یادگار نہیں ہے بلکہ ازمنۂ قدیم میں بھی یہ ایک بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا مجاپاہت، عہد میں بھی اس کی عظمت وشان بالکل ایسی ہی تھی۔ لوگ دور دراز ممالک سے آتے تھے اور اندرون جاوا میں جانے کے لئے اسی کے ساحل پر اترتے تھے۔ آج بھی یہ اسی طرح سیاحوں، سوداگروں، اور سفیروں کی جولانگاہ سفر ہے۔ اور اسی لئے بڑا بارونق ہے۔ مصنف مذکور لکھتا ہے کہ موٹریں، بسیں، گھوڑے گاڑیاں اور بجلی سے چلنے والی ٹرام، ریلیں اس کثرت سے ہیں کہ سڑکوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی۔

"شہر میں[1] ہوٹلیں، خوبصورت سینما گھر، کمپنیوں کے تجارتی مستقر اور حکومت کے دفاتر اسقدر ہیں کہ ان کے بیان کرنے کے لئے بھی بڑی مہلت چاہئے۔ پھر تمام گلیوں اور سڑکوں کے دورویہ بڑے بڑے سایہ دار درخت ہیں جنھوں نے شہر کے حسن کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔"

" علاوہ[2] اس ظاہری حسن کے معنوی اہمیت بھی اس کا ایک خاص امتیاز ہے۔ مثلاً یہ کہ یہاں بڑے بڑے صنعتی کارخانے ہیں، جن میں کہیں بجلی کے قمقمے تیار

---

[1] و [2] کتابچہ "اندونیشیا ناؤ"، صفحہ ۴۸ مطبوعہ وزارت اطلاعات اندونیشیا جکارتا ۱۹۵۰ء

ہوتے ہیں، کہیں کپڑا بُنا جاتا ہے۔ کہیں سگریٹ بنتے ہیں، کہیں سائیکلیں تیار کی جاتی ہیں۔ کہیں شیشے کے برتن، ربڑ کے کھلونے، اور سائنس کے آلات تیار کیے جاتے ہیں۔ تو کہیں جہاز سازی، رنگ بنانے، اور تیل صاف کرنے کا کام ہوتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب اندونیشیا کا سب سے بڑا "ورکشاپ" ہے جہاں انجن، ڈبّے اور پٹریاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کونین اور شکر بنانے اور کھوپرے کا تیل تیار کرنے کے بھی بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ مچھلیاں پکڑنے کا بیڑہ تو شاید چین کے بعد اس سے بڑا مشرق کے کسی اور ملک میں نہیں پایا جاتا "سرآرچی بالڈ"، (مؤلف "پورٹس آف دی ورلڈ"، صفحہ ۳۹۹) کی تحریر کے مطابق جاوا کی تمام جنگلی پیداواریں خواہ وہ لکڑیاں ہوں، یا گوند۔ بڈیاں ہوں یا بانس سب اسی شہر کی ذخیرہ گاہوں میں اکھٹی کی جاتی ہیں اور پھر یہیں سے دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں

ان سب باتوں کے علاوہ یہ تعلیم کا بھی بڑا مرکز ہے۔ پرائمری (سکولہ منگاہ پرتاما) اور ثانوی، (سکولہ منگاہ اتاس) مدارس کے علاوہ قانون اور معاشیات کے بھی دو بڑے بڑے کالج ہیں۔ جو "(جمہوریہ اندونیشیا یونیورسٹی) سے ملحق ہیں۔ اور ایک کالج مخصوص طور سے جہاز سازی کی انجنیئری کے لئے بھی قائم ہے۔ جہاں آسٹریلیا اور سیام سے بھی طلبا تربیت حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ اس کی تاریخ کے ساتھ کچھ موجودہ واقعات بھی مربوط ہیں۔ مثلاً ۱۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو آزادی کے اعلان کے بعد خونریز جنگ بھی سب سے پہلے انگریزوں اور اندونیشیوں کے مابین اسی شہر میں شروع ہوئی تھی

---

[1] اندونیشین ریویو، عنوان "سرابایا"، اشاعت ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء مطبوعہ جکارتا۔

یہ جنگ بمباری اور دیگر خطرناک حربوں سے لڑی گئی تھی چنانچہ ۱۰ نومبر کو سارے ملک میں بہادران وطن کی یاد منائی جاتی ہے، انگریزوں نے اپنی فوجیں سب سے پہلے اسی شہر میں اتاری تھیں۔ ولندیزی بھی جاپان سے شکست کھا کر اسی شہر سے فرار ہوئے تھے۔ ملک کی سب سے بڑی قومی اور تعلیمی انجمن پرسا توان بنگ سا اندونیشیا" بھی ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے اسی شہر میں قائم ہوئی تھی۔ پھر "بارندرا" نامی عظیم اندونیشیا کا نصب العین لے کر اٹھنے والی تحریک بھی اسی شہر سے نکلی غرض یہ مشرق کا نہایت عظیم اور شاندار شہر ہے اور اندونیشیا کی تہذیب کا مرکز ہے

**مالنگ** (Malang) 'سرابایا' کے بعد یہ مشرقی جاوا کا سب سے بڑا شہر ہے اور 'دریائے برانطاس کے پہلے سرے پر آباد ہے۔ برانطاس، 'کوہ آرجولو' سے نکل کر سب سے پہلے اسی شہر میں داخل ہوتا ہے۔ اور شہر کے کنارے کنارے بہتا ہوا جاوا کے انتہائی حصوں کی طرف نکل جاتا ہے۔

یہ شہر بھی باندُونگ کی طرح[۵۲] اپنی خوشگوار آب و ہوا اور دلکش مناظر کے لئے سارے اندونیشیا میں مشہور ہے سرابایا سے بذریعہ ریل متصل ہے اور صرف ڈھائی گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے۔ لوگ عام طور سے ہرا توار کو چھٹی کا دن گزارنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ اور دن بھر گھوم کر اپنے اپنے شہروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ ریل عام طور سے دریا کے متوازی بنائی گئی ہے چنانچہ اسی شہر کے

---

[۵۱]

[۵۲] "اندونیشیا ناؤ"، صفحہ ۷۸

دلچسپ سفر کا بیان کرتے ہوئے ریویو میں تحریر کیا گیا ہے کہ پہاڑی وادیاں، دریا کا سرسبز طاس، ہری ہری چراگاہیں، نہایت ہی پُرلطف ہیں جن کے آس پاس تمام زمینیں زرخیز ہیں۔ اس لئے ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔"

اس کے حوالی کی ساری دیہاتیں اور تمام مضافاتیں تاریخی آثار کی قیمتی نشانیاں ہیں جیسا کہ قدیم قصوں میں مذکور ہے یہ شہر سنگوساری، حکومت کا پایۂ تخت رہا ہے اس زمانہ میں یہ بہت بڑا شہر تھا چنانچہ آثار قدیمہ کے ماہرین نے بھی یہاں کی بہت سی عمارتوں کے حوالے دیئے ہیں۔ خصوصاً "ہندو جاوی" آرٹ کے زیرعنوان زیادہ تر اپنی مثالوں میں اسی شہر کے کھنڈر گنائے ہیں۔ چنانچہ وشنو وردہن، نامی مندر جو تیرہویں صدی کے اواسط کا فنی کارنامہ ہے اسی شہر کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں کے "برہمن ہندو" مذہب کے بڑے کٹر تھے۔ اور چھوٹے درجے کے شہریوں پر بھی بہت سختی کیا کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ اسلام پھیلتا چلا گیا حتیٰ کہ اس علاقہ کی ریاست بھی بمعہ اپنے عوام کے مسلمان ہوگئی۔ چنانچہ اس دور کے آثار بھی آج یہاں ملتے ہیں۔

**جپارا**
**(Japara)**

وسطی جاوا کے شمال میں واقع ہے اور لکڑی کے کاروبار خصوصاً کھدائی اور منبت کاری کے لئے بہت مشہور ہے۔ یہاں پر اس کاروبار کے سکھانے کے لئے بڑے بڑے "اسکول آف آرٹس" بھی ہیں۔

**"باتن"**
**(Banten)**

اسی طرح باتن بھی ایک مشہور تاریخی شہروں میں شمار کیا جاتا ہے مسلم جاوا کے سب سے پہلے درویش حکمراں حضرتؒ حسن الدین"

رمتوفی ۱۵۲۰ء) اسی شہر میں گزرے ہیں ۔ آپ کی بہت بڑی درگاہ بھی ہے ۔ ہزاروں زائرین حاضر ہوتے ہیں ۔ جس طرح ہندوستان میں شہر اجمیر بہت بڑا اسلامی روحانی مرکز سمجھا جاتا ہے بالکل اسی طرح اندونیشیا میں اس شہر کی عظمت ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ بانتن میں تر چاول کی کاشت کا آغاز بھی حضرت موصوف ہی نے کیا تھا ۔ اسی طرح "گریسیک" بھی بڑا اسلامی مرکز ہے جہاں حضرت ملک ابراہیم کا روضہ ہے ۔

## مگ لانگ[۱]

(Magelang)

سمارانگ سے جوگ جکارتا آنے والے راستہ پر واقع ہے اسکا راستہ چانڈی کے پہاڑوں سے گزرتا ہے ۔ اسی کے قریب وہ مشہور مندر ہے جو قدیم عجائبات عالم کی تاریخ میں بوروبودور کے نام سے مشہور ہے ۔ پچھلی صدی ہی میں جنگلوں کو صاف کر کے مشہور انگریز گورنر رلفلیس نے اس کو باہر نکالا تھا ۔ سیکڑوں سال سے جنگلوں میں ڈھکا ہوا تھا ۔ مشہور ہے کہ اسلام کے آجانے کے بعد بھاگتے ہوئے ہندوؤں نے انہدام کے خوف سے اسے درختوں سے چھپا دیا تھا ۔ حالانکہ یہ غلط ہے ۔

بہر حال شہر مگ لانگ بھی جنگ آزادی سے قبل اندونیشیا کا بڑا شہر تھا ۔ مگر غیر معمولی بمباری نے اسے بالکل تاخت و تاراج کر دیا ۔ ورنہ آثار قدیمہ کو دیکھنے کے لئے آنے والے سیاحوں کے لئے یہ ایک عمدہ تفریح گاہ تھی ۔ اس کی ریلیں بھی تباہ کر دی گئیں، ہوٹلیں اور عمارتیں بھی گرا دی گئیں ۔ اور اب یہ شہر دوبارہ زیر تعمیر ہے ۔ اس شہر کے قریب ہی وہ مشہور آتش فشاں پہاڑ (کوہ سمبنگ) ہے

---

[۱] "اندونیشین ریویو"، اشاعت وزارت اطلاعات جمہوریہ اندونیشیا ماہ جولائی ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۲۶ مطبوعہ جکارتا ۔

جس کے دامن میں کئی ہزار سال پرانی قبر ہے جس کو ماہرین اثریات بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی کے ملاحظہ سے قبل تاریخ کے انسانوں کے تمدن میں مردہ دفنانے کے رواج کا پتہ چلایا گیا ہے۔

بہرحال یہ تو ان شہروں کی تفصیلات تھیں جو ہندوستان کے کلکتہ، بمبئی، مدراس دلی اور حیدرآباد دکن اور پاکستان کے کراچی، لاہور، ملتان، پشاور اور ڈھاکہ کی طرح اس ملک میں اہم سمجھے جاتے ہیں مگر چھوٹے چھوٹے شہر بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ بخوف طوالت صرف ان سے متعارف کرانا ہی کافی سمجھتے ہوئے ان کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں مثلاً:۔

**شمالی مغربی جاوا میں:**۔ دی پوک، دی ماک، سکابومی، سیرانگ، بیلا نہتانو، بائے کامبانگ، گینتنگ، سوریانگ، بنگ لولانگ، پی کم پیک، یمم بابگ، واگورندیر، سوریانگ، ماجونگ بانگ، سوکاراجا، پوردلوک۔ گیروت، تاسکملایا۔ چامس

**جنوبی مشرقی جاوا میں:**۔ متاوار، بالگ سی، قدوسی، منگلار، پردوادی، دونوگیری، کیلیوری، جیپو، باجونیگورد، دونوکردمو۔

**وسطی جاوا میں:**۔ کارنگ گنجار، کیداوونگ، مرگوساری، اجویرا، سلادی، بالالولانگ، لوبوت ساری، بنجو بیرو، پریم بن، گوم بنگ، ماؤسن، میلوونگ، وغیرہ۔

**جزیرۂ سماترا**[۱] جا وقوع کے اعتبار سے یہ جزیرہ ایشیا کے نقشہ میں عین خط استوا

---

۱ے ہندوؤں کی آمد کے وقت جب "اندونیشیا" کے ملک کا نام "نوسنتارا" تھا اس جزیرہ کو

ہے یعنی خط استوا اس کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہوا گزرتا ہے۔

درجات طول البلد کے اعتبار سے یہ ۵۷ ر ۵ اور ۲۹ ر ۵ کے درمیان واقع ہے۔ دنیا کا پانچواں سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یعنی پہلے گرین لینڈ (امریکہ) پھر بورنیو، پھر نیوگنی، پھر میڈاغاسکر (افریقہ) اور پھر سماترا "اے ہینڈ بک آف نیدرلینڈس ایسٹ انڈیز" (مطبوعہ لندن ۱۸۹۰ء) کے مندرجات کے مطابق اس کی لمبائی اور چوڑائی ۲۴۸ × ۱۰۶۰ میل ہے اور رقبہ جزیرہ جاوا سے چار گنا زیادہ ہے اور ولندیزیوں کے وطن ہالینڈ سے تیرہ گنا ہے۔ انڈونیشیا کی ٹریڈ ڈائرکٹری (مطبوعہ ۱۹۴۹ء صفحہ ۷) کے مندرجات کے لحاظ سے یہ جزیرہ اپنے رقبہ میں فرانس کے برابر ہے۔

قدرتی ساخت کے اعتبار سے بقول "اے۔ آر۔ ولیس" (صاحب کتاب "دی ملایا ارچیپلیگو") اس جزیرہ کے مغربی حصّہ میں اونچے اونچے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ جو ساحل کے پاس پاس جنوب تک چلے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ پھر انہی سے ملحق مشرقی میدانوں کا بڑا سلسلہ ہے جس میں دریاؤں کا ایک قدرتی جال بچھا ہوا ہے یہ دریا کافی بڑے ہیں اور اپنے معاون دریاؤں کے ساتھ بہتے ہیں۔

"ڈاؤس ڈیکر" لکھتا ہے کہ شمالی مغربی حصہ سے جنوبی مشرقی گوشہ تک پہاڑوں

---

"اندالاس" کہتے تھے کیونکہ قدیم مذہبی قصوں اور چینی روایتوں سے اس کے اسی نام کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاؤس ڈیکر (D..wes Dekker) نے اپنی کتاب (Tanah Air Kita) (میرا وطن) مطبوعہ ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۲۸ پر اس جزیرہ کی لمبائی ۱۱۵۰ میل اور رقبہ ...۱۷۰ مربع میل لکھا ہے۔

حوالہ کے لئے نمبر ا ہی کی کتاب اور صفحہ مراد ہے۔

کالامتناہی سلسلہ ہے۔ جس میں آتش فشاں پہاڑ بھی شامل ہیں۔ چنانچہ محض "بوکت باریسان" (Bukit Barisan) ہی کے سلسلہ میں ۹۳ آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ اور "کورن چی" (Korintji) جزیرہ کا سب سے اونچا پہاڑ ہے جس کی بلندی ۱۲۵۰۰ فٹ ہے۔ اور دوسرے پہاڑ شمال میں "لیوثر" (Leuser) ہیں جو ۱۱۰۰۰ فٹ بلند ہیں جنوب میں خاص سلسلہ "کوہ ڈیمپو" (Dempo) ہے جس کی مجموعی بلندی ۱۰۲۰۰ فٹ ہے۔

محققین جغرافیہ کی رائے ہے کہ اس جزیرہ کے پہاڑ کسی زمانہ میں جزائر نیکوبار، انڈمان، (ہندوستان) اور ملایا کے پہاڑوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور انہی پہاڑوں کا ایک سلسلہ "میڈاغاسکر" سے ہوتا ہوا "سیلون" تک چلا گیا تھا۔ مگر زمین کی صورت کو بدلتے رہنے والے انقلابات نے ان سب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ اور پست حصے سمندر میں یا یاب ہو گئے۔ اور پہاڑی بلند حصے ان جزیروں کی صورت میں ابھرے ہوئے باقی رہ گئے۔ جو آج تک باقی ہیں۔ ان کے اس طرح جدا ہونے کا زمانہ بقول "پروفیسر ناگ" مولود مسیح سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے کا زمانہ ہے۔ پروفیسر مذکور کی رائے ہے کہ اس زمانہ میں ان پہاڑوں کی لمبائی تقریباً دو ہزار میل ہوگی مگر اب صرف ایک ہزار میل ہے یہ پہاڑ "بوکت باریسان" کہلاتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک بہت بڑی وادی ہے جس سے ملحقہ ایک اور پہاڑی ہے جس کے قریب جنوب سے شمال تک جھیلوں کا ایک بڑا سلسلہ ہے جن میں خاص خاص جھیلیں "رانن"، "کورنکلی"، اور "رسنک کارا" ہیں مگر ان میں سب سے بڑی طوبا جھیل ہے اس کا طول و عرض ۴۵ × ۱۵ میل ہے۔

**جھیل طوبا**[۵۱] "یہ اندونیشیا میں ایک نہایت ہی تفریح کی جگہ خیال کی جاتی ہے جو دور تک پھیل کر ایک چھوٹے سمندر کی مانند دکھائی دیتی ہے اسی طرح اس کا منظر بھی نہایت دلکش ہے۔ اس جھیل کے کناروں پر بڑی بڑی شکارگاہیں ہیں۔ اور سیاحوں کے قیام کے لئے شاندار ہوٹلیں ہیں اور آس پاس دیہاتی آبادیاں ہیں۔"

البتہ آتش فشاں پہاڑوں کے سلسلے جو اسی تصنیف کے بموجب "سینیا بنگ" سے لے کر جنوب تک پھیلے ہوئے ہیں بہت کافی اونچے ہیں ان کی خاص چوٹی "سب لیت" (۲۶۵۶ فٹ) شمال میں بندہاسا اور وسط میں تالک پہاڑ ہیں جو ۸۳۹۹ فٹ بلند ہیں مگر ان کے کل سلسلے ۹۰ ہیں جن میں سے ۱۲ ہر وقت متحرک رہتے ہیں۔

ان پہاڑی سلسلوں کے علاوہ اندونیشیا میں سب سے زیادہ دریا بھی اسی جزیرہ میں پائے جاتے ہیں جن میں بعض بعض تو اسقدر طویل ہیں کہ وہ پورے ملک میں سب سے بڑے ہیں۔ اور قدرتی طور پر اس جزیرہ کے لئے بہت زیادہ ہیں ان سے آب پاشی کا کام بھی لیا جاتا ہے اور ان میں جہاز رانی بھی ہوتی ہے۔ خصوصاً جنوب کی طرف بہنے والے دریا اس کام کے لئے بہت زیادہ مفید ہیں۔ ان میں سب سے مشہور دریا "آساہان" ہے جو جھیل طوبا سے نکلتا ہے۔ پھر "پانز" اور "روکان" ہیں۔ "آساہان" اس ملک میں ایک ایسا ہی دریا ہے جیساکہ "امیزن" جنوبی امریکہ میں "مسی سیپی" شمالی امریکہ میں یا "سندھ" پاکستان میں اور گنگا ہندوستان میں ہے۔

---

[۵۱] "اندونیشن ریویو" اشاعت ماہ اگست ۱۹۵۰ء (جھیل طوبا)۔

بہرحال جہاں تک اس جزیرہ کی آب وہوا کا تعلق ہے یہ کہنا پڑے گا کہ نہایت ہی گرم ہے اور بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ اسی طرح نباتات اور پیداوار کی بھی افراط ہے۔ خاص طور پر چار، چاول، شکر، تمباکو، ساگودانہ، ناریل، گرم مصالحہ، دارچینی، مکئی، خوب پیدا ہوتی ہیں، اور ترکاریوں میں آلو، گوبی، سویابین، مولی، گاجر، کٹھل، بڑی شکرقندی، کرم کلا، اور مونگ پھلی ہیں۔ پھلوں میں پپیتا، آم، دُریان، اور ڈوکو، خاص ہیں اسی طرح معدنیات کی بھی بڑی افراط ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر "ایچ۔ او۔ فلورس" نے بڑی اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ چنانچہ اس ماہر معدنیات کی تحقیقات کے بموجب رے جانگ، لی بونگ، سی ماندو وغیرہ پہاڑوں میں سلفر (گندھک) المونیم، ٹین، سوڈا، چاندی، سونا، اور مٹی کا تیل بڑی افراط سے پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ابھی تک یہ سب چیزیں اسی طرح اپنے دفینوں میں دبی ہوئی ہیں مگر جب بھی ان کے نکالنے کا کوئی معقول بندوبست ہو جائے گا۔ ملک کی معاشیات پر بڑا خوشگوار اثر پڑے گا۔ چنانچہ 'بوکت آسیم' کے مقام پر کوئلہ اور "امبلین" کے مقام پر کوئلہ اور پٹرول بہت کافی پایا جاتا ہے پلیم بنگ اور "جامبی" کے مقام پر بھی تیل کے بڑے چشمے ہیں۔

اسی طرح اس جزیرہ میں جنگلی پیداوار کی بھی بڑی افراط ہے۔ خصوصاً عمارتی لکڑیاں، شہد، ڈامر، گوند، گندہ بیروزہ، اور جانوروں کی ہڈیاں ہیں

---

ملاحظہ ہو اس کی کتاب Naturalist's wandering in the Eastern Archipelago)

پھر جانور بھی بڑے متنوع ہیں ۔ چنانچہ ' ولیمیں ' لکھتا ہے کہ یہاں کے جانور جزیرہ بورنیو کے جانوروں سے بہت ملتے جلتے ہیں مگر جاوا سے مختلف ہیں ۔ اور ہاتھی ، یہاں کا خاص جانور ہے ، جو برما ، ملایا اور سیام کی طرح یہاں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے ۔ سب سے عجیب جانور یہاں کا گینڈا ہے جس کے دو سینگ ہوتے ہیں جبکہ جاوائی گینڈے کے صرف ایک ہی سینگ ہوتا ہے ۔ ملائی ریچھ ، بھی بکثرت پایا جاتا ہے ۔ جاوا سے ملتے جلتے جانوروں میں صرف یہاں کے جنگلی شیر ہیں ، جنگلی کتے ، جنگلی سور ۔ ملائی ہرن ، ملائی بلی ، اور تاج والے تیتر ، سفید مور ، اور بڑے بڑے کبوتر ، رگلہری جیسی ۔ بڑی ) چھپکلی ہے ۔ اور سینکڑوں قسم کے سانپ ، بندر اور کیڑے ہیں جو استوائی خطے کے جنگلات کے اور بہت سے جانوروں کی طرح یہاں بھی بکثرت پائے جاتے ہیں ۔ غرض قدرتی وسائل ، آب وہوا ، پیداوار ، معدنیات ، اور حیوانات کے اعتبار سے یہ جزیرہ بھی اندونیشیا کا ایک اہم ترین حصہ ہے اسلام کا اس نواح میں سب سے پہلا گھر ہے اور تمدن کا قدیم مرکز ہے ۔ اس میں بھی جاوا کی طرح بڑے بڑے شہر پائے جاتے ہیں جن کا حال اب ذیل میں ملاحظہ ہو ۔

**میڈان (Medan)** اس جزیرہ کا سب سے بڑا شہر ہے اور مشرقی سماترا کا صدر مقام ہے ۔ ملایا کے بندرگاہ سینگاپور سے بھی بہت زیادہ نزدیک ہے ۔ یہ شہر بقول محققین " سبیاک " (Sibjak) سینیا بنگ (Sihjabang) کے دامن میں آباد ہے ۔ اسی کے قریب خوبصورت جھیل طوبا ہے اندونیشن ریویو ماہ اگست ۱۹۵۰ء میں اس شہر کے باب میں لکھا ہے کہ شہر کے چاروں طرف میلوں تک تمباکو کے بڑے بڑے کھیت ہیں ۔ جن میں اعلیٰ قسم کی

تمباکو پیدا ہوتی ہے۔ چاراور ناریل کی بھی بڑی پیداوار ہے۔ اور تیل بھی کثرت سے پایا جاتا ہے چنانچہ "لانگ کاٹ" کا مشہور تیل کا چشمہ اسی شہر کی حوالی میں پایا جاتا ہے۔ اب وہاں پر پیٹرول صاف کرنے اور ڈامر گریس تیار کرنے کے بھی بڑے بڑے کارخانے بنا دیئے گئے ہیں۔

غرض یہ شہر بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ "گروڈا انڈونیشن ایرویز۔" کی ہوائی سروس کا بڑا مستقر ہے۔ اور سینگاپور، بینکاک، کولمبو، اور سیلون کی تجارت خاص مرکز ہے۔ تمباکو، ربڑ، کھوپرا اور کالی مرچیں سب سے زیادہ اسی شہر سے برآمد کی جاتی ہیں۔ یہ شہر بذریعہ ریل، شمالی سماترا کے شہر کوٹا راجا، سے بھی بہت زیادہ متصل ہے۔

'ریویو' میں آگے چل کر اس کے مناظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ انڈونیشیا کے بڑے شہروں میں یہی شہر سب سے زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔ یہاں پر قدرتی تفریح گاہیں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں مثلاً پہاڑوں کے دلفریب مناظر، جھرنوں کے نظر فریب سین، جنگلات اور جھلیں وغیرہ ہیں۔

یہ شہر اسلامی روایات، تعلیم اور ثقافت کا بھی مرکز مانا جاتا ہے۔ یہاں پر بڑی بڑی مسجدیں بھی ہیں۔ اور قدیم سلاطین کے خوبصورت محلات بھی ہیں۔ اس شہر میں سب سے عجیب چیز یہاں کا چڑیا خانہ (Zoo) ہے جس میں انڈونیشیا کے تمام جزائر کے عجیب عجیب اور خوبصورت جانور سب رکھے گئے ہیں۔ آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے جس میں سیامی، برمی، چینی، ملائی، عرب اور یورپین زیادہ ہیں۔ اور سب کاروباری لوگ ہیں۔ مقامی باشندے زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے ہیں

اور باتاک (Batak) کہلاتے ہیں ان کا پیشہ زراعت ہے ۔ یہ لوگ قبائل میں آباد ہیں اور بہت قدیم اور پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔

شہر سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک نہایت خوبصورت دیہاتی مقام ہے جو "آرن ہیمیا" کہلاتا ہے ۔ اسی قصبہ کے قریب ایک بڑا "بوٹانیکل گارڈن" ہے جس میں اندونیشیا کی سب سے بڑی زراعتی تجربہ گاہ ہے ۔ اسی کے قریب پہاڑوں پر مشہور صحت کا مقام ہے جسے "برس تاگی" کہتے ہیں ۔ جس سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر خوبصورت ترین جھیل طوبی ہے ۔

**پلیم بنگ (Palembang)**

اس جزیرہ کا دوسرا بڑا شہر ہے ۔ اس شہر کے باشندے چینی نسل سے اختلاط رکھتے ہیں ۔ اس کی آبادی ایک لاکھ اور دس ہزار ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں اب سے سات سو سال پہلے جبکہ یہاں "سری وجایا" کی حکومت قائم تھی ایک چینی شہزادی راجہ کی دلھن بنکر آئی تھی اور اپنے ساتھ بہت سی چینی عورتیں لائی تھی جو رفتہ رفتہ یہاں کے مردوں کی مناکحت میں آتی چلی گئیں اور اس طرح ان سے چینی اندونیشی نسل پھیلتی چلی گئی ۔ چنانچہ جب ہی سے یہاں کے باشندوں میں چینی شکل وشباہت ، چینی تہذیب اور چینی رواج پائے جاتے ہیں ۔ "سری وجایا" کے عہد میں اس شہر کا نام "لی بارڈاؤن" (Lebar Daun) "یعنی چوڑا پتہ" مشہور تھا ۔

بہر حال یہ شہر جزیرہ سماترا کے جنوبی مشرقی گوشہ میں آباد ہے ۔ اور شمالی میدان سے دور ہے اس شہر سے قریب دلدلی میدان ہیں اور کئی دریا بھی بہتے ہیں حالانکہ یہ شہر جزیرہ کے اندرونی حصہ میں سمندر سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع

ہے مگر پھر بھی سطح سمندر سے صرف ۷ فٹ بلند ہے اسی لئے نشیبی حصوں میں دریا کی طغیانی کے سبب سیلاب بھی خوب آتے ہیں۔ اس شہر کے قریب سے گذرنے والا خاص دریا ’موسی (Musi) ہے۔ جس سے بے انتہا نہریں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ’ادگان (Ogan) سب سے بڑی نہر ہے۔

یہ شہر انگریزوں کے زمانۂ اقتدار میں لفٹننٹ گورنر جنرل سر ریفلیس کا بھی خاص مرکز تھا۔ ولندیزی بھی اس شہر کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے زمانہ کا ایک مشہور قلعہ بھی اس شہر میں موجود ہے۔ اب یہ شہر ’سینگاپور‘ کی تجارت کا خاص مرکز ہے۔ اور سینگاپور سے جکارتا جانے والے ہوائی راستہ کا اہم مقام ہے اور پیلم بنگ، رزیڈنسی کا بھی صدر مقام ہے۔ اس سے برآمد ہونے والی مشہور مشہور تجارتی اشیاء ربڑ، پٹرول، قہوہ، بید، اور دیگر جنگلی پیداوار ہیں اس کے قریب پہاڑوں میں کوئلہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس شہر کی خاص صنعت مٹی کے تیل کے کارخانے ہیں ان کے علاوہ جہاز سازی کا کام بھی نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس شہر کے ایک قسم کے پاپڑ جو کروپک (Krupuk) کہلاتے ہیں بہت مشہور ہیں جو خشک جھینگا مچھلیوں کے آٹے، بڑی شکر قندی اور چاول وغیرہ سے تیار کئے جاتے ہیں۔ قدیم آثار میں ۱۷۴۰ء کی مشہور مسجد ہے۔

بہرحال یہ تو اس جزیرہ کے بڑے بڑے شہروں کا حال تھا اب چھوٹے قسم کے شہروں کے نام بھی ذیل میں ملاحظہ ہوں:۔

آچیہ، پاڈانگ، چالانگ، سولوہ، رنڈنگ، ناتا، تالو، پنجابونگن، اتاناپن، پاڈانگ، پنیان، اندرپورا، موکوموکو، سیمپانگ، جمبی، لاہان، بنگن پورا، برستاگی،

سیراوی، بیلاوان، باگان، وغیرہ۔

**جزیرۂ بورنیو** یہ اندونیشیا کا سب سے بڑا اور دنیا کے بڑے جزیروں میں دوسرے نمبر کا جزیرہ ہے۔ دنیا میں سب سے بڑا اور نمبر ایک کا جزیرہ "گرین لینڈ" ہے جو براعظم شمالی امریکہ کے شمال میں واقع ہے بورنیو اس کے بعد دوسرا نمبر رکھتا ہے۔ اس نام یعنی 'بورنیو' کی وجہ تسمیہ بورنیو کے لفظ کی تشریح کے باب میں "انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا" (جلد ۳ صفحہ ۹۰۸ مطبوعہ نیو یارک ۱۹۴۶ء) میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اس جزیرہ کے شمالی مغربی ساحل پر ایک ریاست تھی جس کے ابتدائی حکمرانوں میں کسی کا نام "بورنی" (Bourni) تھا چنانچہ اسی فرمانروا کے نام پر اس کا نام پہلے 'بورنی' ہوا پھر 'بورنی' سے بگڑ کر 'بورنیو' ہو گیا۔ یہی نام آجتک انگریزی نقشوں میں چلا آتا ہے۔

اسی نام پر بحث کرتے ہوئے "مسٹر ڈاؤ س ڈیکر" (اپنی کتاب تانا ائر کیتا کے صفحہ ۶۸ پر) رقم طراز ہے کہ اس کا نام ایک پھل (Antidesma Bunius) "اینٹی ڈیسما بونیس" سے نکلا ہے اس پھل کے متعدد نام ہیں مثلاً ہونی یا بونی یا وُونی (Huni. Buni or Wuni) وغیرہ۔ اور ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ شمالی ساحل پر بورونائی (Brunai) ایک بادشاہت کا نام تھا چنانچہ بورنیو کا نام جزیرہ کے لئے اسی سے نکلا ہے جو کثرت استعمال کے سبب 'بورنیو' ہو گیا ہے۔ مگر اب موجودہ صورت میں اسے 'کالیمنتان' کہتے ہیں۔ اور یہی آجکل اس کا سرکاری نام ہے۔ پہلے یہ نام ایک قسم کے 'آم' کے لئے استعمال ہوتا تھا چونکہ نقشہ میں بورنیو کی شکل بھی آم کی سی ہے۔ لہذا اسی مناسبت سے اسے کالیمنتان کہنے لگے۔

مسٹر چارلس بروس نے (اپنی کتاب "ٹوئنٹی ایرس ان بورنیو" میں) لکھا ہے کہ یہ جزیرہ ملائی دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ ہے اور اپنے رقبہ اور وسعت کے لحاظ سے یہ جزیرہ جزائر انگلستان اور ویلس دونوں کے مجموعہ سے چھ گنا ہے اور رقبہ میں تقریباً ۲۹۲٫۴۹۶ مربع میل ہے۔ اور چیلی کے ملک سے بقدر ۴۹۶ ۴ میل بڑا ہے۔ اور جاوا بمعہ مدورا سے چھ گنا ہے۔ اس کا وہ حصہ جو جمہوریہ اندونیشیا کی حکومت میں شامل ہے بقول ڈاؤس ڈیکر ۲۰۸٫۰۰۰ مربع میل ہے جو انگلستان اسکاٹ لینڈ اور ویلس کے مجموعی رقبہ سے دو گنا ہے۔ اور فلوریڈا کے رقبہ سے تین گنا ہے۔

قدرتی ساخت کے اعتبار سے یہ جزیرہ تمام پہاڑی ہے جس میں پہاڑوں کے بڑے بڑے سلسلے ہیں۔ شمال میں سب سے اونچا پہاڑ رکی نی بالو، (Kinibalu) ہے جو ۱۳۴۵۵ فٹ بلند ہے اس کے علاوہ ایک اور بھی سلسلہ ہے جو جمہوریہ اندونیشیا کے علاقے بورنیو کو سراواک، سے علیحدہ کرتا ہے اور مغرب سے مشرق تک پھیلا ہوا ہے جہاں دریائے 'کاپواس (Kapua) کا منبع ہے جنوب میں 'گوکتِ راجا' نام کا پلیٹو ہے اور جنوب مشرق میں 'مرتُس (Meretus) سے ایک اور سلسلہ ساحل کے برابر برابر جزیرہ کی آخری حد تک چلا گیا ہے۔

ان سب پہاڑوں سے بڑے بڑے دریا نکلتے ہیں جو بہت زیادہ مفید ہیں۔ شمالی مغربی ساحل کا خاص دریا" دریائے سرواک" ہے جس کے کنارہ اسی نام کی ریاست کا ایک مشہور اور صدر مقام "کوچنگ" (بمعنی بلی) ہے۔

اسی طرح جنوبی مغربی حصہ کا خاص دریا "کاپواس" (Kapuas) ہے جو ۷۱۰ میل لمبا ہے اور جرمنی کے دریائے رائن سے کچھ چھوٹا ہے دریائے باریتو (Barito) تقریباً ۲۹۰۰۰ مربع میل رقبہ کو سیراب کرتا ہے غرض یہ تمام دریا ان تاریک جنگلوں سے گذرتے ہیں، جن کی انتہا لاپتہ ہے اور جنہیں اب تک محققین جغرافیہ نے عبور نہیں کیا ہے۔ یہ بڑے خطرناک جنگل ہیں یا ان میں خطرناک قسم کے درندے اور وحشی لوگ آباد ہیں۔

آب وہوا بقول "مسٹر چارلس بروس" گرم اور مرطوب ہے مگر پھر بھی پہاڑی اور میدانی حصوں میں ایسے علاقے ملتے ہیں جن کی آب وہوا کچھ معتدل ہے۔ بارش عموماً ۱۵۰" سالانہ ہے۔ اور نومبر اور مئی میں زیادہ ہوتی ہے۔ (مصنف مذکور کا خیال ہے کہ) ان دنوں میں خارش ایک عام اور وبائی مرض کی طرح پھیلتی ہے ساحلوں پر "فیل پایہ" خطرناک قسم کا ایک عام مرض ہوتا ہے۔ جس میں انسان کا پاؤں متورم ہوکر پائے فیل کی طرح ہوجاتا ہے۔ گرمیوں میں اکثر ہیضہ بھی پھوٹ پڑتا ہے۔ سردیوں میں بخار، اور بارش میں ملیریا اور چیچک اکثر خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

پیداوار عموماً گرم مصالحہ، ساگودانہ، سنکونا، شکر، تمباکو، چاء، چاول ربڑ، وغیرہ ہیں۔ پھل، پھول اور لکڑیاں سب سماترا سے مشابہ ہیں۔ البتہ جنگل بڑے گھنے ہیں اور پورے جزیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں میں بقول بروس ایک خاص قسم کا درخت عام ہے۔ جس کی اونچائی بلا کسی ٹھنی کے غیر معمولی ہوتی ہے۔ یہ درخت "ارلویا" کہلاتا ہے۔ عموماً امراء اور رؤسا کے مکانات

ملاحظہ ہو "چارلس بروس" کی کتاب (TWENTY YEARS IN BORNEO) صفحہ ۱۲۵ مطبوعہ لندن۔

اسی درخت کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں۔ اس کی لکڑی بڑی مضبوط کالی اور چکنی ہوتی ہے" مسٹر چارلس بردس کا خیال ہے کہ ان جنگلات میں تقریباً ساٹھ قسم کی لکڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن میں سے بیشتر ایسی ہیں جو آس پاس کے ممالک میں بھی بھیجی جاتی ہیں۔

پھل والے درختوں میں عموماً پام (کھوپرا) کثرت سے ہوتا ہے۔ ڈریان، میٹھے آلو، تربوز، انناس، نارنگیاں، کیلے اور آم بھی بہت سی قسم کے ہوتے ہیں اور بڑی افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔

'ریفلے شیا' (Rafflesia) یہاں کا خاص پھول ہے۔ ولیس کے بیان کے مطابق یہ دنیا میں سب سے بڑا پھول ہے۔ اور ریاست سراوک میں 'لنڈی' کے مقام پر زیادہ ہوتا ہے۔

معدنیات بھی اس جزیرہ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ مثلاً سونا اور ہیرا بڑی مقدار میں نکلتا ہے۔ "مارتاپورہ" (Martapura) میں ہیرے کی بہت بڑی کان ہے۔ کوئلہ اور مٹی کا تیل بھی پایا جاتا ہے مگر کھودنے میں ان چیزوں میں لاگت زیادہ بیٹھتی ہے اسی لئے ان کی کھدائی زیادہ نہیں ہوتی۔

اسی طرح یہاں کی حیوانی زندگی بھی بڑی عجیب ہے۔ چنانچہ "اے۔ آر۔ ولیس" کے بیان کے مطابق یہاں پر عقاب۔ چیل۔ شکرہ، فاختہ، اُلو، تیتر، مور، طوطے، اور کبوتر کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مور بہت سی قسم کے ملتے ہیں۔ کیڑوں میں مچھر کھٹمل مکھیاں تتلیاں چھپکلیاں، اڑنے والے مینڈک اور اڑنے والی گلہریاں اور اڑنے والے بندر بھی خاص جانور ہیں (رینگنے والوں) قسم کے سانپ اور اژدھے اور بڑی بڑی چھپکلیاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

[1] ملاحظہ ہو وزارت اطلاعات حکومت جمہوریہ اندونیشیا کی طرف سے ہینڈ بک کی صورت میں شائع کردہ آرٹیکل "ایگریکلچر اینڈ پراڈکٹس" مطبوعہ جکارتا سنہ ۱۹۴۹ء۔

جنگل کے بڑے بڑے جانوروں کے متعلق "ایس ۔ سینٹ[51] ۔ جان" لکھتا ہے کہ "ایک عجیب قسم کا جانور یہاں کے جنگلات میں ملتا ہے جو شکل و شباہت اور حرکات کے اعتبار سے انسان سے بہت زیادہ مشابہ ہے (یعنی مرد اور عورت کی طرح جنسی علامات اسکے زاویوں میں پائی جاتی ہیں) پھر چال ڈھال اور رفتار بھی انسانوں کی سی رکھتا ہے ۔ سیدھا چلتا ہے، دوڑتا بھی ہے، اور "اورنگ ہوتان" (یعنی بن مانس) (Orang-hutan) کہلاتا ہے ۔ یہ بڑا خطرناک ہوتا ہے، پہاڑوں کے قریب کے جنگلوں میں رہتا ہے ۔ اس کے جسم پر ریچھ کے سے بال ہوتے ہیں ۔ اسی طرح بندر بھی سینکڑوں طرح کے پائے جاتے ہیں ۔ ایک سیاہ قسم کا تیندوا اور پست قامت ہاتھی بھی ہوتا ہے، اور گینڈا بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے ۔ اسی طرح ایک جنگلی بیل ہوتا ہے جسے "پاس سنڈے کس" کہتے ہیں ۔ اور سئور بھی کثرت سے ہوتے ہیں ۔ پہاڑوں میں ایک خاص قسم کی بلی بھی ہوتی ہے جو شباہت میں ریچھ سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے ۔ اڑنے والی چھپکلیاں، جنگل کا خطرناک ترین جانور ہے جسے "ڈراکو" (Draco) کہتے ہیں ۔"

**"بنجرماسین[52]" (Bandjermasin)**

یہ کالیمنتان (بورنیو کے جنوبی حصہ کا خاص شہر اور صدر مقام ہے ۔ اور تقریباً چھ ایسے گہرے اور بڑے دریاؤں کے دلدلی دہانہ پر واقع ہے جو اسی استوائی خط میں بہتے ہوئے آتے ہیں ۔ اور جزیرہ کے ایک وسیع میدان کو سیراب کرتے ہیں ۔ شروع شروع میں یہ شہر

---

[51] (Life in the forest of the Far East) مصنف "ایس ۔ سینٹ جان"، جو ایک عیسائی پادری تھا اور تبلیغ کے سلسلہ میں مدتوں اس نواح میں گھوما ہے ۔

[52] "اندونیشن ریویو" ماہ اکتوبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۴۷ ۔ مطبوعہ جکارتا ۔

بارتیواور مارتاپورہ دریاؤں کے درمیان میں ایک ٹاپو پر آباد کیا گیا تھا اور آج بھی اسی مقام پر آباد ہے۔ ان دریاؤں کے ذریعہ جہاز یہاں تک آتے جاتے ہیں اور تجارت ہوتی ہے۔ یہ شہر تمام پہاڑی ہے۔ جس میں پہاڑوں کے سلسلے شمال سے مشرق کی جانب ایک خاص قسم کا خط منحنی بناتے ہوئے پھیلے ہوئے ہیں۔ انہی کے قریب ایک میدان ہے جس میں گرم مصالحہ ربڑ، رسیاں بنے کا ریشہ، اور بید خوب ہوتا ہے، بطخیں بھی بہت پائی جاتی ہیں انڈوں کی تجارت ہوتی ہے۔ آس پاس کے دیہاتوں میں ناریل، چاول اور ربڑ کی بڑی پیداوار ہے۔ یہاں ہیرا بھی نکلتا ہے اس شہر کے قریب 'الالک' (Alalak) اور 'جیروچک' (T)erutjuk) کے مقام پر لکڑیاں کاٹنے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ اور چالیس میل کے فاصلہ پر "پن گاراں" (Pengaran) کے مقام پر کوئلہ کی ایک بہت بڑی کان ہے "

موجودہ آبادی ایک لاکھ ہے جس میں ۹۰ فیصدی غیر مسلم ہیں۔ سترہویں صدی میں ولندیزی اور انگریز بھی اس شہر میں رہ کر تجارت کرتے تھے۔ ولندیزی اٹھارہویں صدی کے دوسرے چوتھائی میں اس شہر پر قابض ہوئے تھے۔ اور سلطان سے رعایا کی مرضی کے خلاف انھوں نے ایک عہدنامہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ رعایا نے سلطان کو یہاں سے مار بھگایا تھا۔ اور تیس سال تک سارے باشندے بغاوت کرتے رہے تھے اعلان آزادی کے بعد ۱۹۴۵ء میں گوریلا لڑائی بھی اسی کے پہاڑوں میں زیادہ خوفناک طریقہ پر لڑی گئی تھی۔ ڈاکٹر سوکارنو اور حتیٰ بھی اسی شہر میں نظر بند رکھے گئے تھے۔ اب یہ شہر جمہوریہ کا خاص شہر ہے اور تجارت کا مرکز ہے۔

**پونتیاناک** (Pontianak) بورنیو کا شمالی حصہ برطانیہ کے زیر اقتدار

ہے۔ اور بقیہ حصہ جو خط استوا کے قریب قریب چلا گیا ہے۔ اندونیشیا کے قبضہ میں ہے اور مشرقی اور جنوبی مغربی حصہ کہلاتا ہے۔ پون تیاناک اسی حصہ کا صدر مقام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نام قدیم میں چڑیل کے نام سے نکالا گیا ہے جو اسی بستی کے باشندوں کے عقیدہ کے مطابق شہر کے پہاڑوں میں رہتی تھی اور بچہ والی حاملہ عورتوں کو گزند پہنچاتی تھی۔

بہرحال اس شہر کی تاریخ بھی نہایت اندوہناک واقعات سے پُر ہے۔

سلطان حمید حسن نے موجودہ حکومت جمہوریہ کیخلاف بغاوت کی تھی اسی شہر کا حاکم تھا اس کی یہ سلطنت سنہ ۱۷۷۱ء میں عبدالرحمن نے قائم کی تھی۔ جو ایک مشہور عرب عالم کا بیٹا تھا۔ جس نے 'ممپاواہ' (Mampawah) کی گورنری سے بادشاہت قایم کرلی تھی۔

عبدالرحمن تاریخ میں ایک نہایت ہی بداطوار حکمراں سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اس علاقہ کی ایک شہزادی سے شادی کر کے ولندیزی کمپنی سے سازباز کرلی تھی اور ان کی مدد سے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی تھی۔ ورنہ یہ شہر بانتن کے سلطان کا علاقہ تھا۔ ولندیزیوں نے اس سے چھین کر سنہ ۱۷۷۹ء میں عبدالرحمن کو دیدیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے یہ شہر عبدالرحمن کے خاندان کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔ اس شہر کے قریب 'ممپاواہ' اور 'سنگاداؤ' دو اور شہر ہیں یہ بھی اسی شہر کے تحت میں تھے۔ اب سب اندونیشیا کے علاقے ہیں۔

*شہر پون تیاناک، دریائے کاپواس (Kapuas) کے دہانہ پر آباد ہے اس کے قریب ربڑ، کالی مرچیں اور کھوپرہ خوب پیدا ہوتا ہے۔ چاول، مکئی، اور بڑی شکر قندی کی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ ریشم کی رنگائی کا کام بھی خوب ہوتا ہے شکر اور کھوپرے کے تیل کے بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں، مکانات لکڑی کے لٹھوں پر بنائے جاتے ہیں۔ آبادی سنہ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے ۴۵ ہزار

---

ﮯ ملاحظہ ہو" ڈاؤس ڈیکر" کی کتاب بزبان اندونیشی ( TANAH AIR - KITA ) یعنی 'ہمارا دیس' صفحہ ۲۸۰ (بزبان اندونیشی) مطبوعہ باندونگ سنہ ۱۹۵۰ء۔

اور اب موجودہ حیثیت میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ جن میں چینی اور عرب بھی کثرت سے آباد ہیں۔ کھوپرے کا کاروبار سب عربوں کے ہاتھ میں ہے۔"

غرض ان بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں خاص خاص اور مشہور شہر مباس، مم یاواہ یالوہ اور سکادانہ وغیرہ ہیں اور یہ بھی سب کاشتکاری اور پیداوار اکھٹی کرنے کے مرکز ہیں۔ ان سب شہروں میں مچھلیوں کی تجارت بھی خوب ہوتی ہے۔ بہرحال اب اس سلسلہ کا دوسرا مشہور گروپ سلاویسی ہے جس کا حال ذیل میں ملاحظہ ہو۔

## جزائر سلاویسی (سلیبس)[۱]

(Sulawesi)

یہ بھی ایک چھوٹا مجمع الجزائر ہے اور سنڈا کلاں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے جزیرے ۵°۴۰ ۱ اور ۳۰، ۵ درجات عرض البلد شمالی کے درمیان واقع ہیں۔ اس کا اندونیشی نام "سلاویسی" (Sulawesi) ہے۔ اس کے چاروں طرف چار جزیرے نما ہیں۔ اور تین بڑی بڑی خلیجیں ہیں۔ مثلاً (۱) خلیج تومینی (Gulf of Tomini) (۲) خلیج تولو (Gulf of Tolo) اور (۳) خلیج بونی (Gulf of Boni) اور چاروں جزیرہ نماؤں کے سرے جزیروں سے ملے ہوئے ہیں۔ اس طرح اس کی شکل مکڑی کی طرح ہوگئی ہے۔ اس کی کل لمبائی ۸۰۰ میل اور چوڑائی ۱۲۰ میل ہے۔ شمالی ساحل کے قریب سنگر (Sangir) کے جزائر ہیں اور ۵ درجہ عرض البلد شمالی کے قریب اور "تالیابو" (Taliabu)

---

۱؎ ایک مصنف لکھتا ہے کہ لفظ سلیبس کے معنی لوہے کے ہیں، چونکہ اس جزیرہ میں یہ دھات کثرت سے پائی جاتی ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ اسی وجہ سے انگریزوں نے اسے (CELEBES) سلیبس کہنا شروع کیا ہو

اسی سلسلہ کے "شلدپاد" (Schildpad) جزائر ہیں جنہیں "کچھوا جزائر" (Tortoise Is.) بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح "بانگائی" (Banggai Is.) جزائر ہیں جن میں بڑے بڑے جزیرے "مونا" (Muna) اور "بوتنگ" (Butung) ہیں ان کے آس پاس سینکڑوں چھوٹے چھوٹے ٹاپو ہیں۔ جنوبی جزیرہ نما کے آخری سرے پر جزیرہ "رسالایار" (Salajar) ہے جو جنوب کے مشہور بندرگاہ "بولوکمبا" (Bolukumba) کے بالکل مقابل واقع ہے۔

قدرتی ساخت کے اعتبار سے یہ تمام کا تمام سلسلہ پہاڑی ہے جس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اونچا پہاڑ "کوہ کوروی" (Kuruwe) ہے جو جزیرہ سلاویسی کے بالکل وسط میں واقع ہے اور تقریباً دس ہزار فٹ بلند ہے۔ جنوب میں انہی پہاڑوں کا ایک سلسلہ "کالابات" (Kalabat) کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے قریب پوسا۔ مٹانا۔ اور ٹووُتی مشہور مشہور گہرے پانی کی جھیلیں ہیں۔ جن کے قریب بقول ولیس، گرنے والے جھرنے بڑے عجائب المناظر ہیں۔ انہی جھرنوں کا پانی پھر آہستہ آہستہ دریاؤں کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے مگر یہ دریا سب چھوٹے ہیں اور جہازرانی یا آبپاشی کے لئے زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ یہ سب دریا جنوب کی طرف ساحل پر بہتے ہوئے سمندر میں گرتے ہیں جن کے قریب چھوٹے چھوٹے سینکڑوں جزیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ جزیرہ کا وسطی حصہ ٹوراجا (Toradja) کہلاتا ہے مشرقی حصہ بُنگ کوا تارا (Bungku Utara) اور مشرقی سرا منہاسہ کہلاتا ہے۔ وسطی حصہ کے شمالی کا نام ناتجو (Natju.) ہے اور ٹوراجا کا بالائی حصہ مندار کہلاتا ہے۔

پہاڑی چٹانوں کے متعلق ماہرین جغرافیہ اور ماہرین معدنیات کا خیال ہے کہ ان جزائر میں سطح زمین پر دو بڑی بڑی چٹانیں دریافت ہوئی تھیں جو بالکل پہاڑی چٹانوں کی طرح تھیں سب سے اونچی چوٹی "لاتی موجونگ (Latimodjong) ہے جو مغربی "پالوپو (Palopo) میں واقع ہے اور بلندی کے لحاظ سے ۱۱۰۰۰ فٹ ہے۔ جنوبی سلاویسی کی سب سے اونچی پہاڑی چوٹی "لومپوباتانگ" (Lompobatang) ہے جس کی اونچائی دس ہزار فٹ ہے۔ کسی زمانہ میں سے "بونتھین" (Bonthain) بھی کہتے تھے "منہاسہ" کے علاقہ میں "تون دانو" (Tondano) مشہور جھیل ہے جو ۱/۲ ۷ میل کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے "گورن تالو (Gorontalo) کے قریب "لمبوتو (Limboto) نامی جھیل ہے۔ اس جھیل کے ساتھ عجیب بات یہ ہے کہ یہ صرف ۷ فٹ گہری ہے۔ جبکہ اور جھیلیں عموماً ۲۰۰۰ فٹ گہری ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ سمندر ہی کا حصہ تھی مگر سمندر کا پانی پایاب ہو کر جھیل بن گیا ہے اور اب آئندہ کسی زمانہ میں یہ جھیل بھی نہ رہے گی۔ سب سے بڑا دریا "مینادو (Menado) ہے۔ جسے "تون دانو" (Tondano) بھی کہتے ہیں۔ یہ دریا صرف پندرہ میل لمبا ہے جبکہ جاوا کا "دریائے برانطاس"، ۵۰ میل اور بورنیو کا "دریائے کاپواس"، ۷۰۰ میل لمبا ہے۔

آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔ سمندر سے آنے والی ہوائیں پانی برساتی ہیں۔ نباتات عموماً جزائر فلیپائن سے مشابہ ہیں۔ ناریل کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور بہت عمدہ قسم کا خیال کیا جاتا ہے۔ چاول، قہوہ، شکر، روئی،

(جو ایک خاص قسم کی ریشمی جیسی نرم ہوتی ہے) اور کوکو کی پیداوار بھی بہت زیادہ ہے۔ سمندری چھال سے گیلاٹائن (Gelatine) تیار کیا جاتا ہے سنکونا، ربڑ اور مکئی بھی خوب پیدا ہوتی ہیں۔ جنگلوں میں دو خاص قسم کی عمارتی لکڑیاں خوب ہوتی ہیں مثلاً "کیولارا" اور "کولک" وغیرہ جن کے متعلق مشہور ہے کہ یہ بڑی مضبوط ہوتی ہیں اور دوسرے ممالک کو بھی بھیجی جاتی ہیں۔ اسی طرح "بید" بھی خوب پیدا ہوتی ہے۔

یہاں کے جانور سماترا اور بورنیو سے بالکل متباین ہیں۔ ولیس کے بیان کے مطابق ان جزائر کے جنگلات میں ایک خاص قسم کا ہرن دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ مصنف لکھتا ہے کہ یہ ہرن شباہت میں خنزیر سے بہت مشابہ ہے۔ اسکی ٹانگیں اور دم ہرن ہی کی طرح ہوتی ہیں یہ ہرن ہی کی طرح چرتا ہے اور ہرن ہی کی طرح کلیلیں کرتا ہے۔ لوگ اسے "بابی روسا" (بابی کے معنی سور کے ہیں) (Babi-rusa) - کہتے ہیں۔ پہاڑوں میں جنگلی بیل بھی کثرت سے ساتھ پایا جاتا ہے اور "انوووا" (Anovoa) کہلاتا ہے۔ یہ شکار کے لئے نہایت موزوں خیال کیا جاتا ہے کہتے ہیں کہ اس کا گوشت بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے بندر، سینکڑوں قسم کے رنگین طوطے، شہباز، کوئلیں تیتر، فاختہ، مور اور کبوتر بھی بڑے عجیب ہیں۔ یہ سب جانور اور پرندے بقول ولیس جنوبی افریقہ کے جانوروں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور اسی نوع کے جانور میڈاغاسکر کے جزیرہ میں بھی ملتے ہیں۔ جھیلوں میں مگرمچھ بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ان جھیلوں کے کنارے والے جنگلات میں ایسے

بندر بھی بکثرت پائے جاتے ہیں جن کے سروں پر تاج ہیں۔

غرض نباتات اور حیوانات کی متنوع اقسام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سلسلہ جزائر انڈونیشیا کی سب سے قدیم اور پرانی سرزمین ہے۔ کیونکہ اس نسل کے جانور کسی اور جزیرہ میں نہیں پائے جاتے، البتہ یہ جانور ان مقامات کے جانوروں سے ملتے جلتے ہیں جو اپنی قدامت کے لحاظ سے بہت پرانے سمجھے جاتے ہیں۔

معدنیات کے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ اس جزیرہ میں بڑی وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں مگر چونکہ اب تک کوشش نہیں کی گئی ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتنی طرح کی ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ البتہ شمالی سلیبس کے لوگ "سونا" نکالتے ہیں۔ جبکہ وسطی اور مشرقی حصہ میں "لوہا" خوب ہوتا ہے۔ "نیکل" کی دھات کا بھی تجربہ کیا جا رہا ہے "ڈاؤس ڈیکر" "رتانا ایرکینا" کے مصنف کا خیال ہے کہ یہ دھات یہاں کثرت سے نکلے گی "تانبہ" اور "سیسہ" بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ "ولیس" نے لکھا ہے کہ یہاں کے باشندے بھی اہل چین کی طرح "کان کنی" اپنے قدیم دستور کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور تحقیقات سے بھی معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۳۷ء سے پہلے کان کنی کا کوئی رواج بھی نہ تھا۔ کانوں سے ذخائر نکالنا بزرگوں کی روحوں کو اذیت پہنچانے کی مترادف سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب ہزاروں آدمی کانوں پر کام کرتے ہیں اور کھدائی باقاعدہ ہوتی ہے۔

بقول ڈاؤس ڈیکر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ جزیرہ غرق آب ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ یا تو غیر متقل ٹمپریچر کے باعث ہو رہا ہے اور یا پھر سطح سمندر کے بلند ہو جانے کے باعث ہو رہا ہے۔ مگر چونکہ اس جزیرہ میں بڑے بڑے جنگل ہیں۔

اس لئے اس کے بچے رہنے کے زیادہ امکانات ہیں ورنہ سمندر کا پانی تمام ریت کو بہا کر لے جائے اور اس جزیرہ کو بالکل غرق آب کر دے چنانچہ" پالوڈال" (Palu-dal) کے مقام پر یہ عمل اسقدر سرعت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ اب وہاں کی زمین بالکل برباد ہو چکی ہے "

باشندوں کا خاص پیشہ زراعت ہے۔ یا پھر ماہیگیری ہے۔ چنانچہ ماہیگیری کے متعلق " اندونیشیا ٹوڈے" میں تحریر ہے کہ اس جزیرہ کے اسیؔ فیصدی باشندے مچھلیاں پکڑتے ہیں اور باقاعدہ ان کی تجارت کرتے ہیں چنانچہ " گیلے سونگ " (Galesong) کے مقام پر جنوبی" مکاسر" میں ہر سال تقریباً ساٹھ ہزار مچھلیاں حاصل کی جاتی ہیں۔ ان مچھلیوں میں اُڑنے والی مچھلیاں بہت عمدہ مانی گئی ہیں اس طرح " جھیل ٹیمپی " سے بھی حاصل کی ہوئی مچھلیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں اس جھیل سے حاصل کی ہوئی مچھلیوں کا سالانہ اوسط وزن تقریباً ۴۰ سے ۵۰ ملین ٹن ہے "تونسالامہ" (Tonsaalama) کے مقام پر ابھی حال ہی میں ایک بہت بڑا بجلی کا کارخانہ قایم کیا گیا ہے تاکہ منہاسہ کے علاقہ میں اس سے بجلی کافی مقدار میں بہم پہنچائی جاسکے۔ اور رکان کنی کے کاموں میں بھی مدد حاصل کی جاسکے۔

خاص خاص شہروں کے سلسلہ میں بھی یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس جزیرہ میں کئی اچھے اچھے اور کاردباری شہر ہیں۔ چنانچہ شمالی سلادیسی کا خاص شہر "گورن تالو (Gorontalo) ہے جو نہایت خوبصورت ہے اور بقول 'ڈاؤس ڈیکر' تجارت کا بڑا مرکز ہے، اور یہاں کے بازار بھی بڑے شاندار ہیں اس شہر میں 'بید' کا بڑا کاردبار ہے۔

دوسرا بڑا شہر "مینادو" (Menado) ہے۔ جو منہاسہ کے علاقہ کا خاص شہر ہے۔ یہ شہر انڈونیشیا میں 'عیسائیت'، کا سب سے قدیم مقام خیال کیا جاتا ہے تین سو سال پہلے عیسائیوں نے اسی شہر میں اپنے 'مشن'، کے مرکز قائم کئے تھے جن کے آثار یہاں کے باشندوں کی زندگی کے اطوار میں بہت نمایاں ہیں۔ چونکہ یہ شہر نصرانیت کا سب سے بڑا مرکز تھا لہذا بڑے بڑے مدارس بھی پہلے اسی شہر میں قائم کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندوں میں خواندگی کا اعداد شمار نسبتاً بڑھا ہوا ہے۔ لوگ مغربی طرزِ تعلیم سے بہت زیادہ بہرہ مند ہیں۔ اخبار نویسی، پڑھانا لکھانا وغیرہ ان کے خاص پیشے ہیں، یہ لوگ مغربیت زدہ بھی[1] بہت زیادہ ہیں۔ بقول بعض مبصّرین اور سیّاح ان کے انداز پرتگالیوں سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان پر پرتگالیوں کا اثر زیادہ حاوی رہا ہے۔ جنوب میں بولوکمبا اور مشرق میں دونگی، ددسو، اندولیوں، لالوتا اور کنداری مشہور شہر اور بندرگاہیں اور مغربی ساحل پر پارے پارے، سوراماتا، پولورمن، اور دونگالا ہیں۔

بہر حال ان شہروں کے بعد ایک اور بھی بہت بڑا شہر ہے اور وہ "مکاسر" (Makasar) کہلاتا ہے۔ یہ شہر ١٩٤٧ء میں ولندیزیوں کی قائم کی ہوئی "ایسٹ انڈونیشیا اسٹیٹ"، کا بھی صدر مقام رہا ہے۔ یہ شہر سلاویسی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اور تمام شمالی مشرقی جزائر کی تجارت کا بڑا مرکز ہے۔ اب 'سلاویسی' کا صدر مقام ہے۔

---

[1] ہمارے ملک (پاکستان) میں آنے والے تیسرے سفیر ہز اکسیلینسی محمود لاجوبا بھی اسی جزیرہ 'سلاویسی'، کے باشندے ہیں۔

جب پرتگالی آئے تھے تو انھوں نے بھی اسی شہر کو بڑی اہمیت دی تھی۔ یہیں پر انھوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں قایم کی تھیں۔ ان کے بعد جب ولندیزی آئے تو انھوں نے بھی اپنی تجارت کے لئے اسی شہر کو منتخب کیا تھا۔ پھر انگریز بھی ان دیگر اہل مغرب کے تجارتی حریف اسی شہر میں بسے تھے۔ اس طرح سے مدتوں یہ شہر ان اقوام مغرب کی باہمی مقابلہ آرائیوں کا بڑا مرکز بنا رہا ہے۔ باشندے بھی جو "مکاسری" کہلاتے ہیں، پورے علاقہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کی پرورش کرنے میں بڑا کمال رکھتے ہیں، مویشی بھی پالتے ہیں اور زراعت بھی کرتے ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ سے ان لوگوں نے ربڑ، قہوہ اور تمباکو کی کاشت بھی شروع کی ہے۔ اس علاقہ کے لوگ "بوگینی" (Buginese) ہیں جو جسمانی اور شکل کے اعتبار سے ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں یہ لوگ نسبتاً زیادہ علم وادب کے دلدادہ اور مذہب کے پابند ہیں۔ ان میں عالم بھی اچھے ہوتے ہیں غرض یہ بڑے پختہ عقائد کے مسلمان ہیں۔

مکاسر کا خاص شہر جنوبی جزیرہ کے مغربی سرے پر واقع ہے اور یہ ایک قدرتی بندرگاہ ہے برسات کے زمانہ میں اس میں طوفان بھی بہت آتے ہیں۔ آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے۔ جن میں ۲۰ فیصدی غیر اندونیشی لوگ ہیں۔ اس شہر میں ایک میونسپلٹی ہے جس کا میئر (Mayor) بھی ہے اور کونسل بھی ہے۔ بقول ڈاؤس ڈیکر، شہر کا آدھا حصہ قدیم الوضع ہے جس میں ولندیزی اور پرتگالی انداز کی آبادیاں ابتک قائم ہیں۔ "ڈین پاسار کانفرنس" کے وقت انتظام حکومت کے لحاظ سے حکومت جمہوریہ اندونیشیا کے خلاف ولندیزیوں کی اپنی قایم کردہ "ایسٹ اندونیشین اسٹیٹ"

کا خاص مرکز تھا۔ یہاں کے ان لوگوں نے پارلیمنٹ بھی اپنی جداگانہ ہی بنائی تھی۔ اسی شہر میں قائدین اندونیشیا کے نظر بند کرنے کے لئے جیل خانہ بھی قائم کیا گیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں مشہور باغی "ویسٹر لنگ" کی اندونیشیا کے خلاف خطرناک بغاوت بھی اسی مقام سے اٹھی تھی۔ جس کے دبانے کے سلسلے میں تقریباً چالیس ہزار جنوبی سلیبس کے بہادر اندونیشی کام آئے تھے۔

اسی طرح جنوبی مالوکو کی ایک علیحدہ اندونیشی اسٹیٹ قائم کرنے کا اشغلہ چھوڑنے والے "ڈاکٹر سوموکل" (Dr. Sumokil) نے بھی اسی شہر سے خروج کیا تھا۔

بہرحال یہ ایک بڑا تاریخی مقام ہے۔ اور اب اندونیشیا کا خاص تجارتی شہر ہے اس شہر میں[1] "بید" کا کام مثلاً طرح طرح کے رنگ اور ڈیزائن سے چٹائیاں بننا اور ٹوکریاں بنانا مشرق بعید میں بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے اعلیٰ کاریگر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہر بہت سے پائے جاتے ہیں۔ جن کا ذکر سردست بخوف طوالت قلم انداز کیا جاتا ہے اور اب جزیرہ بنکا کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

## جزیرۂ بنکا

یہ سماترا کے مشرقی ساحل کے پاس اسی نام کی آبنائے کے قریب واقع ہے۔ اور تقریباً ۴۴۰۰ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے بہت سے جزیرے ہیں جن میں سب سے اہم جزیرہ "لی پان" ہے۔ جو بقدر ۱۲۸۰ مربع میل وسیع ہے۔ مجموعی طور پر یہ سب جزائر اسی جزیرہ بنکا سے ملحق ہیں۔ اور انتظامی حیثیت سے بھی اسی کے ماتحت ہیں۔

[1] بحوالہ (TANAH AIR KITA) مصنفہ ڈاوس ڈیکر۔

دوسرا سلسلہ لنگا جاتی جزیروں کا ہے جو پہاڑی ہیں۔

بنکا کی مٹی بقول پروفیسر ولیس، بجری نما ہے لیکن سطح کا زیادہ حصہ کثرت نباتات سے سرسبز و شاداب ہے۔ معدنیات بھی بہت زیادہ پائی جاتی ہے جن کے حاصل کرنے کے لئے جنگلات بھی جگہ جگہ سے صاف کر دئے گئے ہیں۔ ولیس کی رائے ہے کہ اندونیشیا میں یہی صرف ایک ایسا جزیرہ ہے جس میں آتش فشاں پہاڑ نہیں پائے جاتے۔ سب سے اونچا پہاڑ مارس (Mars) ہے جس کی بلندی ۲۷۶۰ فٹ ہے بقیہ پہاڑ چھوٹے ہیں اور کم اونچے ہیں۔ دریا بھی اس جزیرہ میں اتنے زیادہ نہیں پائے جاتے۔ خاص دریا سُونگی (Sungei) ہے۔ جس میں مچھلیاں کثرت سے پکڑی جاتی ہیں۔

آب و ہوا بھی گرم اور مرطوب ہے۔ بقول ولیس ۱۱۸ سالانہ بارش ہوتی ہے گرمی کا زمانہ مئی سے اگست تک رہتا ہے۔ اس زمانہ میں گرمی نہایت ہی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ جاڑوں کا زمانہ نومبر سے شروع ہوتا ہے اور فروری تک جاری رہتا ہے اس زمانہ میں کچھ بارش بھی ہو جاتی ہے بقیہ موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ وبائی امراض خطرناک صورت اختیار نہیں کرتے۔ بارش کے دنوں میں ملیریا، عام مرض ہے۔

پیداوار عام طور سے گرم مصالحہ، ساگو دانہ، چاول، چاء، قہوہ ہیں۔ اور بقول[1] اے کبیٹن (A. Cabatan) ٹین کثرت سے نکلتا ہے اور دنیا بھر میں سب سے اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ سارے جزیرہ میں اس کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔

---

[1] (Java and DUTCH East Indies) مصنفہ اے کبیٹن مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۲۵

ان چیزوں کے علاوہ جانوروں کی زندگی بھی جزیرۂ سماٹرا سے بہت زیادہ مشابہ ہے البتہ یہاں کے جنگلات میں ہاتھی پست قامت اور چھوٹا ہوتا ہے جس کو سرکس والے عموماً بہت شوق سے خریدتے ہیں۔ اور انھیں حاصل کرنے کے لئے دور و دراز کا سفر کر کے بھی آتے ہیں۔

بہر حال پہلے یہ جزیرہ "بلیم بنگ" (واقع سماٹرا) کے سلطان کے ماتحت تھا لیکن ۱۸۱۰ء میں بمصالح سیاسی انگریزوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا مگر پھر کچھ شرائط طے ہو جانے پر سلطان کو واگذار کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے یہ اسی سلطان کے تحت میں چلا آرہا تھا۔ اب بالکلیہ "جمہوریہ" کے قبضہ میں ہے۔ اور معدنی حیثیت سے بھی بہت زیادہ اہم ہے۔

منتوک (Muntok) اس کا خاص شہر ہے اور مغربی حصہ میں ابنائے بنکا سے کچھ فاصلہ پر جزیرۂ سماٹرا کے رخ پر واقع ہے۔ زمانۂ جدو جہد میں کسی وقت "ڈاکٹر سوکارنو" جلا وطن کر کے جب اس جزیرہ میں بھیجے گئے تو انھیں اسی شہر میں رکھا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک اس شہر کے باشندے سیاسیات سے بالکل بے بہرہ تھے اور ماحول بھی یہاں کا نہایت ہی غیر ترقی یافتہ تھا۔ اب یہ شہر "ٹین" کے ذخیرہ کا بڑا مرکز ہے۔

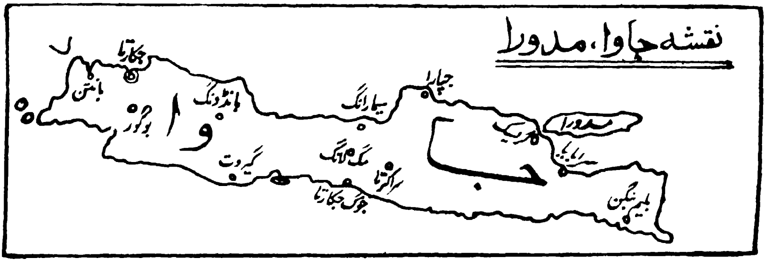
**بلیتون**[1] **(Billiton)** یہ جزیرۂ بورنیو اور بنکا کے درمیان واقع ہے۔ اس کا کل ۱۸۶۰ میل ہے۔ اور لمبائی ۵۵ میل اور چوڑائی ۴۳ میل ہے بقول اے۔ آر۔ ویلیس،، اس جزیرہ سے ۱۳۵ چھوٹے جزیرے وابستہ ہیں اور جن میں پھر اور بھی بہت سے ایسے جزیرے ہیں جنھیں محض ایک قریہ کی حیثیت حاصل ہے۔

[1] ملاحظہ ہو "سفر نامہ" مسٹر اے۔ آر۔ ویلیس۔ جسکا حوالہ پچھلے اوراق میں گزر چکا ہے۔

یعنی سمندر میں چند گھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹاپو ہیں جہاں صرف چند ماہی گیر رہتے ہیں۔

بقول ویلیس طبعی حیثیت سے یہ جزیرہ 'بنکا' سے بہت مشابہ ہے، آب وہوا، پیداوار اور حیوانی زندگی بھی بالکل 'بنکا' کے مماثل ہے۔ البتہ ساحلی کنارے بہت ریتیلے ہیں۔ جن کے آس پاس دلدلی مقامات بھی پائے جاتے ہیں اور جزیرہ کے درمیان میں ایک کم اونچا پہاڑ ہے جسے کوہ تان یم (Tanjem) کہتے ہیں اس پہاڑ کی بلندی تقریباً ۱۶۷۰ فٹ ہے۔ جس کے سلسلوں میں 'ٹین' کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ کمپنیاں ٹین کو کھودتی ہیں۔ یہاں ان کے بڑے بڑے دفاتر قائم ہیں۔ اس جزیرہ کے جنگلوں میں بقول چارلس بروس، انسان سے مشابہت رکھنے والے بندر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مونگا (Mongga) خاص شہر ہے اور ٹین کے ذخیرہ کا بہت بڑا مرکز ہے۔




## جزیرۂ بالی (Ball)

جاوا کے مشرق میں آبنائے بالی کے پار ایک گہرے سمندری حصہ میں واقع ہے۔ جاوا سے اس کو ایک مخصوص آبنائے الگ کرتی ہے جو تقریباً ایک میل چوڑی ہے اور بالی ہی کے نام سے مشہور ہے۔

نقشہ پر یہ جزیرہ اپنی شکل میں بالکل ذوالربعتہ الاضلاع ہے جس کی آخری حدیں جاوا کے نزدیک تک پہنچ گئی ہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ وسعت پچاس میل ہے اور رقبہ ۔۔۔ ۲۱/۵ مربع میل ہے۔ جس میں پہاڑوں کا خاص سلسلہ مشرق سے مغرب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ اور جنوب کی طرف زرخیز میدان ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا" (جلد دوم صفحہ ۹۷۶ مطبوعہ نیویارک ۱۹۴۶ء) میں لفظ بالی کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ لفظ اصل میں سنسکرت سے لیا گیا ہے جو اپنی اصل میں 'بالن' تھا" بہرحال یہ جزیرہ تمام پہاڑی ہے جن کے جنوب میں بڑے بڑے غار ہیں اور ان غاروں کے آس پاس زرخیز میدان ہیں۔ پہاڑوں کا خاص سلسلہ آبنائے لمبوک سے آبنائے بالی تک چلا گیا ہے اور تین خاص سلسلوں میں منقسم ہے۔

(۱) مشرقی پہاڑی سلسلہ جس میں کوہ 'اگنگ' یا چٹان بالی ہے جو مستقل طور پر متحرک رہنے والے آتش فشاں پہاڑ کی اونچی ڈھال ہے۔ جس کی بلندی ۱۰۴۹۹ فٹ ہے۔ اس کے دامن میں ایک خوبصورت جھیل ہے جو" جھیل گنگ " کہلاتی ہے۔

(۲) دوسرا سلسلہ وسطی پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن کے قریب بہت سی چھوٹی چھوٹی پانی کی جھیلیں ہیں جن میں 'براطان'، 'بویان'، اور 'تنبلنگا'، بہت زیادہ مشہور ہیں۔

اور تیسرا 'جمبرانہ' پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو مغرب کے غیر آباد حصوں میں پھیلا

---

اوپر۔ انڈونیشن ریویو ۵ جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ جکارتا

مگر اسی رقبہ کو مسٹر اے کمبیٹن نے اپنی کتاب جاوا اینڈ دیج ایسٹ انڈیز، میں ۹۳ میل لکھا ہے اور چوڑائی کو ایک میل، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہوا ہے اور "باتور (Batur) خاص پہاڑ ہے جو آتش فشاں بھی ہے اس کے جنوب کی طرف ساحل کے پاس تقریباً ۹ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو 'موسی پیدا' کہلاتا ہے۔ "اے۔ آر۔ ویلیس" کی رائے ہے کہ یہی چھوٹا جزیرہ انڈونیشیا کی قدیم آبادی کا مسکن ہے۔ اور ان جزائر میں سب سے پرانہ ہے۔ کسی زمانہ میں بہت بڑا تھا مگر اب سمندر میں غرقاب ہوکر چھوٹا سا باقی رہ گیا ہے۔ محققین نے اس کے پہاڑی غاروں میں بھی بالکل اسی "قدیم ہندوانی مشابہت" کے آثار دریافت کئے ہیں جو ہندوستان کے جنوب میں ریاست حیدرآباد کے "ایلورا" کے غاروں میں ملتے ہیں۔

جزیرۂ[1] بالی کے ساحلوں پر پہاڑی خلیجیں ہیں۔ جن کی وجہ سے طوفانوں سے بھی بڑا بچاؤ رہتا ہے دریا عموماً بہت چھوٹے ہیں، یہ وسطی پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور جنوب کی طرف بہتے ہیں۔ مگر مٹی زیادہ رتیلی ہونے کے باعث بہتے بہتے۔ یہ آگے چل کر پایاب ہو جاتے ہیں۔ بلکہ غیر برسات کے موسم میں قریب قریب خشک ہو جاتے ہیں اور تقریباً چھ ماہ تک خشک رہتے ہیں۔

آب وہوا[2] نہایت خوشگوار ہے، اور انڈونیشیا کے جزائر میں نہایت ہی عمدہ سمجھی جاتی ہے۔ نسیم بحری ہر وقت چلتی رہتی ہے جس کے اثر سے گرمی کی شدت بڑھنے نہیں پاتی۔ پہاڑوں کی آب وہوا نسبتاً زیادہ خوشگوار ہے جبکہ وادیوں میں کچھ گرمی بھی پائی جاتی ہے۔

میدان بہت زرخیز ہیں،[3] جن میں پیداوار کی بڑی افراط ہے۔ خاص پیداوار کی چیزیں سنکونا، گنا، قہوہ، کوکو، تمباکو، نیل اور مونگ پھلی وغیرہ ہیں۔ وادیوں میں

---

لوٹ[1] و[3] "انڈونیشن ریویو، ماہ جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ جکارتا۔

پھل بھی بہت پیدا ہوتے ہیں اور پھول بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں مگر چاول اس جزیرہ کی خاص اور مشہور پیداوار ہے۔ جس کو یہاں کے باشندے نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ پیدا کرتے ہیں اور انڈونیشیا میں چاول اُگانے میں ماہر خیال کئے جاتے ہیں۔

مناظر قدرت کا ذکر کرتے ہوئے "مسٹر اے کرافورڈ" نے لکھا ہے کہ یہ جزیرہ حُسنِ قدرت کا ایک دلفریب مُرقع ہے۔ اس کے پہاڑ اور سبزہ زار جزائر جاوا اور سلاویسی کی طرح ایک عجیب قسم کی دلکشی رکھتے ہیں، جو بارش ہو جانے کے بعد اور بھی عجیب ہو جاتی ہے۔

"مسٹر اے۔ کے۔ کمار سوامی"[۱] نے لکھا ہے کہ مناظر قدرت کے علاوہ یہاں کی سب سے زیادہ قابل دید چیز پرانے منادر ہیں، جو قدیم ہندو تہذیب کی تاریخی یادگاریں ہیں۔ اور "ڈرم پے جنگ" (Drum Pedjung) کہلاتے ہیں ان کے علاوہ "بولی لنگ" اور جمبرانا کے راجاؤں کے قدیم محلات ہیں۔ جنھیں دیکھنے کے لئے آثار قدیمہ کے شائقین دور دور سے آتے ہیں۔ یہ راجگان اس جزیرہ میں ۱۸۵۶ء تک حکمراں تھے مگر ولندیزیوں نے آخری بار لڑکر انھیں ختم کر دیا۔ یہ سب آثار آج ان کی تاریخی یادگاریں ہیں۔

کاروبار اور صنعت و حرفت کے لئے بھی یہ جزیرہ بہت زیادہ مشہور ہے۔ یہاں کے کاریگر زیورات سازی، برتن بنانے اور کار چوبی کا کام کرنے میں مشرق کے اعلیٰ ترین ماہر تصور کئے جاتے ہیں، مجسمے بنانا، لکڑی کے کھلونے اور مورتیاں تیار کرنا بھی ان کا نہایت ہی اعلیٰ کام سمجھا جاتا ہے۔ گانے اور ناچنے میں بھی بڑا کمال

---

[۱] کمار سوامی کی کتاب "ہسٹری آف انڈین اینڈ انڈونیشن آرٹ"، جلد چہارم مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۷ء۔

رکھتے ہیں - ان کا یہ فن آج تمام دنیا میں "بالینیز آرٹ" کے عنوان سے مشہور ہے - باشندے عموماً سب ہندو ہیں مگر یہ سب ہندوستانی ہندو نہیں ہیں بلکہ اندونیشیا ہی کے باشندے ہیں اور قدیم سے ہندو چلے آتے ہیں ان کی روایات اور مذہب کی بہت سی باتیں بھی ہندوستان کے ہندو مذہب سے مختلف ہیں بلکہ قدیم اندونیشی تمدن کی یادگار ہیں جن کی تفصیلات آگے بیان کی گئی ہیں -

انتظامی حیثیت[1] سے یہ جزیرہ دو خاص حصوں میں تقسیم ہے ایک شمالی مغربی حصہ جس کا صدر مقام "سینگاراجا" (Singaradja) ہے اور دوسرا جنوبی مشرقی حصہ جس کا صدر مقام "دین پاسار" (Den Pasar) ہے - اور دونوں کو ایک خاص سڑک "کوہ تابانان" (Tabanan) سے گذرتی ہوئی ملاتی ہے - مگر اس جزیرہ میں ریلیں اور ٹرامیں نہیں ہیں جیسا کہ ریویو میں تحریر ہے سفر عام طور پر بسوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے -

تاریخی حیثیت سے ولندیزی لوگ اس جزیرہ میں سولھویں صدی عیسوی میں پہنچے تھے اس وقت اس جزیرہ میں ۹ ریاستیں یا پرنسپلٹیز (Principalities) قائم تھیں - جو آپس میں ایک دوسرے کی حریف تھیں - چنانچہ ولندیزیوں نے ان کی باہمی عداوت سے بہت فائدہ اٹھایا حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی میں دسلطان سراکرتا، سے جو میاپائت کا جانشین اور خاندان ماترم کا چشم و چراغ تھا یہ جزیرہ چھین لیا تھا۔ اس کے بعد یہاں پر دیسی حکمرانوں میں ولندیزیوں کے خلاف جھگڑے اٹھتے رہے مگر ۱۹۰۸ء میں ولندیزیوں نے سب کو اپنا ماتحت کر لیا - جاپان نے بھی فروری ۱۹۴۲ء

[1] "اندونیشن ریویو" ماہ جولائی ۱۹۵۱ء - صفحہ ۳۴۲

میں جب اپنا حملہ کیا تھا تو اس جزیرہ کو فوجی اہمیت کے پیش نظر قبضہ میں لے لیا تھا۔ جاپان کی شکست کے بعد ولندیزی دوبارہ اندونیشیا میں آئے تو انھوں نے اپنی سازش سے "ایسٹ اندونیشین اسٹیٹ" کی بنا رکھنے کے لئے یہیں پر کانفرنسیں منعقد کیں تھیں اب یہ جزیرہ جمہوریہ اندونیشیا کا ہندو تہذیب تمدن کا مرکز ہونے کے اعتبار سے خاص علاقہ ہے۔

**جزیرۂ مدورا**

جاوا کے بہت ہی قریب واقع ہے اور تقریباً ۱۰۰ میل لمبا اور ۳۴ میل چوڑا ہے اور رقبہ کے اعتبار سے مجموعی طور پر ۲۷۴۰ ,۵ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ طبعی اعتبار سے پورا جزیرہ ہموار میدانوں کا ایک وسیع علاقہ ہے۔ جس میں زمین شمال مغرب سے جنوب مغرب تک چلی گئی ہے۔ یہاں تک کہ پھر مشرق کی جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو دور تک سمندر میں پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کے قریب ساحل کے پاس چھوٹے چھوٹے جزائر کا ایک مجموعہ ہے جو "کان گین جزائر" (Kangean) کے نام سے مشہور ہے۔ اور اثریاتی حیثیت سے 'جاوا' کی پرانی اور قدیم آبادی کا مسکن ہے۔ اور انتظامی حیثیت سے مدورا ہی میں شامل ہے ان کی قدرتی ساخت آب وہوا، اور پیداوار بھی مدورا سے مشابہ ہے۔

بہر حال مدورا کی آب وہوا جیسا کہ "ڈیڈلے اسٹامپ" نے جاوا کے حال میں لکھا ہے مشرقی جاوا سے ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح یہاں کی نباتات، پیداوار اور حیوانی زندگی بھی مشرقی جاوا سے مماثل ہے۔ مگر پیداوار کی زیادہ افراط نہیں ہے چاول بھی عموماً جاوا سے منگوایا جاتا ہے۔ حالانکہ قہوہ، ناریل، گنا اور نیل بہت

تاریخی نقطہ نظر سے بھی یہ جزیرہ بہت مشہور ہے۔ اس میں قدیم ہندو جاوی آثار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے منادر ہیں جو پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے ہیں "بنکولن" اس کا خاص شہر ہے۔ اور ریل گاڑیوں کی دوڑ کے لئے تمام اندونیشیا میں مشہور ہے یہاں کے باشندے سب مسلمان ہیں اور حج کرنے کے سلسلہ میں بھی بڑے پابند ہیں۔ اسی شہر کے بالمقابل جزیرہ جاوا کا ایک پرانا اور تاریخی اسلامی شہر "گریسیک" ہے۔ جہاں اس جزیرہ میں اسلام کے آغاز کی ابتدائی یادگاریں بھی پائی جاتی ہیں۔ اہلِ عرب کی تصانیف میں "غرسیک" کا نام اسی جزیرہ سے عبارت ہے۔

**لمبوک (Lambok)**

بالی اور سمباوا کے درمیان جاوا سے جانب مشرق ایک ہی خط مستقیم میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۸۲۵ مربع میل ہے۔ سطح کے اعتبار سے یہ تمام پہاڑی ہے اور پہاڑ چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں جن کا ایک سلسلہ جنوب کی طرف چلا گیا ہے۔ جو کسی مقام پر بھی ایک ہزار فٹ سے اونچا نہیں ہے۔ شمالی سلسلہ میں "رنجانی" ((Rindjani)) مشہور چوٹی ہے جو اندونیشیا میں سب سے اونچی آتش فشانی چوٹی سمجھی جاتی ہے اس کے جنوب میں سطح مرتفع ہے جس سے متصل ایک خوبصورت 'جھیل' ہے جو "دارو" (Daru) کہلاتی ہے۔ یہ میٹھے پانی کی جھیل ہے اس سے چھوٹے چھوٹے دریا بھی نکلتے ہیں مگر یہ کشتیاں چلانے کے لئے بالکل غیر مفید ہیں۔

یہ جزیرہ آب وہوا اور پیداوار میں بالی اور جاوا سے بہت زیادہ مماثل ہے۔ البتہ سرسبزی اور شادابی کے لحاظ سے یہ اندونیشیا کے تمام جزائر میں ممتاز ہے۔ اسی لئے اکثر جغرافیہ والوں نے اسے اندونیشیا کی "فردوس" کہا ہے بلکہ

ولیس کا تو یہ خیال ہے کہ نباتات کے محققین کے لئے دنیا میں اس کے جنگلات سے بہتر کوئی اور مقام نہیں مل سکتا ولیس لکھتا ہے کہ اس کے پرلطف مناظر، اس کے سرسبز پہاڑ، اس کی خوبصورت جھیلیں پھر اردگرد دہقانوں کی جھونپڑیاں نہایت ہی حسین نظارے پیش کرتی ہیں۔ جہاں بقول ایک دوسرے محقق کے خوبصورت خوبصورت پرندے اور حسین جانور اور بھی زیادہ قابل دید ہیں۔ ان جانوروں میں عموماً ہرے کبوتر، بڑی بڑی کوئلیں، سبز فاختہ ہیں، بڑے بڑے کوّے، اور جنگلی مرغیاں ہیں جنگلی خنزیر اور کتے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں، "امپینان (Ampenan) خاص شہر اور بندرگاہ ہے۔

## سمباوا[1] (Sumbawa)

اس کا مجموعی رقبہ ۵۲۴۰ مربع میل ہے۔ عمدہ چراگاہوں اور بہترین قسم کے گھوڑوں کی پرورش کے لئے بہت زیادہ مشہور ہے۔ یہاں کے گھوڑے "آسٹریلین پونی" کی طرح شہرت رکھتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ کسی زمانہ میں اس جزیرہ میں بیما، ڈوروپا، سنگر، سمبورا، پاپی کت اور سمباوا چھ ریاستیں تھیں مگر ۱۸۱۵ء کے ایک خطرناک اور زبردست زلزلہ کے باعث سب برباد ہوگئیں اور صرف 'پاپی کت' بچی جو اب سے کچھ عرصہ پہلے تک موجود تھی۔ اور اب جمہوریہ میں شامل ہے۔

آب وہوا، پیداوار، نباتات اور جانوروں کے اعتبار سے یہ جزیرہ 'لمبوک' سے بہت زیادہ مماثل ہے حیوانیات جزیرہ فلورس سے ملتی جلتی ہیں جو اس جزیرہ سے ذرا مشرق کی طرف واقع ہے۔

## فلورس[2]

رقبہ کے اعتبار سے ۸۷۰۰ میل ہے اور وضع قطع کے اعتبار سے کافی لمبا ہے اس کی کل لمبائی ۲۲۴ میل ہے اور چوڑائی ۳۷ میل ہے

سلہ وسلہ ملاحظہ ہو انڈونیشی کتاب (TANAH AIR KITA) مصنفہ ڈاؤس ڈیکر۔

سطح قریب قریب تمام پہاڑی ہے۔ اور پہاڑ سب آتش فشانی ہیں۔ اور دس بڑے بڑے سلسلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جزیرہ کسی زمانہ میں "سلاطین سلیبس" کے ماتحت تھا اور اسلام کا مرکز تھا۔ سلیبس کے بڑے بڑے علماء یہاں رہتے تھے اور یہاں کے غیر مہذب باشندوں کو اسلام کی تلقین کرتے تھے۔

اس جزیرہ کی آب و ہوا، پیداوار اور حیوانی زندگی سب سمباوا سے مشابہ ہے گھوڑے یہاں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ ترقی یافتہ بھی کم ہیں۔

## سُمبا (Somba)

یہ تمام جزیرہ نہایت زرخیز ہے۔ اس کا رقبہ بھی تقریباً ۴۶۰۰ مربع میل ہے جس میں بقول ولیس چاروں طرف عمدہ قسم کی قدرتی چراگاہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں پر گھوڑے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور جنگلوں میں صندل کی لکڑی عام ہے۔ قہوہ، چاول اور تمباکو خوب پیدا ہوتے ہیں۔

یہاں کے باشندے "سُمبانیز" کہلاتے ہیں۔ اور اعلیٰ قسم کے شہسوار اور جنگجو ہوتے ہیں۔ اور عموماً مسلمان ہیں۔

## جزیرۂ تیمور (Timor)

سنڈا خورد کے تمام جزیروں میں سب سے بڑا ہے۔ اور دو حکومتوں کے مابین منقسم ہے یعنی شمالی مشرقی حصہ پر پرتگالی قابض ہیں۔ اور جنوبی مغربی حصہ جمہوریہ اندونیشیا کے زیر اقتدار ہے۔ پہلے ولندیزی بھی اسی حصہ پر قابض تھے۔ ان[1] کے زمانہ میں انتظامی حیثیت سے یہ جزیرہ ایک بہت بڑی رزیڈنسی تھا اور سُمبا۔ سمباوا، اور فلورس جزائر اس رزیڈنسی میں شامل تھے۔ اور اس کی پوری آبادی سنہ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے لحاظ سے ۷۶۳۰۷۵۷ تھی۔

[1] حوالہ کیلئے ملاحظہ ہو "اے ہینڈ بک آف نیدرلینڈ ویسٹ ایسٹ انڈیز" صفحات آخر، مطبوعہ کلکتہ۔

طول وعرض کے اعتبار سے یہ جزیرہ ۶۰۰×۳۰۰ میل ہے اور "بحیرہ آرافورا" (Arafura Laut) کے مغرب میں واقع ہے۔ اور سطح کے لحاظ سے تمام پہاڑی ہے۔ جس میں خاموش قسم کے آتش فشاں پہاڑوں کے متوازی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ جو مشرقی ساحل کی طرف سے گذرتے ہوئے جنوب تک چلے گئے ہیں۔ درمیان کا حصہ بھی پتھریلا ہے جس میں بجری والی ریت پائی جاتی ہے۔ اور پہاڑوں کی اونچائی چار ہزار سے آٹھ ہزار فٹ تک ہے۔ سب سے اونچا پہاڑ "کوہ رامین" (Gng. Ramain) ہے جس کی بلندی ۹۶۰۰ فٹ ہے اور پرتگالی علاقہ میں واقع ہے۔

بہرحال[1] تیمور کے پہاڑ عموماً تمام چونے کی چٹانوں سے بنے ہیں۔ جن میں جا بجا غار بھی پائے جاتے ہیں۔

آب وہوا بھی جزائر جاوا اور سماترا سے مختلف ہے۔ بارش کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے۔ جبکہ زیادہ عرصہ تک خشکی رہتی ہے۔ "کوپانگ" (Kupang) کے مقام پر بارش کا سالانہ اوسط ۵۷" ہے۔ جو مجموعی طور پر پورے سال میں صرف ۸۰ دن کا ہوتا ہے۔ مگر یہ اوسط آس پاس کے ان جزائر میں نسبتاً زیادہ ہے جو جنوبی مشرقی ساحل کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ان جزیروں میں خاص خاص جزیرے 'روٹی' (Roti) 'سماؤ' (Semau) اور 'سیوو' (Sevu) ہیں جنمیں روٹی انڈونیشیا کا آخری بڑا جزیرہ ہے جو جنوب کی طرف واقع ہے۔

نباتات بھی اس جزیرہ میں اور جزائر کی نسبت کم پائی جاتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں جنگلات میں 'صندل' کے درخت بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ معدنیات میں عام طور پر سونا، تانبا اور پٹرولیم خاص چیزیں ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری میں آبادی خالص اس جزیرہ کے لحاظ سے ۸۰۰۰۰۰ تھی۔

---

[1] بحوالہ ("Java And Dutch East Indies") مصنفہ "اے بکیٹن" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۰ء۔ "باب تیمور"۔

سنہ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری میں آبادی خالص روٹی ۴۶۰۸۲۳

" " ساوُد ۲۷٫۳۶۵

ولندیزی اس جزیرہ میں سنہ ۱۶۱۳ء میں پہنچے تھے۔ جبکہ اہل پرتگال کو یہاں رہتے ہوئے پوری ایک صدی گذر چکی تھی۔ "کوپانگ" (Kupang) کے انڈونیشی راجہ نے ولندیزیوں کو یہاں رہنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی تھی چنانچہ سنہ ۱۷۴۹ء میں جب ولندیزیوں نے ذرا زور پکڑا تو پرتگالیوں کو مشرق کی طرف بھگا دیا لہٰذا جب ہی سے پرتگالی اس علاقہ میں آباد ہیں۔ جمہوریہ کے تیموری جزیرہ کا رقبہ ۱۹۰۰۰ مربع کلومیٹر ہے اور "کوپانگ" اس کا صدر مقام ہے جبکہ پرتگالی تیمور کا رقبہ ۱۸۹۰۹ مربع کلومیٹر ہے۔ اب جزیرۂ تنمبار کے جغرافیائی حالات پر غور کیا جاتا ہے۔

**تنمبار (Tenimbar)**

جو جنوب مغرب میں جزائر آرو (Aru) کے نزدیک واقع ہے اسکا سمندر "تیمور لاؤت" (Timore Laut) کہلاتا ہے۔ غرض یہ سلسلہ ۴°۸ x ۲۰°۶ درجات جنوب کے درمیان واقع ہے۔ اس سلسلہ میں تقریباً ۶۶ جزیرے شامل ہیں جن میں سب سے بڑا جزیرہ "یام دینا" (Yamdena) ہے جس کا رقبہ ۱۱۰۰ مربع میل ہے۔ معدنیات اور نباتات کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہوئے مسٹر اتیج۔ او۔ فلوربس[1] نے لکھا ہے یہ جزیرہ جزائر کی (Kei Is.) کی اس پہاڑی قوس پر واقع ہے جو سمندر میں پاس پاس دور تک چلی گئی ہے اور جدید قسم کی چٹانوں پر مشتمل ہے۔ اس جزیرہ کے ساحل گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں مگر مغربی ساحل نشیبی ہیں جن کے بالمقابل جزیرۂ "سیرا" (Seira) ہے اور یہ تمام پہاڑی ہے۔ بعض بعض مقامات پر یہ پہاڑ نہایت عمودی ہیں ساحلی میدان بہت تنگ ہے جس میں "ناریل" کے بڑے بڑے باغات ہیں چنانچہ "یام دینا" (Yamdena) کا ناریل بہت ہی اعلیٰ سمجھا جاتا ہے جس کے درخت اسی جزیرہ کے مغربی ساحل پر دور تک اُس پاس سے

---

[1] ملاحظہ ہو اسکی کتاب (A.Naturalist's wandering in the Eastern Archipelago) صفحہ ۲۰۹۔

جزیروں میں پھیل گئے ہیں جن میں خاص خاص جزیرے سیلو (Selu) لائبوبا (Laibobar) سیرا (Seira) دوتار (Wotar) اور وُولیارو (Wuliaru) ہیں۔ جزیرہ لائبوبار میں آتش فشاں نسبتاً زیادہ خطرناک ہیں چنانچہ ان میں سب سے اونچے پہاڑ کی بلندی ۱۵۰۰ فٹ ہے۔ اور مشرقی ساحل کے قریب جزیرہ لارات (Larat) واقع ہے جو کل ۹۰ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اور تمام کا تمام گھنے جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ اسی سے کچھ فاصلہ پر جزیرہ فاردیت Fordate ہے جس کو آبنائے ایگرون (Egeron) لارات سے الگ کرتی ہے۔ جزیرہ سیلارو (Selaru) میں گھاس کے بڑے بڑے میدان ہیں۔

بقول ویلیس[1] ان جزائر میں زمین نہایت دلدلی ہے اور آب و ہوا بھی زیادہ اچھی نہیں ہے بارش عام طور سے جنوبی مشرقی ہوائیں برساتی ہیں۔ جن کے زمانہ میں بخار بڑی شدت سے پھیلا کرتا ہے۔ پانی حاصل ہو جانے کے بعد یہ زمین بڑی زرخیز ہو جاتی ہے پھر ان میں مکئی، چاول، کھوپرا، ساگو دانہ، اور گرم مصالحہ خوب پیدا ہوتا ہے پھلوں میں عموماً آم اور پپیتے بڑی کثرت سے اُگتے ہیں۔ مکئی ان جزائر کے باشندوں کی عام غذا ہے۔ البتہ دریا نہیں بہتے اور اسی لئے تازہ پانی کی بڑی قلت ہے حیوانی زندگی کے لحاظ سے جنگلات کے گھسان علاقوں میں جنگلی بیل کثرت سے پایا جاتا ہے۔ پرندے بھی مختلف قسم کے پائے جاتے ہیں۔ سانپ اور بندروں کی بڑی کثرت ہے جو نہایت زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں۔

ان جزائر کی آبادی ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے لحاظ سے ۳۱,۸۴۷ تھی[1] جو اب تقریباً دوگنی ہے۔

[1] ملاحظہ ہو:- (Census Report - Nds. Dutch East Indies) مطبوعہ ایمسٹرڈم ۱۹۳۱ء

## جزائر بَنْدا (Banda)

ان جزائر کے شمال میں اور جزیرۂ تیمور اور جزائر مالوکو کے درمیان ایک سمندر ہے جسے بحیرۂ بَنْدا کہتے ہیں۔ اسی سمندر میں دس چھوٹے چھوٹے جزائر کا ایک سلسلہ ہے جو بندا جزائر کے نام سے مشہور ہے اور کل ۲۰ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ ان میں بڑے جزیرے صرف تین ہیں۔ جنھیں بندا کلاں کہتے ہیں۔ اور تقریباً ۱/۲ ۷ میل لمبے ہیں ان میں خاص خاص جزیرے "لون تور" (Lontor) "بندا نیرا" (Banda Neira) اور "گونونگ آپی" (Gunong Api) ہیں۔ جزیرۂ لون تور، جنوب مشرق میں، بندا نیرہ شمال میں اور گونونگ آپی مغرب میں واقع ہے۔ یہ جزیرہ خطرناک قسم کے آتش فشاں پہاڑ کا مرکز ہے۔ جو اسی نام سے مشہور ہے اور تقریباً ۲۰۸۵ فٹ بلند ہے۔ اس پہاڑ سے ہر وقت لاوا نکلتا ہے۔ اور خطرناک قسم کے بھونچال آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۵۲ء میں ایسے خطرناک بھونچال آئے تھے کہ یہ جزیرہ قریب قریب برباد ہوگیا تھا۔ موجودہ آبادی اس کی دوبارہ بسی ہوئی آبادی ہے۔

اس نواح میں اقوام مغرب کی آمد کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان جزائر کو ۱۵۱۲ء میں پہلی بار ایک مشہور پرتگالی بحری ڈاکو "انٹونیو ڈی ایبرو" (Antonio de Abreu) نے دیکھا تھا پھر اسی کی مدد سے پرتگالی ان جزیروں میں پہنچے تھے۔ مگر سترہویں صدی میں جب ولندیزی اس نواح میں آنے لگے تو انھوں نے اہل پرتگال سے خطرناک قسم کی لڑائیاں لڑ لڑ کے انھیں یہاں سے مار بھگایا۔ پھر اٹھارہویں صدی عیسوی میں انگریز بھی اپنے ایک مشہور بحری ماہر "کپتان کلینگ" (Capt. Keeling) کے ذریعہ یہاں پہنچے اور باقاعدہ ولندیزیوں کے ساتھ مدت تک لڑتے رہے۔ مگر ۱۸۰۰ء

میں ایک خاص عہد نامہ کے ذریعہ انھوں نے یہ جزائر مستقل طور پر ولندیزیوں کے سپرد کر دیئے چنانچہ جنگِ آزادی سے قبل تک یہ ولندیزیوں ہی کے تحت میں چلے آرہے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جاپان نے بھی ان پر اپنا تسلط جمایا تھا۔ دورِ قدیم یہ جزائر مختلف انڈونیشی سلاطین کے علاقے تھے۔

**مَالُوکُو جزائر کا سلسلہ**

اب ان متذکرہ جزائر کے بعد شروع ہوتا ہے اور سنڈا کلاں کے مجمع الجزائر سلاویسی (سلیبس) اور نیوگنی (ایریان) کے درمیان واقع ہے ان کے باب میں ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ شروع میں ولندیزیوں نے اس سلسلہ کو 'ملوکانہ' کا نام دیا تھا مگر ۱۶۰۰ء میں جب انگریز اس نواح میں آئے تو وہ 'ملوکس' کہنے لگے چنانچہ اسی وقت سے انگریزی زبان کے نقشوں میں اسے 'ملوکس' لکھا جانے لگا۔ مگر انڈونیشی زبان میں انھیں 'مالوکو'[1] کہتے ہیں۔ اور ان کا سلسلہ بہت سے جزائر اور ان کے مختلف گروپوں پر مشتمل ہے۔ جن کے خاص خاص سلسلے یہ ہیں۔

(۱) مالوکو خاص یا ترناتے گروپ جس میں ہلماہیرہ سب سے بڑا جزیرہ ہے۔

(۲) وَائے گیو (Waigeu) اور راوبی گروپ۔

(۳) اَمبون گروپ جس میں سیرام اور بُورُو ہیں۔

(۴) جنوبی جزائر جن میں بابر اور لارت خاص ہیں۔

(۵) جزائر کی (Kei) اور آرُو (Aru) کا آخری سلسلہ ہے جو نیوگنی کے قریب تک چلا گیا ہے۔ اور آس پاس چھوٹے چھوٹے جزائر سینکڑوں ہی کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ سب جزیرے بقول ماہرین جغرافیہ پہاڑی ہیں اور متحرک قسم کے آتش فشاں پہاڑوں سے بنے ہیں۔ چونکہ خطِ استوا ان کے نزدیک سے گزرتا ہے اس لئے بہت گرم ہیں۔ بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ پیداوار بھی کھوپرا، گرم مصالحہ، ساگودانہ اور چاول

---

[1] مالوکو (Maluku) ہی انڈونیشی زبان کے نقشوں میں درج ہے۔

ہیں اس سلسلہ کے بڑے بڑے جزیروں کا حال اب مختصراً ملاحظہ ہو۔

**سیرام (Seram)** اس سلسلہ کا بہت بڑا جزیرہ ہے۔ اور ۳° ارض البلد جنوبی پر واقع ہے آبنائے بورو (Buru) سے دوسرے جزیروں سے الگ کرتی ہے۔ یہ جزیرہ ۲۱۶ میل لمبا ہے اور رقبہ کے لحاظ سے تقریباً ۶۶۲۱ مربع میل ہے۔ انتظامی حیثیت سے یہ جزیرہ پہلے چار حصوں میں تقسیم تھا یعنی مغربی سیرام، وسطی سیرام، اماہائی، اور رواہائی' ساخت کے اعتبار سے یہ جزیرہ تمام پہاڑی ہے۔ بقول ظورس[1] یہ پہاڑ سب چونے کے ہیں۔ اور اس جزیرہ کے مغربی اور وسطی حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں کا دوسرا سلسلہ مغرب تک چلا گیا ہے جن کی سب سے اونچی چوٹی 'پینائیا' (Pinaia) ہے اور تقریباً ۹۰۰۰ فٹ بلند ہے اور وسطی سیرام' میں واقع ہے۔ اور دوسری چار چوٹیوں کی بلندی ۶۰۰۰ فٹ ہے۔ بعض مقامات پر یہ پہاڑ ساحل کے ٹھیک داہنی طرف پھیلے ہوئے ہیں اور بعض مقامات پر کشادہ ہو کر نشیبی میدانوں سے آملے ہیں جہاں زمین دلدل ہے۔ دریا عام طور پر کافی ہیں اور شمالی حصہ میں بہتے ہیں۔ برسات کے زمانہ میں ان دریاؤں میں پانی اسقدر آجاتا ہے کہ ان میں کشتیاں بھی خوب چلائی جاتی ہیں۔

سیرام کے ساتھ مونگے کے جزائر کا ایک اور سلسلہ بھی وابستہ ہے۔ جن میں خاص خاص جزیرے 'مانا وُوکا' (Manawoka) گورام' (Goram) اور 'والوا' (Walva) ہیں اور یہ سب اسی جزیرہ (یعنی سیرام) سے وابستہ ہیں۔

آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔ بارش بہت زیادہ ہوتی ہے، اور زلزلے بھی کثرت سے آتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں اس جزیرہ کی آبادی ۹۵,۶۳۶ تھی، جو اب

---

[1] ملاحظہ ہو اسکی کتاب ( A. Naturalist's Wandering in the Eastern Archipelago. ) صفحہ ۲۱

بقدر دو لاکھ کے ہے لوگ عام طور پر ساحلوں پر آباد ہیں جن میں جاوا اور ترناتے کے لوگ زیادہ ہیں۔ عیسائی عام طور پر مغربی حصّہ میں رہتے ہیں۔ اور جنوبی مشرقی حصّہ کی آبادی اہلِ اسلام ہے۔ زراعت اور ماہیگیری یہاں کے لوگوں کا خاص پیشہ ہے۔

چاول، گنا، مکئی، تمباکو، کھوپرا، گرم مصالحہ، خاص پیداوار ہیں جنگلوں سے ڈامر بھی خوب حاصل ہوتا ہے۔ اور ربڑ بھی خوب پیدا ہوتا ہے۔

جانوروں[1] میں ہرن، سؤر اور دیگر جانور ہیں۔ دریاؤں سے مچھلیاں خوب حاصل ہوتی ہیں۔ "بولا" (Bula) کے مقام پر مٹی کا تیل بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں اس چشمہ سے ۹۴۶، ۱۷۱ گیلن تیل نکالا گیا تھا۔

اندرونی[2] جزیرہ میں لوگ "دیاپن" نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور نیم وحشی ہیں کپڑے بھی مختصر پہنتے ہیں اور گھر بھی عموماً لکڑی کے لٹھوں پر بناتے ہیں ان کی بولی بھی خاص ہے یہ سیرامی کہلاتے ہیں شمالی ساحل پر "واہائی" (Wahai) اور جنوبی ساحل پر "توبو" (Tobo) خاص بندرگاہ ہیں۔ اس کے قریب جزیرۂ امبون ہے۔

**جزیرۂ امبوئنا یا امبون**

یہ جزیرہ ۵۵۵۴، ۱۱ مربع میل رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ انتظامی حیثیت سے ولندیزیوں کے عہد میں اس میں "ساپارُوا" (Saparua)، بُورُو (Buru) سیرام (Seram) اور بندا جزائر شامل تھے۔

جائے وقوع کے لحاظ سے یہ جزیرہ (سیرام) کے جنوب مغرب میں واقع ہے سطح کے لحاظ سے اور دوسرے جزیروں کی طرح پہاڑی ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی "سلہاتو" (Salhatu) ہے جو ۴۰۹۲ فٹ بلند ہے۔ بہنے والے دریا بھی

ا، ۲ ڈاؤس ڈیکر کی کتاب (Tanah Air Kita) کا نسخہ اندونیشی مطبوعہ ہانڈونگ ۱۹۵۰ء ملاحظہ ہوں صفحات آخری

بہت چھوٹے ہیں، اور عام طور پر گرم چشمے (گیزر) بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آب و ہوا نہایت صحت بخش ہے۔ گرمیوں کا موسم شدید نہیں ہوتا۔ بارش مانسون ہواؤں سے ہوتی ہے جس کا سالانہ اوسط ۳۵ انچ ہے۔

پیداوار "سیرام" سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ مچھلیاں نہایت ہی قیمتی قسم کی پائی جاتی ہیں "ونییس" کے بیان کے مطابق یہاں پر سات سو قسم کی ہوتی ہیں۔ بھیڑ اور بکریاں بھی بہت کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ جنگلوں میں سانپ اور اژدھے بھی پائے جاتے ہیں۔

آبادی ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے لحاظ سے ۲۹۷،۴۱۱ تھی۔ "امبوئنا" صدر مقام ہے جو پرتگالیوں نے ۱۵۲۱ء میں آباد کیا تھا اور یہ نام بھی انھیں نے رکھا تھا۔ یہ پرتگالی زبان کا پرانا لفظ ہے۔ مگر اندونیشی زبان میں اب اسے امبون لکھتے ہیں۔

**بورو** (Buru) سلسلۂ مولوکس میں امبون جزائر کے گروپ کا خاص جزیرہ ہے جو درجات ۳،۴۰ اور ۵۰۰ کے درمیان واقع ہے۔ یہ جزیرہ بالکل بیضوی شکل رکھتا ہے۔ اس کی لمبائی ۹۰ میل ہے اور چوڑائی ۵۰ میل ہے۔ اور کل رقبہ ۳،۴۰۰ مربع میل ہے۔

اس جزیرہ میں اونچے اونچے پہاڑ[1] پائے جاتے ہیں۔ جو عموماً شمال مغرب کی جانب پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں کوہ "تومابو" (Tomabu) سب سے اونچی آتش فشانی چوٹی ہے۔ جس کی بلندی ۷،۹۶۷ فٹ ہے۔ جزیرہ کے بالکل وسط میں ایک خوبصورت جھیل ہے جو "وئکولو" (Waikolo) کہلاتی ہے۔ جس کے آس پاس گھنے جنگلات ہیں۔ جن میں ٹیک اور دوسری قسم کی قیمتی لکڑیاں کثرت سے اُگتی ہیں۔

---

[1] بحوالہ (Tanah Air Kita) (بزبان اندونیشی) صفحات آخر۔

آب و ہوا اور پیداوار امبون ، جزیرہ سے مشابہ ہے۔
سنہ ۱۹۳۰ء[1] کی مردم شماری کے لحاظ سے آبادی بھی ...., ۲۰۰ تھی ۔ جن میں مسلمان، عیسائی اور مظاہر پرست سب شامل تھے ۔ عیسائی عموماً جنوب کی طرف آباد ہیں ۔ مغرب، شمال اور مشرقی حصّوں میں مسلمانوں کی بستیاں ہیں ۔ وسطی حصّوں میں مظاہر پرست لوگ ہیں ۔

**ہلماہیرا (Halmahera)** اس جزیرہ کو 'جیلولو' (Djailolo) بھی کہتے ہیں۔ مالوکو ، گروپ کا یہ ایک خاص جزیرہ ہے ۔ اس کا رقبہ تقریباً ۶۵۰۰ مربع میل ہے اور لمبائی ۲۲۵ میل ہے ۔ یہ جزیرہ چاروں طرف سے چار جزیرہ نماؤں سے گھرا ہوا ہے جن کے درمیان میں گہری گہری کھاڑیاں ہیں۔ باقی تمام جزیرہ پہاڑی ہے ۔ اس کی آب و ہوا ، پیداوار اور جانور سب 'سُلاویسی' ، سے مشابہ ہیں ۔

**ترناتے** ہلماہیرا کے مغربی ساحل کے پاس شمال میں ایک سلسلہ کی صورت میں پھیلا ہوا ہے جو جنوب میں 'باچان' (Batjan) کے سلسلہ جزائر تک چلا گیا ہے ۔ یہ جزیرہ بھی تمام پہاڑی ہے اور آتش فشاں قسم کے پہاڑوں سے مل کر بنا ہے ۔ ان کی اونچی اونچی چوٹیاں عرفات، مدینہ اور کیکان کے نام سے مشہور ہیں ۔ ماہرینِ جغرافیہ کا خیال ہے کہ 'ترناتے' کے آتش فشانوں میں چار سو سال میں ۷۰ کے قریب زلزلے آئے ہیں مگر سنہ ۱۷۶۳ء کا زلزلہ سب سے خطرناک تھا ۔ جس سے آبادی کو اسقدر نقصان پہنچا تھا کہ قریب قریب سیکڑوں دیہاتیں برباد ہوگئیں خاص طور سے 'تاکومی' (Takomi) کی بستی جو ساحل کے پاس آباد تھی بالکل ختم ہوگئی ۔

---

[1] بحوالہ " سینسز رپورٹ نیدرلینڈز ڈچ ایسٹ انڈیز" مطبوعہ ایمسٹرڈم سنہ ۱۹۳۱ء۔

گرم لاوا اسقدر بہتا ہوا آیا تھا کہ اب اسی کا بنا ہوا پہاڑ یہاں کھڑا ہے اور باتو انگوس
(Batu Angus) کہلاتا ہے اسی طرح سنہ ۱۸۴۰ء میں بھی ایک شدید ترین زلزلہ آیا
تھا جس کے سبب اس جزیرہ کی آبادی پھر ختم ہوگئی تھی ۔ ساحل کے قریب[۱] جہاں
زمین نشیبی ہے وہاں زرخیز میدان ہیں جن میں چاول، مکئی، ساگو دانہ، اور گرم مصالحہ
خوب پیدا ہوتے ہیں ۔ آم اور دریان کی بھی بڑی افراط ہے ۔

پرتگالیوں[۲] کے عہد میں یہ جزیرہ گرم مصالحہ کی تجارت کا خاص مرکز تھا ۔
اب بھی چنانچہ یہاں پر گرم مصالحہ کی خاص پیداوار اور تجارت ہے ۔ یورپین لوگ
کثرت سے آباد ہیں ۔ اور اسی جنس کی تجارت کرتے ہیں ۔

ترناتے انتظامی حیثیت سے ہلماہیرا اور دیگر آس پاس کے جزائر کے مجموعہ
کا بھی نام ہے سنہ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے اس کی آبادی ۱۷۸۴۸۷
تھی ۔ اب تقریباً دوگنی ہے ۔

ترناتے، اس کا خاص شہر ہے ۔ جو جزیرہ کے جنوب میں واقع ہے بقول
احبابِ اہلِ اندونیشیا یہ آبادی کے اعتبار سے نہایت ہی خوبصورت خطّہ ہے ۔ جو
پہاڑوں کی وادی میں دور تک چلا گیا ہے ۔ اس کی عمارتیں تمام یورپین وضع کی ہیں ۔

**تِدُورے (Tidore)** ترناتے کے جنوب میں واقع ہے اور دائرہ نما ہے ۔ یہ جزیرہ تیس
میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے ۔ اس کے جنوب میں ایک متحرک
قسم کا آتش فشاں پہاڑ ہے جس کی بلندی ۵۹۰۰ فٹ ہے اس کے دامن میں
زرخیز میدان ہیں جن میں قہوہ، پھل، گرم مصالحہ اور تمباکو کی کاشت ہوتی ہے ۔
لوگوں کا خاص پیشہ باغات لگانا، اور مچھلیاں پکڑنا ہے ۔ زرگری اور آہن گری

---

[۱] و [۲] ( EMASTA DUNIA ) (اٹلس بزبانِ اندونیشی) کلاں سائز مطبوعہ جکارتا سنہ ۱۹۵۱ء ۔

بھی اس جزیرہ کے باشندوں کا خاص پیشہ ہے۔ باشندے سب مسلمان ہیں۔

کسی زمانہ میں یہ جزیرہ ایک سلطان کی قلمرو تھا۔ ۱۵۲۱ء میں پرتگالیوں نے آنکر یہاں اپنی آبادی قایم کی تھی، اور وہ سلطان کے ساتھ ایک خوفناک قسم کی لڑائی بھی لڑے تھے۔ پھر ۱۶۵۴ء میں ولندیزیوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں جاپان نے بھی اپنی فوجی چھاؤنی بنائی۔

بہرحال یہ جزیرہ ترناتے کے ساتھ مل کر تدورے ترناتے، کا ایک سلسلہ بناتا ہے جس میں دوسرے اور بھی بہت سے جزیرے شامل ہیں خاص طور پر

دوئی (Doi) ہیری (Hiri) مایو (Maju) تیفورے (Taifore)

مائی تارا (Maitara) پلونگا (Pilonga) ماری (Mari) کیسی رُوتا (Kasirota) پاسوراجا (Pasuraja) موتی (Moti) ماکیان (Makian)

مان ڈیوی (Mandioli) وائیدوہا (Waidoha) تانیتی (Taneti)

کاجووا (Kajua) اور گورائیچا (Goraitja) ہیں جن کے پاس پاس اور بھی چھوٹے چھوٹے سینکڑوں ٹاپو ہیں۔

غرض یہ تمام سلسلے، مالوکو، جزائر کے مختلف سلسلے ہیں۔ اب ذیل میں اس ملک کے مشہور جزیرہ "ایریان" (یعنی نیوگنی) کا حال بھی ملاحظہ ہو۔

### ایریان (نیوگنی)
(Irian)

یہ انڈونیشیا کے بڑے بڑے جزائر میں سے ایک بڑا جزیرہ ہے۔ جو مشرق میں واقع ہے اس کے بالکل نیچے آسٹریلیا کا برّاعظم ہے۔ یہ جزیرہ ۱۲۹° اور ۱۵۱° طول البلد کے درمیان واقع ہے۔ درجات عرض البلد ۳ اور ۹ جنوبی اس سے ہوکر گزرتے ہیں۔

یہ دنیا کے بڑے جزائر میں شمار ہوتا ہے۔ اور عہدِ قدیم ہی سے مملکتِ اندونیشیا کا خاص جزو چلا آتا ہے ایریان (Irian) اس کا قدیم اور اندونیشی نام ہے جو اس جزیرہ کی مقامی زبان بُیاک نمفور، (Biak Numfor) سے نکلا ہے۔ جس کے معنی گرم خطہ کے ہیں بقول بعض مؤرخین اس جزیرہ کے تمام ساحلی علاقوں میں یہی نام رائج ہے۔

جہاں تک اس جزیرہ کی تاریخِ جغرافیائی کا تعلق ہے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس کے بعض حالات اٹھارہویں صدی کے ایک انگریز مورخ مسٹر اُے۔ ڈال۔ رمپل" (A. Dalrymple) کی تصنیف "ہسٹاریکل کلکشن" سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے پہلے اس جزیرہ کے حالات اسقدر عمومیت کے ساتھ اہلِ یوروپ کے علم میں نہ تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے پرتگالی مصنفین نے قلم اٹھایا کیونکہ اہلِ یورپ میں بھی یہی سب سے پہلے لوگ تھے جنہوں نے دولت کی تلاش میں اس طرف کا رخ کیا تھا۔ انگریز مؤرخین نے انکی تحریرات سے استفادہ کیا اور ان کی کتابوں کے ترجمے شائع کئے اور اس طرح انگریزی زبان سے واقفیت رکھنے والی دنیا بھی اس جزیرہ کے حالات سے واقف ہوتی چلی گئی۔ پھر رفتہ رفتہ اہلِ یوروپ کا اس نواح میں ایک تانتا سا بندھ گیا۔

بہرحال یہ ذیل کی معلومات بھی اسی انگریز مُصَنِّف کی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ اس کے بیان سے واضح ہے کہ یوروپ سے آنے والے سیاحوں میں سب سے پہلا سیاح ایک پرتگالی تھا جس کا نام اس تاریخ میں "ڈیِ جارج ڈی مِنیزیز" (De Jorge de Menses) لکھا ہے۔ اس سیاح نے ۱۵۲۶ء میں اس جزیرہ

---

لہ (Historical Collections) مصنفہ (A. Dalrymple) مطبوعہ لندن ۱۷۷۰ء۔

کے شمال میں ایک مشہور مقام "ازلاڈی ورسیجا" (Isla-de-Versiga) میں پناہ لی تھی اور پھر اس کے دو سال بعد ہی ایک دوسرے پرتگالی بحری قزاق "الویرو ڈی ساوردا" (Alvero-de-Saaverda) نے "ازلاڈی اورو" (Isle-de-Oro) کا جزیرہ دریافت کیا تھا جو غالباً جنوبی جزائر میں سے ایک جزیرہ تھا۔ اس دریافت کے بعد وہ شمالی ساحل کی طرف بڑھا اور جیسے ہی کہ وہ وہاں پہنچا اس کے ساتھیوں میں سے ایک شخص "یوریگو اورٹیز ڈی رٹیز" (Yourigo Ortiz de Retez) نے یہاں کے باشندوں کو دیکھکر افریقہ کے مغربی ساحل "گنی کوسٹ" کے باشندوں سے ملتا جلتا پایا تو اک دم چیخ کر بولا "کہ او ہو یہ ملک تو "نو واگنی" (Nova Guinea) ہے۔ چنانچہ جب ہی سے اس جزیرہ کا یہ نام پڑگیا مگر چونکہ یہ نام پرتگالی ترکیب پر مشتمل تھا۔ لہذا جب انگریز مورخین نے اس کو اپنی زبان میں لکھا اور ان کے کچھ آدمی اس جزیرہ پر پہنچے تو کچھ لسانی تصرف کے ساتھ وہ اسے "نیوگنی" (New Guinea) کہنے لگے جو پھر رفتہ رفتہ اسی طرح رائج ہوگیا اور جغرافیائی نقشوں پر بھی آگیا۔ مگر اب اہل انڈونیشیا اسے اُسی قدیم نام سے پکارتے ہیں اور وہ اسے "ایریان" (Irian) کہتے ہیں۔ یہ اس جزیرہ کا بہت پرانا نام ہے، اور مقامی زبان سے مشتق ہے۔ قدیم میں جب یہ جزیرہ مجاپائت اور سیدوے کی انڈونیشی حکمرانوں کے ماتحت تھا تب بھی اسکا یہی (ایریان) نام تھا۔

اس جزیرہ کے نصف حصہ پر جو "پاپوا" (Papua) کہلاتا ہے آسٹریلیا کا تسلط ہے یہ جزیرہ کا تمام جنوبی مشرقی حصہ ہے اور شمالی مغربی حصہ پر ولندیزی قابض ہیں۔ جس کا جھگڑا انڈونیشیا کے ساتھ تاہنوز چل رہا ہے یہ انتزاعی حصہ رقبہ کے لحاظ سے ۲۵۰۰ مربع میل ہے اور تقریباً فرانس کے برابر ہے ورنہ پورا جزیرہ ۰۰۰ ۳۱۱ ...

مربع میل رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ایک بہت بڑے ملک کے مانند ہے۔ اس کے شمال سے خط استوا ہو کر گذرتا ہے۔ اور درمیان میں ایک مشہور دریائے فلائی ہے۔ باقی تمام حصہ پہاڑی ہے اور جنوبی مغربی ساحل ہموار اور زرخیز میدان ہے۔ جزیرہ کا سب سے بڑا دریا "میمبارا" (Membara) ہے جس میں مچھلیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کچھوے اور مگرمچھ بھی بکثرت ہیں۔ جن کی کھالیں یہاں سے برآمد کی جاتی ہیں۔ اس کے قریب سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزیرے دور تک سمندروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور مختلف

آب و ہوا اور پیداوار اور باشندوں کے حالات میں مسٹر ایل۔ بی۔ گبس (L. B. Gibbs) ایک انگریز مصنف[1] نے لکھا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا نے باشندوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور یہ بہت ہی گرم اور مرطوب ہے۔ پیداوار بھی بلاکسی زحمت کے آسانی سے ہو جاتی ہے۔ ساحلی کناروں پر جہاں لوگوں میں عمدہ قسم کی تہذیب کے اثرات آ گئے ہیں وہاں چاول، تمباکو، گنا، اور ساگو دانہ وغیرہ بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ ورنہ لوگ عموماً نیم وحشی ہیں اور بعض بعض حالات میں بالکل خانہ بدوش ہیں۔ "کینگرو" (جو ایک خاص قسم کا جانور ہوتا ہے) کی شکار کرتے ہیں، یا پھر مچھلیاں پکڑتے ہیں دریاؤں کے قریب بسنے والے کچھوؤں اور مگرمچھوں کا بھی کثرت سے شکار کرتے ہیں۔ ان میں تیر و کمان کا بھی رواج پایا جاتا ہے، اندرون ملک میں اکثر ایسے مقامات بھی ہیں جہاں مرد اور عورت بالکل برہنہ رہتے ہیں۔ اور بڑے جنگجو ہوتے ہیں۔ نشانہ لگانے میں بھی کمال رکھتے ہیں ان کا

---

[1] (Dutch New Guinea) مصنفہ (L. B. Gibbs) مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء۔

رہن سہن، اور چلنا پھرنا بھی سب وحشیانہ ہے۔

قدرتی وسائل اور معدنیات کے متعلق[۱] "اے۔آر۔اسٹارنے" (A. R. Starney) نے چند خاص خاص چیزوں کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً اس نے لکھا ہے کہ یہاں مٹی کا تیل، چونا، تانبا اور سونا وغیرہ پایا جاتا ہے۔ مگر چونکہ ولندیزیوں نے باشندوں کو آجتک جنگلی رکھ چھوڑا ہے۔ اس لئے وہ غریب ان قدرتی نعمتوں کے استفادہ سے بالکل محروم ہیں۔ اور تمام انواع معدنیات سے ولندیزی استعماری مستفید ہیں۔

یہاں کی حیوانی زندگی کے متعلق محققین کا خیال ہے کہ بڑی عجیب ہے۔ پہاڑوں میں ایک خاص قسم کا شیر پایا جاتا ہے جو رنگت میں سیاہ ہوتا ہے اور برما کے "پوما" سے بہت مشابہ ہے۔ جنگلی بلیاں بھی بڑی خطرناک قسم کی پائی جاتی ہیں۔ پھر بندروں کی سینکڑوں قسمیں ہیں۔ ایک سیاہ قسم کا بندر بھی بڑا عجیب جانور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے دُم نہیں ہوتی۔ یہ شکل میں ریچھ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر "کینگرو" بھی بہت پایا جاتا ہے۔ جس کا شکار کرنا یہاں کے باشندوں کا لطیف مشغلہ ہے یہ جانور آسٹریلیا میں بھی ہوتا ہے۔ شکل و شباہت میں خرگوش سے ملتا جلتا ہے مگر اس کے آگے کی دونوں ٹانگیں چھوٹی اور پچھلی بڑی ہوتی ہیں، پچھلی ٹانگوں کے درمیان ایک قسم کی تھیلی ہوتی ہے جس میں بھاگتے وقت یہ اپنے بچہ کو چھپا لیتا ہے، قد و قامت میں لومڑی کے برابر ہوتا ہے، اس کی جست بھی بڑی تیز ہوتی ہے۔ گھاس پات اور چارہ پر زندگی گذارتا ہے۔ اور اپنے بچوں کو

---

[۱] (Geology of New Guinea) مصنفہ اے۔آر۔اسٹارنے مطبوعہ لندن ۱۹۲۳ء۔

دودھ پلاتا ہے۔ اس کے سینہ پر تین تھن ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پرندے بھی بقول اجباب اندونیشی بھانت بھانت رنگ اور شکل کے پائے جاتے ہیں۔ لوگ دوسرے ممالک میں انھیں لیجاتے ہیں اور چڑیا خانوں میں رکھتے ہیں۔

باشندوں کی اصل ونسل کا حال باشندوں کے باب میں آگے بیان کیا جائے گا اور اس جزیرہ کے موجودہ سیاسی کوائف دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے۔ لہذا جغرافیہ کا باب اب اسی جزیرہ پر ختم کیا جاتا ہے اور اگلی فصل میں پورے ملک کے باشندوں کی اصل ونسل پر روشنی ڈالی جائے گی اور عہد قبل تاریخ کے تہذیب وتمدن کو واضح کیا جائے گا۔

# فصل دویم

# عہدِ قبل از تاریخ

اس فصل میں "قبل از تاریخ" کے عہد کی پوری انسانی سرگذشت بیان کی گئی ہے اور اماکنِ انسانی، کی حیثیت سے اندونیشیا کا تقدم تاریخی نقطۂ نظر سے واضح کیا گیا ہے۔ پھر انسان کا سب سے پہلا قدم کب اور کس طرح اس ملک میں پہنچا، قدیم نسلوں کا کس طرح آغاز ہوا، اور دیگر نسلوں نے دنیا کے مختلف مقامات سے اس نواح میں کب اور کس طرح ہجرت کی ان کے تاریخی شواہد اور آثار کیا ہیں؟ اُن کا باہمی امتزاج کس طرح ہوا؟ اور پھر اس امتزاج سے 'اہلِ اندونیشیا' کس طرح اور کب وجود میں آئے؟ انھوں نے کس طرح رہنا سہنا شروع کیا؟ پھر ان کے اس رہن سہن کے طریقے کیا تھے؟ ان کے اطوار و عادات، ان کا تمدن، ان کا کلچر، ان کا اخلاق، ان کا کردار، اور نظم و نسق کیا تھا، اور ان کے مذہب کی عام حالت کیا تھی؟ یہ سب کچھ تاریخی شواہد اور صنادیدی آثار کے حوالوں سے اس فصل میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بیان کی اسی رعایت سے پوری فصل کو دو ابواب پر منقسم کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے باب میں اس ملک میں انسان کا پہلا قدم اور مختلف انسانی نسلوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے باب میں تہذیب انسانی کے مختلف دور کی تاریخ لکھی گئی ہے اور اس تاریخ کو

زمانۂ تاریخ کے آغاز سے پہلے کے اس دور تک بیان کیا گیا ہے جب عقائد کی حیثیت سے مظاہر پرستی کا رواج تھا۔ صنعت و حرفت، لین دین اور کاروبار سب قدیم اور ابتدائی صورتوں میں تھا۔ لوگ غالباً لکھنا اور پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ اخلاق و کردار کے اعتبار سے بھی بڑے سادہ تھے۔ یہاں تک کہ ہندو ہندوستان سے نکل کر اس ملک میں آ پہنچے اور عہد قبل از تاریخ، ختم ہو کر ایک نیا دور شروع ہو گیا جسے ہندوؤں کا زمانہ کہتے ہیں۔ جس پر بالاستیعاب ایک فصل آگے چل کر لکھی گئی ہے۔

بہر حال اب اس ترتیب سے پہلے باب کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس کے ختم پر دوسرے باب کو شروع کیا جائے گا۔

# باب اوّل

## اس ملک میں انسان کا پہلا قدم اور اس کی نسلی سرگذشت

### انسانی آبادی کے لحاظ سے اندونیشیا کا تقدم

اندونیشیا جیسا کہ جغرافیائی ابواب میں واضح کیا جا چکا ہے انسانی آبادی کے بہت ہی قدیم اماکن میں شمار کیا جاتا ہے اور "تحقیقاتِ انسانیات" کے ماہرین سائنس" کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ دنیا کے بہت ہی قدیم گوشہ ہائے ارضی میں محسوب ہوتا ہے۔ اس کے بھی باشندے اپنی قدامت میں سب سے پرانے ہیں۔ اُن کا تمدن، ان کی تہذیب اُن کی بولیاں، اُن کی رنگ رلیاں، ان کی رہایش گاہیں، ان کی پناہ گاہیں، اُن کے آلات اُن کے حربات، ان کی زراعتی زمینیں، ان کے معدنی دفینے، ان کی زندگی کے قرینے، ان کے سفر کے سفینے، ارتقار تہذیب کی ہزاروں داستانیں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور آج بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسل انسانی کی وہ قدیم یادگار ہے جس نے کبھی پہاڑوں میں یا پہاڑوں کی گپھاؤں میں، کنارِ دریاؤں میں یا دریاؤں کی غاروں میں اندونیشی تہذیب کے

چراغ کی لو کو بلند کیا تھا۔ جس کے مٹے ہوئے آثار آج بھی جگہ جگہ بدیار و امصار چھپے ہوئے ملتے ہیں۔

## قدیم انسانی آثار کی تحقیقاتی کوششیں

جن کی تحقیقاتی کوششیں انڈونیشیا کی موجودہ تاریخ میں تقریباً انیسویں صدی کے اواخر سے شروع کی گئی تھیں۔ اور اس سلسلہ کا سب سے پہلا محقق ایک ولندیزی "ماہر انسانیات" پروفیسر "یوجین ڈُو بائے" (Prof. Eugene Dubois) تھا جس کو خصوصیت کے ساتھ ولندیزی یونیورسٹی۔ ایمسٹرڈم نے ان علمی کوششوں اور تاریخی کاوشوں پر ۱۸۸۹ء میں متعین کیا تھا۔ پروفیسر مذکور "اثریات" (Archaeology) کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اور دنیا کے مختلف ممالک کی اثریات کے علمی مطالعۂ کا بہرۂ وافر رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے "انڈونیشیا" میں پہنچنے کے بعد "جاوا" کے مشہور "ٹرنیل" (Trinil) کے علاقہ میں جا بجا کُھدائی کا کام شروع کیا۔ اور ایک سال کی "محنت شاقہ" کے بعد ۱۸۹۰ء میں ایک فاصل میمل[1]" (اکازی چٹان) کی سُراغ رسانی میں کامیابی حاصل کی۔ ابتدا میں ڈاکٹر موصوف کی رائے اس کے متعلق یہ تھی کہ یہ بھی جدید طبقات الارض کا کوئی حصہ ہے مگر بعد میں مزید تحقیقات کرنے پر اس کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور نتیجہ کے طور پر یہ اخذ کرنا پڑا کہ یہ "**عہد قدیم کا ایپ مین[2]**" ہے۔

---

[1] "یہ لفظ آثار قدیمہ کی ایک انگریزی اصطلاح ہے جس میں "فاصل" (Fossil) کے معنی جسم کے اس ڈھانچہ کے ہیں جو ہزاروں برس تہ خاک رہنے کے باعث جم کر پتھر کے مانند ہو جاتا ہے اور "میمل" (Mammel) دودھ پلانے والے جانور کو کہتے ہیں۔ اردو کی اصطلاح میں اسے اکازی چٹان بھی کہتے ہیں۔

[2] "ایپ مین" (Ape-man) بھی اسی طرح "علم انسانیات" کی ایک اصطلاح ہے جو حیات انسانی کے ارتقا پر ایمان رکھنے والے یورپ کے ان سائنسدانوں نے وضع کی ہے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان

مگر ایک انگریز محقق "ڈاکٹر آر۔ ونسٹیٹ، ڈی۔ لٹ" (Dr. R. Winstedt. D. Litt)
نے اپنی کتاب "دی ملایار" صفحہ ۵ (The Malays) مطبوعہ لندن ۱۹۵۰ء میں اسی موضوع

---

نے اپنی موجودہ شباہت ہزاروں سال کے ارتقائی عمل کے بعد حاصل کی ہے۔ اور اس موجودہ شباہت یا صورت کے اختیار کرنے سے قبل اس کو (انسان کو) مختلف حیوانی قالبوں سے بھی گذرتے رہنا پڑا ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کا سب سے پہلا خیال یہ ہے کہ انسان ابتدا میں ایک نہایت حقیر اور مختصر سے جسم کا ایک ایسا باریک کیڑا تھا جو بغیر آلات کی مدد کے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ترقی کرتا گیا اور ہر دور اور ہر زمانہ میں ایک نیا قالب اختیار کرتا گیا حتیٰ کہ کروڑوں سالوں کے بعد یہ ان شکلوں اور شباہتوں میں آیا جنھیں آج مینڈک، مچھلی اور رینگنے والے کیڑے یا دودھ پلانے والے جانوروں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی نے جب بہت زیادہ ترقی کی تو بندر سے مشابہت پیدا کرلی جس کے اوصاف واطوار بھی انسانی توصف سے خالی تھے۔ یہی انسانی ارتقا پر ایمان رکھنے والے ان گمراہ سائنسدانِ یورپ کے نظریات ارتقا کے فن میں "ایپ مین" کہلاتا ہے جسکے معنی لنگوری انسان کے ہیں۔ ڈاروِن اور اسکے معتقدین نظریاتِ ارتقا کے خیالات اسی قسم کے ہیں۔

<u>جن سے مجھے اور اسیطرح ہر حق پرست کو ہرگز اتفاق نہیں ہو سکتا یا ہر کہ ایک زمانہ سو ڈاروِن کے ان گمراہ کن فلسفیانہ نظریات کو باطل ثابت کیا جا چکا ہے، انسان اپنے ارتقا میں کبھی بندر نہ تھا بلکہ اپنی تخلیق میں احسن تقویم کے ہے، اولادِ آدم ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے (قادری)</u>

---

بہرحال انہی سائنسدانوں کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ "ایپ مین" تعداد اور شمار کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ قلیل تھا اور فطرتاً تنہائی پسند تھا۔ یا تو بالکل یکتا و یگانہ رہتا تھا یا پھر اپنی مادیان کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے بچے بھی ہوتے تھے اور یہ بھی جنسیاتی لذات سے متمتع ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی صورت اختیار کرلی اور پہاڑوں کی گھپاؤں میں زندگی گذارتا تھا۔ اسی لئے اس کے آثار بہت کمی کے ساتھ ملتے ہیں اور جو کچھ بھی ملتے ہیں وہ پہاڑی چٹانوں میں مدفون ملتے ہیں۔ جو ارضی دباؤ کے سبب پچک کر، سخت ہو کر انسانی خاکہ کی صورت میں دبے رہ گئے تھے۔ یہی نشانات (Fossil Mammels) "اکازی" "فاصل میمل" کہلاتے ہیں۔

پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ" جاوا کے اس قدیم الخلقت فرد کو غلطی سے انسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس کا کاسۂ سر جسامت میں بقدر ایک زندہ نر معمر گوریلہ کے سر کے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انسانی آبادی سے قبل کے عہد میں مختلف النوع بنادر بھی موجود ہوں۔ جن میں سے محض ایک ہی جسے ہم فی الحال" قدیم الخلق" انسان کہہ رہے ہیں باقی رہ گیا ہو اور بقیہ دیگر اس سے پہلے ہی مرکھپ کر عدیم الوجود ہو گئے ہوں۔ کیونکہ انہی تہاؤں میں علاقۂ ٹرنیل اور سولو کے نزدیک ایسی تہائیں بھی ملی ہیں جو اس دور کے ہاتھیوں، دریائی گھوڑوں، اور شمشیری دانت رکھنے والے شیروں کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح "نگنڈونگ"[1] (Ngandung) واقع جاوا میں جو سب سے بعد کی نکلی ہوئی تہائیں ہیں اسی قسم کے جانوروں پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر بہرکیف" ڈُوبائے" کے نظریہ کو صحیح مان کر" ایپ مین" کو انسان بھی تصور کر لیا جائے تو پھر" آسٹریلیا" کے شہر" میلبورنی"

---

[1] یہ تحقیق ۱۹۳۱ء کا نتیجہ ہے۔ اور مشہور ولندیزی ماہر معدنیات ڈاکٹر۔ سی۔ ٹر۔ بار" (Dr. C. Ter Harr) نے انجام دی تھی۔ "نگنڈونگ" دریائے سولو کے نزدیک واقع ہے یہاں جو فاصل یمل دریافت کیا گیا ہے اُسے عام طور پر" سولومین" (solo-Man) کے نام سے معنون کیا جاتا ہے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ جنوبی افریقہ کے" رہوڈیشی انسان" (Rhodesian-Man) سے بہت زیادہ مشابہ ہے چونکہ" رہوڈیشی انسان" کا تعلق" نینڈرتھال گروپ" (Neanderthal-Group) سے ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق بھی اسی کے ساتھ ہو مگر" سولومین" کے پتھر کے اوزار زیادہ ابتدائی ہیں مگر اس کے بعد جو" واجک مین" (Wadjak-Man) دریافت ہوا ہے۔ غالباً اس کا تعلق آسٹریلیا کی اس آبادی سے معلوم ہوتا ہے جو جاوا میں آن کر آباد ہوگئی تھی۔ کیونکہ یہ "سامپونگ غار" (Sampung Cave) سے برآمد ہوئے ہیں اور وضع قطع میں" عہد متاخر حجری" (Neolithic) سے متعلق ہوتے ہیں۔

کے نزدیک "کیلور" کے مقام سے نکلے ہوئے آثار انسانی کو ان کا بھی "ابوالآبا" ماننا پڑے گا کیونکہ وہ شکل میں ان سے بھی زیادہ ابتدائی حیثیت رکھتے ہیں"۔

انہی آثاری تحقیقات کی اور زیادہ چھان بین کرنے سے مزید طور پر پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۹ء میں ایک جرمن "ماہر انسانیات" نے بھی پروفیسر ڈوبائے کے نظریہ کی تصدیق کرنے کے لئے انڈونیشیا کا سفر کیا تھا۔ اور انہی (ٹرنیل کے) مقامات کی دوبارہ کھدائی کی تھی۔ اور پھر بعد میں نتیجہ کے طور پر واضح کیا تھا کہ "ڈوبائے" کا محققہ انسان اصل میں جانور نہ تھا بلکہ "عہد حجری" کا قدیم انسان تھا۔

۱۹۲۲ء میں مغربی جاوا کے "علاقہ چیری بون" (Cheribon) میں بہنے والے "دریائے گلاگا" (Glagah) کے طاس میں اور بھی "فاصل ہیل" کی کھدائی کی گئی یہ کھدائی ولندیزی حکومت کے محکمۂ معدنیات" کے مشہور" ماہر معدنیات" ڈاکٹر جے۔ ایچ۔ آر۔ فان کیونگس والد (Dr. G. H. R. Van Koenigswald) کی نگرانی میں کی گئی تھی۔ جس نے بعد میں "ابتدائی انسان (Early man) کے عنوان پر ۱۹۳۷ء میں ایک باقاعدہ رپورٹ مرتب کی تھی۔ جو فیلیڈلفیا (واقع امریکہ) کی "اکیڈیمی آف نیچرل سائنس" کے ایکسو پچیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی تھی اس رپورٹ میں قریب قریب اسی نظریہ کا اعادہ کیا گیا ہے جو پروفیسر "ڈوبائے سے منسوب ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی کا مشہور "ماہر اثریات" پروفیسر کالیداس ناگ (اپنی کتاب۔ انڈیا اینڈ دی پیسفک ورلڈ صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۱ء میں رقمطراز ہے کہ" جاوا کے اس فاصل ہیل کا رشتہ ہندوستان اور چین کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی قسم کے آثار ۱۹۳۰ء میں چین (پیکنگ) اور شمالی ہند (شوالک کی پہاڑیوں) میں بھی نکلے ہیں۔ اور ان کے ساتھ

اسی قسم کے تپھر کے اوزار بھی دستیاب ہوئے ہیں جو سب اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ان مقامات پر انسانی کلچر ایک ہی قسم کا پایا جاتا تھا اور نسل بھی قریب قریب ایک ہی قسم کی تھی۔ اور یہ سب مقامات بھی ارضی حیثیت سے ایک ہی تھے۔ مگر تقریباً ۵۰۰۰ ق۔ م میں کسی وقت سمندر کے بر آمد ہو جانے سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور آجتک جدا ہیں اور اس جدائی کے بعد سے اس وقت تک مختلف ناموں سے معنون ہیں۔"

## ابتدائی مرکزی وطن

اگر بالفرض "پروفیسر ناگ" کا یہ نظریہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان سب کا ابتدائی مرکزی وطن کیا تھا؟ یہ لوگ سب سے پہلے کس گوشۂ ارضی پر آباد تھے؟ اور اپنے اس وطن قدیم سے کس طرح اور کیونکر ادھر ادھر نکل کر منتشر ہوئے تھے؟ اگرچہ جواب تو بظاہر بہت دشوار ہے۔ مگر اسی کے حل سے باشندوں کی قدامت اور نسلی اتقدیم کا صحیح نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس ذیل میں کچھ اور سمجھنے سے قبل یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ موجودہ نسلوں کے ماہرین نے تقسیم انتسال کرتے وقت ان بحری علاقوں[1] کے گرد متوطن اقوام کے لئے ایک مجموعی عنوان تراشا ہے۔ جسے اصطلاحی طور پر "بحریائی" (Oceanian) کہا ہے۔ اور ان کی متعدد اقسام قرار دے کر ایک کو "پولینیشائی" (Polynesian) بھی لکھا ہے چنانچہ اسی ذیل میں ایک مشہور "ماہر النسانیات" "ڈاکٹر بک"[2] اپنی کتاب رانشیٹ ہوائین رسولز لیشن صفحہ ۳۰-۱۹) میں پولینیشائی لوگوں کی ہجرت پر سیر حاصل طریقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔ "یہ لوگ اصل میں کاکیشائی نسل کی ایک شاخ ہیں جو مشرق کی طرف

---

[1] جن میں وہ تمام بحری جزائر اور حصۂ زمین شامل ہے جو بحرِ ہند اور بحر الکاہل کے مابین واقع ہے
[2] اس نوع کی تحقیقات بحر الکاہل کے جزیرۂ ہنولولو کے مشہور ادارہ "بشاپ میوزیم" کا کارنامہ

ہمالیہ کے جنوب سے گذرتی ہوئی ان مشرقی مجمع الجزائر تک پہنچی جنھیں آج مجموعی حیثیت سے اندونیشیا کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد یہ لوگ مختلف لوگوں سے مخلوط ہوتے رہے اور امتزاج پاتے

## نسلوں کی نقل وحرکت

بہر حال نسلوں کی نقل وحرکت کو تاریخی نقطۂ نظر سے جانچنے کے لئے ایک اور ماہر "نسبیات" پروفیسر "کین" نے ان کو ان پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:۔

(۱) میلیشیائی۔ (۲) مائی کرونیشیائی۔ (۳) میلنیشیائی۔ (۴) آسٹریلیشیائی۔ اور (۵) پولینیشیائی۔

اور ہر ایک کے زیرِ عنوان چند مخصوص بحری علاقوں کی نسلوں کو اس طرح شامل کیا ہے مثلاً:

(۱) میلیشیائی (Malysian) (Micronesian): میڈاغاسکر، انڈمان، جزائرِ نکوبار، جزیرۂ نما ملایا، سماترا، جاوا مدورا، بورنیو، فلورس، سیلبس، تیمور، مالوکو، لمبوک سولو، فلیپائن، اور فارموسا کے باشندے قرار دیئے گئے ہیں۔

(۲) مائی کرونیشیائی پیلیو، لیڈرونس، کیرولائن، مارشل، گلبرٹ، اور فونیکس،

---

ہے جو مشرقِ بعید میں اس قسم کی تحقیقات کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور جس نے پولینیشیائی تہذیب کے علاوہ میلنیشیائی تہذیب پر بھی بالاستیعاب کاوشیں کی ہیں۔ اسی طرح (Hawaii) ہوائی کی امریکن یونیورسٹی نے ابھی ابھی تقریباً گیارہ سال قبل اپنے ایک مشہور پروفیسر ڈاکٹر بج۔ کولٹر کو ہوائی، سوموا، نیوزی لینڈ آسٹریلیا، فی جی اور جزائر اندونیشیا کی ارضی شناخت کے اصول پر تحقیقات کرنے کے لئے تعینات کیا تھا جس کا سلسلہ ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا ختم ہوا ہے۔ ان کی مصنفات منصۂ اشاعت پر آئینگی تو یقیناً انسانیات کی "تحقیقی سائنس" میں ایک گراں قدر اضافہ کرسکیں گی۔

(واقع جاپان) کے باشندے قرار دیئے گئے ہیں۔

۳) میلنیشیائی (Malanesians)
پاپو سیائی (نیوگنی کے لوگ) لوئی سائڈ، فی جی، سلومن و نیو ہیبری ڈس، نیوکیلی ڈونیا اور جزائر لاسلبٹی کے باشندے قرار دیئے گئے ہیں۔

(۴) آسٹریلیشیائی (Australisians)
وہ لوگ ہیں جو خود آسٹریلیا اور جزیرہ طسمانیہ میں آباد ہیں۔ اور

(۵) پولینیشیائی (Polynesians)
نیوزی لینڈ، ٹونگا، منگائیا، مارکوئس، ساموا، ہوائی اور ایسٹر کے باشندے پولینیشیائی قرار دیئے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ ایک نسل اور بتائی گئی ہے جسے بعض مورخین نے (Negritoes) کے عنوان سے معنون کیا ہے۔

## ان کی تاریخ نسلیات

بہرحال پروفیسر سلیگ مین" (Prof. Saligman) نے اپنی کتاب ریسیز آف (Races of Africa) افریقہ مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء میں) لکھا ہے کہ:۔

"رہوڈیشی انسان، کی سراغ رسانی نے قدیم الوضع انسان کے وجود کو ثابت کر دیا ہے اور نیز واضح کر دیا ہے کہ سانولی نسل (حبشیائی) چند ہزار سال قبل افریقہ سے میڈاغاسکر کے راستہ سے انڈمان، نیکوبار، اور ملایائی دنیا (جس میں خود اندونیشیا اور جزیرہ نما ملایا شامل ہے) میں ہجرت کر کے آئی تھی۔ ان کے صحیح مرزوبوم کا تعین تو اب بھی نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان

---

لہ اس نسل کے لوگ اصل میں ہندوستانی دراوڑی اور دوسری اسی قبیل کی گندم گوں سانولی نسلوں پر مشتمل ہے (جن میں مدراسی، دکنی اور بنگالی شامل ہیں) ورنہ خالص سیاہ فام (Negroes) کہلاتے ہیں۔ جو ایک بالکل جداگانہ نسل سے ہیں۔ اور وہ افریقہ اور امریکہ کی نواح میں ملتے ہیں۔ اُن کے بال گھونگروالے ہوتے ہیں۔ ہونٹ بڑے۔ آنکھیں گہری، اور پیشانی چھوٹی ہوتی ہے۔

سانولی نسلوں کو جغرافیائی حیثیت سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو بہت گہری سیاہ ہے اور جس میں ''افریقی شامل ہیں۔ اور دوسری وہ جو سانولی ہے جن میں ''بحریائی'' نسلیں شامل ہیں۔

مگر اسی تسلسل میں پروفیسر ''کینی'' (Kene) کا نظریہ یہ ہے کہ:۔

''ابتدائی نسلِ انسانی کا گہوارہ غالباً جاوا ہے اور یہی مرکزی رقبۂ انتشار ہے۔ جہاں سے ہجرت یا نقل و حرکت کی پہلی مہم شمال میں سرزمینِ ایشیا تک اور مغرب میں افریقہ تک اور مشرق اور جنوب میں ان تمام بحری علاقوں تک پھیلی ہے۔''

یعنی اس سے یہ مستفاد ہوا کہ ''جاوا'' ہی اصل میں نسلی اعتبار سے اس نواح میں شروع کے انسانوں کا مرکز تھا۔ اور اسی سے مشرقِ بعید میں انسانی نسل کے تمام سرچشمے پھوٹے ہیں، جن میں نیوگنی یا ایریان کی ''پاپین نسل'' بھی اسی طرح شمار ہے۔

مگر اس سلسلہ میں پروفیسر ''کالیداس ناگ''[۵۱] کا خیال یہ ہے کہ ''ملائی'' لوگوں (ملائی اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ تمام علاقہ ملائی زبان کا رقبۂ لسانی ہے) کی تاریخ نسلیات تاہنوز واضح نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان نسلوں کو جزائر کے قریب کی نسل سمجھ کر بعض دفعہ لوگوں نے ''بحریائی ملائی'' بھی کہا ہے اور انھیں جو برّاعظم کے خشکی کے علاقوں میں جاکر آباد ہوگئے تھے ''برّاعظمی ملائی'' کا نام دیا ہے۔ اور کبھی ''ابتدائی ملائی'' (Proto-Malays) کو ''بحری منگول'' بھی کہا ہے۔''

لیکن ''ڈاکٹر ہوٹن'' (Dr. Hutton) کا نظریہ[۵۲] یہ ہے کہ:۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو ''انڈیا اینڈ دی پیسفک ورلڈ''، صفحہ ۴۸ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۱ء (مصنفہ پروفیسر ناگ)۔

۵۲ ملاحظہ ہو ڈاکٹر ہوٹن کی کتاب (Man in India) جلد بارہ ۱۲ مطبوعہ لندن ۱۹۳۲ء۔

" ایشیائے بعید کی نسلیں مثلاً ابتدائی ملائی ۔ مخلوط نسلوں کا گروپ ہے ۔ جو حبشیائی، پاپن، اور شروع کے ڈراوڈیوں کے اختلاط سے تیار ہوا ہے"۔

ایک اور ماہر نسلیات لکھتا ہے کہ گہری گندمی رنگ کی ملائی نسل غالباً شمال سے آنے والی زرد فام نسل اور اس سیاہ فام نسل کے باہمی امتزاج سے وجود میں آئی ہے ۔ جو جنوبی ایشیائی علاقہ میں آباد تھی ۔

لیکن فرانس کے ماہرین نسلیات کا عقیدہ یہ ہے کہ میڈاغاسکر کا دور افتادہ جزیرہ نسلی اور لسانی دونوں اعتبار سے ملائی نسل سے وابستہ ہے ۔ لہٰذا ابتدائی ملائی اور خالص ملائی نسل کی تاریخ پر اگر ذرا تحقیق کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو آسانی واضح ہو سکتا ہے کہ قدیم زمانہ کے لوگ افریقہ سے میلیشیا آئے تھے یعنی بحر ہند کو عبور کر کے بحرالکاہل کے آخری مشرقی گوشوں (جنھیں نیوگنی کو بھی شامل سمجھا جائیگا) میں پہنچے تھے ۔

اسی طرح بعض اور ماہرین کا خیال یہ ہے کہ میلیشیا میں پھیلنے والی سانولی نسل بحر پائی سانولی نسل کی پیش رو ہے اور اسے موجودہ براعظم افریقہ کی حبشی نسل کی حریف کہا جا سکتا ہے ۔ ہندوستان کے بھیل، گونڈ، اوراؤں، منداری، جونگ، اور سوار قبائل بھی اسی قبیل کے ہیں ۔ اور ڈراوڈی کی بگڑی ہوئی زبان بولتے ہیں ۔ اور اسی طرح مشرقی سماترا کے "ریمانگ"، اور فلپائن کے "ایٹا" لوگ بھی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔

پروفیسر ناگ نے لکھا ہے کہ یہ حبشیائی (Negritoes) اصول کاشت کاری سے بھی ناواقف تھے ۔ جانوروں کے پالنے کا اصول بھی نہیں جانتے تھے ۔ البتہ انھیں تیر و کمان کا استعمال آتا تھا اور اسی کے ذریعہ وہ اپنی غذا اکھٹی کرتے تھے ۔

اس حبشیائی (Negritoes) نسل کے بعد ہمیں تاریخ " بحر پائی جلبشی "

(Oceanic Negritoes) کا عہد بتاتی ہے جس کا سلسلہ میلنیشیا میں "فی جی" اور "پاپوا" جزائر میں پھیلا ہوا ہے۔ میلنیشیائی کے بعد "اندونیشی" نسل کا عہد شروع ہوتا ہے۔ جو منگول اور کاکیشائی اختلاط سے وجود میں آئی تھی، لیکن ان کے پھیلاؤ کا رقبہ کمبوڈیا، یونین (فرانسیسی ہند چینی)، برما، ہندوستان (کھاسی کی پہاڑیاں اور چھوٹے ناگپور کا پلیٹو) ہے۔
اسی ذیل میں ان کی مشابہت کا بیان کرتے ہوئے پروفیسر ناگ نے لکھا ہے کہ:[۵۱]۔

ہندوستان کے ان علاقوں میں بھی اسی قسم کے آلات، ہتھیار، اوزار اور دیگر چیزیں برآمد ہوئی ہیں جو اندونیشیا وغیرہ میں نکلی ہیں۔ ہم ان لوگوں میں بھی اجنبیوں کا سر کاٹ کر لٹکانے اور ڈھول بنانے کی تفصیلات کا بالکل اسی طرح پتہ چلتا ہے جس طرح اندونیشیوں کے متعلق تحقیق سے چلایا گیا ہے چونکہ ہندوستان کی اس نسل کا مرکز جنوبی ہند میں مدراس کا علاقہ تھا لہٰذا ان کا بھی ابتدائی مرکز یہی علاقہ (جنوبی ہند ہو سکتا ہے اور چونکہ وہ لوگ قبل از دراوڑی تھے لہٰذا انھیں بھی قبل از دراوڑی خیال کیا جا سکتا ہے۔[۵۲]

اس کے علاوہ مشہور ماہر نسلیات "رابرٹ ہین گیلڈرن" نے ایک اور دوسری نسل "ویڈوئڈ" (Veddoid) کا بھی پتہ چلایا ہے جو اندونیشیوں میں خالص قسم کی نسل خیال کی جاتی ہے۔ اس نسل کے لوگ "وسطی ساکائی" ہیں۔ جنھیں جزائر سلیبس کے "ٹوردھا" لوگوں سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نسل کے نشانات بقول پروفیسر مذکور دریائے اراوڈی اور "جنوبی مغربی چین" میں بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح سماترا کے قدیم ملیشیائی بھی "ویڈوئڈ" ہی ہیں۔ یہ لوگ اصل میں اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ جبکہ لوگ نہ زراعت

---

۵۱ انڈیا اینڈ دی پیسفک ورلڈ مصنفہ پروفیسر ناگ صفحہ ۸۵۔
۵۲ (SUMAtRA: ItS HIStORY & PEOPLE) مصنفہ ڈاکٹر رابرٹ ہین گیلڈرن مطبوعہ وانا ۱۹۳۵ء۔

کرنا جانتے تھے اور نہ انھیں جانور پالنا آتا تھا۔ درختوں کی چھالیں پہنتے تھے، اور خودرو ترکاریاں کھاتے تھے۔

مگر ڈاکٹر ریچارڈ ونسٹیڈ لکھتا ہے[۱] کہ:۔

"آسٹرونیشیائی اور ملینیشیائی کے مورثین اعلیٰ کے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے چار پانچ قسم کی نسلوں کا اندازہ کیا جاتا ہے مگر انھیں انسانیات کی فنی حیثیت سے ان تین مخصوص گروپ میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) جشیائی (Negritoes) (۲) ساکائی یا سنوئی (Sakai or Senoie) بعض اسی کو اندونیشی نسل بھی کہتے ہیں۔ (۳) جے کنس یعنی ابتدائی ملائی (Proto-Malay) یا منگولیائی۔ اندونیشی (Mangolaid Indonesians) مگر سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اندونیشیوں میں جشیائی نسل کا زیادہ امتزاج پایا جاتا ہے۔ حالانکہ ان تینوں درجوں میں اسٹریلیشیائی (Austroloid) اور ملنیشیائی (Melanesoid) کے اثرات بھی شامل ہیں۔

اسی طرح بعض محققین کا کہنا ہے کہ ملائی نسلوں میں سب سے پرانی نسل جشیائی ہے جنھیں سیمانگ (Semang) بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا قد چھوٹا، بال گہرے کتھئی ہوتے ہیں۔ مگر گھونگروالے ہوتے ہیں۔ یہ نسل فلیپائن، اندوچین، ملایا اور نیوگنی میں پائی جاتی ہے یہ لوگ اب بھی جنگلی اور نیم وحشی ہیں۔

لیکن اندونیشیا کی تیسری نسل بقول ہین گیلڈرن "آسٹرونیشن" ہیں جو ۲۰۰۰ ق۔م میں چین سے ہجرت کرکے یہاں پہنچی تھی۔ اسی کا ایک حصہ ابتدائی ملیشیائی کہلاتا ہے۔ ہر قسم

---

[۱] ڈاکٹر ریچارڈ کی کتاب (The Malays) صفحہ ۶۔

کے نسلی اختلاط سے پاک تھی۔ اور جزیرہ سماترا کے اندرونی پہاڑی علاقہ میں رہتی تھی۔ اور آج سماترا کے باتاک، بورنیو کے دایاک سلیبس کے توردجا اور فلیپائن کے اگوروٹ اسی نسل میں شامل ہیں۔ اور مخلوط قسم کے "ملائی" وہ لوگ ہیں جنھیں موجودہ جاوائی کہا جاتا ہے۔ اور جو جاوا میں بھی خصوصیت کے ساتھ ساحلوں پر آباد ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ لوگ اپنے ساتھ منطقائی پودے خصوصاً گنا، کیلہ، بانس اور چاول اور بیراس (یعنی بیل) لے کر آئے تھے۔

مشہور ماہر لسانیات (کروم) (Krom) کی تحقیقات کے مطابق ان کی قدیم بولی میں کشتی اور کشتی بانی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندونیشی لوگ دریائی اور سمندری مسافت کے عمل عبور سے بھی واقف تھے۔ اور غالباً اسی لئے انھوں نے اس وقت کے بحر الکاہل کو عبور کیا تھا

بہر کیف بقول گیلڈرن اس زمانہ کی یہ تمام عجائب اثریات جاوا کے اثریاتی عجائب خانہ[۵] میں موجود ہیں۔ اور اس ملک کے قدیم تہذیب و تمدن کے متعلق گرانقدر معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔

---

[۵] "یہ عجائب خانہ، دی رایل بیٹیوین سوسائٹی آف آرٹس اینڈ سائنسیز کے ماتحت تھا جو ۲۴ اپریل ۱۷۷۸ء میں قائم کی گئی تھی۔ مغربی نمونوں پر قائم کی جانے والی اثریاتی سوسائٹیوں میں ایشیا بھر میں یہ سب سے پرانی ہے اس کا بانی "ڈچ ایسٹ انڈیز کونسل" کا ایک رکن (J. C. Readgmochr) تھا۔ جو خود بھی بہت بلند پایہ ماہر اثریات تھا۔ ۱۸۱۱ء میں جب انگریز اس ملک پر چند سالوں کے لئے مسلط ہوئے تو (Thomas Stamford Reffles) جو اس وقت کا انگریزی لفٹننٹ گورنر جنرل تھا اس سوسائٹی کا بھی صدر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد جب ولندیزی دوبارہ ان جزائر میں بحال ہوئے تو انھوں نے ۱۸۶۰ء میں اس کے مصارف کے لئے ۸۰۰۰ گیلڈر سالانہ رقم بطور مصارف اس کے لئے منظور کی۔ جب ہی سے یہ سوسائٹی ایک ادارہ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ اور اب عجائب خانہ بھی

**تمدن کی قدامت** کسی ملک کا تہذیب و تمدن اور اس تہذیب و تمدن کی قدامت اس ملک کی قومی اور نسلی قدامت سے تعلق رکھتی ہے پچھلے اوراق میں تفصیل کے ساتھ واضح کیا جا چکا ہے کہ "انسانیات اور نسلیات"

---

سرکاری طور پر قائم ہے۔ اور مسٹر ڈاکٹر حسین جایادی نگرت اس کے ڈائرکٹر ہیں۔

قدیم باشندوں کی اسی ہجرت کے بارے میں اندونیشیا میں دوسری جنگِ عظیم کے وقت کا گورنر جنرل **فان موک**[۱] رقمطراز ہے :۔

"اگرچہ شروع کے آنے والوں کے متعلق بہت سے سوالات حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم بہت سے سوالات تاہنوز لاینحل ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہ آمدورفت ایشیا کے خشکی کے ان رہنے والوں نے شروع کی تھی جو مہذب تھے اور جنھیں دوسرے لوگوں نے ان کے اپنے وطن سے نکال دیا تھا۔ یا وہ قحط کے مارے ہوئے تھے، یا کسی وبا سے بھاگ کر پناہ لینا چاہتے تھے چنانچہ قدیم اور ابتدائی قبائل ان کی آمد سے بھاگ بھاگ کر آگے کی طرف (یعنی اندرون ملک میں) نکل گئے پولینیشیائی اور مائکرونیشیائی لوگوں نے مشرقی اندونیشیا (یعنی نیوگنی اور الکاہل جزائر) میں پناہ لی اگوروٹس (Igorots) دایاک (Dyaks) باتا، لاؤس (Laos) اور شان قبائل اور کارن وغیرہ پہاڑوں میں چلے گئے یا پھر بورنیو اور سماترا کے جنگلوں میں چھپ گئے وہ لوگ کہ جو بعد میں آئے اور ایک عمدہ قسم کا معیارِ زندگی انھوں نے اختیار کیا ملک کے زرخیز ترین علاقہ میں آباد ہوتے چلے گئے . . . . . . . . . اور جب یہ ہجرت عملی طور پر بند ہوگئی تو اندونیشی لوگ پھیلتے ہوئے فلپائن تک پہنچ گئے۔ مگر ان کی آبادی کا بڑا حصہ اندونیشیا ہی میں رہا۔ یا پھر ملایا، سیام (تھائی لینڈ) کمبوڈیا اور انام میں رہا بلکہ ان حدود سے بھی نکل کر آس پاس بھی جا پہنچا۔ وہاں پہنچکر وہ شمالی مشرقی ایشیا کے منگولوں سے مخلوط ہوگیا۔ اور پھر فارموسا اور میڈاغاسکر میں بھی پہنچا۔ جہاں انھیں "ہووا"

---

[۱] ایچ۔ جے۔ فان موک کی کتاب (The Shakes of Democracy in South East Asia) صفحہ ۹۳ مطبوعہ ایڈنبرگ سنہ ۱۹۵۰ء۔

کی سائنس نے آج یہ چیز بالکل آئینہ کی طرح صاف کر دی ہے کہ اندونیشیا کی قوم بہت قدیم ہے اور اسی طرح ان کی نسلی حیثیت بھی بہت قدیم ہے، اور ظاہر ہے کہ ہر قوم کی ایک تہذیب اور ہر ملک کا ایک تمدن ہوتا ہے۔ قدیم ملک کا تمدن قدیم اور نئے ملک کا تمدن نیا ہوتا ہے،

---

کہتے ہیں۔ اور یہ پھر شمالی مشرقی ہند وچین کے علاقوں میں بھی پہنچے جہاں ٹون کنی، کا علاقہ واقع ہے اور وہاں وہ چین کے مضبوط انسان سے مخلوط ہوگئے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے اس نقشہ پر جس میں سیلون تھائی لینڈ، فرانسیسی ہند وچین، ملایا، اندونیشیا، فلپائن، فارموسا اور جزائر شامل ہیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ٹوٹا ہوا ملک ہے اور تاریخ کے کسی دور میں ایک ہی بڑی سرزمین کا حصہ تھا۔ مگر اب سمندر جا بجا پھیل گیا ہے اور یہ سب ایک دوسرے سے الگ ہوگئے ہیں۔ اور جزیرے بن گئے ہیں۔" اسی کے ذیل میں ۱۹۱۰ء میں "محکمۂ آثارِ قدیمہ" قائم کیا گیا حسنِ اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کی علم نوازیوں کے سبب اسی قسم کا محکمہ ہندوستان میں بھی قائم ہوا تھا۔ بہرحال باقاعدہ طور پر اس کمیٹی نے تحقیقاتِ آثار کا کام ۱۹۰۱ء سے کیا ہے مگر یہ اسقدر ناکام کوشش تھی کہ اسے نہ ہونے کے برابر کہا جا سکتا ہے۔ کامیاب کوشش کا آغاز ۱۹۲۶ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ "ڈاکٹر پی۔ وی۔ فان۔ اسٹین کلینفلز (Dr. P. V. Von Stein Callenifils) نے سب سے پہلے مشرقی ایشیا کے میلینیشائی کلچر کا باضابطہ سروے کیا تھا۔ اور سمپنگ (مشرقی جاوا) کے نزدیک تحقیقات کرتے ہوئے ایک قدیم پہاڑی غار (Gua Lawa) سے میلینیشائی تہذیب کی کچھ نشانیاں کھود کر نکالی تھیں۔ ان میں کچھ ہڈیوں کے اوزار بھی تھے۔ جو کبھی ڈاکٹر موصوف کو (Hoa-Bink) (فرانسیسی ہند وچین) سے کھدائی کے درمیان ملے تھے۔ اور اسی قسم کے اوزار انھوں نے آسام کی پہاڑیوں اور جزیرہ سیلبس سے بھی برآمد کئے تھے۔ بہرحال ان لوگوں کی محنتِ شاقہ کے باعث یہ اب سمجھنا چنداں دشوار نہیں رہا۔ کہ "تہذیبِ جاوا کے ابتدائی حجری، وسطی حجری، اور آخری حجری دور کی تہاذیں میں کیا فرق تھا۔ ڈاکٹر اے۔ جے فان در ہوپ (Dr. A. J. Vonder Hoop) کے اثریاتی مطالعہ نے آج یہ چیز

تمدن انسان کی معاشرت ہی کا نام ہے۔ ہر دور میں انسان کچھ نہ کچھ معاشرت ضرور رکھتا رہا ہے۔ ہر دور میں کچھ نہ کچھ ضرورتیں، معاملات کی صورتیں، حالات کی نوعیتیں، اور ان پر غالب آنے کی قابلیتیں اُس نے بہم پہنچائی ہیں۔ اسی طرح اُس نے اپنے گرد وپیش سے بھی کام لیا ہے، ممتاز قوت کا بھی نام لیا ہے۔ جانوروں کو بھی رام کیا ہے۔ حجر، شجر، آگ، آب برق و باراں غرض ہر چیز سے اپنی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یا ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نئے نئے آلات، ـــ نئے حربات بھی استعمال کئے ہیں جو امتداد زمانہ کے بعد آج بھی اسی طرح تہِ خاک سے برآمد ہو رہے ہیں اور اپنے بنانے والوں کی عقل اور کردار پر دلالت کر رہے ہیں۔ آج انہی چیزوں سے تہذیب کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مُلک عظیم یعنی انڈونیشیا میں تہذیب و تمدن کی ـــــــــــــــ

## تمدن کی ابتدا

ابتدا بہت پرانہ زمانہ میں ہو چکی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ملک میں تمدن کا آغاز سنِ عیسوی کے ابتدائی دور میں ہوا جبکہ ہندوستان کے ہندو تجارت کی غرض سے اس ملک میں پہنچے تھے، مگر جدید تحقیقات نے اس خیال اور نظریہ کو بالکل جھٹلا دیا ہے بلکہ لغو قرار دیا ہے اور اس کے برعکس یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس ملک کا تمدن بھی اتنا ہی پرانہ ہے جتنا کہ خود ہندوستان کا ہے بلکہ اپنی قدامت میں ہندوستان سے زیادہ قدیم ہے۔ یہاں کے لوگ ہندؤں کے آنے سے ہزاروں برس پہلے تہذیب کے بہت سے مدارج طے کر چکے تھے اور تمدن کی منزلوں سے گذر چکے تھے۔ ان کے ملک کا نام بھی اُس وقت "نوسنتارا" تھا ان کی بولیاں بھی تھیں اور رسم و رواج بھی تھے، طرزِ زندگی اور اندازِ عبادت گذاری

---

بھی ثابت کردی ہے کہ جنوبی سُماترا میں (Megalithic) تہذیب کے لوگ بھی موجود تھے۔

بھی تھے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندو آئے اور اس ملک کا عہد قبل تاریخ ختم ہوگیا۔

## عہدِ قبل تاریخ کی آخری مدت

کیونکہ ہر ملک کے عہدِ قبل از تاریخ کی آخری مدت بقول پروفیسر "اسٹورٹ پگٹ"[1] وہ زمانہ ہے جب اس ملک میں باقاعدہ زمانۂ تحریر آغاز کرتا ہے۔ آغازِ تحریر خواہ پہاڑی کتبوں سے ہو، یا چٹانی تحریروں سے، نقش نگاری سے ہو، یا تصویر انگاری سے وہ بہرحال زمانۂ تحریر ہے زمانۂ تحریر شروع ہوتا ہے اور معلوماتِ تاریخی کا سرمایہ بہم پہنچانے کے اسباب پیدا کردیتا ہے اور عہدِ قبل از تاریخ ختم ہوجاتا ہے۔

پروفیسر موصوف کے خیال کے مطابق مشرق کے مختلف ملکوں میں یہ مدت مختلف قرار دی گئی ہے مثلاً (عراق) مسوپٹامیہ، ایران، اور مصر میں اس کی آخری مدت ۳۰۰۰ ق م ہے ہندوستان میں ۲۳۳ ق۔م (زمانۂ اشوک) ہے اور انڈونیشیا میں ۴۰۰ء ہے ۴۰۰ء کی ایک پتھر پر لکھی ہوئی تختی برآمد ہوئی ہے کیونکہ تاریخی حیثیت سے یہی وہ تاریخیں ہیں کہ جب ان ممالک میں زمانۂ تحریر شروع ہوا تھا۔ لہٰذا یہی تاریخیں ان ممالک میں عہدِ قبل التاریخ کی آخری مدت ہوں گی۔ مگر اس سے یہ تاویل نہیں کی جاسکتی کہ اس سے قبل کے عہد میں تہذیب و تمدن کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ تہذیب بھی تھی اور تمدن بھی تھا مگر اس کے افشائے راز کرنے والے باضابطہ تحریری آثار نہ تھے آج جتنا کچھ بھی اس کی سراغ رسانی کے سلسلہ میں ملتا ہے بجز اِن آلات و حربات اور نشانات و علامات کے کوئی اور چیز نہیں ہے

---

[1] پروفیسر اسٹورٹ پگٹ (Prof. Stuart Piggot) اِس وقت (Edinbourg) یونیورسٹی میں عہدِ قبل تاریخ کے پروفیسر ہیں جن کی کتاب (Pre-Historic India) میرے مطالعہ سے گذری ہے جو ۱۹۵۰ء کی مطبوعہ لندن ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۔۱ پر اس قسم کا اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

جو ان کے اپنے پرانے مدافن سے کھود کھود کر نکالی جا رہی ہیں - آج انہی کے مقدمات کی ترتیب سے تاریخ کی تدوین کا کام ہو رہا ہے - مورخین نے انہی چیزوں کی بناوٹ، اور انہی آلات کی ساخت کو معیار قرار دے کر اس عہد پر غور کیا ہے اور غور و خوض کے بعد باقاعدہ اس کی ترتیب وار تقسیم کی ہے -

## زمانہ قبل تاریخ کی عہد وار تقسیم

چونکہ کھود کر نکالی ہوئی چیزوں میں پتھروں کی بھی ہیں - اور ہڈیوں کی بھی ہیں - اور بعض جانوروں کے سینگوں کی بھی ہیں - اسی طرح کچھ اور عہد ترقی کی کانسی کی بھی ہیں اور لوہے کی بھی ہیں - ان سب چیزوں سے اس عہد کے لوگوں کے کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے، چلنے، پھرنے، لڑنے، مرنے، رہنے، سہنے، لین دین، کاروبار، صنعت و حرفت غرض، ہر چیز کا پتہ چلتا ہے اور عہد بعہد ترقی کا حال معلوم ہوتا ہے - اسی لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی چیزیں ابتدائی ہوں گی، اور جب ذرا ہنر نے ترقی حاصل کی ہوگی تو یہ کچھ عمدہ بنائی گئی ہوں گی، اس سے بھی بڑھ کر زمانہ نے کچھ اور ترقی کا قدم اٹھایا ہوگا تو ان میں اور اعلیٰ کاریگریوں کا اضافہ ہوا ہوگا - اس طرح ہر دور نے ہر دور پر کچھ نہ کچھ مسابقت حاصل کی ہوگی غرض آج سائنسدانوں کے سامنے وہ سب اوزار، اور وہ سب ہتھیار موجود ہیں - انہی کی موجودگی سے اس تمام قبل تاریخ کے عہد کو تین خاص زمانوں میں تقسیم کیا ہے - یعنی ایک وہ زمانہ جبکہ لوگ ہر ضرورت کی چیز پتھر سے بناتے تھے - جمادات کی اقسام میں پتھر کے علاوہ کسی اور دھات سے واقف نہ تھے - یہ زمانہ پتھر کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے اسی کو "عہد حجری" بھی کہتے ہیں پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ لوگوں نے تانبے اور ٹین کی آمیزش سے کانسی کا برتن بنایا، اور آہستہ آہستہ پھر

لوہے کا پتہ چلایا۔ دوسرا دور کانسی کا زمانہ اور تیسرا دور لوہے کا زمانہ کہلاتا ہے ۔ اس کو 'عہدِ حدید' بھی کہتے ہیں ۔ 'اندونیشیا' میں عہدِ قبل از تاریخ کی مصنوعات میں ان تینوں ادوار کی چیزیں ملی ہیں ۔ اور اسی لحاظ سے یہاں کے عہدِ قبل از تاریخ کو انہی تین زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ جن کی تفصیلات اگلے باب میں بیان کی گئی ہیں ۔

# باب دویم

## تہذیب قبل از تاریخ کے مختلف دور

جیساکہ پچھلی سطور میں لکھا جا چکا ہے اس ملک میں بھی انسانی تہذیب کا پہلا دور قریب قریب اسی طرح کا تھا جو ہر قدیم اور ہزاروں سال پرانے ملک میں گذرا ہے اور جسے "عہد حجری" یا (Stone age) کہتے ہیں۔ اور جو بقول ماہرین انسانیات انسانی تہذیب اور تمدن کا سب سے ابتدائی دور تھا جبکہ انسان کی زندگی بالکل بہائم سے مماثل تھی۔ مثلاً بہائم یا چوپائے بھی پہاڑوں میں رہتے اور جنگلوں میں گھومتے ہیں اور درختوں کے پھل پھول کھاکر، زندگی بسر کرتے ہیں یا پھر بعض کا گذارہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کی شکار پر ہوتا ہے اور تشنگی کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے بھی آب رواں کا کنارہ ہوتا ہے۔ اس ابتدائی دور کی انسانی زندگی بھی محققین کے خیال کے مطابق قریب قریب بالکل اسی نوع کی تھی۔ انسان خودرو درختوں کے پتّے، پھل اور پھول کھاتا تھا۔ دریاؤں کے کناروں پر جانوروں کی طرح منہ ڈال کر پانی پیتا تھا۔ سردی، گرمی، اور بارش سے بچنے کے لئے پہاڑوں کی قدرتی طور پر بنی ہوئی گھپاؤں میں جا چھپتا تھا

اور اس طرح اس کی ابتدائی حالت بالکل جانوروں کی مثال تھی۔ مگر رفتہ رفتہ پھر اسی دور میں جب اس نے جانوروں کو جانوروں کا شکار کرتے ہوئے دیکھا تو پتھروں کے نکیلے ٹکڑے حربہ کے طور پر استعمال کر کے خود بھی جانوروں کا شکار کرنا شروع کر دیا۔ انہی کی طرح وہ بھی ان کا خون چوستا تھا۔ ان کا کچا گوشت چباتا تھا۔ اور انہی کی طرح بالکل ننگا اور برہنہ پھرتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب اس کے شعور نے ترقی کی اور احساس نے مقام حیوانیت کو عبور کیا تو اس نے انہی جانوروں کی کھالوں کو اوڑھنا شروع کر دیا اور ان کے لمبے لمبے سینگوں اور بڑی بڑی ہڈیوں سے اپنی شکار کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پتھروں پر گھسے ہوئے اور رگڑے ہوئے اوزار بنا لئے۔ جب یہ اوزار کسی کسی وقت ٹوٹنے لگے اور اُسے دھوکا دینے لگے تو انہی کے مماثل پھر اُس نے پتھروں کے اوزار بھی بنا لئے چنانچہ وہ اسی طرح سینکڑوں اور ہزاروں سال تک اسی قسم کے اوزار اور حربے استعمال کرتا رہا ہے۔ جو شباہت میں نہایت بھدے ہوتے تھے اور نہ ان پر صیقل ہوتے تھے اور نہ صفائی ہوتی تھی۔ ہین گیلڈرین کی رائے ہے کہ انڈونیشیا میں کھدائی کے ذریعہ (جاوا اور سماٹرا کے مقامات پر جو قدیم حجری آلات دستیاب ہوئے ہیں وہ سب اسی قسم کے ہیں اور اسی ابتدائی حجری دور کے شعور انسانی کی ایجاد ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں (بحوالہ کالیداس کی کتاب انڈیا اینڈ دی پیفک ورلڈ صفحہ ۱۲۹) ٹرنیل (Trinil) کے قریب پتھروں کے اوزار کا جو مجموعہ برآمد ہوا ہے اور اسی طرح جو اوزار وسطی جاوا میں "پاجی تان" (Patjitan) کے مقام پر نکلے ہیں وہ سب اسی ابتدائی دور حجری پر دلالت کرتے ہیں۔ ان اوزاروں میں زیادہ تر پتھروں کی چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں ہیں۔ ان کلہاڑیوں کی شکل بقول ڈاکٹر ریچارڈ ونسٹیڈ ("دی ملایا" صفحہ ۵) ان پتھروں کے اوزاروں

سے ملتی جلتی ہے جو برما میں دریائے اراودی کی وادی کے نزدیک سے برآمد ہوئے تھے۔ اور پھر چین میں "پیکنگ" کے قریب بھی نکلے تھے۔

بہرحال اسی زمانۂ حجری کو مورخین انہی آلات کی شباہت اور صورت ترقی کے لحاظ سے تین خاص عہد میں تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی[1]

(۱) ابتدائی دورِ حجری ........

(۲) درمیانی دورِ حجری ........

(۳) متاخر دورِ حجری ........

چنانچہ ابتدائی دورِ حجری بقول "مِیں گیلڈرین" وغیرہ اس ملک میں چالیس ہزار برس پہلے گذرا ہے جبکہ انسان کی تہذیب بہت ہی ابتدائی حالت میں تھی اور وہ حیوانی حرکات کا آدمی (Pithecanthropus) کہلاتا تھا۔ اس کا تمدن بھی نہایت ہی ابتدائی تھا۔ کمین گاہوں، اور پناہ گاہوں میں چھپکر زندگی بسر کرنے والے جس طبقۂ انسانی کا ابھی اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے حالات اس سے زیادہ کچھ اور اخذ نہیں کئے جا سکے۔ پھر اس دور کے بعد درمیانی دورِ حجری اور متاخر دورِ حجری کا زمانہ گذرا ہے جو اپنی طوالت اور امتداد کے اعتبار سے اسی طرح کئی ہزار سال کی، ایک طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں یہاں کے انسانوں نے قدرے ترقی کر لی تھی۔ ان کے اوزار اور ہتھیار بھی ذرا قاعدہ اور سلیقہ میں آگئے تھے بقول "ہِین گیلڈرین" ان اوزاروں اور ہتھیاروں سے پتہ چلتا ہے کہ اب ان انسانوں کی زندگی جانوروں کی زندگی

---

[1] مختصر نوٹ "اندونیشیا کے قدیم باشندے"، جو اندونیشین ریویو ماہ جولائی ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۵۰ پر چند سطور میں شائع ہوا تھا۔ جس میں انہی تین ادوار پر مختصر بحث کی ہے مگر یہ بحث ناکافی ہے۔

سے بہت کچھ ممتاز بھی ہو چکی تھی۔ انھوں نے زراعت کے اصول بھی نکال لئے تھے۔ کیونکہ ان اوزاروں میں کھیتی باڑی کرنے کے آلاتِ حجری بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ جانور چَراتے وقت استعمال کرنے کے حجری ڈنڈے بھی نکلے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انھوں نے اس دور میں جانوروں کا چَرانا اور ان کی پرورش کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ پھر جنگلوں میں کھدائی کے ذریعہ ایسے نشانات بھی ملے ہیں جو ان کے بستی بساکر رہنے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ للٰہذا اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دیہاتی زندگی کی ابتدائی صورت بھی اختیار کرلی تھی پھر انہی دیہاتی علاقوں میں ان کے مٹی کے برتن بھی نکلے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان لوگوں نے برتن کی ضرورت کو بھی سمجھ لیا تھا۔ بقول ڈاکٹر ریچارڈ اسی قسم کی تمام چیزیں جزیرہ سُماترا میں جھیل طوبیٰ کے مضافاتی علاقہ میں بھی برآمد ہوئی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقہ میں بھی یہی دور اسی نہج پر گذرا ہے بہرحال پروفیسر کالیداس نے ہندوستان میں کھاسی کی پہاڑیوں میں نکلی ہوئی جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ بھی قریب قریب اسی تہذیب سے مماثل ہیں چنانچہ اب سے چند سال قبل پاکستان کے علاقہ سندھ میں قدیم شہر موہن جی دارو کی کھدائی سے جو چیزیں نکلی ہیں وہ بھی قریب قریب ان چیزوں سے ملتی جلتی ہیں۔ حالانکہ حیدرآباد دکن کے مشہور پروفیسر "الیشو اڑوپا" نے اپنی کتاب ہندوستانی تمدن، میں موہن جی دارو کی تہذیب کو دراوڑی تہذیب، قرار دیا ہے جو آریوں سے ہزاروں سال پہلے سے ہندوستان میں رہتے چلے آرہے تھے اور جو بقول پروفیسر مذکور آسٹریلیا یا اس کے نزدیک (غالباً نیوگنی) کے علاقہ سے آئے تھے۔ بہرحال اگر اسی نظریہ کو کسی حد تک درست بھی مان لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ جاوا، سماترا اور نیوگنی کا دورِ حجری بھی تاریخ کا ایک ایسا ہی دور تھا جیساکہ

ہندوستان میں "دراوڑیوں" کے زمانہ میں یا پھر برما اور چین میں گذر چکا ہے۔

چنانچہ موہن جی دارو کی دراوڑی تہذیب کے بارے میں "ایشوراٹوپا"[1] نے لکھا ہے کہ:—

"یہ کھدائیاں اس امر کی شاہد ہیں کہ دراوڑی لوگ اس زمانہ میں شہروں کے بسانے کے اصول سے واقف تھے۔ . . . . . مکان کا بنانا بھی انھیں خوب آتا تھا۔ . . . . . . . وہ لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ تھے۔ اور سوت کاتنے سے بھی واقف تھے کیونکہ سوت کاتنے کی تکلیاں بھی برآمد ہوئی ہیں۔ زیورات کے شوق کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ ہڈیوں اور مٹی کے زیورات بھی ملے ہیں۔ مٹی کے برتنوں کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ کیونکہ مٹی کے برتن بھی کثرت سے نکلے ہیں۔ ان برتنوں کی نوعیت سے ان کے کھانوں کا بھی پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

یہ تو ہندوستان کی حجری تہذیب کا خاکہ تھا اب اندونیشیا کے متعلق بھی غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں یہاں کے تہذیب و تمدن کی بھی قریب قریب یہی کیفیت تھی چنانچہ انڈونیشن ریویو (جس کا حوالہ پچھلے صفحہ پر گذر چکا ہے) کے مندرجات سے واضح ہے کہ "متاخر عہد حجری" کے لوگ کافی ترقی یافتہ ہو چکے تھے۔ اور تہذیب کی بہت سی منزلوں سے گذر چکے تھے۔ ان کے اوزار جلائے ہوئے ملے ہیں نیز معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ بڑھئی بھی ضرور تھے اور غالباً لکڑی کے بنائے ہوئے گھروں میں رہتے تھے کیونکہ لکڑیاں چیرنے اور انھیں صاف کرنے کے پتھر کے ایسے دھاردار اوزار بھی دستیاب ہوئے ہیں جو اسی قسم کے کام دینے والے آہنی اوزاروں سے ہم شکل ہیں۔

---

[1] پروفیسر ایشوراٹوپا کی کتاب "ہندوستانی تمدن" صفحہ ۱۵-۱۶ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء۔

اور اس طرح یہ متاخر حجری دور کا کلچر جاوا اور سماٹرا دونوں میں قریب قریب ایک ہی قسم کا پایا جاتا ہے۔ اس دور کے کچھ قیمتی پتھروں (جواہرات وغیرہ) کے آثار بھی ملے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ جواہرات کے استعمال سے بھی واقف تھے، اسی طرح سنگتراشی بھی کافی طرح جان گئے تھے۔ کیونکہ پتھروں کے ایسے عمدہ گھڑے ہوئے نمونے بھی ملے ہیں جن سے ان کے حسن مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ اور کاری گری کو واضح کرتا ہے۔

اس دور کی حیوانی زندگی کے متعلق پروفیسر کالیداس ناگ نے لکھا ہے کہ:[ل۵]—

"تجی جیولانگ (TJI Djeolang) کے مقام پر علاقائی قسم کے جانور تحقیق کئے گئے ہیں۔ جن میں سمندری گھوڑے، سور، ہرن، اور چھوٹی قسم کے مویشیوں کی اکازی چٹانیں برآمد ہوئی ہیں۔ اور قدیم ہاتھی کی قبیل کا ایک جانور بھی ملا ہے جسے غالباً "اسٹیگوڈون"، کہتے تھے۔ یہ سب جانور ہندوستان کے "سیوالک" پہاڑ کے اردگرد کے علاقائی جانوروں سے بہت قرابت رکھتے ہیں"۔

ان تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ اس دور میں ہاتھی سے بھی ضرور کام لیتے تھے اور مویشیوں کو پالتے تھے سؤر کے پالنے کا بھی رواج تھا۔ وہ یقیناً اس کو کھاتے بھی ہوں گے کیونکہ اسی دور کی ہندوستانی قوم میں اس کا بھی گوشت کھانا "پروفیسر اٹویا" کی کتاب سے ثابت ہے۔

**اس دور میں لوگوں کی زبان** یوں تو ہر ملک میں اس کے اضلاع اور صوبوں کی زبانوں اور بولیوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اور ہر ملک میں بیک وقت واحد قومی زبان کے علاوہ کئی کئی بولیاں بولی جاتی ہیں جو قبائلی اثر سے تاریخ کے

---

ل۵ کالیداس کی کتاب "انڈیا اینڈ دی پیسیفک ورلڈ"، صفحہ ۱۲۹ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۱ء۔

کسی دور میں وجود میں آئی تھیں مثلاً ہندوستان میں تقریباً سات سو بولیاں ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی ان کی تعداد سو کے لگ بھگ پہنچتی ہیں، اندونیشیا میں بھی آج ۲۲۵ بولیاں اور زبانیں ہیں۔ مگر پھر بھی ایک قرینہ یہ ہے کہ ہر ملک میں ایک مشترکہ زبان ہوتی ہے بلکہ بیک وقت کئی کئی ملکوں میں بھی اس کا اثر ہوتا ہے" جہاں جہاں آپس کے تعلقات، سیر وسفر اور لین دین کا سلسلہ ہوتا ہے وہاں زبان بھی قریب قریب ایک ہی سی مشترکہ طور پر ہوتی ہے مگر خصوصاً وہاں جہاں ایک ہی نسل ہو مشترکہ زبان کا ہونا اور بھی لابدی سا ہو جاتا ہے۔ اندونیشیا کے جزائر میلنیشائی، (Malaysian) میلنیشائی نسل ہے جس کا سلسلہ مغرب میں میڈاغاسکر سے جنوب مشرق میں فلیپائن اور فارموسا تک پھیلا ہوا ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی ان تمام نسلوں کی مشترکہ بولی ایک ہی ہو اور وہ غالباً نسلی مناسبت سے میلنیشائی ہی ہو سکتی ہے جس کو غلطی سے 'بورنی' نے پولینیشائی لکھا ہے اور اس کا حلقۂ اثر میڈاغاسکر سے انڈمان، نیکوبار، جزیرہ نما ملایا، سماترا، جاوا، مدورا، بورنیو، فلورس، سلیبس، لمبوک فلیپائن، اور فارموسا وغیرہ کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ انھیں علاقوں میں میلیشیائی نسل آباد ہے جس کو اب اندونیشی کہا جاتا ہے بہرکیف اس مشترکہ بولی کے پائے جانے کے وجوب میں اس نے دلیل یہ پیش کی ہے کہ آج بھی اگرچہ جاوا میں کئی زبانیں ہیں، سماترا میں پانچ سلیبس میں چار، تیمور میں چالیس، اور فلورس میں ۴ ہیں اور اسی طرح ترناتے۔ تیدورے، ہیرام، اور سایامرا اور سمباوا کی بولیاں بھی مختلف ہیں مگر باوجود اختلاف کے آج بھی ان میں اکثر پرانے اور قدیم الفاظ تھوڑے تھوڑے فرق سے ایک ہی قسم کے پائے جاتے ہیں اور ان الفاظ کی قدامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایریان

بورنیو، فلورس، لمبوک اور سیرام کے وحشی اور نیم عریاں بلکہ بالکل عریاں لوگ بھی انھیں اسی طرح بولتے ہیں اور چونکہ ان لوگوں کی زندگیاں قدیم اور زمانۂ قبل تاریخ کی زندگیوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ اس لئے ان الفاظ کا قدیم ہونا بھی لازمی ہی سا ہے۔ اور پھر نسلاً چونکہ ایک ہیں اس لئے ان کی اس دور کی مشترکہ بولی کا بھی اس قرینہ سے ایک ہونا لازم آتا ہے۔ ہاں تو دلیل کے سلسلہ میں "بورنی" کہتا ہے۔ کہ مثال کے طور پر لفظ 'چاند' کے لئے یہاں کی زبان میں یا تو 'دولان' کا لفظ آتا ہے اور یا 'بُولان' بولا جاتا ہے۔ مگر ادھر کی بولی میں یہ لفظ ملتا ہے مثلاً لمبوک کے لوگ 'اُلان' بولتے ہیں۔ گورونگ تالو میں یہ لفظ 'بکلان' بولا جاتا ہے سیرام میں بولانتے اور 'بیما' میں 'دوراہ' مانیدو میں لیلئی بون اور مکاسر میں 'بُولانگ' بولا جاتا ہے۔

بہر حال یہ اہل سائنس کی قیاس آرائی ہے اور اس کے ماتحت انھوں نے اس زمانۂ قبل تاریخ کی زبان پر اس قرینہ سے روشنی ڈالی ہے ہوسکتا ہے کہ پھر بعد میں جس زبان کو 'ملائی' کہا جاتا ہے وہ اس سے آمیز ہوکر نکلی ہو اور عہد قبل تاریخ کی آخری مدت میں 'ملائی' کے عنوان سے معنون کی جانے لگی ہو۔ بہر حال ہندؤں کے آنے سے قبل ملائی زبان کا رواج تھا۔ جیساکہ اس دور کی زبان کے متعلق اندونیشی محققین کا خیال ہے کہ اس دور کی زبان[۵۲] موجودہ ملائی کی شروع کی زبان تھی جسکا مادر وطن جنوبی مشرقی ایشیا کا کوئی علاقہ ہوسکتا ہے۔ یہ علاقہ "مان کھومر" (Man komer) (Language) کا علاقہ ہے۔ کیونکہ ابتدائی علاقوں سے "متاخر حجری"

---

۵۱ (Burney) کی کتاب (History of Voyages and Discoveries) جلد دوم صفحہ۔ مطبوعہ لندن۔

۵۲ "اندونیشین ریویو" ماہ جولائی ۱۹۵۰ء صفحہ ۵۰۔ مطبوعہ جکارتا۔

نسل کا جنوبی سمت میں نقلِ وطن کرنا ہندوستان کے جزیرہ نما میں ثابت ہوتا ہے۔ یہ علاقہ "مان کھومر" کھلاتا ہے۔ اسی کی ایک شاخ جنوب میں ملایا جزیرہ نما کے انتہائی جنوب تک پہنچی۔ اور یہاں سے عبور کرکے وہ مجمع الجزائر میں پہنچ گئی۔ چنانچہ ملایا میں استعمال ہونے کے باعث اس کا نام اور اس کے خاندان کا نام 'ملائی' پڑگیا۔ رفتہ رفتہ یہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہوگئی اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر اس کا نام بھی مختلف پڑگیا۔ بہرحال اس کی 'اصل' ابتدائی ملائی تھی اور یہی اس دور کی ابتدائی بولی تھی۔

**عقائد**

ڈاکٹر ریچارڈ کی تحقیقات سے واضح ہے کہ اس دور کے لوگوں کا مذہب بالکل مخلوق پرستی تھا۔ یعنی یہ لوگ مظاہر پرست تھے۔ چاند، سورج، ستارے، آگ، بارش، درخت اور جانوروں کو اپنے نزدیک قوتِ اعلیٰ سمجھتے تھے ان چیزوں کے سامنے جھکنا ہی ان کی عبادت میں داخل تھا۔ چنانچہ بہت زمانہ بعد کے ایسے آثار ملے ہیں جن میں اس دور کی بعض ایسی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔

**معاشی زندگی**

۱۹۲۶ء میں جاوا میں ایک زبردست سیلاب آیا تھا۔ جس کے باعث زمین کے بعض حصے بہت گہرے ہوگئے تھے۔ انہی گہرائیوں میں قدیم زمانہ کے ایسے آثار ملے ہیں جو اس دورِ متاخر حجری کے گاؤں کی بستیوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ریچارڈ لکھتا ہے کہ "اس دورِ اواخر حجری کے انڈونیشی کاشت کرتے تھے، جانور چراتے تھے، اور انہی چیزوں سے اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔

**سماجی حالت**

ان میں پوری آبادی کے سردار بنانے کا رواج تھا چنانچہ ریچارڈ لکھتا ہے کہ "قدیم زمانہ میں حکمراں سردار کو "نگاری نگارا" کہتے تھے جیساکہ قدیم سینہ بہ سینہ چلی آنیوالی کہانیوں میں اس لفظ کے پائے جانے سے ثابت ہے

سردار ہندو عہد میں راجہ اور اسلامی عہد میں سلطان کہلایا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی حکومت کی کوئی نہ کوئی شکل موجود تھی۔ ان کے شادی بیاہ وغیرہ کے متعلق کوئی تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ البتہ ان کے ہاں مرنے کے بعد کے رواج کا ایک ہلکا سا اشارہ ڈاکٹر ریچارڈ نے اس طرح کیا ہے کہ:۔

"یہ لوگ بھی اپنے مردوں کو زمین میں گاڑتے تھے کیونکہ سماٹرا میں اس دورِ حجری کی بعض بے ڈھنگی قبریں ملی ہیں۔

غرض اثری (Archaeological) اسباب پر "ہین گیلڈرین" نے ان قدیم اندونیشیوں کے متعلق مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلایا ہے:۔ مثلاً یہ کہ یہ لوگ ہڈی کے بھالے، ہڈی کے اوزار، ہڈی کے تیر، اور پتھروں کا مالا (تسبیح کے مانند) بناتے تھے۔ چاول اور مکا کی کاشت کرتے تھے۔ اور درختوں کی چھالوں کا لباس پہنتے تھے۔ اور قریب قریب یہی چیزیں ان کی دیگر ہم عصر نسلوں "بحر یائی پولینیشیوں" میں بھی رائج تھیں۔

مسٹر لوکلے (Locle) کی رائے کے مطابق ان اندونیشیوں کا نظام معاشری دیدہ داد اور جبتائی کے نظام معاشری کے مماثل تھا اور شخصی بادشاہت معدوم تھی، فقط قوم کا ایک سردار ہوتا تھا اور وہی دیوتا سمجھا جاتا تھا، غالباً ان لوگوں نے یہ نظریہ پولینیشیوں سے مستعار کیا تھا۔ کیونکہ نیاس (Nias) کے سرداروں کی نسبت بھی انہی باتوں کا پتہ چلایا گیا ہے۔

غرض اسی طرح وہ سماٹرا کی نسلوں کے کلچر کے متعلق بھی لکھتا ہے کہ کلچر کے اثرات کی لہریں جو اس جزیرہ میں یکے بعد دیگرے اٹھتی رہیں وہ دراصل ہندوستان

کے جنوب کی طرف سے چلی تھیں کیونکہ اس سمت سے آنے والا ہر گروہ اپنے ساتھ اپنا تہذیبی اثر بھی لے کر آیا۔ مگر جزیرہ نما ملایا کے قدیم ملیشیائی کے سلسلہ میں جے کم قبائل کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ہندوستان کے کلچر کی باتیں نہیں پائی جاتی تھیں مثلاً ہندوستان کے ہندوؤں سے پہلے کے لوگوں میں قربانی کرنے اور برت رکھنے کا رواج ملتا ہے مگر ان میں نہ تھا۔ البتہ برتن سازی کے جو نمونے اس متاخر دور حجری کے برآمد ہوئے ہیں وہ کسی قدر ملتے جلتے ہیں۔ ان کے اور گہرے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بر اعظم کے علاقوں سے جیسے جیسے اور ملیشیائی آباد کار آتے رہے جنیشیائی یہاں سے معدوم ہوتے چلے گئے اور اسی طرح ’ویدواڈ لوگ بھی مار مار کر جزائر کے بنجر اور غیر آباد حصّوں میں ڈھکیلے جاتے رہے‘‘ اسی طرح سماترا کے ان میلنیشیائیوں کے متعلق رہن سہن کے بارے میں یہ بھی اور مزید معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ انبار نما گھر بناتے تھے۔ اور کشتیوں کے بنانے سے بھی واقف تھے۔ پروفیسر کالیداس ناگ لکھتا ہے کہ ’’سماترا میں‘‘[1] متاخر دور حجری ’’ کا کلچر چوکور آر سے (Quadrangular Adazes) سے ظاہر ہوتا ہے جو ملائی پولینیشی (یعنی انڈونیشی) راہ سے ۲۵۰۰ ق م اور ۱۵۰۰ ق م کے درمیان لائے تھے۔ انہی چیزوں کے ساتھ ساتھ ہمیں (Beaked Adazes) یعنی پتھر کے آروں کا بھی پتہ چلتا ہے اور سر کے شکار کرنے کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔‘‘

ڈاکٹر ریچارڈ لکھتا ہے کہ:[2]

’’ اس دور کے لوگ جن جھونپڑیوں میں رہتے تھے وہ درختوں کے پتوں اور

---

[1] پروفیسر کالیداس ناگ کی کتاب ’’انڈیا اینڈ دی پیسفک ورلڈ‘‘ صفحہ ۱۲۶ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۱ء۔

[2] ڈاکٹر ریچارڈ کی تصنیف ’’دی ملایاز‘‘، صفحہ ۶۔

چھالوں سے بنائی جاتی تھیں، پھل اور ترکاریاں ان کی عام خوراک تھیں ۔ پھر وہ مچھلیوں اور جنگلی جانوروں کا بھی شکار کرتے تھے ۔ مگر بورنیو کے دایاک (Dayaks) اور سماٹرا کے باتاک شکل وصورت، قامت اور جسامت میں جشیائی لوگوں سے زیادہ صاف اور خوبصورت ہوتے تھے (اور چنانچہ اب بھی ہوتے ہیں) ۔

## آہن اور کانسی کا زمانہ

مگر یہ سب حجری دور تقریباً ایک ہزار قبل مسیح کے آغاز تک ختم ہوجاتے ہیں کیونکہ اس آخری دور کے فوری بعد ہی لوگوں نے کانسی (Bronze) اور آہن (Iron) کا استعمال شروع کردیا تھا ۔ کانسی کے دور میں ٹین اور تانبے کی آمیزش سے چیزیں تیار کرنے کا آغاز ہو چلا تھا ۔ برتن، اوزار، حربات اور موسیقی کے آلات سب اس زمانہ میں بننے لگے تھے ۔ اس دور کی یہ تمام چیزیں بقول "ہین گیلڈرن" دریافت کی جا چکی ہیں اور شہر جکارتا کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں ۔ اس زمانہ میں ان آلات وحربات کے علاوہ ڈھول بنانے کی بھی صنعت کا پتہ چلا ہے ۔ کیونکہ اس وقت کے بنائے ہوئے کانسی کے ڈھول بھی عجائب خانۂ مذکور میں موجود ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان ڈھولوں کو شادی بیاہ کی تقاریب میں یا پھر مذہبی فرائض کے انجام دینے کی صورت میں استعمال کرتے ہوں گے ۔

اس دور کے بعد ہی تقریباً ۳۰۰ق م میں زمانۂ حدید یا آہن کے استعمال کا زمانہ شروع ہوا جس کے آغاز کا سب سے پہلا مقام ان جزائر میں بقول پروفیسر ناگ جزیرۂ سماٹرا ہے جہاں یہ کلچر ان سوداگروں کے ذریعہ پہنچا جو جنوبی چین اور شمالی مشرقی ہندوچین سے آئے تھے ۔ چنانچہ محققین کی رائے ہے کہ لوہے کی

دھاتوں کو پگھلانے اور ان کو باقاعدہ لوہے کی شکل میں لاکر حسب ضرورت آلات کی صورت میں تشکل کرنے کے فن سے لوگوں نے اسی دور میں واقفیت پیدا کرلی تھی کھیتوں میں چلانے کے ہل، لڑنے کے ہتھیار، کام کرنے کے اوزار سب کچھ اب لوہے سے بنے لگ گئے تھے۔ اسی طرح یہ دونوں زمانے قبل از تاریخ کے عہد میں ترقی یافتہ زمانے خیال کئے جاتے ہیں۔ چونکہ ہندو مذہب اور تہذیب کا آغاز اس ملک میں اس دور کے تقریباً پانچ سو سال بعد یعنی سن عیسوی کے آغاز میں ہوا ہے اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں ہندو مذہب کے آنے سے قبل ہی لوگ بہت کافی مہذّب ہوچکے تھے اس دور کی بنی ہوئی چیزیں آج دریافت کرلی گئی ہیں اور "جکارتا" کے عجائب خانہ میں موجود ہیں لہذا آج ان سب چیزوں کی مدد سے یہ دریافت کرنا آسان ہوگیا ہے کہ اس وقت کے اندونیشیوں کے ابوالآبا تہذیب تمدن میں کس حد تک اور دیگر باشندگانِ عالم کے ساتھ چشم نما تھے۔ چنانچہ "ہین گیلڈرین" لکھتا ہے کہ[۱]:-

"زمانۂ قبل تاریخ کے ان تمام ادوار کی وہ ساری چیزیں جو سماترا، جاوا، دیگر جزائر اندونیشیا میں برآمد ہوئی ہیں ان کا تقابل جب ان اشیاء کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کی دریافت جنوبی مشرقی ایشیاء کے دیگر حصوں مثلاً فلپائن اور جاپان میں ہوئی ہے تو پھر یہ نتیجہ اخذ کرنے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی کہ موجودہ اندونیشیوں کے مورثین اعلیٰ چین کے علاقہ "یونن" (Yunnan) سے یا انڈوچین کے علاقہ "ٹون کن" (Tonkin) سے آئے تھے" قریب قریب یہی رائے ایک دوسرے ماہر انسانیات پروفیسر "کینس" (Kens) کی ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو ہین گیلڈرین کی کتاب "سماترا۔ اٹس ہسٹری اینڈ پیوپل" مطبوعہ وائنا ۱۹۳۵ء۔

## اس دور میں لوگوں کا رہن سہن

بہر حال اس کانسی اور آہن کے دور میں لوگوں کے عام رہن سہن اور بود و باش پر روشنی ڈالتے ہوئے "پروفیسر کالیداس ناگ" لکھتا ہے کہ:-

"تحقیقات[۱] سے یہ دریافت ہو چکا ہے کہ اس دور میں لوگ قدیم ادوار کی طرح گاؤں بسا کر رہتے تھے اور اک مقام سے دوسرے مقام پر بھی جاتے تھے مگر اس دور میں گاؤں کی زندگی بڑی عجیب تھی۔ کیونکہ ہر گاؤں بہت سی چھوٹی چھوٹی ڈہانیوں میں تقسیم تھا۔ ہر ڈہانی میں ایک سردار حاکم کے طور پر رہتا تھا۔ اگرچہ وہ مطلق بادشاہ تو نہ ہوتا تھا مگر اس سے کچھ کم بھی نہیں کہہ سکتے۔" اسی طرح قانون کی اس دور میں کیفیت کیا ہو گی؟ یہ محض ایک ظنی اور قیاسی چیز ہے۔ قانون اور ضابطہ ہر ملک میں اس کے اپنے زمانہ تحریر کی چیز ہے۔ قبل تاریخ کے دور میں جہاں تک کہ مورخین کا اس باب میں متفقہ فیصلہ ہے محض رسم و رواج پر قانون اور قانونی فیصلوں کا دارومدار تھا۔ البتہ جہاں تک تفصیلات کا تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ زندگی اس دور میں بالکل سادہ تھی، تکلف اور تصنع بالکل نام کو نہ تھا۔ لوگ سیدھے سادھے اور بے دغل ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے دور کی چیزیں ان کی سادگی اور سیدھے پن پر دلالت کرتی ہیں۔

مذہب بھی اس زمانہ کے لوگوں کا دور حجری کے لوگوں کی طرح مظاہر پرستی تھا۔ بقول کالیداس ناگ "سماترا" کے "کابو" اور مینتوائی (Mentwai) لوگوں میں بھی ہندوستان کے قبل از تاریخ کے عہد کے لوگوں کی طرح جانوروں کی قربانی کرنا ان کے عقیدہ کے لحاظ سے بہت بڑی چیز تھی۔ اسی طرح وہ پوشیدہ

---

[۱] کالیداس ناگ کی کتاب "انڈیا اینڈ دی پیسفک ورلڈ" صفحہ ۱۲۶-۱۲۷ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۱ء۔

قوت (جس سے ان کی مراد بھوت، پریت، آسیب اور دیگر روحیں ہیں) پر بھی ایمان رکھتے تھے،" "اندونیشیا کے عصر حاضر کے بعض مورخین کا خیال ہے کہ اسی قسم کے عقائد چونکہ آج بھی بورنیو، سماترا، جاوا، سلیبس، امبون، سیرام، تیمور، اور نیوگنی کے جنگلوں میں بسنے والے ان لاکھوں وحشیوں میں پائے جاتے ہیں جو اب تک اپنے اسی حالِ قدیم پر قائم ہیں اور جن پر باہر سے آنے والے مذاہب (مثلاً ہندوازم، بدھ وازم، اسلام اور نصرانیت) کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں کے آنے سے قبل کے عہد قبل از تاریخ میں نوسنتارا (اندونیشیا کا جیسا اس زمانہ میں نام تھا) کے باشندوں کا مذہب تھا، ان وحشیوں میں بھوت پریت آسمانے، اور ان کے اثر سے بیماریوں کے عارض ہونے کا بھی عقیدہ ملتا ہے، یہ لوگ سورج کی عظمت کے بھی قائل ہیں، پرانی روحوں کی حاضرات بھی انتر منتر کے ذریعہ کرتے ہیں۔ بقول مصنفین اندونیشیا ان میں جو قصے مشہور چلے آتے ہیں ان سے بھی اسی قسم کے مذہب کی سراغ رسانی ہوتی ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ آگ روشن کرکے اس کے گرد ناچنا بھی ان کے نزدیک عبادت تھا کسی مریض کے شفایاب ہونے پر بہَینس (کرباو) کی قربانی کرتے تھے۔ بت پرستی کا نام و نشان نہ تھا، نہ ان میں ہندوؤں کے سے دیوی دیوتاؤں کا پتہ چلتا ہے البتہ وہ سارے عالم کی ایک بہت بڑی چھپی ہوئی قوت (جس سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہی ہوسکتی ہے) کے بھی قائل تھے۔ سورج کی عظمت اور آگ وغیرہ کے سامنے ناچنے کا طریقہ عبادت ہندوستان سے آئی ہوئی نسلوں کے اثر سے معلوم ہوتا ہے۔

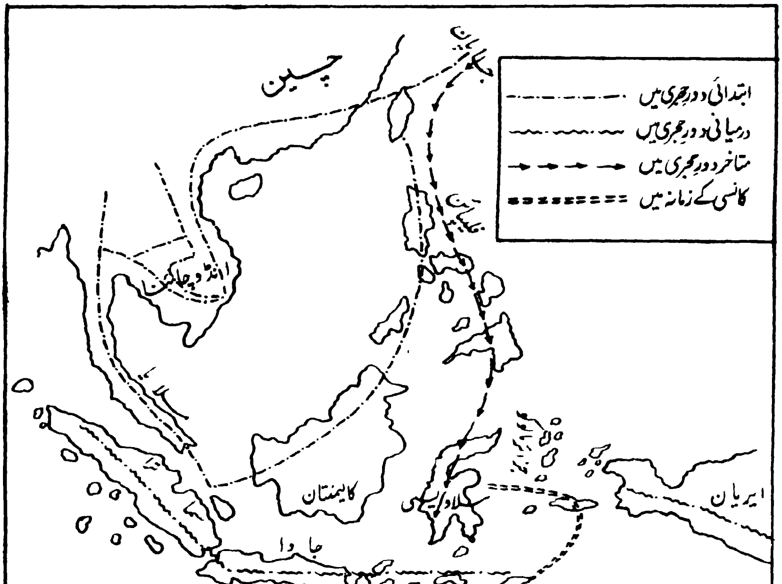
چنانچہ "مسٹر لوکلے" (Locle) کا بیان ملاحظہ ہو وہ لکھتا ہے کہ:۔

" سماترا کے باتاک، بورنیو کے دایاک، اور منہاسا کے بوگی، نیوگنی کے پاپن اور دیگر وحشی آبادی کے لوگوں نے مذہب سے متعلق تمام پیچیدہ خیالات اور بت پرستی کے بعض نظریے (جو اگرچہ پورے طور سے ہندوستان کی سی بت پرستی پر محمول نہیں کئے جا سکتے) دورِ مابعد کے ہندومت سے کسی قدر لئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح فلسفیا خیالات کے ماتحت بھوت پریت کو جگانا بھی ہندو مذہب ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے پھر یہی خیالات غالباً 'انڈونیشیا' سے 'پولنیشیا' پہنچے تھے۔"

اب اس بیان سے اس عہد کے مذہب کی پیچیدہ گتھی قدرے سلجھ جاتی ہے اور اب یہ سمجھنے میں زیادہ دقّت باقی نہیں رہتی کہ اس دورِ اواخرِ عہدِ قبل از تاریخ میں یہاں کے لوگوں کا مذہب بھی ترقی یافتہ قسم کی مظاہر پرستی تھا۔ لیکن پھر بھی قدیم عہدِ حجری کی طرح ہوا، پانی، آگ، خاک، باد، حجر، شجر، دریا، آبِ رواں، طوفانِ آبِ رواں اور صاعقہ وغیرہ کو بھی مقامِ الوہیت حاصل تھا (جیسا کہ پاکستان کے قدیم دراوڑیوں اور آریوں کی سرگذشتِ مذہبی میں ملتا ہے) کیونکہ تا ہنوز یہاں شعورِ انسانی اسقدر ترقی پر نہیں پہنچا تا کہ وہ کائناتِ خلق کے صفاتِ جلالی و جمالی کو دیکھ کر حقیقی صانع قدرت کی طرف رجوع کرتا اور برگزیدہ انبیاء کی تعلیمات سے متاثر ہو کر، خدا، ماننے والے انسانوں کی طرح خدائے وحدہٗ کو مانتا۔ لہذا وہ انہی مصنوعات میں الجھکر رہ گیا اور اپنی محدود اور غیر مہذّب عقل کی عدم رسائی کے باعث انہی صفات کو 'قوتِ اعلیٰ' سمجھنے لگا۔ مذاہب کی تاریخ میں اسی کا نام مظاہر پرستی ہے۔ یہی مظاہر پرستی اس دور کے یہاں کے انسان کی بقول مورخین 'روحِ مذہبی' تھی، جس کا نمونہ بقول انڈونیشیا کے بعض ادبا اور مصنّفین آج بھی جزائر کے وحشت زدہ

حلقوں میں نظر آرہا ہے۔ اور لاکھوں کی تعداد میں آج بھی یہاں کے پہاڑوں، وادیوں اور دشت و ہامون میں گم گشتگانِ منزل پھرتے ہیں، جن کے بزرگوں کی زندگی بھی اس نہج پر تھی، جو اس عہدِ قبل از تاریخ میں ان پہاڑی گپھاؤں میں یا دریاؤں کے قرب میں بستے تھے۔ اب اگلے اوراق میں عہدِ تاریخ کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔

---




زمانہ قبل تاریخ میں نسلوں کی جنوبی مشرقی ایشیا سے انڈونیشیا میں نقل و حرکت

# فصل سویم

# عہدِ تاریخ

اس فصل میں آغاز تاریخ کے زمانہ اور اس کی مبادیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہندو اور بدھ مذہب کا ہندوستان سے آنا، اور باقاعدہ اس ملک میں شائع ہو جانا، ان کی ابتدائی اور انتہائی حکومتیں، ان حکومتوں کی وسعتیں، ان کی تہذیب، ان کا تمدن، ان کے آدابِ حکمرانی، ان کے اصول زندگانی، ان کا کردار، ان کا اخلاق، غرض یہ سب کچھ بخوف طوالت نہایت ہی اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ دور جسے عموماً عہدِ تاریخ کے زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے اس ملک کی تاریخ کا ایک نہایت ہی طویل دور ہے جو تقریباً میلادِ مسیح کی پہلی صدی سے شروع ہو کر سوا ہزار برس اس ملک پر مسلّط رہا ہے، اور تہذیب و تمدن کے مختلف انداز مختلف صورتوں میں پیش کرتا رہا ہے جس کے آثار اب بھی اس ملک میں کسی حد تک پائے جاتے ہیں۔ آخر میں ہندو تہذیب کے اسبابِ زوال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہانتک کہ پھر اسلام

کا داخلہ شروع ہوجاتا ہے لہذا اس پوری فصل کو " تمدن " کے موضوع کے
پیش نظر ذیل کے خاص خاص ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے مثلاً : -

(۱) عہدِ تاریخ کا آغاز اور ہندوؤں کی ابتدائی حکومتیں -

(۲) ہندو تہذیب کا عروج و زوال -

# باب اوّل

## زمانۂ تاریخ کا آغاز

## اور

## ہندوؤں کی ابتدائی حکومتیں

### علمائے تاریخ کی رائے میں ہندوؤں کا پہلا قدم

بہرحال اس ملک (اندونیشیا) میں "زمانۂ تاریخ" کی ابتدا ہندوستان کے ہندوؤں کی آمد کے وقت سے شروع ہوتی ہے مگر تاریخی حیثیت سے صحیح طور پر یہ تعیّن کرنا کہ ہندو ہندوستان سے چل کر اس ملک میں کب پہنچے۔

### ہندوستان[1] کے ہندو

"اندونیشیا" پر (جس کا زمانۂ قبل تاریخ میں یا ہندوؤں کے آنے کے وقت "نوسنتارا" نام تھا) ہندو تہذیب، ہندو تمدن اور ہندو مذہب کے اثرات ونقوش کو سمجھنے کے لئے اور تاریخی مناسبت سے اس کا ایک مستقل سلسلہ قائم کرنے کے لئے پہلے یہ جاننا بھی ضروری

کس طرح پہنچے، اور سب سے پہلے کس مقام پر پہنچے آج تک علمائے تحقیق اور ارباب تاریخ کے لئے ایک لانحل سا معمہ بنا ہوا ہے جس پر یونانی، چینی، ولندیزی اور خود اندونیشی محققین بھی کسی قطعی فیصلہ کے ساتھ صحیح رائے قائم نہ کر سکے۔ البتہ تاریخوں میں اس ملک میں ہندؤوں کے آنے کی وجہ اور ان کے زمانۂ آمد کے متعلق جو تفصیلات مورخین نے قیاساً درج کی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس ملک میں سب سے

---

ہے کہ وہ ہندو جو اس ملک میں آئے خود اپنے وطن (یعنی ہندوستان) میں کس طرح دوسری نسلوں کے امتزاج سے اور دوسری تہذیبوں کے اختلاط سے معرض وجود میں آئے تھے۔ ان سے پہلے ہندوستان کے عقائد اور وہاں کے تمدن کو الٹ کیا تھے اور پھر ان کے دور میں ان کی کیفیتیں کیا گذریں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ خود وہاں کی تاریخ کا ایک جداگانہ باب ہے مگر اس مقام پر محض تعارفی حیثیت سے بطور پس منظر کے نہایت ہی اجمال کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

چنانچہ آج ہندوستان کے قدیم مورخین کی تحریرات سے یہ امر منکشف ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں 'ہندو' نام کی قوم کے معرض وجود میں آنے سے قبل باہر سے آنے والی ایک بہت ہی مہذب قوم تھی جسے 'آریا' کہتے ہیں اور جن کا زمانہ ہندوستان میں ۱۱۰۰ق م ہے یا بعض محققین کی رائے کے مطابق ۲۱۰۰ ق۔ م ہے۔ ان سے پہلے 'ہندوستان میں جو لوگ بستے تھے وہ 'دراوڑی' کہلاتے ہیں اور 'دراوڑیوں' سے پہلے بھی جو لوگ آباد تھے۔ انھیں مورخین نے 'مونڈا یا کول' کے عنوان سے لکھا ہے اور شائد 'مونڈا' سے پہلے بھی کوئی قوم اور گذر چکی ہو مگر اس کی نشانیاں نہیں ملتیں اس لئے سب سے پرانی قوم جس کا زمانۂ حیات تقریباً سات ہزار قبلِ مسیح تھا 'مونڈا' ہی تھی۔ اس قوم کے لوگ بھی سیاہ فام، پست قامت، اور رہنے بسنے والے لوگ تھے ان کے متعلق جو آثار ہندوستان کے جابجا حصوں میں ملے ہیں وہ ان آثار سے ملتے جلتے ہیں جن کی تفصیلات ماہرینِ اثریات

پہلے تجارت کرنے کے خیال سے آئے تھے اور ان کے اس آنے کے سلسلہ میں مدت کا تعین بھی عموماً ایک یونانی مؤرخ کی تحریر کے حوالہ سے پہلی صدی عیسوی میں کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں اس یونانی 'مؤرخ' کی تحریر ہی کو سب سے پہلی معلومات سمجھا گیا ہے۔ جو ۷۰ء سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جس میں اس نواح کے ایک شہر کا نام "کرسی" (Chryse) یعنی سونے کا ملک لکھا ہے جس کی تجارت

---

نے 'نوسنتارا' کے قدیم انسانوں کے سلسلہ میں کھدائی کے ذریعہ سے تلاش کر کے نکالی ہیں اور ان کا ذکر اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ پھر اسی طرح پانچ ہزار قبل مسیح کی دہ ڈراوڈی قوم جس کے کلچر کے آثار پاکستان کے ایک قدیم شہر 'موئن جی دارو' میں ملے ہیں وہ بھی نوسنتارا 'کی میلینشیائی' نسل کے کلچر سے بہت زیادہ مماثل ہیں۔ بہرحال ہندوستان میں اس قوم سے آن کر مخلوط ہو جانے والی قوم وہ آریائی قوم ہے جو وسطِ ایشیا یا کوہ قوف کی طرف سے نکل کر ہندوکش کی راہ سے پنجاب میں آئی تھی اور پھر سندھ یا اور دوسرے ہندوستانی مقامات میں فاتح کی حیثیت سے پھیلتی چلی گئی۔ ان کی زبان سنسکرت تھی کہ جو قدیم ایران کی ایشیائی زبان، یا یورپ کی آریائی زبانوں سے ملتی جلتی تھی، چنانچہ ماہرین لسانیات نے بھی یورپ کی ان زبانوں کو جو سنسکرت سے کسی نہج بھی ملتی جلتی ہیں، آریائی زبان، کہا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ خود 'ایران' کا لفظ 'آریا' کی وطنی مناسبت سے وضع ہوا ہے جو پہلے آریائی تھا اور اب ہزاروں برس کے استعمال سے 'ایران' ہے۔

**وید** | بہرحال یہ آریہ لوگ بالکل ابتدا میں خانہ بدوش تھے، اور ایک نظام کے ماتحت کاشت بھی نہیں کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ بسنے لگے اور کاشت بھی کرنے لگے۔ ان کے خاص جانور گھوڑے اور گائے تھے۔ ان جانوروں سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ بلکہ وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو آج بھی گائے کو مانتا ہے بلکہ اس کا بڑا احترام کرتا ہے

جنوبی ہند کے تین خاص بندرگاہوں کے ساتھ جاری تھی۔ مگر اسکندریہ کے ایک مورخ "پرولی مابوس" (Prolemacus) نے اسی "کرسی" شہر کو "کرسوتی سوس" (Chersonesos) قرار دیا ہے۔ جو غالباً اس کی اپنی زبان کا ترجمہ ہے اور اس سے بھی اس کی مراد 'سونے کے ملک' ہی کی ہے۔ جس سے 'اندونیشیا' کے مورخین خصوصاً سنوسی پانے[۵۱] کی مراد ملایا کے مشہور جزیرہ نما (سمینان جونگ) سے ہے

[۵۱] "سجارا اندونیشیا"، مصنفہ سنوسی پانے صفحہ ۲۲ مطبوعہ جکارتا ۱۹۵۰ء۔ (بزبان اندونیشی)

رسم گتو گتونری مشہور ہے ان کے مذہب کے متعلق تفصیلات کا ہندوستان کی پرانی کتابوں یعنی ویدوں سے پتہ چلتا ہے۔ جو تعداد میں چار ہیں مثلاً (۱) رگ وید۔ (۲) سام وید۔ (۳) اتھروید اور (۴) یجروید 'رگ وید' میں گیت ہیں جو دیوی دیوتاؤں کی مدح میں پوجا کے وقت گائے جاتے تھے بلکہ ان کا گانا ہی پوجا تھا۔ دیوی دیوتاؤں میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا 'اندرا' تھا جو لڑائی اور بارش کا دیوتا مانا جاتا تھا 'اگنی' آگ کا 'سوریا' سورج کا اور 'ورونا' چاند کا دیوتا تھا، اسی طرح ہوا کے دیوتا کو 'وایو' کہتے تھے اور وہ سب ان دیوتاؤں کا ایک 'آقا' بھی مانتے تھے اور اسے "پرجاپتی" کہتے تھے۔ جب ان کی پوجا کرتے تھے تو گاتے تھے اور ہر ایک کی مدح کے لئے جدا جدا گانے تھے جنھیں وہ منتر کہتے تھے اور یہ گانے والے شروع میں گھر کے بزرگ تھے پھر یہی برہمن کہلاتے تھے۔ جو گاتے وقت سوم (ایک خاص قسم کی شراب ہوتی تھی جو جو سے تیار کی جاتی تھی) پیتے تھے۔ ان کے نزدیک عام عقیدہ یہ تھا کہ یہ دیوی دیوتا سب آگ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ گاتے وقت آگ بھی روشن کرتے تھے۔ چنانچہ ہندوؤں کے مندروں میں اب بھی 'چراغاں' کا عام رواج ملتا ہے۔

اسی طرح دوسری مذہبی کتاب 'سام وید' ہے جس میں رگ وید ہی کے منتر

جو اہل یوروپ کے خیال کے مطابق قدیم زمانہ میں سونے کے لئے بہت مشہور تھا اور اب بھی تجارت کا خاص مرکز ہے۔ غالباً اس زمانہ میں جاوا ہی کو "یاوادیپا" کہتے تھے اور اسی طرح سماترا "انڈالاس" کہلاتا تھا چنانچہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ "آبادیو" جو قدیم تحریرات میں آیا ہے اس سے مراد بھی یہی جزیرۂ جاوا ہے۔ جو جنوبی ہند کے قدیم ہندو تاجروں نے دریافت کرلیا تھا اور وہ اس کے ساتھ تجارت کرتے تھے بلکہ وہ اس کی بدولت ان جزائر کے

---

بیان کئے گئے تھے۔ تیسری کتاب اتھر وید ہے جس میں بیماروں کو صحت میں لانے کے منتر تھے اور چوتھی کتاب یجر وید میں جادو ٹونے اور ٹوٹکے کرنے کے منتر تھے جن پر عمل کرنا حصول استدراج کا بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ آج بھی جوگی لوگ اپنی جوگت میں اس کو بڑی اہم سمجھتے ہیں مگر یاد رکھنا چاہئے کہ آریاؤں کے وقت میں صرف ایک وید تھا یعنی رگ وید اور اسی مناسبت سے وہ زمانہ بھی رگ وید کا زمانہ کہلاتا ہے بقیہ تین وید راماین اور مہابھارت کے دور میں برہمنوں نے تیار کئے تھے جن سے مذہبی پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔

**تمدن کی عام حالت**

بہرحال ان کی اس عبادت کے لئے کسی مندر کی ضرورت نہ تھی، اور نہ رشی "تارک الدنیا" ہوتے تھے، آریوں کی تہذیب کا یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں "رگ وید" کا زمانہ کہلاتا ہے۔ یہ زمانہ رہائش اور تہذیب کے اعتبار سے بھی بہت سادہ تھا۔ سوسائٹی کی عام حالت بہت سادہ تھی۔ مرد اور عورت سب متاہل زندگی گذارتے تھے۔ شادی بیاہ کا رواج تھا۔ البتہ طلاق نہ ہوتی تھی۔ اور نہ بیواؤں کی شادی ہوتی تھی۔ روح کو ابدی مانتے تھے۔ اور تناسخ کے قائل تھے ان کا خاص پیشہ زراعت تھا، چنانچہ سنسکرت میں "آرین" کے معنی ہی کاشت کار کے لئے جاتے ہیں غرض برہمنوں کے علاوہ اور لوگ گوشت بھی کھاتے تھے، سیر و شکار بھی کرتے تھے اور تیر و کمان اور جال سے شکار پکڑتے تھے۔ طرز حکومت بھی بہت سادہ تھا ہر فرقہ کا سردار جدا ہوتا تھا جسے وہ "راجن" یا "وِشپتی" کہتے تھے۔ اور ان کے صلاح کار،

جغرافیائی حالات سے بھی واقف ہو گئے تھے ۔ چنانچہ انہی کی بہم پہونچائی ہوئی معلومات سے ایک یونانی مورخ اور جغرافیہ داں 'ٹالمی (Patolemy) نے ۱۵۰ء میں اپنی جغرافیہ میں اس ملک کی بھی تفصیلات درج کی تھیں اور ان جزائر کو "جزائر زمردیں" لکھا تھا ۔ جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ اس وقت کے ہندو 'سفنارا' کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتے تھے اور ان کا یہ جاننا ان کے اس نواح میں وارد ہونے پر دلالت کرتا ہے اور

---

راج پروہت کہلاتے تھے ۔ لڑائی کے وقت جنگ کے دیوتا سے دعا مانگتے تھے ۔ سزائیں بہت ہلکی تھیں ۔

غرض تاریخ میں یہی قوم ہندو کہلاتی ہے ۔ جو رفتہ رفتہ مشرق اور جنوب کی طرف بھی بڑھتی چلی گئی حالانکہ شروع میں کئی سو برس سندھ اور ستلج کے درمیان ہی آباد رہی اس کے مشرق کی طرف بڑھنے کا زمانہ تقریباً سنہ ۱۳۰۰ ق ۔ م ہے جبکہ یہ لوگ جمنا اور جمنا کے پاس آکر بسے تھے ۔ دریاؤں کے یہ نام بھی انہی کے رکھے ہوئے ہیں ۔

## راماین اور مہا بھارت کا زمانہ

ان کے اس حملہ کے بعد ہی رامائن اور مہابھارت کا دور شروع ہوتا ہے ۔ ان میں سے کچھ لوگ ہمالیہ کے دامن میں نیپال کے پاس بھی آباد ہوگئے تھے ۔ جہاں ان کی قائم کی ہوئی ریاستوں میں دو بہت مشہور ہیں ۔ پہلی ریاست شاکیہ اور دوسری لکشویہ کہلاتی تھی ۔ شاکیہ کی راجدھانی کپلاوستو تھی جو موجودہ بنارس سے تقریباً سو میل دور واقع ہے ۔ اور لکشویہ کی راجدھانی 'ویسالی' (جو اب پٹنہ کا ایک شہر تھا ۔ یہ دونوں ریاستیں بدھ مذہب کی تاریخ میں بہت مشہور رہیں ۔ کیونکہ 'گوتم بدھ' اسی پہلی ریاست کے راجہ شدھودھن کے بیٹے تھے اور دوسری ریاست کی شہزادی چندرگپت موریہ سے منسوب تھی ۔ جس کے پوتوں میں 'اشوک' ایک بڑا بدھ راجہ گذرا ہے ۔

## مدھیہ دیش

اسی طرح گنگا اور جمنا کے پاس بھی آریوں نے چند ریاستیں قائم کر لی تھیں اور اسے وہ 'مدھیہ دیش' کہتے تھے ۔ اس دیش میں ان کی دو ریاستیں

بقول پروفیسر کالیداس 'دیاوادیپا'، کا لفظ رامائن میں بھی 'ایک شادی کے سین' میں وارد ہوا ہے جس کے متعلق "سنوسی پانے" کا خیال ہے کہ یہ حصہ رامائن میں غالباً پہلی صدی عیسوی میں شامل کیا گیا تھا۔

بہرحال ان تمام تفصیلات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان اور نوسنتارا، (انڈونیشیا) کے درمیان تجارت کی راہ و رسم قائم تھی۔ اور سوداگر جنوبی

---

بہت مشہور تھیں ایک کرو اور دوسری پنچال ۔ کرو حکومت موجودہ دہلی کے شمال میں تھی جس کی راجدھانی 'ہستناپور' تھا اور پنچال کا صدر مقام کاسپلیہ قنوج کے قریب واقع تھا۔ ان دونوں ریاستوں کے درمیان کروکشیتر کے میدان میں ایک خوفناک لڑائی ہوئی تھی جسے تاریخ میں مہابھارت کہتے ہیں ۔ یہ ہندو مذہب اور آریائی ہندوستان کا ایک اہم واقعہ خیال کیا جاتا ہے ۔

### اجودھیا اور دیگر ریاستیں

بہرحال اسی طرح ریاست 'پنچال'، کے مشرق میں 'کوشل'، اور کوشل کے مشرق میں 'ودیہہ' کی بہت مشہور ریاستیں تھی ۔ ان کے دارالحکومت اجودھیا اور متھلا تھے ۔ ہندوؤں کے مشہور پیشوا "رامچندر جی" اسی کوشل ریاست کے راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے ۔ اور ان کی بیوی 'سیتا'، متھلا کے 'راجہ جنک' کی لڑکی تھی۔ ان ریاستوں کے علاوہ وادیٔ گنگا میں پانچ چھ ریاستیں اور تھیں مثلاً :-

| نام ریاست | راجدھانی |
|---|---|
| رنگ | بہ چمپا |
| وتس | کوشامبی |
| کاشی | کاشی |
| سورسین | متھرا |
| جیدی | جندری |

ہند کے ساحلوں سے بحر ہند کو عبور کر کے اس نواح میں پہنچتے تھے اور یہاں کے گرم مصالحہ اور دیگر اجناس سے مستفید ہوتے تھے۔

**ایک قدیم ریاست**

دسنوسی پانے، اسی تسلسل میں آگے لکھتا ہے کہ اس دور میں "نوسنتارا" کی حکومت جس کے متعلق کچھ تحریری آثار دریافت ہوئے ہیں۔ وہ 'کوتائی' (واقع کالیمنتان) میں قائم تھی یہ تحریر حال ہی کی دریافت ہے

یہ سب شخصی حکومتیں تھیں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں قائم تھیں۔ پھر یہ ہند و جنوب مشرق میں بڑھ گئے جہاں انھوں نے 'اونتی اور کامبوج' کی ریاستیں قائم کیں۔ ان میں سے پہلی کا دارالحکومت 'اجین' تھا اور دوسری کا دوارکا تھا چنانچہ ہندوؤں کے مشہور مذہبی پیشوا 'سری کرشن جی' اسی دوارکا کے حکمراں تھے۔ اور گیتا اسی مقام پر لکھی گئی تھی پھر ۶۰۰ ق۔م میں بدھ مذہب کا آغاز ہوا (اسکا قائم کرنے والا گوتم بدھ کپل وستو کے راجہ کا لڑکا تھا جس میں آگے چل کر دو فرقے۔ (۱) مہایانہ اور (۲) ہنایانہ بھی بن گئے۔

**ہندو اور سیلون**

بہرحال ہندوستان کے مذہب کی تاریخ میں یہ دور 'رامائن اور مہابھارت کا دور' کہلاتا ہے۔ اسی دور میں ہندوؤں کو لنکا کے راجہ راون کی سرکوبی کے لئے بھی دکن کی راہ سے جنوب میں جانا پڑا تھا۔ کیونکہ راون رامچندر جی کی بیوی "سیتا جی" کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ رامائن میں یہ واقعہ لنکا کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے اور اسی واقعہ کے ساتھ انکے مشہور بندر دیوتا 'ہنومان' کی وفاداری بھی قصہ کے طور پر چلی آتی ہے۔ اس دور میں دکن میں کوئی بڑی اور مضبوط سلطنت نہ تھی البتہ آریوں کے خوف سے بھاگے ہوئے دراوڑی تمام دکن میں دونوں طرف کے ساحلوں تک آباد تھے اور یہ لوگ تامل، تلیگو وغیرہ کہلاتے تھے۔ اس وقت ان کی خاص ریاستیں چول اور چیر تھیں ان کی بولیاں بھی کناری، تامل، اور تلیگو ہی کہلاتی ہیں۔

چنانچہ اسی 'لنکا کی لڑائی' کے وقت سے ہندو لنکا میں تجارت کے لئے آنے جانے لگے

اور چار ستونوں پر کندہ ہے۔ اس تحریر کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر "راجہ مولاورمان" حکمراں تھا اور اس نے برہمنوں کو بطور ہدیہ کے ۲۰۰۰ گائیں اور ایک قطعۂ آراضی بھی نذر گذرانا تھا۔ اسکا یہ نام ہندوستان کے ہندو ناموں سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور ہندوانی نام ہے مگر کچھ تفصیلات دستیاب نہ ہوسکنے کے باعث یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا یہ یہاں پر آنکر آباد ہوجانے والے ہندؤوں کی اولاد تھا یا مقامی باشندہ تھا کہ جس نے

---

غالباً یہیں سے انھیں اور جزیروں کا بھی حال معلوم ہوا ہوگا۔ ان ہندو آریوں کے وقت میں دکن کے دراوڈی تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ اور ایک علیحدہ قوم تھے بعض اندونیشی مورخین کا یہ خیال غلط ہے کہ ہندو، ان دراوڈیوں اور آریوں کے اختلاط وامتزاج سے بنے ہیں۔ بلکہ آریا ہی ہندو کہلاتے ہیں۔ (اوران کا یہ نام بقول البیرونی فتوحات غزنویہ کے عہد سے پڑا ہے)

**برہمنوں کا غلبہ** جن کی مذہبی سادگی اب اس رامائن مہا بھارت کے دور میں بالکل ختم ہوگئی تھی اور پیچ در پیچ بہت سی باتیں پیدا ہوکر برہمنوں کے غلبہ کا ذریعہ بن چکی تھی۔ جو رفتہ رفتہ نہایت عصبیت پرست اور خود بیں ہوکر باہمی جھگڑوں کا سبب بن گئے تھے لہٰذا پوری قوم چار ذاتوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک برہمن دوسری چھتری، تیسری ویش اور چوتھی شودر کہلائی جانے لگی اور ان چاروں میں کاروبار، اور مذہب سب جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ انسانی شرافت اور رذالت کا بھی معیار پھر انہی ذاتوں سے قائم کیا گیا تھا۔ (یہ واقعہ ہے قیاساً ۱۰۰۰ ق۔م کا) حتیٰ کہ پھر یہی ذاتیں تعداد میں زیادتوں کے زمانہ میں جو ۱۳۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک خیال کیا جاتا ہے) بڑھ کر سو تک پہنچ گئی تھیں یہ سب کچھ اسی رامائن کے دور میں ہوا ہے۔ اس دور کے بعد آخری تین وید بھی مرتب کئے گئے تھے۔ اور یہ دور برہمنوں کے غلبہ کا دور کہلاتا ہے جب کہ مذہب کے ساتھ ساتھ حکومت و دولت، علم اور وقار ہر چیز پر برہمن چھائے ہوئے تھے، حتیٰ کہ راجاؤں کے درباری بھی وہی ہوتے تھے

ہندو دھرم اختیار کر لیا تھا۔ اسی کے متعلق ایک اور کتبہ برآمد ہوا ہے جس میں درج ہے۔ کہ ایک گاؤں کے سردار نے دوسرے سردار کو شکست دے کر بادشاہت حاصل کی تھی اس کتبہ کے متعلق ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کتبہ "پلاوا" رسم الخط میں تحریر ہے جو پہلی صدی عیسوی میں چمپا اور جنوبی ہند میں رائج تھا چنانچہ اس رسم الخط کی یکسانیت بھی ہندوؤں کے جنوبی ہند سے اس دور میں یہاں آنے پر دلالت کرتی ہے۔

---

اور پڑھنے پڑھانے والے بھی وہی' ان کے دور سے پہلے وید اور دیگر چیزیں بھی سب زبانی یادداشت پر ملتوی تھیں سینکڑوں سالوں کے بعد یہ سب چیزیں بقید تحریر لائی گئیں تھیں۔ اور اس کام کو انجام دینے والے وہ "رشی" لوگ تھے جو بعد میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے ان ویدوں کو کتابی شکل میں لائے اور انھیں عام فہم کرنے کے لئے باقاعدہ کوششیں کیں اور پھر ان کی شرحیں بھی لکھنی شروع کیں جو دو خاص قسموں پر مشتمل تھیں مثلاً (۱) براہمن اور (۲) ارینک یا شاستر مگر ان کے بعد چھتری راجاؤں کی سعی سے دس کتابیں اور زبانی یادداشت پر مرتب کی گئیں جو "اپنشد" کہلاتی ہیں جن میں روح اور مادہ وغیرہ اور تناسخ کے مسائل پر بحث کی گئی تھی۔ چنانچہ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ "گوتم بدھ" نے اپنے مذہب کی بنیاد انہی اپنشد سے اخذ کئے ہوئے اصول پر رکھی تھی۔ یہ تقریباً ۸۰۰ ق م کا عہد شمار کیا جاتا ہے۔ مگر رامائن اور مہابھارت بقول خود ہندو مورخین ان سے کچھ پرانی ہیں۔ مہابھارت کے اٹھارہ حصے ہیں اور یہ سب .. کوروؤں اور پانچ پانڈوؤں کی باہمی جنگ کی تفصیلات ہیں اور رامائن میں رام چندر جی کے حالات ہیں یہ دونوں کتابیں ہندوؤں کے قدیم انداز شعر و شاعری اور فلسفہ کو واضح کرتی ہیں اور دونوں انواع ادب کے لحاظ سے طویل قسم کے رزمیوں پر مشتمل ہیں

ت زمانہ کے بعد آریوں کے اور دوسری قوموں کے ساتھ خلط ملط ہو جانے۔

## مشرقی جاوا کے قدیم سند

بہرحال سنسکرت کے جو کتبے مشرقی جاوا میں برآمد کئے گئے ہیں وہ بھی 'بیلاوا' رسم الخط میں تحریر ہیں مگر بقول بعض ماہرین وہ بہت بعد کے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی تحریر بہت متفرق ہے اور بعد کے زمانوں کے اندازِ تحریر سے ملتی جلتی ہے چنانچہ ان کتبوں میں سے چار کتبے 'پچی ساڈا' نے (مشرقی جاوا) کے نزدیک اور ایک کتبہ 'ڈنوگو' (جکارتا) کے نزدیک ملا ہے۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ مشرقی جاوا میں "تروما" نام کی ایک بڑی سلطنت تھی اور ایک مشہور راجا 'پورناورما' کے زیرنگیں تھی۔ بقول 'سنوسی پانے' دو پتھروں پر اس راجا کے نقشِ پا بھی تحریر کے ساتھ ساتھ کندہ ملے ہیں چنانچہ اس کی ریاست 'تروما' کا نام 'تو چی تارون' (واقع مشرقی جاوا) میں اب بھی ملتا ہے۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ 'تروما' کے راجہ جنوبی ہند سے آئے تھے۔ مگر کوئی تحریری سند ایسی سردست دستیاب نہیں ہے کہ جس کی رو سے یہ قطعی فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ واقعی جنوبی ہند کے باشندے تھے مگر جنوبی ہند میں 'کوہ مالابار' سے ایک دریا بھی اسی 'ترووما' نام سے نکلتا ہے اور جنوب تک بہتا ہوا آتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان راجاؤں نے 'نوسنتارا' (انڈونیشیا) میں پہنچکر

---

بعد میں سو چھوٹی چھوٹی کتابیں اور لکھی گئیں جو 'سوترز' کہلائیں۔ جن میں مورہ رون یگیوں، جماعتی رسم ورواج کا بیان ہے۔

بہرحال انڈونیشیا میں ہندو اور پھر بدھ مذہب آئے مگر دونوں کی تہذیب میں رنگ کر اسی ملک کے انداز میں ڈھل گئے۔ اور اس طرح انڈونیشیا کا تمدن زیادہ متاثر اور مختلف نہ ہو سکا۔

اپنے وطن کے اسی دریا کے نام پر اس نئی حاصل کی ہوئی سلطنت کا نام منسوب کرلیا ہو۔ بہر حال اسی طرح جنوبی ہند کے مشرقی ساحل (کارومنڈل) پر ایک قصبہ کا نام بھی "سنڈا" مشہور رہے۔ اور یہی نام انڈونیشیا کے جزیروں کے ایک سلسلہ کے لیے جغرافیہ میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ مگر وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا سلسلۂ جزائر کے لئے اس وقت بھی یہ نام استعمال ہوتا تھا یا نہیں۔

**فاہیان کا ورود**

البتہ چینی سیاح "فاہیان" کا جو چندر گپت بکرماجیت کے عہد میں ۴۰۵ء میں ہندوستان کی سیاحت کے لئے پہنچا تھا بدھ مذہب کے مقدس مقامات دیکھکر جب ۴۱۱ء میں واپس لوٹا تو اس نواح سے گذرنا "خراف" اور دیگر تمام مورخین کی تحریرات سے ثابت ہے اس کے لئے مشہور ہے کہ جب وہ واپس وطن کو مراجعت کر رہا تھا تو ان جزائر کے سمندر میں جہاز کے برباد ہوجانے کی وجہ سے بمشکل جان بچاکر ساحل پر پہنچا۔ چنانچہ اپنے سفرنامہ میں اس نے اس مقام کا ذکر کرتے ہوئے چینی زبان میں دی پوتی (Ye-po-ti) لکھا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس سے غالباً مراد یاوادیپا ہی ہے۔ مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا فاہیان کی مراد بھی اس لفظ سے یاوادیپا تھی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس بیان سے ہندؤں کی اکثریت اور بدھ مذہب کی اقلیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چار صدیوں کے اس طویل امتداد میں ہندؤں نے پورے ملک میں اپنا مذہب پھیلا لیا ہو۔

**قدیم چینی روایات**

فاہیان کے علاوہ چین کی اور دوسری مذہبی قسم

کی روایات و درایات اور تحریرات سے بھی اس باب میں بعض مورخین نے استفادہ کیا ہے یہ تمام تحریرات اپنے ادبی کردار کی نوعیت سے بالکل ایرانی 'اساطیر' سے ملتی جلتی ہیں چنانچہ انہی اساطیری روایات سے مستفاد ہے کہ اہلِ چین اس جزیرہ (جاوا) کو "چوپاڈا" (Cho-po) کہتے تھے۔ اسی "چوپاڈا" کے سلسلہ میں ایک کہانی بھی ان مورخین نے لکھی ہے کہ ان نو واردانِ ہندی میں ایک 'بدھ' مذہب کا مشہور 'بھکشو' (مبلّغ) بھی تھا جو کشمیر کے خانوادۂ شاہی سے تعلق رکھتا تھا اور غلبۂ مذہبی کے جوش میں آکر تارک الدنیا ہوگیا تھا۔ اور ملک ملک گھومتا پھرتا تھا۔ چنانچہ اس نواح میں بھی وارد ہوا۔ اور اپنے مذہب یعنی 'بدھ ھنایانہ' کی تبلیغ کرنے لگا۔ یہ شخص "گونا ورمان" کے نام سے مشہور ہے 'چوپاڈا' میں اس کے آنے کی مدت کے بارے میں مورخین نے سنہ ۴۲۴ء کا سال تحریر کیا ہے جبکہ "سیلون" (لنکا) کی تاریخ میں اس کے ورود کا زمانہ سنہ ۴۲۳ء ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص دکن کی راہ سے پہلے 'سیلون' پہنچا ہو اور پھر وہاں سے 'چوپاڈا' (جاوا) میں وارد ہوا ہو۔

بہرحال چینیوں کی اور مزید تاریخوں سے اقتباس کرتے ہوئے بعض اور مورخین لکھتے ہیں کہ سنہ ۴۳۳ء اور سنہ ۴۳۵ء کے مابین بھی ایک سفارت ہندوستان سے "ہولوتان"[۵۱] (Ho-lo-tan) کے ہاں وارد ہوئی تھی۔ پھر "ہولوتان" سے

---

۵۱۔ 'ہولوتان' بھی ایک ریاست کا نام ہے جو 'نوسنتارا' ہی میں کہیں واقع تھی۔ جس کے متعلق صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ آیا یہ وسطی جاوا میں تھی یا مشرقی جاوا میں اور یا اندالاس (سماٹرا) میں تھی مگر تھی ضرور اور 'نوسنتارا' ہی میں واقع تھی۔

اس کے جواب میں سفارتیں ۴۳۶ء اور ۴۴۹ء میں اور آخری سفارت ۴۵۲ء میں ہندوستان بھیجی گئیں تھیں۔ اس طرح ہندوستان کے ساتھ اس دور میں جاوا، کا تجارتی اور مذہبی رابطہ قائم تھا۔ مگر ہولاتان، کی جاوا میں صحیح جائے وقوع کے متعلق روایات مستبعد ہیں۔ اس لئے وثوق کے ساتھ کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی کہ ہولوتان، جاوا کی کس سمت میں تھا۔ البتہ زمانۂ حال کے ایک ' اندونیشی' مورخ کا خیال ہے کہ 'ہولاتان' سے مراد "سمانان جونگ" کا مقام 'کیلانتان' ہے جو اُس دور میں تجارت و حرفت اور مذہب و سیاست وغیرہ کے سلسلہ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور بہت مشہور تھا۔ جس کو چینیوں نے اپنی زبان میں 'ہوتان' کہا ہے۔

اسی طرح چینیوں کی ایک اور روایت سے 'نوسنتارا' (اندونیشیا) کی ایک دوسری پرانی ریاست "کان تالی" (Kan-ta-li) کا بھی پتہ چلایا گیا ہے جس کے تلفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ چینیوں نے غالباً "کنداری" کے لفظ کو بگاڑ کر 'کان تو لی' لکھا ہے۔ کیونکہ 'کنداری' "جزیرۂ اندالاس" (سماترا) کی ایک بہت ہی مشہور ریاست تاریخ میں گذری ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ راجہ "کاؤن ڈن یا" کی ریاست 'پاؤلی' (Paoli) بھی ایک شاندار ریاست رہی ہے مگر چینیوں کے حوالہ سے مورخین نے اس کے صحیح جائے قیام پر اظہار تشکک کرتے ہوئے 'شمالی اندالاس' (شمالی سماترا) لکھا ہے۔

---

مگر چونکہ 'چوپاؤا' کے ساتھ چینیوں نے اسکا تعلق بتلایا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ مغربی جاوا ہی میں ہو کیونکہ بدھ مذہب کا زیادہ تر غلبہ اسی طرف رہا ہے اور چینی بھی مذہباً بدھ تھے اس لئے ان کے بیان کا تعلق اسی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

---

لہ سنوسی پانے کی کتاب سجارا اندونیشا جلد اول صفحہ ۲۰ مطبوعہ جکارتا ۱۹۵۰ء۔

## عہدِ تاریخ کے آغاز کے متعلق مورخین کا قیاس

بہرحال یہ تمام ریاستیں 'انڈونیشیا' کی بہت ہی قدیم اور پرانی ریاستیں ہیں اور اس دور سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ تفصیلات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا بھی کوئی مستقل رواج نہ تھا محض ان کے نام اور ان ناموں کے قرینے بھی دوسرے ممالک کے معاصرین کی سرسری تحریرات سے آج معرضِ علم میں لائے جاتے ہیں۔ ورنہ خود انڈونیشیا کی تاریخیں یا وہاں کے مقامی مصنفین کی تحریرات ان کے بارے میں ضروری تفصیلات پیش کرنے میں واضح نہیں، اب ان معاصرین کی تحریرات کے علاوہ ان کے انشائے نام کا دوسرا ذریعہ قدیم کتبے اور ستون وغیرہ ہیں جو ملک کے جابجا حصّوں سے دریافت ہوئے ہیں اور بہت ہی مختصر معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ انہی کی شہادت پر مورخین نے یہ قیاس کیا ہے کہ اس وقت کے لوگ پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے، چونکہ ان سے پہلے کے لوگوں کے علمی مشاغل پر دلالت کرنے والے اثبات اب تک ہم نہیں پہنچ سکے ہیں اس لئے یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ وہ لوگ غالباً تحریر کے فن سے ناواقف تھے۔ اور یہ فن سنِ عیسوی کے آغاز میں آنے والے 'ہندو' تارکانِ وطن ہی نے اس ملک میں رائج کیا تھا۔ اسی لئے ہندوؤں کو اس ملک میں 'عہدِ تاریخ' کا آغاز کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔

لیکن ان تمام قرائنِ تاریخی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ 'ہندو' اس ملک میں بیک وقت نہیں آئے تھے اور نہ ان کے آنے کی محض ایک ہی کوئی مخصوص حیثیت تھی۔ مختلف مورخین کے مختلف بیانات سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ میلادِ مسیح کی پہلی سات صدیوں میں کسی کسی وقت آتے رہے اور یہاں بستے رہے اُن کی آمد کا یہ سلسلہ کبھی کبھی درمیان میں ختم بھی ہوتا رہا ہے کیونکہ اس درمیانی دور سے متعلق ان کی کسی

نقل و حرکت کی تفصیلات، چینی اور ہندوستانی تحریروں کے حوالوں سے مورخین پیش نہیں کر سکے ہیں۔

## ہندوؤں کی آمد کے متعلق مورخین کی متفقہ رائے

مورخین کا اجماع ہے کہ ہندو اس ملک میں پہلی بار سنِ عیسوی کی پہلی صدی میں آئے تھے چنانچہ مشہور ہندوستانی مصنّف" پنڈت جواہر لعل نہرو" نے لکھا ہے کہ: [1]

"ہندو اس (اندونیشیا) سرزمین میں پہلی بار پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں پہنچے تھے یہ لوگ جنوبی ہند کے رہنے والے تھے چنانچہ کچھ صدیوں کے بعد پھر وہاں بدھ مذہب بھی پھیلا یہاں تک کہ تمام ہند و ملیشیا بدھ ہوگیا۔ ان ہندو نوآباد کاروں نے سب سے پہلی بار ہند چین میں "چمپا" کے مقام پر اپنی نوآبادی قائم کی جواب "انام" کا علاقہ ہے۔ اور تیسری صدی عیسوی میں ایک شہر "پندورنگام" (Pandurangam) آباد کیا اور اس کے بھی دو سو سال بعد کمبوجا (Comboja) کا شہر بسایا جہاں انھوں نے ہندو طرز کی عمارتیں بھی بنائی تھیں اس طرح یہ تجارت کرنے والا طبقہ بھی وہاں جاکر حکمراں ہوگیا اور کبھی کبھی انھوں نے وہاں کے بدھوں سے بھی لڑائیاں لڑیں۔

اسی طرح جنوبی ہند کے "پلاوا" لوگوں نے مولودِ مسیح کی پہلی ہی صدی میں جزیرۂ سماترا میں اپنی ابتدائی بستی قائم کی جو بتدریج بڑھتی رہی حتیٰ کہ پھر تمام جزیرہ نما ملایا بھی اسی بستی میں شامل ہوگیا۔ اس ریاست کا دارالحکومت "سری وجایا" تھا۔ اور

---

[1] پنڈت جواہر لعل نہرو کی کتاب (Glimpses of world History) صفحہ ۱۳۳ خط دربابِ "سری وجایا"، مطبوعہ لندن ۱۹۴۹ء۔

سماترا کے پہاڑوں میں واقع تھا۔

اسی ذیل میں ایک دوسرا اولندیزی مورخ "ڈاکٹر خراف" لکھتا ہے[1] "کہ ان آنے والے ہندوؤں میں سب سے پہلا شخص 'جاوا' کا وہ نبجانے والا حکمراں تھا جو آجی ساکا کے نام سے مشہور ہے اور جو 'چمپا' سے آیا تھا وہی جاوا کا سب سے پہلا باقاعدہ حکمراں گذرا ہے۔ اسی نے جاوی شاعری کی بنیاد رکھی اور اسی نے "ساکا سن" چلایا جو

---

[1] یہ عبارت پروفیسر ڈاکٹر خراف (Dr. H. J. de Graaf) کی کتاب بزبانِ ڈچ "خذخڈینز فان اندونیشی" (Eschiedenis Van Indonesie) یعنی "تاریخ اندونیشیا" کے صفحہ ۱۲ (مطبوعہ ہالینڈ ۱۹۴۹ء) پر بیان کی ہوئی کہانی کا مفہوم ہے اصل عبارت نہیں ہے۔ اس کی اس سلسلہ میں بیان کی ہوئی اصل کہانی ذیل میں ملاحظہ ہو۔

**آجی ساکا کی کہانی** اس ملک (اندونیشیا) میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ چنانچہ ہند و مذہب اور ہند و تہذیب کی آمد کی ساری تاریخ انہی قصوں پر مشتمل ہے انہی قصوں میں سے ایک قصہ جو بہت زیادہ مشہور ہے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ:۔

قدیم الایام میں (جس کی صحیح تاریخ کا آج تک پتہ نہ چل سکا) جاوا میں (جس کے کسی مخصوص قریہ اور شہر کا نام بھی صحیح طور سے کسی کے علم میں نہیں ہے) ایک حکمراں تھا جو نہایت ہی ظالم اور بے رحم تھا۔ انسانوں کا گوشت کھاتا تھا۔ اور خاص طور سے چھوٹے بچوں کا گوشت کھانا بہت پسند کرتا تھا۔ بچوں کی فراہمی کے سلسلہ میں ہر روز کے لئے رعایا کے افراد میں سے خاندانوں کی باری مقرر تھی۔ باری کے مطابق خاندان والے خود ہی صبح کے وقت اپنا نونہال راجہ کا لقمہ بننے کے لئے پیش کر دیتے تھے۔ اس طرح ایک مدت، اور ایک زمانہ گذر گیا اور ہزاروں بچے اس بے رحم اور شقی القلب راجہ کی ہوس کاری کے شکار ہوگئے۔ قضارا اسی زمانہ میں ایک ہندو سادھو جس کا نام "آجی ساکا تھا (چمپا) کا رہنے والا تھا اپنے دو ہمراہیوں کے ساتھ جو اس کے چیلے

عیسوی سن سے ۷۰ سال متفرق ہے۔ اور یہی جاوائی زبان کا سب سے پہلا شاعر بھی مانا جاتا ہے اور اسی کو اس ملک کا قدیم قصوں میں نظم قائم کرنے والا حکمراں بھی قرار دیا گیا۔۔۔ وہ بڑا صاحب سطوت راجہ تھا۔ محل اور مندر بنانے کا سلسلہ بھی اسی نے شروع کیا تھا۔

---

جن میں سے ایک کا نام "دورا" اور دوسرے کا نام "سمبوترا" تھا جاوا کے قریب کسی جزیرہ میں وارد ہوا اور چنداں مقیم رہنے کے بعد جاوا کے اس بے رحم راجہ کا حال سنکر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جاوا چلا آیا اور دوسرے کو اپنا ایک آہنی خنجر دے کر اسی جزیرہ میں چھوڑ آیا اور اسے ہدایت کردی کہ نہ تو وہ اس جزیرہ کو چھوڑے اور نہ یہ خنجر کسی دوسرے آدمی کو دے۔ بالآخر وہ جاوا میں وارد ہوا اور ناواقف ہونے کی وجہ سے ادہر ادہر گھومتا پھرا حتیٰ کہ آبادی کے ایک گوشہ میں ایک بوڑھیا کے گھر جا پہنچا جو اپنے پورے کنبہ کے ساتھ ایک کٹیا میں رہتی تھی۔ یہ سادھو بہت ہوشیار تھا اور استدراج کے فن میں کمال رکھتا تھا۔ للٰہذا یہ واقعات سنکر متعہد ہوا کہ اب جب تک وہ اس راجہ کو نیست ونابود نہ کردے گا۔ کبھی آرام سے نہ سوئے گا۔ اتفاق سے انہی ایام میں بوڑھیا کے خاندان کے ایک بچے کی باری آگئی۔ مگر آجی ساکا نے بوڑھیا کو روک دیا اور خود بچہ کے روپ میں آکر پیش ہو گیا۔ اس کے سر پر اس وقت ایک پگڑی تھی۔ جب اس کو راجہ کے حضور میں پیش کیا گیا تو اس نے ایک سوال کیا کہ اے راجہ میں تیری غذا بننے سے قبل ایک خواہش رکھتا ہوں اسے پوری کردے یعنی میری اس پگڑی کے لمبان کے برابر اپنے ملک میں سے کسی مقام پر ایک چھوٹی سی زمین عنایت کردے۔ آجی ساکا اس وقت نہایت ہی حسین بچے کے روپ میں تھا راجہ کے منھ میں پانی بھر آیا اور اس نے اس کی درخواست منظور کر لی۔

بہرحال آجی ساکا کی پگڑی اتاری گئی۔ اور زمین کے ناپنے کے لئے اس کے پیچ کھولے گئے مگر جیسے جیسے اس پگڑی کے پیچوں کو کھولا جاتا تھا وہ برابر لمبی اور لمبی ہوتی چلی جاتی تھی حتیٰ کہ

اب ایک انگریز مورخ " جے۔ ایس۔ فرنیول" کی رائے بھی ملاحظہ ہو وہ لکھتا ہے[اہ] کہ۔

" یہ تقریباً دوسری صدی عیسوی کا زمانہ تھا کہ ہندوستانی ہندو سوداگر برما سے لے کر انام (ہندو چینی) تک مختلف مقامات تک آباد ہوتے چلے گئے۔ اور اکثریت کے ساتھ خاص طور پر آبنائے ملکا اور جاوا کے شمالی گرم مصالحہ والے علاقہ میں بس گئے۔ یہ آبادکاری

---

وہ اسقدر بڑھی کہ سارا جاوا، اس کے لبان میں آگیا اور پھر بھی اس کا ایک کونا باقی رہ گیا۔ راجہ اب تو بڑا گھبرایا۔ اپنے ملک سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا اور پھر بھی اپنے بچن کے مطابق سائل کا سوال پورا نہ کرسکا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ اک دم آجی ساکا نے اپنا روپ بدل لیا اور اصلی شکل میں رونما ہو گیا یہ دیکھکر راجہ ڈر گیا اور مارے خوف کے سمندر میں کود پڑا آجی ساکا نے کچھ ایسی منتر پڑھ کر اس پر پھونکی کہ وہ راجہ سمندر میں کودتے ہی ایک سفید رنگ کا گھڑیال بن گیا۔ اور آجی ساکا اس کی جگہ راجہ بن گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ جاوا کا سب سے پہلا راجہ تھا۔ اس کے اس کمال کو دیکھکر ہزاروں آدمی اس کے چیلے بن گئے اور اس طرح اس کا مذہب یہاں پھیلتا چلا گیا وہ چونکہ ایک ہندو سادھو تھا لہٰذا لوگ بھی ہندو بن گئے۔

غرض اس طرح راجہ بنجانے کے بعد آجی ساکا نے اپنے ہمراہی کو دوسرے چیلے کے بلانے کے لئے اب اسی جزیرہ میں بھیجا جہاں وہ پہلی بار مقیم ہوا تھا۔ یہ شخص پہنچا اور اپنے راجہ بنجانے والے گورو کی ہدایت کے مطابق اس ساتھی سے خنجر طلب کیا۔ اس کو حالات کا علم نہ تھا لہٰذا گورو کی پرانی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خنجر دینے سے انکار کر دیا۔ یہ چیلا بھی گورو کا ایسا ہی عقیدتمند تھا لہٰذا اک دم سے لڑ پڑا۔ دونوں چیلے بالآخر لڑنے لگے لڑتے لڑتے مر گئے۔ جب اس پر اک مدت گزر گئی اور ان کی کوئی خیر خبر نہ آئی تو آجی ساکا خود اس جزیرہ میں پہنچا اور اس نے وہاں پہنچکر دیکھا کہ دونوں مرچکے ہیں اور ان کے ڈھانچے پڑے ہوئے ہیں تو اسے بڑا صدمہ ہوا۔ آخر اس رنج سے متاثر ہوکر اس نے

---

[اہ] (V.S. Furnivall) کی کتاب (Netherlands india) صفحہ مطبوعہ کیمبرج ۱۹۴۴ء۔

ابتدا میں تجارتی نوآبادی کی شکل میں شروع ہوئی مگر رفتہ رفتہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی صورت میں بدلتی چلی گئی۔ مگر ان کی اس آمدورفت کا سلسلہ گاہے گاہے چھٹی صدی عیسوی تک جاری رہا ہے۔ چنانچہ چھ صدیوں کے اس طویل زمانہ میں یہ آنے والے ہندو ہندوستان کے مختلف حصّوں سے آتے رہے اور اپنے ساتھ مختلف الوضع ہندو تمدّن بھی اس ملک میں لاتے رہے مثلاً ان کے ساتھ مذہبی حیثیت سے کبھی برہمنیّت آئی تو کبھی وشنونیت آئی، کبھی شیو، بدھ کے نظریات نے بھی اس ملک پر غلبہ حاصل کیا۔

## ہندو تہذیب کا اختلاط

بہرحال ہندو اس ملک میں آئے اور ان کی تہذیب بھی ان کے ساتھ آئی۔ ان کی زبان (سنسکرت) اور ان کا مت (ہندو دہرم) بھی ان کے ساتھ آیا۔ یہ لوگ چونکہ تاجر پیشہ بھی تھے لہٰذا بقول محققین کے زیادہ تر ساحلوں ہی پر آن کر آباد ہوئے لہذا انکے تمدن اور تہذیب کا اثر بھی زیادہ تر ساحلوں ہی پر پڑا جہاں رفتہ رفتہ بڑے بڑے شہر بنتے چلے گئے اس لئے ملک کے عوام جو عموماً دیہاتی تھے ان کے اثر سے دور رہنے کے باعث اپنے قدیم، اصول، قدیم روایات ملکی ہی پر قائم رہے۔ چونکہ

دردناک فقرے کہے جو باوزن تھے لہٰذا وہی فقرے شاعری کی جان بن گئے اور اس طرح جاوائی زبان کی شاعری وجود میں آگئی۔ خراف کی تحریر کے مطابق وہ فقرے یہ ہیں:-

"آنا جارہ کا، دتا سوالا، پاڈاجایاں، ساگا باتا نگا"

اب یہ قصہ کہاں تک درست ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ بالی کے ہندوؤں میں بہت مشہور ہے یا میرے نزدیک تو اس قصہ کی وہی حیثیت ہے جو موئن جی دارو (پاکستان) کے متعلق راجہ ماکیان اور اس کی لڑکی ساشی اور اس کے عاشق زار ماہار کا قصّہ ایک ہندو سادھو کے حوالہ سے عام طور سے مشہور کیا جاتا ہے اب یہ کہاں تک درست ہے تاریخ کی حقائق کے ماتحت کچھ نہیں کہا جا سکتا قادری

دولتمندوں کا طبقہ ہمیشہ ہر ملک میں محدود ہوتا ہے، لہذا یہاں بھی ان نو واردوں میں محدود تھا۔ آبادی کی کثرت کاشت کاروں پر مملو تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قدیم تہذیب اور قدیم تمدن جسے ''انڈونیشی کہنا چاہیے'' دیہاتیوں کی آغوش میں محفوظ رہنے کے باعث ہندوؤں کے آجانے کے بعد بھی اپنی اصلی حالت پر باقی رہا۔ اور بقول بعض ''یورپین مورخین'' بلکہ زیادہ غالب رہا۔ پھر ہندوؤں کی آمد درمیان میں کبھی کبھی کئی کئی صدی تک منقطع بھی رہی ہے اس لئے ان کی تہذیب کا زیادہ اثر دیرپا بھی نہ رہ سکا۔ جو لوگ ہندوستان سے ''انڈونیشیا پہونچتے تھے وہ سکونت اختیار کرنے کے بعد وہاں کی عورتوں سے رشتۂ تزویج بھی کر لیتے تھے لہذا وہ کچھ زمانہ کے بعد بالکل انڈونیشی بن جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آئین حکمرانی سے لے کر انداز زندگانی تک ہر امر خواہ وہ مذہب سے متعلق تھا۔ اور خواہ سیاست سے مگر انڈونیشی غلبہ کی وجہ سے وہ خالص ہندوستانی نہ رہ سکا۔ اسی لئے مورخین نے اس ملک کی تہذیب کو ہمیشہ خالص ''انڈونیشی تہذیب'' قرار دیا ہے جو اگرچہ بعض بعض شقوق میں ہندوستانی تہذیب کے اختلاط سے متاثر ضرور نظر آتی ہے۔

اس اختلاط کے غلبہ کا زیادہ بڑا اور آخری دور تقریباً وہ ہے جبکہ ہرش[1] ہندوستان میں حکمراں تھا (جو قنوج میں سنہ ۶۰۶ء سے ۶۴۸ء تک حکمراں رہا)[2]

---

[1] اس راجہ نے دکن فتح کر لیا تھا مگر سنہ ۶۲۰ء میں ایک راجہ پلکیشن نامی سے اس کی بڑی خونریز لڑائی ہوئی اور یہ ہار گیا اس ہار کی وجہ سے اس کا اقتدار دکن سے اٹھ گیا اس کا فاتح راجہ پلکیشن جو چالوکیہ خاندان کا راجہ تھا اور مہاراسٹر کا حکمراں تھا بہت سخت

کیونکہ اس دور میں آنے والے لوگوں نے اندونیشیا میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات پیدا کئے اور وہ لوگ غالباً یا تو شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے امراء اور رؤسا تھے اور یا اعلیٰ طبقہ کے لوگ تھے کیونکہ ان لوگوں نے آنے کے بعد اپنے انقلابات سے حکومتیں قائم کرلیں اور ظاہر ہے کہ ایک مقام سے بے سروسامان نکل کر دوسرے ملک میں جانے والے اور جانے کے بعد حکومت اور اقتدار حاصل کرنے والے کوئی معمولی صلاحیت وقابلیت کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ وہ ضرور تجربہ کار اور آزمودہ کار ہوتے ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً ہرش کی ہاری ہوئی حکومتِ دکن کے کارفرما تھے کیونکہ "مہاراسٹر" کی تاریخ میں ان امراء کا سیلون میں پناہ لینا واضح ہوتا ہے لہذا یہ بھی یقینی امر ہے کہ اس دور میں اندونیشیا پہنچنے والے لوگ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہوں گے۔

بہرحال اس آخری آمد و رفت کے باعث باقاعدہ وہ ہندو، حکومتیں جن کی تاریخیں صرف کتبوں پر کندہ ملتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اندونیشیا میں قائم ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر ایسے دور کا آغاز ہوا جسے باقاعدہ ہندو مذہب کا دورِ عروج کہنا چاہئے جس میں خاص خاص ریاستیں ملایو، سری وجایا یا سیلینڈرا

---

آدمی تھا چنانچہ اس کی فتح سے وہ تمام جرنیل جو ہرش کی طرف سے دکن میں تعینات تھے اب رفتہ رفتہ فرار ہونے لگے، کچھ ان میں سے سیلون چلے گئے اور کچھ لوگوں نے (اندونیشیا) مجمع الجزائر کا رخ کیا۔ غالباً یہی لوگ ہندوستان سے آنے والے ہندو تارکان وطن میں آخری لوگ تھے جو بعد میں اندونیشیا پر قابض بھی ہو گئے تھے۔ اور بڑی بڑی حکومتیں بھی انھوں نے قائم کرلی تھیں۔ (ملاحظہ ہو حالات ہرش)۔

اور کیدیری اور مجاپاہت وغیرہ وغیرہ تھیں پھر ان میں بھی یہ شروع شروع کی ریاستیں مثلاً ملایو، کیدیری اور سلینڈرا، اس قسم کی ریاستیں گذری ہیں جن کی تفصیلات کا تاریخوں میں کوئی مرتب سلسلہ دستیاب نہیں ہے کیونکہ اس دور میں بلکہ آغازِ عہدِ اسلامی تک اندونیشیا میں فنِ تاریخ، کسی حیثیت سے بھی رائج نہ تھا۔ اسلاف کے واقعات اور حکمرانوں کے حالات رامائن اور مہابھارت کے داستانوں کی طرح یا تو سینہ بہ سینہ چلتے تھے یا پھر اس عہد کے رسم و رواج کے مطابق پام کے پتوں پر چاقو کی قسم کی چیزوں سے رومانٹک انداز میں لکھے جاتے تھے جن میں بقول محققین کے نہ تاریخی ثقاہت ملحوظ رکھی جاتی تھی اور نہ سن و تاریخ اور مقام کو قلمبند کرنے کا کوئی لحاظ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس ملک کی ساری تاریخیں اس عہد کی نسبت شرح و بسط کے ساتھ ہر قسم کی تفصیلات بیان کرنے کے باب میں خاموش ہیں۔ البتہ ان کے متعلق ناموں اور ان کے عہد کے سن و سال کا جو مختصر سا سراغ لگایا گیا ہے اس کے صرف دو ذرائع عام طور پر قرار دئے گئے ہیں مثلاً پہلا چینیوں کی اس عہد کی مذہبی کہانیاں جو رطب و یابس سے پُر ہیں اور نہایت مبہم ہیں اور دوسرا ذریعہ جابجا برآمد گئے ہوئے کتبے ہیں چنانچہ پہلا ذریعہ ان بھکشوؤں اور سیاحوں کی وساطت سے بہم پہنچا جنھوں نے سرسری اپنی تحریروں میں بلا کسی دقتِ تحقیق کے ہلکی سی روشنی ڈالدی۔ اور دوسرا ذریعہ پتھروں کی چٹانیں ہیں یا پھر منادر کے دیوار و در ہیں جن پر خود اس عہد کے حکمرانوں نے ان مختصر کتبوں کو نصب کیا تھا۔

بہرکیف آج انہی ذرائع کو کام میں لاکر مؤرخینِ عصرِ حاضر اور محققینِ آثارِ قدیمہ نے مقدمات ترتیب دے کر ان قدیم ریاستوں کی تحقیق کا سلسلہ مرتب کیا ہے اور اس سلسلہ کی پہلی ریاست 'کیڈیری' کو قرار دیا ہے۔ ذیل میں اب انہی ذرائع کے ماتحت محققین کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے ان ریاستوں کی کچھ تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔:۔

## عہدِ تاریخ کی متذکرہ بڑی ریاستوں کے متعلق چینیوں کی مبہم کہانیاں

اندونیشی مورخین کا خیال ہے کہ اس عہدِ تاریخی کی ابتدائی صدیوں میں 'کیدیری'، ضرور ایک بڑی ریاست تھی اور وہ اندلاس (یعنی جزیرہ سماترا) میں قائم تھی مگر اس کے تخت پر کتنے حکمراں گذرے اور کب اور کس طرح اس کا آخری انجام ہوا اس کے متعلق بادثوق طریقہ پر کچھ نہیں کہا جا سکتا چینیوں کی کہانی جو ۶۴۴ء اور ۶۴۰ء کے مختلف زمانوں کے لئے مشہور ہے وہ ایک اور ہی حکومت "مولویَن" (Mo-lo-yen) کے نام کی طرف اشارہ کرتی ہے جو غالباً 'ملایو'، ہی کے لئے مخرب کر کے لکھا گیا ہے اور اس میں راجہ کی طرف سے شہنشاہ چین کے دربار میں ملک کی پیداوار لے کر ایک سفارت کا جانا داضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور دوسری کہانی میں ملایو، موہوسن، تولانگ اور پوہانگ ریاستوں کے نام لئے گئے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ کمبوجا، اور چمپا کا بھی نام درج کیا گیا ہے۔ چنانچہ اندونیشی مصنّف (سنوسی پانے) کا خیال ہے کہ 'موہوسن'، کا اصلی نام 'ماہاسن'، تھا اور ماہاسن قدیم زمانہ میں اس مقام پر ایک شہر آباد تھا جہاں 'سنگاپور'، بسایا گیا ہے چنانچہ ہوسکتا ہے کہ تولانگ اور پوہانگ بھی متحد ہوں اور ایک ہی ریاست کی صورت میں کارفرما رہی ہوں کیونکہ 'تولانگ' کا شہر اب تک بھی ضلع 'لمپونگ'، میں آباد ہے۔

ایک دوسرے چینی سیّاح نے بھی جس کا نام 'ای سن'، تھا 'ملایو' پر کچھ روشنی ڈالی ہے چنانچہ اس کی تحریر سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ملایا، ریاست آبنائے 'ملکا'، پر داقع تھی جہاں سے ہو کر جہاز چین سے ہندوستان اور ہندوستان سے چین جاتے تھے۔ 'ملکّا'، آبنائے پر بڑا شہر تھا اور تجارت کا مرکز تھا مگر اس کا نام 'ملکّا'، کے بجائے 'ملایو'،

لکھا ہے۔ مگر کچھ مصنفین یوروپ کا خیال ہے کہ ملایو، اصل میں اس مقام پر واقع تھا۔ جہاں اب 'جامبی'[۱]، (جزیرہ سماترا کا شہر) واقع ہے اور اس ریاست کا مذہب 'بدھ ہنایانہ' تھا اور کچھ حصہ کے لوگ "مہایانہ" مذہب کے بھی قائل تھے۔

## ان ریاستوں کے متعلق قدیم کتبے

انڈونیشی مورخین کی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی حال ہی میں چار پتھر دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک پر کچھ عبارت کندہ ہے چنانچہ پہلا پتھر 'پلیم بنگ'، کے قریب پہاڑوں سے ملا ہے جس پر ۶۸۳ء کا سال کندہ ہے۔ اور عبارت 'پلاوا' زبان میں تحریر ہے جس سے مستفاد ہے کہ 'دم پونتا ہیانگ' سمپاؤ (کشتی) پر سوار ہوا اور 'سدھایار کاما' پہنچا جہاں شری وجایا کا راجہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ان راجاؤں میں کوئی خونریز معرکہ ہوا تھا کیونکہ بعض قصوں میں ان کی باہمی دشمنی کا بھی کچھ حال واضح کیا گیا ہے۔

اسی طرح دوسرا پتھر بھی 'پلیم بنگ'، ہی کے قریب 'تالانگ تودو'، کے مقام پر نکلا ہے جس پر ۶۸۴ء کا سال کندہ ہے اور اس پر درج ہے کہ "پنتا ہیانگ" یعنی "شری جایا ناگا" نے ایک باغ 'شرک شتیرا'، کی بنیاد رکھی جو افادۂ خاص کے 'نقطۂ نظر' سے بنایا گیا تھا۔ یہ راجہ مذہب "بدھ مہایانہ" تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ پتھر بدھ مذہب کی کسی ریاست کی اسی حصہ میں سراغ رسانی کے سلسلہ میں سب سے پرانا ہے۔

---

[۱] 'سنوسی پانے'، لکھتا ہے کہ یہاں بدھ مذہب ایک کشمیری بھکشو 'دھرم پال'، نے پھیلایا تھا جو پٹنہ کے بدھ اسکول نالندہ سے مشن لے کر آیا تھا کیونکہ اس کے متعلق انڈلاس میں تحریریں دستیاب ہوئی ہیں۔

اور تیسرا پتھر "کوٹا کاپور" (واقع جزیرہ بنکا) میں ملا ہے اس پتھر پر ۶۸۶ء کندہ ہے اور عبارت میں تہدید آمیز الفاظ ہیں جن میں صاف طور پر ان لوگوں کو ڈرایا اور دھمکایا گیا ہے جو "سری وجایا" کے خلاف آمادۂ بغاوت تھے۔ اور جنھوں نے اس کی شہنشاہیت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

چوتھا پتھر ایک چٹان ہے جو دریائے "مرانگن" کے دہانہ پر ملی ہے اس کی عبارت "کوٹا کاپور" کے کتبہ کی مانند ہے۔ انڈونیشی ماہرین آثار نے لکھا ہے کہ یہ چاروں پتھر "ملائی زبان" میں کندہ ہیں۔ جو اگرچہ حالیہ زبان ملائی سے متبائن ہے کیونکہ اس پر سنسکرت کا اثر زیادہ غالب ہے اور اسکا رسم الخط بھی پلاوا ہے اور رسال بھی "ساکا" سن سے تعلق رکھتا ہے (ساکا کی کہانی اس باب کے شروع میں فٹ نوٹ میں بیان کی گئی ہے) بہرحال اس پتھر کے ایک رخ پر "سری وجایا" کی تعریف کندہ ہے اور اس تعریف کے ساتھ ساتھ یہ بھی درج ہے کہ راجہ سری وجایا نے تین مناد ر بنائے تھے اور ۷۷۵ء میں ایک بڑا استوپ بھی تعمیر کیا تھا۔

بہرکیف اس عبارت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ ۷۷۵ء میں حکمراں تھا اور مذہباً بدھ تھا۔ اور زبان چونکہ سنسکرت آمیز ہے اس لئے یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کے دفتر کی زبان بھی سنسکرت ہوگی بہرحال اسی پتھر کے دوسرے رخ پر "سلینڈرا" خاندان کا نام درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یقیناً "سلینڈرا" خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

اسی طرح وسطی جاوا میں بھی شہر "جوگجا" کے قریب "کالاسان" کے مقام پر ایک پتھر نکلا ہے جو سنسکرت زبان میں تحریر ہے اسکا رسم الخط "ناگری" ہے۔ اس پتھر پر

۷۷۸ء کا سال کندہ ہے۔ اس کی عبارت بتاتی ہے کہ 'پاناگ کرنا' نے ایک مندر تعمیر کیا تھا جس کا نام 'تارا' رکھا تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ اس سے مراد راجہ سری وجایا ہے جو سلینڈرا خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

اسی طرح وسطی جاوا میں ایک اور پتھر 'کالوراک' کے مقام پر بزبان سنسکرت ملا ہے اس پر کندہ ہے کہ 'گاؤدی' (بنگال) کے ایک گورو نے ۷۸۲ء میں ایک مورتی 'منجوشری' کے نام سے نصب کی تھی۔ اور اس نے اس پر راجہ کا نام 'اندرا' سری مہاراج لکھا ہے اور نیز بتلایا ہے کہ وہ سلینڈرا کے خاندان سے تھا۔

اسی طرح ہندوستان میں 'نالندا' (واقع پٹنہ) کے مقام پر بھی ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس پر کندہ ہے کہ 'بالاپترا دیوا' مہاراجہ 'سورنا دیپا' (جاوا) خاندان 'سلینڈرا' کے مہاراجہ یاوا بھومی کا پوتا تھا اور اس نے نالندا کے مقام پر ایک آشرم بنایا تھا۔ اس کے باپ کا نام 'سماگ راویرا' درج ہے اور نیز یہ بھی درج ہے کہ اس نے 'سوما' کے خاندان کی لڑکی 'تارا' کے ساتھ شادی کی تھی اور 'بالاپترا دیوا' اسی عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ 'سنوسی پانے' کا بیان یہ ہے کہ یہ تحریر بنگال کے راجہ 'دیوا پلادیو' کے عہد سے تعلق رکھتی ہے جو وہاں ۹۸۳ء تک حکمراں رہا ہے۔

اسی طرح بعض محققین کی اطلاع ہے کہ ایک پارۂ سنگ ہالینڈ کی مشہور درس گاہ لیڈن یونیورسٹی میں بھی محفوظ ہے جو سنسکرت اور تامل دونوں زبانوں میں لکھا ہوا ہے اس کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ 'چولا' خاندان کے پہلے راجہ "راجہ راجہ" کے دورِ حکومت کے اکیسویں سال (۱۰۰۵ء میں) "سری مارا دیجا بوتنگا رمن" نے ایک گاؤں بطور ہدیہ کے نذر گذرانا تھا اور 'یہ' سلینڈرا خاندان سے تھا۔

بعض اور اسی قسم کی تحریروں سے بھی واضح ہے کہ راجہ راجہ اول، کا جانشین "راجندر چولا دیوا، تھا (جس کا عہدِ حکومت ۱۰۳۰ء میں گذرا ہے) اور وہ بہت بڑا فاتح تھا اس نے اوڑیسہ (ہندوستان) سیلون، بنگال اور دیگر علاقے بھی فتح کر لئے تھے۔

بہرحال اب ذیل میں اس درمیانی عہد کی خاص خاص ریاستوں کو انہی معلومات کے ذریعہ ترتیب دے کر مختصر طور پر تحریر کیا جاتا ہے مگر اس تحریر کے ذیل میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس سلسلہ کی پہلی بڑی ریاست غالباً "سلینڈرا" تھی جسے بعض کے نزدیک "سری وجایا" بھی کہا جاتا ہے۔

## سلطنت سلینڈرا

یہ ایک بہت بڑی سلطنت تھی اور وسطی جاوا تک پھیلی ہوئی تھی چنانچہ اس خاندان کے "وسطی جاوا" میں وارد ہونے کے سلسلہ میں بھی قدیم اہل چین ہی کی تحریر کردہ کہانیوں سے مورخین نے استفادہ کیا ہے مثلاً ایک مورخ ایک کہانی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ "راجہ ہولنگ" "جوپاؤ" میں حکمراں تھا لیکن اس کے دادا "کیئین" نے اپنے راجدھانی کو مشرق کی جانب منتقل کر لیا تھا۔ نیز جس وقت "سلینڈرا" خاندان وسطی جاوا میں پہنچا تو اس وقت وہاں "ہندوانڈونیشی" سوسائٹی کے آثار بھی موجود تھے۔ مگر "دی نیو" کے مقام کی معلومات (جو حال ہی کی بہم پہنچی ہوئی اطلاع ہے) کے مطابق دستاویزی تیھر دریافت ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً نویں صدی عیسوی کے اواسط میں "سلینڈرا" خاندان کا وسطی جاوا سے اخراج ہو چکا تھا حتیٰ کہ پھر رفتہ رفتہ وہ غائب ہوتا چلا گیا نیز ایک اور تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۰۰۶ء میں "ادلیھہ ودوراداں" نے راجہ سری وجایا کے حکم سے ایک خوفناک لڑائی بھی لڑی تھی مگر ابھی اس کو زیادہ زمانہ بھی

نہ گزرنے پایا تھا کہ 'سری وجایا'، راجہ 'چولا دیوا' کے ہاتھوں برباد ہوگیا چنانچہ اسی وقت سے قیامِ اقتدار کے سلسلہ میں مشرقی اور مغربی جاوا کے مابین ایک نزاع پیدا ہوگئی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر 'سری وجایا' نے 'نوسنتارا' پر مغرب کی جانب سے اور مشرقی جاوا نے 'نوسنتارا' پر مشرق کی جانب سے قبضہ کرلیا اس طرح سے جزیرہ جاوا مع اور علاقوں کے ایک ہی وقت میں دو جدا جدا بڑی سلطنتوں میں بٹ گیا۔ اور ۱۲۷۵ء میں "سنگو ساری" کی حکومت نے ایک فوج سماٹرا کی جانب بھیجی۔ اس طرح ملایو خاندان نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر دوبارہ حاصل کرلی۔ اس وقت سے سری وجایا پیچھے ہٹتا چلا گیا حتیٰ کہ پھر بالکل ختم ہوکر معدوم[1] ہوتا چلا گیا۔

---

[1] "لیگور" کے مقام پر جو ابھی حال ہی میں ایک تحریر برآمد ہوئی ہے اس سے ماہرینِ آثار نے اندازہ کیا ہے کہ یہ تحریر بھی سری وجایا ہی سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سلینڈرا خاندان سے تھا۔ مگر بعض مورخین کو یہ تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہے اور چنانچہ ان کا خیال ہے کہ سلینڈرا اور سری وجایا دو جدا جدا خاندان تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے ہمعصر تھے اسی باب میں ایک ہندوستانی مورخ نے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سلینڈرا خاندان اپنی اصل کے لحاظ سے کلنگ واقع مدراس کا متوطن تھا وہ اس نواح میں منتقل ہونے سے قبل 'جنوبی برما' میں رہ چکا تھا پھر سمنان جونگ (یعنی ملایا) کی طرف آیا اور وہاں سے پھر وسطی جاوا میں منتقل ہوگیا۔ حالانکہ کلنگ خود وسطی جاوا میں بھی واقع تھا۔
۱۹۲۹ء میں ایک یورپین محقق کو 'بلیتون' کے مقام پر چند کتبے دستیاب ہوئے تھے جو اپنی تحریر کی وضع میں بقول اسی مصنف ان کتبوں سے مماثل ہیں جو 'کالاسان' کے مقام سے تعلق رکھتے ہیں چونکہ وہ کتبے سری وجایا سے متعلق تھے لہذا ان کا تعلق بھی اسی عہد سے معلوم ہوتا ہے اور اس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ علاقہ بھی اس کی حدود قلمرو کا

غرض سلینڈرا خاندان کی حکومت بہت مضبوط اور وسیع سلطنت تھی۔ اور بہت سے راجاؤں کے پے درپے سلسلہ پر مشتمل تھی۔

بہرحال ہندوستان کی ایک بدھ کہانی میں بتلایا گیا ہے کہ 'سلینڈرا' کی یہی حکومت وسطی جاوا میں 'کاتاہا'[1] کے نام سے بھی مشہور تھی۔ اور اس خاندان کے

کوئی اہم مقام تھا۔ اس کتبہ پر' راجہ سنجایا' کا نام درج ہے چنانچہ اسی محقق کی رائے ہے کہ 'سنجایا' بھی سلینڈرا تھا۔ اور نالند کے مقام پر نکلی ہوئی تختی پر کندہ نام کے راجہ 'بالاپترا' کا دادا تھا اور بالاپترا سری وجایا کا راجہ تھا جس نے جاوا کی رہائش چھوڑ دی تھی۔

بہرحال جہاں تک اہل عرب کی تحریروں کا تعلق ہے انھوں نے "زاباق" کا نام 'یاواد یپا منڈالا' کے باب میں تحریر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے ان کی مراد بھی جاوا ہی ہو کیونکہ انھوں نے اسی تسلسل میں لکھا ہے کہ یہاں پر ایک بہت بڑی قلمرو تھی۔ اور اس قلمرو کا حاکم اعلیٰ خاندان 'سلینڈرا' تھا۔

سنوسی پانے کا بیان ہے کہ 'سری وجایا' نے ۷۷۵ء سے قبل حکمرانی نہیں کی اور نہ اس امر پر دلالت کرنے کے لئے کوئی ایسا ثبوت ہے کہ سری وجایا نے اس دور میں وسطی جاوا پر بھی حکومت کی ہو۔ جبکہ وہاں 'بورو بُودور' اور دیگر عظیم تعمیرات انجام دی جاری تھیں یہ ہوسکتا ہے کہ سلینڈرا نے اسے فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کرلیا ہو۔ بہرحال 'بورو بُودور' کا اَستُوپ خاندان سلینڈرا ہی کی تعمیر ہے جو دنیا کی عظیم اور حیرت انگیز تعمیرات میں شمار ہوتی ہے۔ نہایت ہی وسیع و عریض ہے۔

[1] بعض انڈونیشی مورخین کا خیال ہے کہ چینیوں نے اپنی کہانیوں میں جاوا کی جس سلطنت کو "سان فوسی" کے عنوان سے تحریر کیا ہے وہ دراصل یہی 'کاتاہا' کی سلطنت تھی، جو 'سیبو' نے وسطی جاوا میں قائم کی تھی۔

ایک دوسرے فرد ' سیبو' کے زیر نگیں تھی جو 'راجہ بالا پترا' کا سوتیلا بھائی تھا۔ اسی کہانی میں بتایا گیا ہے کہ سیبو حصولِ تخت و تاج سے مایوس ہوکر وسطی جاوا چلا گیا تھا جہاں پہنچکر رفتہ رفتہ اس نے اقتدار حاصل کرلیا اور اپنی ایک جداگانہ سلطنت قائم کرلی اور اسکا نام بھی 'کاتاہا' رکھا۔ اور اپنا اقتدار "گنتنگ کرا" تک پہنچا دیا چونکہ وہ 'سری وجایا' کا بھی حریف تھا لہذا سلینڈرا خاندان نے جب اور ذرا زور پکڑا تو ایک باقاعدہ جنگ کر کے اسے ختم کر دیا۔ اور وسطی جاوا فتح کرلیا حتیٰ کہ "ماترم"[1] کے بجائے پھر انھوں نے اپنا دارالحکومت بھی 'کاتاہا' ہی کو بنا لیا۔ اور مشرقی جاوا میں "دہرما بنک سا" کے دارالحکومت کو بھی تاراج کر دیا۔

کچھ اور محققین کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ اہل عرب نے 'زاباق' کا جو تذکرہ کیا ہے اُن کی مراد بھی اس سے یہی 'کاتاہا'[2] کی ریاست تھی جو بعد میں سلینڈرا کا

---

[1] یاد رکھنا چاہیے کہ ماترم اصل میں مشرقی جاوا میں ایک مقام کا نام تھا لیکن بعد میں چلکر یہی خاندان کا نام پڑ گیا بات یہ تھی کہ اس سرزمین پر حکومت کرنے والے امراء اسی کی وطنی مناسبت سے 'ماترم' کہلانے لگے جاوا کے عہد اسلامی کی تاریخ اسی خاندان کی سرگزشت شوکت سلطانی کی ہزار داستان ہے۔ جو کروفر، اور سطوت و جلالت کے ساتھ سالہائے دراز تک برسر اقتدار رہا ہے یہاں کے ہندو مذہب کی تاریخ میں بھی یہ نام ایک سلطنت کے نام کے ساتھ وابستہ اور مشہور ہے۔ جو اپنے دائرۂ عمل کے اعتبار سے ایک محدود سی سلطنت تھی۔ سلینڈرا یا سری وجایا کی طرح زیادہ وسیع و عریض نہ تھی۔ اس حکومت کے عہد اور اقتدار پر آگے چل کر اسی عنوان کے ماتحت روشنی ڈالی گئی ہے۔

[2] **کاتاہا کے متعلق اہل عرب کی رائے** اہل عرب نے جس عنوان کے ماتحت اس ریاست کا حال تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے

جزو سلطنت بن گئی تھی۔

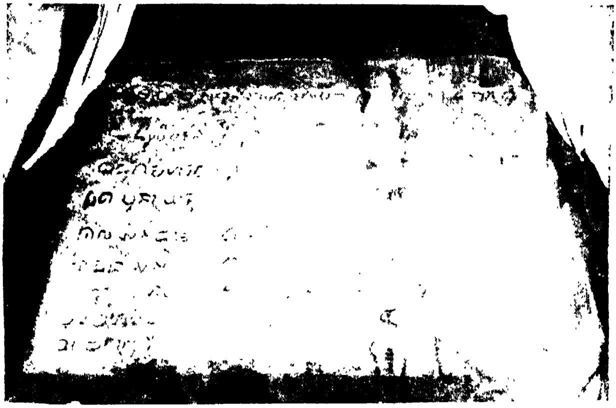
'سنوسی پانے لکھتا ہے کہ وسطی جاوا میں اس خاندان (سلیبنڈرا) کے صرف دو حکمراں گزرے ہیں۔ ایک بالاپتزا اور دوسرا سنجایا۔[1]

---

کہ یہ ریاست دریائے تاکوسس (وسطی جاوا) کے دہانہ پر واقع تھی۔ اور دکیڈا، مشہور تاریخی شہر بھی اسی میں شامل تھا۔ گنتنگ کرا اور 'سمنانا جونگ'، بھی اس کی حدود میں شامل تھا۔ سنہ ۹۰۳ء یا سنہ ۹۰۴ء میں اس ریاست نے دسری وجایا، کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اور چنانچہ اسی وقت سے یہ دونوں حکومتیں ایک ہی حکمراں کے تحت میں آگئیں اور متحدہ طور پر سمبہ جیا، کہلائی جانے لگیں۔ اس عہدِ فتح کے کامراں حکمراں نے دبوردبودور، کی تعمیر شروع کی تھی (جو سلینڈرا تھا) مگر وہ کسی مجبوری کے باعث اسے ادھورا چھوڑ کر اندلاس (سماترا) کی طرف واپس لوٹ گیا چنانچہ بعد میں یہ مندر د کاتاہا، کی مدد سے بنتا رہا۔

---

[1] بعض مورخین نے سنجایا کے ذیل میں دگرلیسک، کی اور ایک حریف حکومت کا ذکر کیا ہے جس کا حکمراں 'دبالیتون'، تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بالیتون بھی قدیم میں سری وجایا کا منقاد رہ چکا تھا اور اس کی حیثیت ایک ماتحت حکمراں کی سی تھی مگر چونکہ اس کی شادی ماترم، کے رؤسا کے خاندان میں ہوئی تھی لہذا اس نے انھیں تقویت پہنچا کر بلند کرنے کی سعی کی اور اس طرح 'سنجایا'، سے اس کی جنگ ہوئی۔ چنانچہ یہ شہر گرلیسک، جب ہی سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے یا عہد اسلامی کے سلاطین ماترم، کے وقتوں میں بھی اس شہر کی بڑی عظمت تھی اور اب بھی یہ شہر حضرت ملک ابراہیم کی خانقاہ کی وجہ سے بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ نقشہ میں مشرقی جاوا کے اس سرے پر واقعہ ہے جہاں سے جزیرہ مدورا بہت نزدیک پڑتا ہے۔



۶۸۳ء کا ایک پرانا کتبہ جو پلاوا رسم الخط میں تحریر ہے شہر پلیم بنگ کے کھنڈرات سے ملا ہے۔ اور انڈونیشیا کی قدیم بدھ سلطنت سری وجایا کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔



عہد سری وجایا کی ایک تاریخی چٹان جس پر ملایو رسم الخط میں کتبہ تحریر ہے

## سلطنت سری وجایا

جیسا کہ پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے وسطی جاوا میں اقتدار بڑھانے والے خاندان سلیندرا نے جو ایک زمانہ میں سری وجایا کے ماتحت رہ چکا تھا رفتہ رفتہ عروج کر کے کافی طاقت حاصل کر لی اور جب سری وجایا اپنے صدیوں کے اقتدار کے بعد ناکارہ حکمرانوں کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تو سلینڈرا نے ۹۰۰ء میں اس پر چڑھائی کر دی اور جاوا سے اس کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ حتیٰ کہ پھر آس پاس کے جزائری علاقہ بھی چھین لئے۔

اس طرح نوسنتارا (قدیم انڈونیشیا) کی وہ سلطنت سری وجایا جو عہد ہنود کی ابتدائی سلطنتوں میں سب سے بڑی سلطنت تھی اور رقبہ میں بھی موجودہ انڈونیشیا سے کہیں زیادہ بڑی تھی اب سمٹ سمٹا کر صرف جزیرہ سماٹرا ہی تک رہ گئی۔ اس کا ایک وہ زمانہ بھی آیا کہ جب اس کی قلمرو میں سماٹرا، جاوا، بورنیو، سلاویسی، اور جاوا کے مشرق کے تمام جزائر بشمول نیوگنی، مالوکو، فلپائن، فارموسا، گنتنگ کرا (جو چین کے ساحل کے ایک بندرگاہ ہے) سمنان جونگ (ملایا) اور سیلون وغیرہ شامل تھے۔ اب یہ شکست کے بعد صرف سماٹرا کے چند علاقوں تک محدود رہ گئی۔ سلینڈرا خاندان اس کے تمام علاقوں پر چھا گیا جس نے بت پرست دنیا کا سب سے بڑا استوپ بوروبودو تعمیر کیا تھا۔

سری وجایا کے عہد میں نوسنتارا (انڈونیشیا) کا دارالحکومت پلیم بنگ (واقع سماٹرا) تھا جو حکومت کے بدھ مت کی وجہ سے بدھ تمدن کا بڑا مرکز تھا جہاں چینی، اور ہندوستان سے بدھ بھکشو کثرت سے آتے جاتے تھے اور اس کے طول طویل ساحلی علاقوں پر اہل عرب بھی کثرت سے تجارت کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلطنت کے عہد تمدن کے متعلق آج جس قدر بھی معلومات مؤرخین کو بہم پہنچی ہیں ان کے بڑے ذرائع بھی راجاؤں کے خود کندہ کرائے ہوئے کتبوں کے علاوہ انھیں بھکشوؤں اور عرب سوداگروں کی تحریرات ہیں یا پھر اہل چین کی کہانیاں ہیں۔ جو انھوں نے یہاں کے بعض بعض راجاؤں کے حالات سے

سلسلہ میں اپنی بدھ مت کی کتابوں میں لکھی ہیں۔ سری وجایا کے عہد کے تمدن کا حال انہی ذرائع کو کام میں لے کر مورخین نے لکھا ہے جو اگرچہ بہت مختصر ہے مگر سر دست اسی سے استفادہ کیا جائے گا، تاکہ ایک حد تک انڈونیشیا کے اس قدیم بدھ عہد کا کچھ تمدنی حال معلوم ہو سکے۔

**وسعت سلطنت** البتہ جہاں تک اس کی وسعت کا تعلق ہے قدیم کتبوں ہی کی تحریر سے مختلف مقامات کے کندہ شدہ ناموں کی شہادت پر مورخین نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ یہ سلطنت (یعنی سری وجایا) ایک نہایت ہی وسیع سلطنت تھی اور دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ انڈونیشیا کا نوجوان مصنف "سنوسی پانے" لکھتا ہے کہ:[۵۱]

"جو کچھ ہمیں یقین کے ساتھ معلومات کے ذریعہ ہم پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ سری وجایا کی سلطنت، پلیم بنگ، علاقہ جامبی، (سماترا میں ہے) بنکا، اور علاقہ گنتنگ کرا تک پھیلی ہوئی تھی۔ پلیم بنگ اور گنتنگ کرا (یہ غالباً چین کے قریب بحر الکاہل کا کوئی مقام ہے) کا فاصلہ یہ واضح کرتا ہے کہ سری وجایا کی حکومت وسعت کے لحاظ سے بہت بڑی تھی۔ اور آبنائے ملاکا اس کی پوری قلمرو میں آمدورفت کی ایک کلید تھی۔ چین سے ہند جانے والے جہازوں کو اسی سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا اور گنتنگ کرا پر ٹھہرنا پڑتا تھا۔"

اسی باب میں ہندوستانی مصنف "پنڈت جواہر لعل نہرو" نے لکھا ہے کہ:[۵۲]

"یہ شری وجایا سلطنت روز بروز بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ پھر اس میں بورنیو، فلپائن، سلیبس، نصف جزیرہ جاوا، نصف فارموسا، سیلون، اور جنوبی چین میں کینٹن کے قریب کا ایک بندرگاہ بھی شامل تھا۔ اور اسی طرح ہندوستان کے جنوبی سرے پر سیلون کے بالمقابل بھی

---

۵۱ سنوسی پانے کی کتاب "سجارا انڈونیشیا" (بزبان انڈونیشی) صفحہ ۲۹ مطبوعہ جکارتا ۱۹۵۰ء۔

۵۲ پنڈت جواہر لعل نہرو کی کتاب (Glimpses of World History) صفحہ ۱۳۵ مطبوعہ لندن ۱۹۴۹ء۔

ایک بندرگاہ اس کا مقبوضہ تھا عرب اور اہل چین کی تحریروں میں اس کے بہت سے بندرگاہوں کا حال ملتا ہے۔"

**حکومت** حکومت کے انداز اور اصول پر زیادہ بحث نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس باب میں قدیم چینی کہانیوں سے مورخین کو زیادہ تفصیلات بہم نہیں پہنچ سکی ہیں البتہ عربوں کی تحریر سے پتہ چلایا گیا ہے کہ اس سلطنت کے راجاؤں نے 'مہاراج' کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ جو شہنشاہ کا مترادف ہے۔ اس لئے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حکومت شخصی تھی۔ اور بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا چونکہ بعض کتبوں میں بادشاہ کا افواج کے ساتھ جانا بھی واضح ہوتا ہے اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد کا بادشاہ اپنے کمانڈر اعلیٰ پر بھی فوجی مسابقت رکھتا تھا۔ اور چونکہ کتبوں کی زبان عموماً سنسکرت ہے اس لئے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ سرکاری زبان سنسکرت ہی تھی۔ جو بعض بعض حالات میں علاوہ ناگری کے پلاوا رسم الخط میں بھی لکھی جاتی تھی کیونکہ پلاوا رسم الخط کی تحریریں بھی دستیاب ہوئی ہیں ایک کتبہ سے کالنگ (واقع سُمنَان جونگ) کے راجہ سنجایا کا شکست کھا کر وسطی جاوا میں جانا اور وہاں جاکر "آدہی پتی" (وزیر اعظم) ہو جانا بھی ثابت ہوتا ہے اس لئے گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد کے حکمراں اپنے دربار میں وزیر اعظم رکھتے تھے اور ان کا دار الحکومت بھی اسی نام کا شہر 'سری وجایا' (واقع سماترا) تھا۔

**مذہب** بہرکیف جہاں تک مذہب کے متعلق کتبوں یا اور ذرائع سے پتہ چلا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا سرکاری مذہب 'بدھ' تھا۔ اب یہ کہنا کہ بدھ مذہب کب پہنچا تھا کسی مستقل تحریر کے عدم وجود کے باعث بہت دشوار ہے۔ البتہ پانچویں صدی کے آغاز میں جب چینی سیاح 'فاہیان' جاوا پہنچا تھا تو اس کے

بیان کے مطابق بدھ بہت کم تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مذہب کو آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کیونکہ ایک ڈچ مورخ "خراف" (اپنی کتاب خرز غدنیز فان اندونیشی کے صفحہ ۲۲ پر) لکھتا ہے کہ "بدھ مذہب یہاں ہندو مذہب کے بعد پہنچا ہے"۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مذہب شروع کی صدیوں ہی میں کسی وقت پہنچا ہو مگر یہ مذہب کبھی پورے انڈونیشیا کا مذہب نہ بن سکا البتہ جہاں تک جاوا کا تعلق ہے یہ مذہب صرف مغربی جاوا تک محدود رہا کیونکہ اس جزیرہ کا صرف یہی علاقہ (سری وجایا) کی سلطنت میں شامل تھا، البتہ سماترا اور ملایا پر اس مذہب کا زیادہ اثر غالب رہا ہے۔

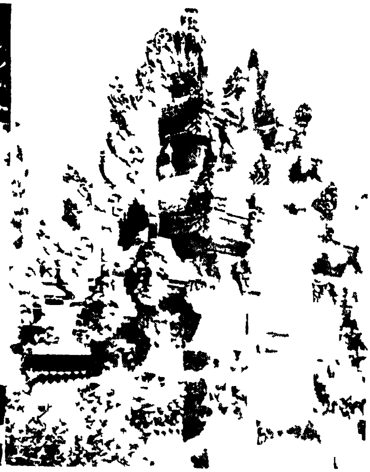
سنوسی پانے کے بیان کے مطابق ابتدا میں یہاں کا بدھ مذہب[۱] ہنایانہ تھا مگر بعد میں مہایانہ ہوگیا تھا۔

**تعلیمات**

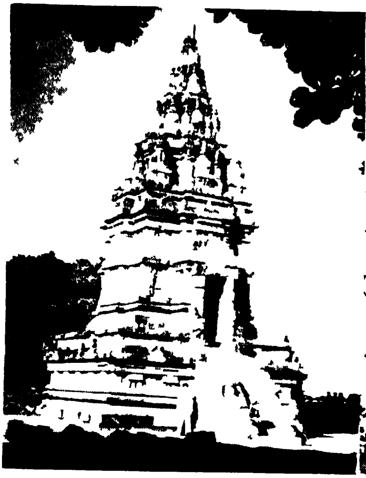
دارالحکومت سری وجایا جیساکہ مورخین کی رائے ہے بدھ مذہب کے علوم کا مرکز تھا۔ نالندا (واقع پٹنہ ہندوستان) کے فارغ التحصیل یہاں آتے تھے۔ بدھ مذہب کا مشہور ساتواں عالم (شاکیا کرتی) اسی مقام پر رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی مشہور کتاب "ہستاڈنڈ شاستر" بھی یہیں رہ کر لکھی تھی۔ چین سے بھی چینی بھکشو اس سے استفادہ کرنے کی غرض سے اس کے پاس کثرت سے آتے تھے اور چینی زبان میں اس کی کتابوں کا ترجمہ کرکے اپنے وطن کو لیجاتے تھے، کیونکہ بعض ایسی

---

[۱] ہنایانہ اور مہایانہ — بدھ مذہب کے آخری دور زوال یعنی ۱۲۰ء میں شہر پشاور (واقع پاکستان) میں کوشن خاندان کا بدھ حکمراں "کنشک" برسراقتدار تھا تو اس نے بدھ مذہب میں ترمیم کرکے اسے ایک نئی شکل دی اور اسکا نام 'مہایانہ' رکھا۔ اور اسی کے تقابل سے پرانہ مذہب ہنایانہ کہلایا اور دراصل ہنایانہ ہی وہ مذہب تھا جو گوتم بدھ نے جاری کیا تھا۔



بالی کا ایک قدیم مندر



پریم بانان کا ایک چانڈی



بوروبودور کا عظیم بدھا استوپ

تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جن سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

**فنِ تعمیرات** مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہاراجگانِ حکومت سلینڈرا (یا سری وجایا) فنِ تعمیرات کے بڑے سرپرست تھے۔ انھیں اعلیٰ اور شاندار قسم کی عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا جیساکہ ان کے عہد کی بڑی بڑی تاریخی یادگاؤں سے آج بھی ثابت ہے چونکہ یہ لوگ اپنے مذہب (یعنی بدھ دہرم) کے بہت دلدادہ تھے لہذا زیادہ تر مذہب سے متعلق ہی عمارتیں تعمیر کراتے تھے۔ ان کے زمانہ میں "بدھ" تہذیب نے مغربی جاوا میں بڑا عروج حاصل کیا تھا، چونکہ ان کے عہد کی کوئی مستقل تاریخ آج دستیاب نہیں ہے اس لئے یہ تو نہیں بتایا جا سکتا کہ ان کے عہد میں علم وادب کا کیا حال رہا مگر یہ ضرور ہے کہ جو لوگ "بورو بودور"، "چانڈی سارا"، "چانڈی سیو" اور "تنجانہ کالاسان"، جیسی شاندار اور سنگین عمارتیں بنوا سکتے تھے اور ان پر اعلیٰ قسم کے کتبے کندا کرا کر جڑوا سکتے تھے ضرور "علم وادب"، کے بھی سرپرست ہوں گے اور یہ چونکہ ان کے عہد میں چینی بدھ بھکشوؤں کا جاوا میں آنا اور وہاں کے بھکشوؤں سے استفادہ علمی کرنا خود ان کی اپنی سرگزشتوں اور حکایتوں سے ثابت ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں علم وادب کا بھی کافی رواج تھا۔ مگر طرزِ تعلیم کے متعلق کوئی معلومات دستیاب نہیں ہے۔

**بورو بودور** بہرحال تعمیرات کے سلسلہ میں "بورو بودور" کا مندر اس عہد کا سب سے عظیم کارنامہ ہے جس کا پوری "بت پرست دنیا" (برما، سیلون، چین، جاپان اور ہندوستان) میں شاید آج تک کوئی نظیر نہیں ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ مندر عجائبات عالم میں شمار ہوتا تھا، اور آج بھی مورخین اس کے باب میں اظہارِ حیرت واستعجاب کرتے ہیں۔ چنانچہ سیلون کا ایک بدھ مورخ

اے[۵۱]۔ کے کمار سوامی اسی مندر کے باب میں لکھتا ہے :۔

"یہ عظیم الشان استوپ پہاڑ کی چٹان کے مانند تیار کیا گیا تھا دنیا کا سب سے بڑا استوپ ہے اور سب سے خوبصورت ہے۔ اس استوپ میں سیکڑوں برجیاں اور سینکڑوں ہی گمٹیاں اور دروازے ہیں۔ پوری عمارت[۵۲] تقریباً ایک میل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے اور آجتک اپنی اصلی حالت میں برقرار ہے۔ اس میں چار بڑی بڑی گیلیریاں ہیں اور نیچے کی طرف پہاڑی ہے۔ بالائی حصہ میں خوبصورت مخروطی شکل کی گمٹیاں ہیں ان گمٹیوں کے نیچے ہال بنے ہوئے ہیں جن میں "گوتم بدھ" کے بت نصب ہیں گیلیریوں میں چاروں طرف سنسکرت کے "اشلوک" کندہ ہیں اور دیواروں میں قدیم

---

[۵۱] اے۔ کے کمار سوامی کی کتاب "ہسٹری آف انڈین اینڈ انڈونیشن آرٹ"، جلد چہارم مطبوعہ ۱۹۲۷ء۔

[۵۲] مجھے محترم جناب ڈاکٹر شمس الدین سفیر انڈونیشیا کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ انگریزوں کے لفٹنٹ گورنر جنرل ریفلیس کے وقت تک اس عمارت کو انڈونیشیا میں کوئی نہیں جانتا تھا کیونکہ یہ عمارت ہندو مذہب کے زوال کے وقت سے سونی پڑی رہنے کے باعث کثرت بادوباراں اور افراط نباتات کے سبب جنگلوں میں روپوش ہو چکی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ انگریزوں کے ساتھ بنگال کے ہندو سپاہی بھی فوج میں آئے ہوئے تھے اور چونکہ عادت ہے کہ وہ صبح اٹھ کر رفع حاجت کے لئے عموماً جنگل کی طرف جایا کرتے ہیں اتفاق سے ایک بنگالی ہندو برہمن سپاہی بھی اس طرف پاخانہ پھرنے کے لئے نکلا فراغت کے بعد اس نے اپنی لٹیا مانجنے کے لئے جو ریت اٹھائی تو زمین میں اس سے کوئی گڑی ہوئی مورتی سی نظر آئی اس نے کھودنا شروع کر دیا کھودتے کھودتے مندر کا حصہ دکھائی دیا۔ چنانچہ وہ لپک کر آیا اور اس نے اپنے افسروں کو سنایا، ریفلیس کے کانوں میں بھی یہ بات پہنچ گئی لہذا اس نے اس کی کھدائی شروع کرادی اس طرح یہ سینکڑوں سال کا دبا ہوا مندر برآمد ہو گیا۔ اور آجتک محفوظ ہے۔

پاپن وغیرہ نسل کے لوگوں کی کھدی ہوئی تصویریں ہیں، جنھیں ان کے اپنے اپنے پیشے کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، اور انہی تصویروں کے پاس گارودڈا (یعنی عقاب) کی تصویر ہے"۔ چنانچہ ان کندہ تصاویر سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ بوگنی بھی اس حکومت کی حدود میں شامل تھا۔

بہرحال یہ مندر جاوا کے شہر "میگ لانگ" کے قریب واقع ہے (اس شہر کا حال جغرافیہ کے باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح کالاسان کا مندر، جو شہر جوگ جکارتا کے قریب واقع ہے قابل دید بتایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ 'چانڈی سیو' اور 'چانڈی سارا'، کے منادر بھی خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ سب منادر 'بدھ مہایانہ' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے منادر ان کے علاوہ ہیں جن کا ذکر آگے ہندو سلطنتوں کی تہذیب میں بیان کیا جائے گا۔

## سلطنتِ ماترم

جاوا میں سلینڈرا کے زوال کے بعد ان کا جانشین خاندان "ماترم" برسر اقتدار آیا جو ہندو تمدن کے اعتبار سے اس ملک کی تاریخ میں اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے جتنا کہ 'سلینڈرا یا سری وجایا کا۔ اگرچہ اس خاندان کی سلطنت سلینڈرا کی سلطنت کی طرح زیادہ وسیع و عریض نہ تھی اور نہ اندونیشیا سے باہر شبہ قلبک اور دوسرے حصوں پر پھیلی ہوئی تھی مگر پھر بھی ترقیات، اور علم و ہنر کے اعتبار سے اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے اس سلطنت کے حالات بھی بیان کرنے سے اندونیشیا کی تاریخیں (خواہ وہ قصے کہانیوں ہی پر مملو کیوں نہ ہوں) اسی طرح خاموش ہیں جس طرح "سلینڈرا" کے حالات میں یا اس سے قبل کی ابتدائی ہندو حکومتوں کے باب میں خاموش نظر آتی ہیں کیونکہ اس دور کے حالات بھی تاریخ

کی "سائنٹفک ضرورتوں" کے ساتھ مربوط اور منظم طریقہ سے اب تک مورخین کو دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ لہذا اس عہد کا اجمال بھی خاندان سلیبنڈرا کی تفصیلات کی طرح عموماً کتبوں اور چینی حکایتوں ہی کے ذریعہ سے بیان کیا جاتا ہے جو سراسر افسانوی اور داستانی رنگ میں ہے اور کافی پیچیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ولندیزی مورخین" نے بھی اس عہد کا کوئی اجمال پیش نہیں کیا ہے۔ اور نہ کسی انگریز مصنف نے اس کی تحقیقات کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ البتہ کچھ تفصیلات انڈونیشی مورخین نے اپنے قومی ادب کی پرانی روایات اور قصوں سے اقتباس کر کے ابھی حال ہی میں تاریخ کے رنگ میں ترتیب دی ہیں جن سے اس پیش نظر بیان کو مرتب کرنے میں کافی مدد لی گئی ہے۔

## لقب کی وجہ تسمیہ

بہرحال مورخین انڈونیشی کا خیال ہے کہ عہد قدیم میں "ماترم"، وسطی جاوا میں ایک علاقہ کا نام تھا۔ جہاں کچھ امراء اور رؤسا آباد تھے۔ ان لوگوں نے امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنے اس وطن کی مناسبت سے خود کو بھی "ماترم" کہنا شروع کر دیا اور اس طرح پھر ایک زمانہ کے بعد یہ حکمراں خاندان کا نام پڑ گیا۔ حالانکہ اب تک یہ صاف طور سے واضح نہیں ہو سکا ہے کہ وسطی جاوا میں "حکومت" کے لئے یہ نام کب اور کس طرح وضع کیا گیا تھا اور اس کا واضع کون تھا۔

مگر اسی تسلسل میں انڈونیشیا کا مورخ "سنوسی پانے" لکھتا ہے کہ "اس علاقہ کے قدیم راجاؤں کی ایک فہرست دریافت کی گئی ہے جس میں حکمرانوں کا ایک لمبا شجرہ درج ہے مگر اس شجرہ میں "رکیے ئی ماترم" کے الفاظ ہیں جو وہاں کی زبان میں

صوبہ یا علاقہ کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں پر بسنے والے زمینداروں اور جاگیرداروں نے اپنی زمینوں کی مناسبت سے یہ لقب خود کے لئے بھی اختیار کرلیا ہو نیز یہ لقب "ریکے لی"، ان حکمرانوں کے ناموں میں بھی ملا ہے جو اس مخصوص علاقہ میں برسراقتدار رہے تھے۔ اور اسی نام (یعنی ریکے لی مانزم) کا اختیار کرنے والا بعد کے زمانوں میں "سنیایا"[۵۱] (Sanjaja) سب سے پہلا حکمراں تھا۔ مگر اس نے یہ نام کیوں اختیار کیا اس کی وجہ کا تاریخ کو کوئی علم نہیں ہے"۔ البتہ چینیوں نے اپنی کہانیوں میں "ساٹیاں"[۵۲]، نام کے ایک راجہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے باب میں لکھا ہے کہ وہ "ہولنگ" کا راجہ تھا اور اس کے زمانہ میں ملک

---

۵۱ "چنگل"، (علاقہ کیدو واقع وسطی جاوا) (Tjanggal) کے گاؤں میں ایک مشہور پہاڑی "ووکر" (Wukir) پر پرانے کھنڈرات میں ابھی حال ہی کی اطلاع ہے کہ ایک کتبہ ملا ہے جو پلاوا رسم الخط میں بزبان سنسکرت کندہ ہے۔ اس پتھر پر ۷۳۲ء کے سال کے ساتھ یہ اطلاع بھی کھدی ہوئی ہے کہ اس مقام پر اس سال یہ مندر 'سنیایا' نے تعمیر کرایا ہے۔ اس مندر میں شیوا، وشنو اور برہما کی پوجا ہوتی ہے وغیرہ۔

اسی طرح ایک مختصر کہانی بھی مشہور ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک راجہ 'ساما' تھا جو اس جزیرہ 'یاوا' پر حکمراں تھا اور تھوڑے زمانہ کے بعد ہی مرگیا تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا "سنیایا" اس کی جگہ حکمراں بنایا گیا جو اپنی بہن کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ اس کی بہن کا نام عموماً 'ساما' بتایا جاتا ہے جس نے ۶۷۴ء سے ۶۷۵ء تک حکومت کی ہے۔

۵۲ چینی قصہ | پھر اسی کے ساتھ ان چینی مصنفین نے 'حکمراں سیمو' کی حکایت بیان کی ہے جس سے مراد بھی غالباً سنیایا کی بہن سیمو ہی ہے۔ چینی حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حکمراں ہولنگ میں برسراقتدار تھا اس نے چین کو تین سفارتیں بھیجی تھیں۔

نہایت خوشحال تھا، لوگ امن وعافیت کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور جرائم سے ڈرتے تھے وغیرہ۔

بہرکیف 'بالیتونگ'[۱] سے چینی مصنفین کی مراد 'سلطنتِ ماترم' سے ہے اور یہی امر کتبوں کی تحریر سے بھی ثابت ہوتا ہے، (سلینڈرا کے حال میں بھی پچھلے اوراق میں یہ نام اکثر جگہ توارد کے ساتھ آتا رہا ہے کیونکہ اس حکومت کے فرمانروا بھی جاوا میں معاصر رہے ہیں)

اور اس وقت چین میں "شاہ تاچے" (جس کو اہلِ عرب نے تاشے بھی لکھا ہے) حکمراں تھا چنانچہ وہ ان سفارتوں کے جواب میں خود چین سے سفر کرکے "ہُولنگ" کے فرمانروا سے ملنے کے لئے آیا، اتفاق سے سفر کے دوران میں اس کی سونے کی تھیلی 'ہُولنگ' کی حدود میں کسی شاہراہ عام پر گرگئی، شاہ کو بھی اسکا کچھ خیال نہ آیا، اور جب وہ اپنے وطن (چین) کو واپس لوٹا تو کسی دوسری راہ ہوتا ہوا نکل گیا۔ اور سونا اسی طرح پڑا رہا۔ مگر کسی کی بھی مجال نہ ہوئی۔ کہ اُسے کوئی چھوتا یا چُراکر لے جاتا۔ تین سال تک وہ سونا اسی طرح پڑا رہا، اتفاق سے تین سال کے بعد ہولنگ کے حکمراں کا ولیعہد بسلسلہ سیر وشکار اس طرف سے گزرا، تھیلی کو دیکھکر وہ اس کے قریب پہنچا اور پاؤں سے ہٹاکر دیکھنے لگا، مگر کسی راہگیر کی امانت سمجھکر اس کو اسی طرح چھوڑکر آگے کو بڑھ گیا۔ جب سیر وشکار سے واپس لوٹا مخبر نے دربار میں پہنچکر 'ہولنگ' کے حکمراں کے سامنے شہزادہ کے سفر کی ساری رُوداد بیان کی اور اس واقعہ کو بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا، 'ہُولنگ' کے حکمراں نے واقعہ کو سُنا اور سنکر بہت ناراض ہوا اور شہزادہ کے عمل کو اپنے قاعدہ کے منافی سمجھکر اس نے حکم صادر کیا کہ ولیعہد نے جس پاؤں سے اس راستے کے

[۱] 'بالیتونگ' حکمراں کا نام بھی ہے اور اس کی مناسبت سے اس کی حدودِ مملکت پر بھی یہی نام منطبق کیا گیا ہے، چنانچہ اس مقام پر بھی اس سے مراد سلطنت کی حدود ہی ہیں۔

البتہ اس کی عمارات اور ان منادر سے جو آج بھی 'چانڈی' کے نام سے قائم ہیں اور بطور آثارِ قدیمہ باقی ہیں، یہ امر صاف طور سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اس 'خاندان - (ماترم) کا سب سے بڑا راجہ گزرا ہے، اس کے زمانہ میں ملک قدرے خوشحال تھا، دولت کی آمد بھی اور ہر طرف امن وامان تھا، لوگ تعمیرات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے، کیونکہ اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو نہ اسقدر تعمیرات وجود میں آتیں اور نہ اسقدر کتبے اور تحریریں اس کے متعلق دریافت ہوتیں راجہ مطلق گمنام و بے نشاں ہوتا۔ بقول اندونیشی مصنّفین ایک کتبہ اس کی تاریخ وفات سے متعلق بھی دریافت ہوا ہے۔ جس پر ۹۱۰ء کا سال کندہ ہے اور دوسرا کتبہ راجہ "دکشا[1]" کا ملا ہے جس پر درج ہے کہ وہ بالیتونگ کا جانشین تھا اور خاندانِ ماترم کا فرمانروا تھا۔ اس نے یہ کتبہ ۹۱۵ء میں کندہ کرایا تھا۔ مورخین کی تحقیق کے مطابق یہ راجہ ۹۱۹ء تک حکمراں رہا ہے۔ اس کی حکومت وسطی جاوا کے

مال کو ٹھکرایا ہے، وہی پاؤں اس کا قلم کر دیا جائے۔ اگرچہ اُمرائے دولت نے شہزادہ کی موافقت میں درگزر کی استمداد کی مگر پذیرائی نہ ہوئی اور بالآخر حکم راجہ کے مطابق شہزادہ کا وہ پاؤں قلم کر دیا گیا۔

اس طرح چینیوں نے اس قسم کے واقعات بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ میں 'جاوا' میں بڑا امن وامان تھا اور عدل وانصاف کا دور دورہ تھا، لوگ بھی جرم نہیں کرتے تھے اور جرم کرنے سے ڈرتے تھے اور نیز یہ کہ سزائیں بڑی سخت تھیں اور انصاف کے معاملہ میں رو رعایت مطلق نہ ہوتی تھی، ہاتھ اور پاؤں قلم کروانا عام طور سے رائج تھا۔ وغیرہ۔

[1] اس کا پورا نام اصل میں (Daksnottana Bhubajrapratipak Shaksbya) "ڈکسنوتانا بھوبجراپراتی پاک شکسبیا" اتنا بڑا ہے مگر بقول اندونیشی مصنّفین کے اس نام کے ساتھ ساتھ "دکشا" بھی لکھا ہے۔

لے کر مشرقی جاوا تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اسی نے اپنے خاندان کے سب سے پہلے حکمراں "سنیایا" کے نام سے ایک سن بھی جاری کیا تھا، حالانکہ اس وقت تک "ساکا" سن تحریر میں آتا تھا، بہرحال جب وہ مرگیا تو اس کی جگہ اس کی بیوی "راکے لایانگ دیا" اس کی جانشین ہوئی، جو سنہ ۹۲۱ء تک حکمراں رہی اس کے متعلق بھی معلومات محض اس کے کتبوں ہی کی تحریر سے بہم پہنچائی گئی ہے، چنانچہ اس کے ایک کتبہ کے ذریعہ سے مورخین نے لکھا ہے کہ جب وہ تخت پر آئی تو اس نے پھر "ساکا" ہی کے سن کو رواج دیا کیونکہ اسکا خاندانی تعلق ساکا کے خاندان سے تھا، پھر اس کے بعد سنہ ۹۲۴ء تک کے درمیانی وقفہ کے لئے کوئی کتبہ دریافت نہیں ہو سکا ۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس درمیانی دور میں حکمراں کون تھا ۔ البتہ سنہ ۹۲۴ء سے متعلق ایک کتبہ ملا ہے جس پر "رکائے ہنگ کایا" کا نام درج ہے جو سنہ ۹۲۷ء تک برسر اقتدار رہا ہے اس کے بعد آخری معلومات "میُو سِنڈو" (Mpu Sindok) کے متعلق بہم پہنچائی گئی ہے جس کے متعلق کتبوں میں درج ہے کہ یہ "ماترم" کے خاندان کا آخری حکمراں تھا، اور "واوا" کا جانشین تھا، مگر اس معلومات پر سن درج نہیں ہے اس لئے یہ صحیح نہیں بتایا جاسکتا کہ یہ خاندان حقیقتاً ختم کس سن میں ہوا ۔ البتہ چونکہ اس خاندان کے متعلق برسر اقتدار آنے والی دوسری حکومت "اشانہ" تھی اور اس کے شروع کے ایک راجہ دھرمشری اِشانہ دکرِما کے کتبہ کے مطابق سنہ ۱۰۴۲ء کا سال مورخین نے لکھا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ گیارہویں صدی کے آغاز ہی کا کوئی زمانہ اس حکومت کے خاتمہ کا دور ہو ۔

بہرحال چینیوں کی تحریر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس خاندان کے

معاصرین حکمراں جو 'پولی'<sup></sup> (Po-li) میں برسر اقتدار تھے "کاودنیا" خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بڑے شان وشوکت کے دلدادہ تھے۔ان کا تعلق مارتم کے ساتھ دوستانہ تھا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ 'مارتم' کی وسعت سلطنت صرف جاوا ہی تک محدود تھی اور 'بالی' ایک علیحدہ ریاست تھی۔

**وسعت سلطنت** مگر چینیوں کی ایک کہانی سے جس میں"سنیا یا ولد سینا" تحریر ہے اس سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس نے بالی، بیما، کیمر، کیلنگ (یہ مشرقی جاوا کا علاقہ ہے) اور علاقہ سری وجایا اور کچھ علاقہ چین کا بھی فتح کر لیا تھا، مگر چونکہ سنیا یا اس خاندان کا سب سے پہلا حکمراں تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کے عہد میں فتوحات کے باعث 'مارتم' کی حدود اسقدر وسیع ہو گئی ہوں مگر بعد کے حکمرانوں کے متعلق جس قدر بھی کتبے محققین کو ملے ہیں ان سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ عموماً مشرقی جاوا ہی میں باقی رہ گئی تھی۔

**دارالحکومت** اور دارالحکومت بھی "میڈانگ" (Medang) تھا کیونکہ کتبوں پر یہی نام محققین نے دریافت کیا ہے، اور یہ شہر اس زمانہ میں "پریم بانان" کے آس پاس کسی مقام پر واقع تھا، مگر بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ شہر اصل میں ضلع 'رمبانگ' (Rambang) میں تھا 'پریم بانان' کے نزدیک نہ تھا۔

**زبان** زبان[۵۲] کے متعلق انڈونیشی مصنفین نے چینی تحریرات ہی سے معلومات

---

۵۱ چینیوں نے اپنی کہانیوں میں (Po-li) (پولی) 'بالی' کے لئے لکھا ہے۔

۵۲ مشہور چینی سیاح "آئی تسنگ" (I. Sting) کے سفرنامہ میں درج ہے کہ اس عہد

بہم پہنچائی ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ اس عہد کی سرکاری زبان 'جاواکونو' (Djawa Kuno) یعنی پرانی جاوائی زبان تھی یعنی وہ زبان تھی جسے اہلِ ملک بولتے تھے اور یہی ان کا ذریعۂ تحریر بھی تھی اور اس پر سنسکرت کا اثر زیادہ غالب تھا، مگر استعمال کے اعتبار سے بھی یہ کافی پرانی زبان تھی، چنانچہ سب مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ یہ زبان بہت زمانہ پہلے سلینڈرا کے عہد ہی میں معرضِ وجود میں آچکی تھی، کیونکہ اس عہد کی ایک کتاب

---

ماترم میں چین کا ایک مشہور بدھ عالم 'ہوئی ننگ' بدھ مذہب کی کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے "ہولنگ" آیا تھا (ہولنگ سے کونسا شہر مراد ہے یہ اب تک فیصلہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ البتہ یہ علاقہ کیدوہی کا کوئی مقام ہے) اور وہاں کے مقامی عالم "جوُہنا پوتولو" سے ملا تھا جو خود بدھ مذہب کا بہت بڑا عالم تھا، ہوئی ننگ اس ملک کی زبان "کون لُن" (Kw'un-lun) سے واقف تھا۔ اور اس لئے چینی زبان میں ترجمہ کرنا اس کے لئے ممکن ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ جو نام چینیوں نے استعمال کیا ہے وہ 'نوسنتارا' کی اُن تمام زبانوں اور بولیوں ہی کی نسبت ہو جو تھوڑے تھوڑے فرق سے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھتی تھی، کیونکہ یہ نام بقول اندونیشی مصنفین مختلف جزائر کے مختلف حصوں کی بولیوں میں استعمال ہوتا تھا۔ چینی لٹریچر، میں 'کُون لُن' کا نام 'ملایو' کے بارے میں ملتا ہے، اور اسی لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ 'کُون لُن' سے اُن کی مراد 'ملایو' ہی ہے (یعنی بہ وسعتِ نوسنتارا کی تمام زبانیں) اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں 'ملایو' زبان کا دائرۂ عمل بہت وسیع تھا۔ اور یہ ایک علمی زبان تھی، 'نوسنتارا' میں بہت زمانہ قبل سے رائج تھی۔ بلکہ اس کا تعلق 'عہدِ قبل تاریخ' سے بھی بتایا جاتا ہے اس کے متعلق کوئی تحریری شہادت کتبہ یا کسی اور صورت میں محققین کو آج تک نہیں مل سکی ہے (میں نے اس پر کچھ بحث عہدِ قبل تاریخ کی لسانی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے بھی کی ہے) - قادری

"اُمرا مالا"، جو سنسکرت رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے دریافت کی گئی ہے جو عبارت کے لحاظ سے "جاوا کونوں" میں تحریر ہے، اور خاندان سلینڈرا کے ایک راجہ "دیپئی تندرا" کے حالات پر بھی ہلکی ہلکی روشنی ڈالتی ہے۔

اسی طرح "پینگنگ" (جس کا نام اب سُرا کرتا ہے) کے مقام پر جو تانبہ کی تختی برآمد ہوئی ہے اور جس پر ۱۵۰۶ء کے سال کے ساتھ "راجہ راکر یان" کا نام اور خاندان کا نام درج ہے اس کی ساری عبارت بقول "سنوسی پانے" "جاوا کونو" ہی سے تعلق رکھتی ہے حالانکہ اس کا رسم الخط "پلاوا" ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں غالباً یہی رسم الخط جاوا میں رائج تھا۔

**مذہب اور تمدن** بہر حال مذہب کے متعلق بھی عموماً مصنفین کا یہی خیال ہے کہ بالی اور ہولنگ (جس سے مراد ماترم ہے) میں اکثریت کا مذہب بدھ ہنایانہ تھا، اور رسم و رواج بھی بہت حد تک ملتے جلتے تھے البتہ "سنیایا" شیوا کو پوجتا تھا اسی لئے اس کے منادر عموماً شیوا ہی سے منسوب ہیں۔

چینی مصنف آئی سنگ (I. Sting) نے اس وقت کے پولی (بالی) کے راجہ کی جاہ و حشم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے[۱]۔

"اس حصہ میں کوڈنیا خاندان کا راجہ راج کرتا ہے۔ اس کے تحت میں بہت سے گاؤں ہیں، علاقہ کی آب و ہوا گرم ہے۔ سرسبزی و شادابی کی بھی فراوانی ہے، لوگ سال میں دو فصلیں کاٹتے ہیں۔ اور کپاس سے بُنا ہوا کپڑا استعمال کرتے ہیں، راجہ سِلک کے کپڑے پہنتا ہے، اور سونے کا تاج اوڑھتا ہے جو جواہرات سے مرصع ہے، اس کا تخت بھی

---

[۱] "سجارا اندونیشیا"، صفحہ ۴۶ مصنفہ سنوسی پانے مطبوعہ جکارتا ۱۹۵۰ء۔

طلائی ہے، اور جواہرات سے مزّین ہے، اس کی غاشیہ بردار عورتیں ہیں۔ جو اپنی چوٹیوں میں پھول سجاتی ہیں، اور ہاتھوں میں سفید مور کے پروں کا پنکھا رکھتی ہیں راجہ گاڑی میں بیٹھکر سیر کو جاتا ہے۔ اور ہاتھی پر بھی سوار ہوتا ہے۔ گاڑی باقاعدہ چھت دار ہے، یہ چھت بھی پروں سے منڈی گئی ہے۔ جب سواری نکلتی ہے تو ڈھول بجانے والے گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور آگے آگے بگلچی ہوتے ہیں، جب گاڑی ہنکتی ہے تو گولے چھوڑے جاتے ہیں۔ گولوں کو سر کرنے کے لئے توپ اور بارود دونوں استعمال ہوتی ہیں دربار میں وزیر بھی ہوتا ہے۔ راجہ بڑا سخت ہے، قاتل اور چور کو سخت سزائیں دیتا ہے جُرم ثابت ہو جانے پر ہاتھ اور پاؤں قلم کرا دیتا ہے۔ لوگوں کا مذہب بدھ ہنایانہ، ہے۔ لوگ چاند چھُپ جانے پر عبادت کرتے ہیں، اور ان کی عبادت کا طریقہ یہ ہے کہ کھانے کی چیزیں اور شراب وغیرہ چاندی کے برتن میں رکھتے ہیں اور جا کر بہتے ہوئے چشمہ میں بہا دیتے ہیں"۔

بہرحال یہی قریب قریب بعہد ماترم، جاوا کا تمدن ہو گا کیونکہ پولی (بالی) اس زمانہ میں (بعہد سینیایا) یا اس سے کچھ قبل و بعد، ماترم کا علاقہ رہ چکا تھا۔ جداگانہ طور پر ماترم کے راجاؤں کے متعلق چینی قصے اسقدر تفصیلات کے ساتھ دستیاب نہیں ہیں۔ اس لئے عموماً یہی قیاس کیا جاتا ہے کہ جاوا کے راجگانِ ماترم کا تمدن بھی اسی قسم کا تھا۔

**منادر اور آثار** اِس خاندان کے راجاؤں کو بھی عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا، چونکہ یہ لوگ سلینڈرا، حکمرانوں کی طرح مذہب کے دلدادہ تھے اس لئے عموماً منادر بہت بڑے بڑے بنوانے تھے، ان راجاؤں میں

میالیتونگ' اس خصوص میں بہت زیادہ مشہور ہے بقول مورخین آثار قدیمہ پریم بانان اور چانڈی کورو جونگر ینگ کے جو منادر ہیں وہ عموماً بالیتونگ اور دوسرے اسی سلسلہ کے حکمرانوں کی یادگار ہیں کہا جاتا ہے کہ جب کوئی راجہ مرجاتا تھا تو اس کے جسم کو ان منادر کے مقامات پر لاکر نذر آتش کیا جاتا تھا، اور پھر اس کی خاکستر بھی اسی مقام پر ہوا میں اڑائی جاتی تھی۔ پھر اسی مقام پر مندر تعمیر کر دیا جاتا تھا، اور اس مرنے والے کا پتھر کا مجسمہ بنا کر لایا جاتا تھا اور قدیم دیوتاؤں ہی میں سے (مثلاً شیوا، مہادیو وغیرہ) کسی کے نام کے ساتھ معنون کر دیا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ مورتی یا مجسمہ اس دیوتا کا نہ ہوتا تھا، بقول ایک مصنف یہی وجہ ہے کہ "پریم بانان" کے مندر کی 'مہادیو' کی مورتی مہادیو کی مورتی نہیں ہے بلکہ وہ بالیتونگ کی مورتی ہے جو اسی رسم کے مطابق مہادیو کے نام سے منسوب ہوگئی ہے۔

## سلطنت اشانہ

بہر حال 'ماترم' کے ساتھ ساتھ ایک اور ہندو حکومت کے قیام اور عصر کے متعلق ماہرین اثریات نے اپنی جدید تحقیقات کے ذریعہ پتہ چلایا ہے جو 'اشانہ' کے نام سے قیام کیدیری کے وقت تک برسر اقتدار رہی ہے، مگر یہ اسکا قیام وقرار او مستقر واستقرار ملک کے اطراف وجوانب میں کس سمت میں تھا کچھ معلوم نہ ہوسکا اس کی کتباتی معلومات کی اس قدر قلت سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت ہی چھوٹی سی ریاست تھی اور غالباً مدت کے اعتبار سے بھی کچھ ہی عرصہ قایم رہی تھی، بہر حال اس کے متعلق انڈونیشیا کے بعض مصنفین نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ تاریخی اور تمدنی نقطۂ نظر سے زیادہ مفید اور اس قابل نہیں ہیں کہ اس مقام پر کتاب کی بیجا ضخامت کے لئے درج کی جائیں لہٰذا اس کے بیان کو اب اسی منزل پر چھوڑا جاتا ہے اور کیدیری کے حالات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

## سلطنت کیدیری سنہ ۱۰۴۲ء تا سنہ ۱۲۲۲ء

"سلطنت اِشانہ" کے بعد جزیرۂ جاوا میں کیدیری[۵۱] سلطنت کا آغاز ہوا جو انڈونیشیا کے عہدِ تاریخ کی ان ریاستوں میں شمار ہوتی ہے جن کے حالاتِ تاریخی، صحیح صحیح طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو کسی خاص ربط اور تسلسل کے ساتھ نہیں ہیں بہرکیف یہ واقعات جسقدر بھی دستیاب ہوئے ہیں، پچھلی سلطنتوں کے حالات کی طرح سے مورخین اور محققین نے انھیں تین خاص وسائل سے ترتیب دیا ہے۔ مثلاً وقتاً فوقتاً آثارِ قدیمہ میں سے نکلے ہوئے کتبوں سے، قدیم مذہبی داستانوں سے اور پھر اہلِ چین کی بیان کردہ کہانیوں سے۔ اسی لئے اس حکومت کے دور کی صحیح تاریخ، حکمرانوں کا سلسلہ اور ان کا عہد بعہد سریر آرائے سلطنت ہونا، قوانین مرتب کرنا اور آئین کو رائج کرنا، سکوں کی تشخیص، جنگ و نبرد کے واقعات، امور معاشی کی تکمیل اور واقعاتِ سیاسی کا تجزیہ یہ سب کچھ سائنٹفک اصولوں پر تاریخ کے علم میں نہ آسکا۔ لہٰذا اس باب میں تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں بتایا جاسکتا البتہ جسقدر بھی معلومات تاریخ کے علم میں آسکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کیدیری" بھی اپنے زمانۂ عروج میں جس کی مدت[۵۲] سنہ ۱۰۴۲ء سے سنہ ۱۲۲۲ء تک قرار دی گئی ہے، ایک مضبوط ترین

---

[۵۱] کیدیری کا نام اس سلطنت کے لئے کیوں تجویز کیا گیا، بقید وجوہ کسی ذریعہ سے بھی معلوم نہ ہوسکا، البتہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً مقام کی مناسبت سے یہ نام سلطنت کا عنوان بنا ہے۔ کیونکہ کیدیری جنوبی مشرقی جاوا میں اس سلطنت کا خاص شہر اور پایۂ تخت تھا اور آج بھی نقشوں میں یہ شہر موجود ہے، اب ریلوں کا جنکشن ہے، تجارت کا مرکز ہے اور آثار قدیمہ کا حامل ہے، آبادی کے اعتبار سے محض ایک قصبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

[۵۲] اس سلسلہ میں جو متعدد کتبے دریافت ہوئے ہیں ان میں سب سے پہلے کتبہ پر سنہ ۱۰۴۲ء کا سال کندہ ہے اور بقول محققینِ آثارِ قدیمہ اس پر مشہور راجہ "جایاورشادِگ جایا سستراپرابو" کا طویل

سلطنت تھی، ایک مستقل نظم ونسق کی حامل تھی اور ایک باقاعدہ تمدن کی مدعی تھی اور جاوا کے ایک وسیع رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ چین اور دیگر آس پاس کے ممالک کے ساتھ رشتۂ مخالصت رکھتی تھی۔

## تمدنی کیفیات

چنانچہ چین کے قدیم بدھ مصنفین کی کہانیوں اور دیگر تحریرات سے "کیدیری" کے عہد کے بارے میں جو تفصیلات بہم پہنچائی گئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سلطنت کا دائرہ عمل نوسنتارا کے مشرق میں پھیلا ہوا تھا، پاپوا بھی اس کی قلمرو میں شامل تھا، مشرقی جاوا اس سلطنت کا خاص رقبہ اثر

---

نام کندہ ہے جو ہندو دیوتا "وشنو" کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا کیونکہ کیدیری کی حدود میں وشنو کے مذہب کو اسی راجہ نے رائج کیا تھا۔

ایک اور کتبہ سے پتہ چلایا گیا ہے کہ اس سلطنت سے قبل مشرقی جاوا میں ایک اور طاقتور سلطنت بھی برسر اقتدار تھی جس کا حال نہ تو کتبات ہی پر درج ہے اور نہ اہل چین کے قصوں ہی میں ملتا ہے۔ ماسوا اس کے کہ اس سلطنت کے بارے میں صرف ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جو کیدیری کے زمانہ سے کچھ ہی قرب رکھتا ہے اور اس پر بقول ماہرین آثار قدیمہ راجہ "سری کاوت سنہا کرنا" کا نام کندہ ہے اور ریاست کی جگہ جنگالا مندرج ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس سلطنت کے کئی سو سال بعد اقتدار حاصل کرنے والی سلطنت "مجاپاہت" کے عہد میں بھی اس کے جاری کئے ہوئے خطابات رائج تھے اور بعض قانون بھی برقرار تھے لہذا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سلطنت بھی ترقی یافتہ تھی مگر کیدیری کے بعض کتبات سے مورخین نے اس امر کا پتہ چلایا ہے کہ جنگالا کے حکمراں کیدیری کے راجاؤں کو اپنا شہنشاہ مانتے تھے اور ان کے درباروں میں تحفے اور سوغات بھی بھیجتے تھے۔

## بیشورا اول

ایک اور کتبہ سے مزید معلومات یہ بہم پہنچائی گئی ہے کہ کیدیری میں ۱۱۱۵ء سے ۱۱۳۰ء تک "سری مہاراجہ راکے سری کن سری کم ایشوراسکالا ہوانا تستی کرانا سروانی وریا پراکراما تنگا دیوا"، (جو باختصارِ نام "کمیشورا اول" کے نام سے مشہور ہے) برسر اقتدار رہا ہے اور یہ کہ یہ

تھا، اور یہاں پر خوب تجارت ہوتی تھی، لوگ عموماً گرم مصالحہ چاول، مونگ پھلی، مچھلی، پھل بکریاں، ہاتھی اور گینڈے کے سینگ، چاندی کے برتن، ردئی اور ریشم ملک چین کو بھیجتے تھے، دونوں ممالک کے درمیان آمد ورفت تھی، سوداگر آتے جاتے تھے سوداگروں کی رہائش اور ان کے عارضی طور پر قیام کرنے کے لئے سرکار کی طرف سے بڑی بڑی سرائیں تھیں، ان سراؤں میں کھانے پینے کا بھی انتظام معقول تھا، شادی کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ دلھن والے دولھا والوں کو تحفے تحائف اور رقوم ادا کرتے تھے، جب کوئی بیمار پڑجاتا تھا تو دوا دارو کے بجائے دِر، درپن، دُوار اور انتر منتر سے کام لیا جاتا تھا، ہر پانچ ماہ کے بعد ایک تہوار

---

حکمراں بڑا طاقتور تھا، علم وادب سے بھی شغف رکھتا تھا، چنانچہ بدھ مذہب کا ایک مشہور عالم اور مصنف "درمایان"، اس کے دربار کا خاص عالم تھا۔ اس نے چند کتابیں لکھی ہیں جن میں سے "اسمارا دہانہ" بہت مشہور ہے۔ اسی کتاب کے حوالہ سے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس راجہ کا جانشین کمیشورا دوم جس کی شادی جنگالہ کے راجہ کی لڑکی 'امشیانہ' کے ساتھ ہوئی تھی جاوا کے قدیم رومانی قصوں "پانجی"، میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی مصنف کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کمیشورا دوم کے مرنے کے بعد اس کا جانشین "سنگ ماپانی جاپا بایا"، ۱۱۳۵ء سے ۱۱۵۷ء تک وہ مشہور حکمراں گذرا ہے۔ جس کے آخری زمانہ میں تخت نشینی کے سلسلہ میں زبردست خانہ جنگی ہوئی تھی جس میں ایک طرف کے فریق مہابھارت کی طرح 'پینڈوا'، اور دوسرے 'کوروا'، کہلاتے تھے۔

اسی طرح ایک اور قدیم کتاب 'بری ونگ ساہی' کے حوالہ سے بتایا جاتا ہے کہ ۱۱۶۰ء میں "راکے سری کُن سرو یشورا" اور ۱۱۷۱ء میں "راکے ہی نوسری آریشورا" اور ۱۱۸۱ء میں "سری کورنچاریہ دیپا" کیدیری کے حکمراں گذرے ہیں جو عظیم الشان بحری طاقت بھی رکھتے تھے کیونکہ ان کے کتبوں پر "سینا پاتی سرو اجالا" (یعنی امیر البحر) کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور اسی شہادت سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ کیدیری کی قوت جاوا کے باہر بھی ضرور پھیلی ہوئی تھی۔

منایا جاتا تھا۔ اور ہر سال دس مہینے گذر جانے پر لوگ پہاڑوں میں چلے جاتے تھے اور دیوی دیوتاؤں کے سوانگ رچاتے تھے، عیش ونشاط اور لہو ولعب بھی کرتے تھے، بانسری اور ڈھول بجاتے تھے۔ عورتیں بھی ان کے ہمرکاب ہوکر دادِ عشرت دیتی تھیں۔

راجہ عموماً شان وشوکت سے رہتا تھا، ریشمی لباس اور چمڑے کے جوتے پہنتا تھا سروں پر لمبے لمبے بال رکھتا تھا، اور پیچھے کی طرف چوٹی کو عورتوں کی طرح باندھ لیتا تھا اور اس میں پھول گوندلیتا تھا۔ کھانا چاندی کے برتنوں میں کھاتا تھا، اور دربار میں لکڑی کے چوکور تخت پر بیٹھتا تھا، اردگرد سپاہی کھڑے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کمان اور ترکش رہتے تھے۔ جب راجہ کی سواری نکلتی تو ہاتھی جلوس میں چلتے تھے۔ راجہ خود ہاتھیوں کی گاڑی میں بیٹھتا تھا، آگے پیچھے پانچسو اور کبھی سات سو سپاہی ہوتے تھے، جب راجہ کی گاڑی عام شاہراہوں سے گذرتی تو چلنے والے رک جاتے تھے اور آگے کی طرف آکر دوزانوں بیٹھکر سربسجود ہوجاتے تھے۔ قتل، چوری اور ڈاکہ زنی کی سزا موت تھی، مگر معمولی جرائم پر جرمانہ کیا جاتا تھا، کاشت کاروں سے صرف دسواں حصّہ لگان لیا جاتا تھا، اور سوداگر بھی ٹیکس ادا کرتے تھے۔

راجاؤں کی رہائش گاہوں کے متعلق چینیوں کا بیان ہے کہ وہ ایک عمدہ قسم کے محل میں رہتے تھے، ان کے محل میں کنیزوں اور رانیوں کی بڑی تعداد ہوتی تھی محل کی حفاظت کے لئے ایک خاص پلٹن مقرر تھی جو فوج کے افسر اعلیٰ "سینوپاتی" کے تحت میں عمل کرتی تھی۔ کل فوج تیس ہزار تھی، جنھیں بمعہ نگران محل ہر چھ ماہ کے بعد تنخواہ دی جاتی تھی، "سینوپاتی" (کمانڈر اعلیٰ) کو راجہ کی طرف سے ہر چھ ماہ کے بعد دس تولہ سونا بھی مرحمت ہوتا تھا۔ راجاؤں کو علم وادب کا بھی ذوق تھا، شعر وشاعری کی بڑی

قدر تھی، چنانچہ مشہور شاعر "تاناکنگ[۵]" اسی عہد میں گذرا ہے جس کی رزمیہ نظمیں "لُو دہاکہ" اور "ورتا سنچایا"، بہت مشہور رہیں۔

غرض ان مختصر تمدنی حالات سے پتہ چلتا ہے کہ "کیدیری"، جاوا کی ایک بڑی اور طاقتور سلطنت تھی، اس کے دورِ حکومت میں جاوا کی تہذیب نے کافی ترقی حاصل کی تھی، اس کا آخری حکمراں "کرتاجایا" (۱۲۲۲ء) گذرا ہے جس نے ایک مشہور شخص "انگروک[۶]" کے ساتھ لڑائی میں شکست کھا کر سلطنت کو اپنے خاندان سے کھو دیا اور پھر یہ سلطنت دوسرے خاندان میں منتقل ہوگئی اور نہایت ہی کمزور طریقہ پر چلتی رہی۔

---

[۵] ۔ شاعر کیشورا دوم کے عہد (تقریباً ۱۱۰۰ء) میں گذرا ہے اس کی کتاب "ورتا سنچایا"۔ بقول میرے دوست مسٹر سومار یو افسر اطلاعات سفارت خانہ اندونیشیا کراچی، جکارتا کے عجائب خانہ میں تاہنوز موجود ہے۔ (قادری)

## انگروک کی کہانی[۶]

"انگروک" کے حالات کے بارے میں اندونیشیا کے بعض مصنفین نے ایک قدیم کتاب "پرارتون" سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مشہور ہندو دیوتا "برہما" کا لڑکا تھا، اور نہایت ہی مافوق الفطرت خصائل سے متصف تھا۔ اس کے بارے میں قدیم ہندو اندونیشی نے مندرجہ ذیل کہانی لکھی ہے کہ ایک بار "برہما" نے ایک دیہاتی ہندو حسینہ "بینکور" کے ساتھ انسانی شکل میں آکر مباشرت کرلی تھی جس کے نتیجہ کے طور پر یہ لڑکا پیدا ہوا، اس کی ہیئت اور شکل بھی دیوتا کے صُلب سے ہونے کے باعث عجیب و غریب تھی یعنی وہ جھلملاتا اور چمکتا تھا، لہٰذا اس کی ماں نے ڈر کر ایک پہاڑی کی کھوہ میں جاکر رکھدیا کہا جاتا ہے کہ یہ کھوہ ایک مشہور ڈاکو کی کمین گاہ تھی۔ "بینکور" واپس چلی آئی، اور ادھر تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکو بھی کہیں ڈاکہ مار کر واپس اپنی کمین گاہ میں چلا آیا کیا دیکھتا ہے کہ کوئی چیز ایک چٹان کی آڑ میں رکھی ہوئی چمک رہی ہے، قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا ہے، اس کے کوئی اولاد نہ تھی، اس نے اس بچہ کو پاکر بہت خوش ہوا اور لوٹتے وقت اپنے گھر لے گیا۔ اور اس کا نام "انگرو" رکھا۔ جب یہ بچہ بڑا ہوا تو اسے بھی ڈاکوؤں کے رسم و

۱۲۲۲ء میں 'انگرو' نے اس کے مقابلہ کی ایک دوسری سلطنت قایم کرلی۔ جو ''سلطنت سنگوساری'' کہلاتی ہے۔

## سلطنت سنگوساری
## ۱۲۲۲ء تا ۱۲۹۳ء

یہ سلطنت بھی 'کیدیری' کی طرح ایک طاقتور سلطنت گذری ہے۔ اس کا بانی (جیساکہ حاشیہ کے نوٹ میں بیان کیا گیا ہے) 'انگرو' تھا، جو بعض ہندؤں کے مذہبی قصوں کے مطابق ۱۲۲۷ء میں قتل ہوکر مرا ہے۔ اس کے قتل کے بعد اس کا ایک گیلڑ لڑکا ''انوسپاتی'' سریر آرائے سلطنت ہوا جو تقریباً ۱۲۴۸ء تک سنگوساری کا حکمراں

---

آئین سکھائے گئے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ایک اچھا خاصہ ڈاکو بن گیا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ بستیوں اور گاؤں کو لوٹنے کے لئے آنے جانے لگا۔ اتفاق سے ایک بار اس نے کسی گاؤں کے سردار کے ہاں ڈاکہ مارا اور اس کی بھینس چرا کر لے گیا، یہ سردار بہت با اثر تھا لہذا انگرو کو بھی اب ڈر محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے بھینس کسی دوسرے گاؤں میں جاکر بیچدی۔ اور وہیں وہ کسی مشہور جواری کے ساتھ رہنے لگ گیا۔ اتفاق سے ایک روز انگرو اس جواری کے ساتھ کسی مقام پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک آواز سنائی دی کہ اگر کوئی شخص اس لڑکے کو اپنے ساتھ رکھے گا تو عمر بھر خوش رہے گا۔ چنانچہ وہ جواری اس نوعمر لڑکے کو اپنے گھر پر لے گیا اور اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ اب انگرو کا شب و روز کا مشغلہ صرف قماربازی تھا۔ یا پھر ڈاکہ ڈالنا اور بستیوں کو غارت کرنا تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے ملک کا مشہور ترین ڈاکو بن گیا۔ تاریخ کی حیثیت سے یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مشرقی جاوا میں 'کیدیری' سلطنت عروج پر تھی، چنانچہ جب اس سلطنت کے حکمراں نے اس ڈاکو کی غارتگری کے حالات سنے تو وہ حیران رہ گیا اور اس نے اپنے ایک مشہور رئیس 'تنگل امیتنگ' کو حکم دیا کہ وہ 'انگرو' کو فوراً گرفتار کرے اور طعمۂ اجل بناکر ختم کردے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اسی اثناء میں انگرو کی ملاقات پہاڑوں کے بہت سے بھوتوں اور دیوتاؤں سے ہوئی اور وہ ایک برہمن سے بھی ملا جو بڑا جوتشی تھا اور وشنو کا عقیدتمند تھا، چونکہ انگرو کو

رہا ہے۔ یہ حکمراں سیر و شکار اور مرغ بازی کا بڑا شایق تھا، چنانچہ اسی مرغ بازی میں وہ ۲۴۸ء میں اپنے ایک سوتیلے بھائی "توہ جایا" کے ہاتھوں قتل کیا گیا کہتے ہیں کہ اس کے جسم کو جس مقام پر نذرِ آتش کیا گیا آج وہاں "چانڈی کیتل" کے مشہور منادر اس کی یادگار کے طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہ منادر شہر مالنگ (مشرقی جاوا) کے قرب وجوار میں واقع ہیں۔ اور شاندار قسم کے تاریخی آثار ملتے جاتے ہیں۔

اسی تسلسل میں آگے چل کر پرانے قصّوں سے پتہ چلتا ہے کہ "انوسپاتی" کے قتل کے بعد ۲۴۸ء میں "توہ جایا" سلطنت سنگوساری کے تخت پر بیٹھا مگر وہ شکل

---

اپنی گرفتاری کے لئے "تنگل امیتنگ" کے تعینات کئے جانے کا علم ہو چکا تھا لہٰذا وہ شکل وصورت اور بھیس بدل کر اس برہمن کے ساتھ "تنگل امیتنگ" کے مکان پر پہنچا جو برہمنوں کا قدرداں تھا اور اس کی خدمت سے وابستہ ہو گیا۔

تنگل امیتنگ نہایت ہی عیاش آدمی تھا، چنانچہ وہ ایک بار ایک بدھ بھکشو کی حسین و جمیل لڑکی "کین ڈیڈس" کو اغوا بھی کرلایا تھا جو اب اس کی ایک ناجائز بیوی تھی۔ ایک روز آنگرو کے سی برہمن نے علم جوتش کے ذریعہ "آنگرو" کو بتلایا کہ یہ عورت بڑی خوش نصیب ہے، جو شخص بھی اس کے ساتھ شادی کرے گا اپنے وقت کا بہت بڑا آدمی بنے گا۔

ادہر "تنگل امیتنگ" آنگرو کی تلاش میں تھا مگر آنگرو اسے کبھی نہیں ملتا تھا حالانکہ وہ بھیس بدلے ہوئے خود اسی کے گھر میں موجود تھا، اور ہر وقت اس کی ملازمت میں رہتا تھا۔

آخر ایک روز موقع پاکر "آنگرو" نے عورت کو حاصل کرنے کے خیال سے تنگل امیتنگ کو قتل کر دیا اور اس کے بجائے خود اس گاؤں (توماپل) کا سردار بن بیٹھا اور اس کی حسین مغویہ کے ساتھ اپنی شادی کرلی اور رفتہ رفتہ اپنی طاقت بڑہانی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ مشرقی جاوا کے مشہور پہاڑ "کاوی" کی بستیوں کو اپنے اثر میں لے لیا۔

کیدیری کے راجہ "کرتاجایا" نے جو بدھ لوگوں کا دشمن اور برہمنوں کا دوست تھا، اپنے شہر

سے چند ماہ ہی حکمراں رہا ہوگا کہ انوسپاتی کے بڑے لڑکے "رنگاؤنی" کے پیدا کردہ انقلاب کی زد میں آکر تخت وتاج سے دستبردار ہوگیا اور کسی گمنام مقام پر روپوش ہوکر لاپتہ ہوگیا۔

اس کے بعد (اسی سال یعنی ۱۲۴۷ء میں) انوسپاتی کا لڑکا رنگاؤنی "جایا وشنو وردانا" کے لقب سے سریرآرا ہوا اور ۱۲۶۸ء تک حکمراں رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رنگاؤنی ایک نہایت ہی عیش پرست اور بدطینت حکمراں گذرا ہے۔ اس کے عہد میں سنگوساری کا دارالحکومت "کوٹاراجہ" سے بدل کر "سنگوساری" کیا گیا۔ تعمیرات اور فوجی قوت کو بھی فروغ دیا گیا، اور ایک نیا شہر بھی "چنگو" کے نام سے آباد کیا گیا جو بعد میں آگے چل کر تجارت

---

کے بدھوں کے خلاف فساد برپا کر کے انھیں بیرحمی کے ساتھ قتل کروانا شروع کیا تو ان کے بعض بڑے اور بااثر لوگ 'آنگرو' سے آملے اور اس کو تقویت پہنچا کر ایک فوج کی شکل میں جمع ہوگئے۔ اور بالآخر ایک مقام "گنتر" پر کرتا جایا کے ساتھ جنگ آزما ہوگئے۔ کیدیری کی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ گئی، کرتا جایا بھی فرار ہوگیا، اس کی بیوی بھی غائب ہوگئی اور 'آنگرو' اس کی جگہ راجہ بن گیا اور اس نے اپنا نام 'راجہ سا' اور اپنی حکومت کا نام 'سنگوساری' رکھا۔

غرض کیدیری کی بڑی سلطنت برباد ہوگئی اور چھوٹی چھوٹی کئی آزاد سرداریوں میں بٹ گئی۔ چنانچہ بعض قصوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس حکومت کا ایک اور جانشین سُستراجایا ۱۲۷۱ء میں ہوا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں قدیم جنگالا کی عمارتیں بھی قایم تھیں، لہذا ایک زمانہ میں ان سب نے متحد ہوکر ایک بار پھر 'کیدیری' کے نام کو چمکایا مگر وہ سنگوساری کے مقابلہ میں پیش نہ آسکیں۔

## آنگرو کا قتل

بہر حال تنگل امیتنگ کی بیوی نے جو اب 'آنگرو' کی رانی تھی اپنے پچھلے شوہر کی یاد کو نہ بھلایا، اور ایک روز اس شوہر کے لڑکے سے (جو خود اس کے بطن سے تھا) اور انوسپاتی کے نام سے مشہور تھا، اس کے باپ کے قتل کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ انوسپاتی ایک غیرتمند اور جوشیلہ نوجوان تھا، باپ کے قتل کی داستان سُنکر غضب میں آگیا اور عہد کرلیا کہ جب تک وہ آنگرو (یعنی راجا سا) کو بھی اسی طرح قتل نہ کردے گا چین سے نہ بیٹھے گا۔

کا بڑا مرکز اور بندرگاہ بھی بن گیا۔

بہرحال اس راجہ نے ۶۸ھ/۱۲۶۸ء میں "مبنڈارا گیری" (جو ملیبے تار کے نزدیک واقع ہے) کے مقام پر انتقال کیا۔

**کرتانگارا کی تخت نشینی**

اس کے بعد اس کا لڑکا 'کرتانگارا' کے لقب سے تخت نشین ہوا مگر اس کے حالات بہت کم ملتے ہیں، عصر حاضر کے ایک اندونیشی مورخ اور قصہ نویس، نے ایک پرانی اندونیشی قصوں کی کتاب "نگاراکرتاگاما" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ مذہباً بدھ تھا اور اعلیٰ قسم کا فلسفی بھی تھا، اور اپنے خانوادۂ شاہی

چنانچہ ایک روز اس نے سازش کرکے ایک دربان کے ذریعہ اپنے سوتیلے باپ 'آنگرو' کو قتل کروادیا اور پھر اس ڈر سے کہ کہیں راز فاش نہ ہوجائے اس دربان کو بھی مار ڈالا، اس طرح سنگوساری کے پہلے حکمراں کو قتل کرکے ۱۲۲۷ء میں 'انوسیاتی' خود راجہ بن گیا۔

**انوسیاتی کا قتل**

جاوا کی پرانی کتاب 'پرارتون' کے حوالہ سے واقعہ نگاروں نے لکھا ہے کہ 'آنگرو' کے بھی دوسری بیوی سے ایک لڑکا تھا اور 'توہ جایا' کے نام سے مشہور تھا، رفتہ رفتہ جب اسے بھی واقعہ کا علم ہوا تو وہ بھی 'انوسیاتی' کی گھات میں رہنے لگا۔ 'توہ جایا' کو بھی انوسیاتی کی طرح سیر وشکار اور مرغ بازی کا شوق تھا (کیونکہ اس زمانہ میں مرغ لڑانا ہندو مذہب کا ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا) چنانچہ ایک روز 'توہ جایا' نے اپنے محل میں (جو اسے بطور شہزادہ کے زندگی بسر کرنے کے لئے ملا ہوا تھا) دعوت کا اہتمام کیا اور مرغ بازی کو بھی ترتیب دیا اور 'انوسیاتی' کو اس میں مدعو کیا، 'انوسیاتی' اب تک صورت حال سے نابلد تھا۔ چنانچہ بلاتامل دعوت میں چلا گیا۔ 'توہ جایا' نے اس کے قتل کی سازش مکمل کر رکھی تھی، لہٰذا جیسے ہی کہ وہ اس شہزادہ کے محل میں آیا، قتل کر دیا گیا۔ اس طرح 'انوسیاتی' 'توہ جایا' کی سازش سے قتل ہوگیا اور پھر توہ جایا خود اس کی جگہ راجہ بن گیا۔

کے تمام حکمرانوں میں سب سے پہلا شخص تھا جس نے 'پرابو' کا لقب اختیار کیا مگر وہ اعلیٰ قسم کا منتظم اور مدبر نہ تھا، البتہ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور شان وشوکت کا بڑا دلدادہ تھا، عمدہ قسم کے کھانوں سے بھی اسے بڑی رغبت تھی، چنانچہ ایک بار اپنے ایک باورچی سے خوش ہوکر اسے اپنا وزیر اعظم بھی بنالیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں خرابیاں اور بدنظمیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ دربار کے اکثر اشراف بھی اس کے مخالف ہوگئے۔

## توماپل کی جنگ ۱۲۹۲ء

اتفاق سے اسی دور میں 'کیدیری' کی اس ٹوٹی پھوٹی حکومت نے جو ایک چھوٹے رقبہ میں 'کرتا جایا' کے لڑکے

## توہ جایا کی تخت نشینی اور اس کا واقعۂ قتل

کہتے ہیں کہ انوسپاتی کے بھی دو اولادیں تھیں یعنی ایک لڑکا اور ایک لڑکی لڑکے کا نام 'رنگاؤنی' اور لڑکی کا نام 'می ساچمپاکا' تھا اور یہ دونوں نہایت ذہین اور بااثر تھے، عوام کی ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ تھی۔ لہذا انپار اجہ توہ جایا (جس نے ان کے باپ کو قتل کرایا تھا) اب ان کے خوف سے ہر وقت مشوّش اور متفکر رہنے لگا اور انھیں اپنے اقتدار کے خلاف ایک خطرۂ سیاہ تصوّر کرکے قتل کرنے کی فکر کرنے لگا۔ چنانچہ بالآخر اس نے ایک روز اپنے وزیر اعظم 'لمبو امپل' کی طرف رجوع کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح موقع مناسب سمجھکر ان دونوں بہن بھائیوں کو قتل کروادے۔ امپل ایک سمجھدار اور عواقب شناس آدمی تھا، وقت اور موقع کو بھی پہچانتا تھا لہذا بہت عرصہ تک وہ یونہی ٹال مٹول کرتا رہا۔ اور راجہ کے ان دونوں دشمنوں کو قتل کرانے سے باز رہا۔

'توہ جایا' کو یہ بات ناگوار گذری لہذا اس نے امپل پر سختی کرنی شروع کی۔ بالآخر امپل، اس کو برداشت نہ کرتے ہوئے 'توہ جایا' کے دشمنوں سے آملا اور ان سے سازش کا سارا احوال کہ سنایا۔

رنگاؤنی اور می ساچمپاکا، امپل کے آملنے سے خبردار ہوگئے اور اب توہ جایا کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی سوچنے لگے، چونکہ راجہ کے محل کے سپاہیوں پر بھی ان کا اثر تھا لہذا ایک عظیم الشان سازش تیار کرکے محل کے سپاہیوں کو انقلاب برپا کرنے کے لئے رضامند

'جایا کتوانگ'، کے زیرنگیں برسراقتدار تھی، جزیرۂ مدورا کے ایک باا ثر رئیس اور کرتاجایا کے پرانے دوست "آدی پاتی ویرا راجہ" کی مدد سے کرتانگارا کے ملک پر ۱۲۹۲ء میں چڑھائی کرنے کا حکم صادر کردیا اور جنگ چھڑ گئی۔

**سنگوساری کا خاتمہ**

کرتانگارا نے 'جایا کتوانگ'، کے حملہ کو روکنے کے لئے ایک بڑی فوج اپنے ایک مشہور جرنیل "ریڈن وجایا"[۱] کی ماتحتی میں روانہ کی، پھر خود بھی ایک کمک لیکر میدان میں آیا 'توماپل'، کے مقام پر خونریز لڑائی ہوئی۔ فوج اور افسر سب راجہ سے بددل تھے لہذا کامیابی کے ساتھ دشمن کے کرنے میں کامیاب ہو گئے بالآخر بغاوت ہوئی، راجہ بھی زخم خوردہ محل سے فرار ہو گیا، اور حکومت تہ و بالا ہو گئی۔

**رنگاوُنی کا دور حکومت**

اس طرح 'توہ جایا'، کے معزول ہو جانے پر ۱۲۴۸ء میں رنگاوُنی سلطنتِ سنگوساری کا حکمراں بنا، چھ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۲۵۴ء میں اس نے اپنے بڑے لڑکے 'کرتانگارا'، کو اپنا ولیعہد سلطنت (یوتیرامہ کوتا) بھی قرار دیا، کہتے ہیں کہ یہ سنگوساری کا ایک نہایت ہی غیر معروف سا حکمراں گذرا ہے، اس کے حالات بھی کتبِ قصص میں بہت کم ملتے ہیں، اور جو کچھ بھی ملتے ہیں ان سب سے یہی پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ راجہ نہایت ہی عیش پرست اور دلدادۂ نشاط تھا۔

[۱] 'ریڈن وجایا'، 'مہی ساچمپاکا'، کا پوتا تھا اور قدیم شاہی خاندان سے تھا اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے راجہ کرتانگارا کی افواج کا جرنیل تھا) جب کرتانگارا کو شکست ہو گئی تو یہ راجہ کی لڑکیوں کو جو تعداد میں چار تھیں بچانے کی غرض سے اپنے ہمراہ لے کر جزیرۂ مدورا کو چلا گیا اور وہاں کے رئیس "آدی پاتی ویرا راجہ" (جس نے جایا کتوانگ کو مدد دی تھی) کے لڑکے کا مصاحب ہو گیا اور رفتہ رفتہ ویرا راجہ سے بھی اپنے تعلقات خوشگوار کرلئے۔ کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد اس کی مدد سے ایک بڑی سپاہ بہم پہنچا کر جاوا میں 'ترک'، نامی مقام حاصل کرنیکی

مقابلہ پر نہ لڑ سکے اور بالآخر کرتا نگارا ہار گیا اور میدان میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور اس طرح سنگوساری کی سلطنت ختم ہوگئی۔ رڈن وجایا بھی میدان چھوڑ کر فرار ہوگیا جو بعد میں ایک نئی سلطنت کا بانی گذرا ہے۔ یہ سلطنت قدیم ہندو اندونیشیا کی سب سے زیادہ شاندار اور وسیع و عریض سلطنت خیال کی جاتی ہے۔ اس کا رقبہ بھی موجودہ اندونیشیا کی طرح بہت ہی بڑا تھا، ہندؤوں کے مذہبی علوم کی بھی اس سلطنت کے دور میں بڑی ترقی ہوئی اور اندونیشیا کی ہندو تمدن نے بھی کافی فروغ حاصل کیا، تاریخ میں یہ سلطنت "مجاپائٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے حالات اب آگے کے باب میں ملاحظہ ہوں۔

غرض حملہ آور ہوا۔

## مجاپائٹ کے نام کی وجہ تسمیہ

جب رڈن وجایا کی سپاہ "ترک" نامی مقام کو حاصل کرنے کی غرض سے جاوا میں پہنچی اور اس مقام کی نواح میں قیام پذیر ہوئی تو ایک افسر کو ایک درخت نظر آیا جس پر کچھ پھل لگے ہوئے تھے، قریب پہنچا اور کھانے کے لئے ایک پھل کو توڑا تو ذائقہ میں تلخ پایا، آس پاس کے گنواروں سے اس کا نام پوچھا تو پتہ چلا کہ وہاں کے لوگ پھل کو مجو کہتے ہیں اور ان کی زبان میں کڑوے کے لئے پاہت کا لفظ استعمال ہوتا ہے لہذا اس پھل کی مناسبت سے تمام سپاہیوں نے اس مقام کا نام بھی "مجو پاہت" (یعنی کڑوا پھل) رکھدیا جو کثرت استعمال سے بگڑتے بگڑتے "مجاپائٹ" ہوگیا۔ اور اب یہی تلفظ اس معنی کی اصطلاح میں آتا ہے قدیم قصوں میں بھی یہی لفظ استعمال ہوتا رہا ہے

# باب دویم

# ہندو تہذیب کا عروج و زوال

## اور

# سلطنتِ مجاپائت کا عہدِ اقتدار

## سلطنت کا قیام

اس کا بانی "ریڈن وجایا" تھا۔ جس نے ۱۲۹۳ء میں اپنے خود بسائے ہوئے ایک نئے مقام مجوپاہت (مجاپائت جس کے نام کی وجہ تسمیہ ذیل کے نوٹ میں گذر چکی ہے) میں اس کا سنگِ بنیاد رکھا اور رفتہ رفتہ عروج کر کے چینیوں کی مدد سے اس کے وقار کو بڑھایا۔

## چینیوں کا جاوا پر حملہ ۱۲۹۳ء

اس دور میں طوبان" (جو شمالی مشرقی جاوا کے ساحل پر اب بھی ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے) تجارتی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اور کیدیری کے حکمراں "جایا کتوانگ" کا خاص بندرگاہ ہے، اہل چین کے ساتھ بھی اسی بندرگاہ کے ذریعہ تجارت ہوتی تھی۔ بڑے بڑے جہاز آتے جاتے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے راجہ کتوانگ نے چینیوں[۱] کے لئے گرم مصالحہ کی

[۱] بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس حملہ کی تحریک کا باعث مشہور یورپی سیاح (مارکوپولو) کی ترغیب تھی وہ ان جزائر سے گذر کر چین پہنچا تھا اور قبلائی قاآن کے دربار سے وابستہ ہوگیا تھا۔ اس نے چینی

برآمد بند کردی تھی۔ لہٰذا یہ بات وہاں کے شہنشاہ "قبلائے قاآن" کو ناگوار گذری۔ چنانچہ اس نے راجہ کو سزا دینے کے لئے بیس ہزار کا عظیم الشان لشکر ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے ذریعہ روانہ کر دیا۔ یہ فوجیں طوبان میں پہنچکر معرکہ آرا ہوئیں۔ اسی اثنا رمیں ریڈن وجایا، بھی جو کتوانگ کا پرانہ دشمن تھا اپنا لشکر لے کر چینیوں سے آملا اور ایک عہدنامہ کر کے ان کے ساتھ مل کر کتوانگ کے خلاف نبرد آزما ہوگیا۔

اگرچہ کتوانگ بھی ایک لاکھ سپاہ لے کر میدان میں آیا تھا مگر تاتاریوں کی خونخوار فوج کا مقابلہ نہ کر سکا پھر دوسری طرف ریڈن وجایا کی فوج بھی اس کے خلاف چینیوں کی مدد کے لئے موجود تھی۔ غرض آٹھ گھنٹوں کے اندر اندر کتوانگ کی فوج میدان سے بھاگ نکلی اور اس طرح اسے شکست ہوگئی۔ قدیم قصوں سے پتہ چلتا ہے کہ چینیوں نے کتوانگ کو قید کر لیا اور سولی پر لٹکا کر ہلاک کر دیا۔ اس طرح جاوا کی ایک بڑی سلطنت کا آخری راجہ بھی ختم ہوگیا، سنگوساری پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا اب "ریڈن وجایا" کو اپنی حکومت قایم کرنے کے لئے میدان صاف ہوگیا۔

### چینیوں کی ہلاکت

کتوانگ جیسے دشمن کو ختم کروا کر ریڈن وجایا نے اب چینیوں کے خلاف بھی سازش کی۔ انھیں اپنا مہمان بنانے کے لئے اپنے گاؤں "مجاپائت" میں ایک دعوت میں مدعو کیا، جب بہت کچھ سپاہ آپہنچی تو کھانے میں زہر ملا کر سب کو موت کی نیند سلا دیا اور اس طرح چینیوں کے لشکر کا ایک بڑا حصہ ہلاک کر کے بے غل و غش پورے جاوا کا حکمراں بن بیٹھا۔ اور سنہ ۱۲۹۳ء میں۔

---

شہنشاہ سے یہاں کی دولت کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ وہ خود بھی سپاہ کے ساتھ آیا اور پھر یہیں سے اپنے وطن (یورپ) لوٹ گیا۔

## مجاپائت کا پہلا حکمراں ۱۲۹۳ء تا ۱۳۰۹ء

"مجاپائت" کی نئی سلطنت قائم کر کے اس کا سب سے پہلا حکمراں بنجانے کا اعلان کر دیا۔ اور اپنا لقب "کرتا راجاسا جایا وردانا" اختیار کیا۔ وہ ۱۳۰۹ء تک حکمراں[1] رہا ہے۔

قدیم جاوائی کتاب "نگارا کرتا گاما" کے حوالہ سے بعض مصنّفین نے لکھا ہے کہ "ریڈن وجایا" نہایت ہی اولوالعزم اور شاندار حکمراں تھا، اس کے زمانہ میں نظم و نسق بھی نہایت عمدہ تھا۔ لوگ امن کے ساتھ زندگی گذارتے تھے، اور ملک رو بہ ترقی تھا، راجہ اگرچہ قابل تھا مگر نہایت درجہ وہمی اور خود پسند تھا، اور وہم کی وجہ سے اکثر اپنے ساتھیوں سے بھی خائف رہتا تھا، اسی لئے انھیں ترقی دیتے ہوئے بھی ڈرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اکثر اس کے ساتھی (مثلاً نمبی اور رنگالادے وغیرہ) بھی اس کے دشمن ہو گئے تھے، لیکن اس نے آہستہ آہستہ سب کا قلع قمع کر دیا مگر ۱۳۰۹ء میں اچانک حرکت قلب کے رُک جانے سے مر گیا۔

## مجاپائت کا سب سے مضبوط حکمراں

اس کے مرجانے کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا 'جایا نگارا' کے لقب سے

---

[1] حکمراں بنجانے کے بعد اس نے اپنے قدیم آقائے دولت کرتا نگارا (والیٔ سنگو ساری کی ان چاروں لڑکیوں کے ساتھ شادی رچالی جنھیں وہ کرتا نگارا کی شکست کے بعد بچانے کے خیال سے جزیرۂ مدورا میں لے گیا تھا۔ "پانجی" کے قصّوں میں ان کے نام اس طرح دئے ہیں۔ پہلی عورت (کا نام) پرامیشوری یا استیری بوانا، دوسری نرندرا دُوہتا، تیسری پراجنا یارامیتا، اور چوتھی گایاتری یا راجہ پتنی تھی، یہ چاروں بہنیں تھیں اور بیک وقت ایک ہی شوہر (ریڈن وجایا) کی زوجیت میں تھیں۔

۱۳۰۹ء میں مجاپائت کا حکمراں بنایا گیا۔ کہا جاتا ہے۔ یہ راجہ اپنے وقت کا سب سے بڑا اور لائق حکمراں گذرا ہے۔ اس کے زمانہ میں سلطنت کو بھی بڑی وسعت حاصل ہوئی اور جاوا کے ہندو تمدن کو بھی کافی عروج ہوا۔ کالیمنتان (بورنیو) بھی اسی کے زمانہ میں جاوا کی قلمرو میں شامل کیا گیا۔

پرانے قصّوں میں لکھا ہے کہ یہ راجہ بھی شان و شوکت کا بڑا دلدادہ تھا۔ اعلیٰ قسم کے محل میں رہتا تھا، اور محل پر فوج کی ایک بڑی گارد متعین تھی، جسے "باینگ کاری" کہتے تھے۔ انہی میں سے ایک شخص "گجا مد" بھی تھا جو آگے چل کر مجاپائت کا کامیاب ترین وزیر اعظم گذرا ہے یہ شخص قدیم انڈونیشیا کی تاریخ میں بہت شہرت رکھتا ہے۔

## باینگ کاریوں کی بغاوت ۱۳۱۹ء

بہرحال راجہ "جایانگارا" کے بھی اس کے باپ کی طرح سے بہت سے جاہ طلب لوگ دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہی دشمنوں میں ایک شخص "ستمی" گذرا ہے جس نے ایک بار ہولناک قسم کی سازش کر کے محل کے تمام سپاہیوں کو راجہ کے خلاف اُکسا دیا اور ایک خطرناک قسم کی بغاوت کرا دی یہ بغاوت "باینگ کاریوں کی بغاوت" کہلاتی ہے اس بغاوت نے بڑھتے بڑھتے کچھ اس طرح کا زور پکڑا کہ راجہ بھی اس کی تاب نہ لا سکا اور آخر کار جان بچا کر محل سے بھاگ نکلا۔ اس وقت وفادار "گجا مد" نے بڑی مدد کی اور چپکے سے لیجا کر اسے کسی مندر کے تہ خانہ میں روپوش کر دیا اور عوام کی رائے اور راجہ کی ہر دلعزیزی کو جاننے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ راجہ اس بغاوت میں ہلاک ہو گیا ہے، جب یہ خبر عام ہوئی تو عوام میں کہرام سا مچ گیا، لوگ راجہ

کو دل سے چاہتے تھے لہذا سب اک دم اکھٹے ہو کر باغیوں کے خلاف امادۂ جنگ ہو گئے۔ گجا مَدَ نے یہ موقع بہت غنیمت سمجھا۔ چنانچہ وہ ان کی رہنمائی کے لئے میدان میں نکل آیا، اور پورے پورے جوش کے ساتھ باغیوں سے ان کی سپاہ کو لڑا کر کامیاب ہو گیا۔ کامیابی کے بعد اس نے عوام کو بتلایا کہ راجہ تا ہنوز زندہ ہے اور فلاں مقام پر روپوش ہے، لہذا راجہ کو لایا گیا اور دوبارہ حکمراں بنایا گیا۔ راجہ نے بھی گجا مَدَ[۵] سے خوش ہو کر پہلے اسے اپنی سپاہ کا جرنیل اور پھر وزیر اعظم چن لیا۔

---

[۵] **گجا مَدَ** اگرچہ سلطنتِ مجاپائت کا عظیم ترین شخص گذرا ہے مگر اس کے ابتدائی حالات بھی عہد قدیم میں فن تاریخ کے عدم وجود کے باعث تا ہنوز پردۂ اخفا میں ہیں اور صحیح طور پر آجتک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوا تھا اور اس کے خاندان کے حالات کیا تھے اور پھر کس طرح اس نے راجاؤں کے دربار میں رسوخ اور ملازمت حاصل کی وغیرہ۔

قدیم ہندو قصوں میں جیسا کہ اس دور کے ہندو مصنفین کی عادت رہی ہے ہر بڑے اور غیر معمولی قابلیت کے آدمی کو دیوبانی سمجھکر مافوق الفطرت انسان کے طور پر لکھا ہے اور دیوتا شمار کیا ہے۔ چنانچہ گجا مَدَ کے حالات میں بھی قدیم قصوں میں اسی قسم کی مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔ ایک قدیم کتاب "اوسانہ جاوا" میں (جو قدیم آثار میں دبی ہوئی ملی ہے اور جس کا ترجمہ اندونیشی زبان میں اندونیشیا کے ایک مشہور ادیب مسٹر محمد یامین نے کیا ہے) لکھا ہے کہ گجا مَدَ کے نہ باپ تھا اور نہ ماں تھی بلکہ وہ ایک ناریل کے پھل سے ٹپک پڑا تھا۔ اور دیوتاؤں نے اس کی پرورش کی تھی وغیرہ۔ یورپین محققین کی رائے ہے کہ وہ جاوا میں دریائے برنطاس کے میدانوں میں کسی گاؤں میں ایک غریب کاشت کار کے گھر پیدا ہوا، مگر سن ولادت تاریخ کے علم میں نہیں ہے اس کا ابتدائی زمانہ نہایت ہی پر آلام تھا چنانچہ انہی آلام سے تنگ آکر اُسے راجہ کے محل میں سپاہی کے طور پر نوکری کرلی تھی۔ چونکہ نہایت ہی وفادار قابل اعتماد شخص تھا لہذا برابر ترقی پاتا رہا حتیٰ کہ وزیر اعظم تک ہو گیا۔ وہ تاریخ میں

ولندیزی مورخ ڈاکٹر خراف (اپنی کتاب خرُ خڈ نیز اندونیشی صفحہ ۴۶ پر) لکھتا ہے" کہ گجا مَدَ، قدیم اندونیشیا میں سب سے قابل اور مشہور ترین وزیر اعظم گذرا ہے۔ اس کے دور میں" اوڈرریکوڈی پورڈی نون" (Oodorico de Pordenone) ایک مشہور برنگیزی عالم اور سیاح بھی ۱۳۲۱ء میں جاوا میں آیا تھا اس سیاح نے گجا مَدَ سے ملاقات کی تھی، چنانچہ اپنی اس ملاقات کا ذکر اپنے سفر نامہ میں کرتے ہوئے اس نے اس کی قابلیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ گجا مَدَ نے اپنے حکمراں خاندان کی زرّین خدمات انجام دیں بلکہ اس نے دنیا کے دور دراز حصّوں میں بھی سلطنت مجا پاہت کے اثر کو پھیلا دیا۔

ابھی گجا مَد نے اپنے ملک کے انتظام کو سنبھالا ہی تھا کہ ۱۳۲۸ء میں راجہ جایا نگارا کو اس کے ایک دشمن (تنچا) نے دھوکہ سے قتل کر دیا اور چونکہ اس راجہ کے کوئی لڑکا نہ تھا لہذا تخت و تاج بھی اس کی ماں "براجینشوری" کے سپرد کیا گیا جو تارک الدنیا ہو کر بدھ مذہب کی بھکشن (مُبلّغ) بن چکی تھی۔ اور بدھ مذہب کے اصول کے مطابق حکمراں نہیں بن سکتی تھی چنانچہ اس نے یہ تخت و تاج اپنی ایک لڑکی (یعنی راجہ جایانگارا کی بہن) "تری بوانا تنگا دیوی" کے سپرد کر دیا جو حکمراں ہو کر "وشنو وردانی" کے نام سے موسوم کی جانے لگی اور ۱۳۵۰ء تک "گجا مَدَ" کی نگرانی میں راج کرتی رہی پھر اس کے بعد اس کا ایک لڑکا (جو ایک سنگوساری کے شہزادہ کے صُلب سے تھا) "ہایم وورُک" کے نام سے تخت نشین ہوا۔

---

نہایت ہی باوقار شخص گذرا ہے۔ آج بھی اندونیشیا کے لوگ اس کے وقار کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شہر جوگ جکارتا میں ایک یونیورسٹی بھی قایم کی ہے جو گجا مَدَ یونیورسٹی کہلاتی ہے۔

## راجہ ہایم وُورک ۱۳۵۰ء

تاریخ میں یہ راجہ بہت بڑا حکمراں سمجھا جاتا ہے۔ اور "راجہ سانگارا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ "ہایم وُورک" خود بھی بڑا عالم اور سمجھدار شخص تھا۔ چنانچہ وہ عالموں اور سمجھدار لوگوں کی بھی بڑی قدر کرتا تھا اور اسی لئے اس نے گجا مَدَ کی بھی بڑی قدر کی حالانکہ گجا مَدَ کافی بوڑھا ہو چکا تھا مگر اسی لئے اس نے گجا مَدَ کو پنشن دے کر یا کسی اور طریقہ سے ہرگز علیحدہ نہ کیا، اس طرح گجا مَدَ نے بھی نہایت ہی خلوص کے ساتھ اس کی خدمات انجام دیں۔ بلکہ ملک کے قابل قابل لوگوں کو اعلیٰ خدمات کے لئے اطراف و جوانب سے بھی بلالیا چنانچہ انہی لوگوں میں ایک شخص "آدمی چیا وَرسن" کا نام بھی مصنفین نے اکثر لکھا ہے۔ اور بتلایا ہے کہ یہ شخص بھی گجا مَدَ کی طرح امور خارجہ میں بہت ہی نامور گذرا ہے اس نے ۱۳۵۹ء میں چین کے ساتھ مجاپاہت کے تعلقات کو استوار کیا اور آس پاس کے مقامات میں بھی اپنی حکومت کی زرین خدمات انجام دیں۔

## بچاجاراں کے ساتھ جنگ[۱]

"گجا مَدَ" وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہو جانے کے بعد مدت سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ اس کے راجہ کا اثر آس پاس کے تمام علاقوں پر محتوی ہو جائے اور چھوٹا بڑا کوئی حکمراں ایسا باقی نہ رہے جو "سلطنتِ مجاپاہت" کے زیر اقتدار نہ آگیا ہو، لہٰذا اس نے سُنڈا (مغربی جاوا کے) حکمرانوں سے اس قسم کے تعلقات بڑھانے شروع کئے اور ان سے راجہ کی رشتہ داریاں پیدا کیں۔

---

[۱] یہ ریاست مجاپاہت کے عہد میں ایک نہایت ہی چھوٹی سی ریاست تھی اور قدیم سنگوساری کے زمانہ میں بھی ایک خودمختار اور باوقار ریاست کے طور پر قائم تھی چنانچہ مجاپاہت کے عہد میں پہلی بار اس کو ختم کر کے ایک بڑی سلطنت کا جزو بنایا گیا۔ اس کا کچھ حال صفحہ ۱۲۵ کے ذیلی نوٹ میں ملاحظہ ہو۔

انہی ریاستوں میں ایک ریاست "پجاجاراں" تھی ، جو اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ مگر خود مختار طریقہ پر حکمراں تھی۔ چنانچہ گجا مدّ نے یہاں کے حکمراں کو لکھا کہ وہ اپنی لڑکی راجہ کے حرم میں پیش کر کے تعلقات قایم کرلے، چونکہ 'پجاجاراں' کا حکمراں خود بھی 'مجاپائت' کے راجہ کے ساتھ اپنے تعلقات پیدا کرنے کا متمنّی تھا، لہٰذا وہ اپنی لڑکی کو ہمراہ لے کر خود 'ہایم وُورک' کے دارالحکومت کو چلا آیا، اور آنے کے بعد اس نے گجا مدّ کے ذریعہ رشتہ قایم کرنے کی بات چیت شروع کی گجا مدّ ایک اعلیٰ قسم کا سیاست داں تھا۔ اس اہمیت کو سمجھ گیا اور فوراً ہی اس نے حاکم پجاجاراں سے کہا کہ وہ بجائے اپنی لڑکی کو رانی بنانے کے دلیسے ہی تحفہ کے طور پر راجہ کے حرم میں پیش کردے، اس کو اس نے نہ مانا اور وہ دلیسے ہی بے نیل و مرام واپس لوٹ گیا، اس پر گجا مدّ کو طیش آگیا اور اس نے پجاجاراں کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ پجاجاراں کا راجہ بھی اپنی چھوٹی موٹی فوج لے کر میدان میں نکل آیا، لڑائی ہوئی اور وہ ہار گیا، اور لڑتا ہوا بہادری کے ساتھ مارا گیا، راجہ کی لڑکی بھی اپنے باپ کی شکست کے صدمہ کو برداشت نہ کرتے ہوئے آگ میں جل کر مرگئی، "ہایم وُورک" (مجاپائت کا شہنشاہ) اگرچہ اس لڑائی میں کامیاب ہو کر 'پجاجاراں' پر قابض ہو گیا مگر اپنی حسین معشوقہ کے خودکشی کرنے سے بڑا مایوس ہوا اور مدّتوں اس کے غم میں دیوانہ بنا رہا۔ کیونکہ وہ اس پر عاشق تھا اور اسی کو حاصل کرنے کی غرض سے اس نے پجاجاراں پر چڑھائی کی تھی۔

## دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات

بہرحال پجاجاراں کی فتح کے بعد گجا مدّ نے اپنے نائب "آدی چیاورمن" کے ذریعہ

چین، کمبوجا، چمپا، انام، سیلون اور ہندوستان (کرناٹک) کے ساتھ بھی تعلقات پیدا کئے، متعدد سفارتیں بھیجیں اور تجارتی اور سیاسی تعلقات پیدا کئے۔ اور جزیرہ سماترہ میں جہاں اگرچہ 'کیدیری'، کے ساتھ اسی زمانہ میں جاوا کا اثر پیدا ہو چکا تھا پھر اس اثر کو دوبالا کیا، اس طرح دوستانہ تعلقات قایم کرنے کے ساتھ ساتھ آس پاس کے جزائری ممالک کی فتوحات کی طرف بھی توجہ دی۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اس نے عہد کیا تھا کہ جب تک مجاپائٹ کو ملایا کے پورے حلقۂ اثر میں نہ پھیلاوں گا نہ پنشن لوں گا اور نہ آرام کروں گا، لوگ اس کی پیران سالی اور کہولت کے پیش نظر اس قسم کے عزم کو سن کر، ہنستے تھے اور بعض دفعہ اس کا مذاق بھی اڑاتے تھے، مگر اس نے بھی درحقیقت جو کہا تھا وہ کر دکھایا اور اپنے ولیٔ نعمت کے خاندان کو 'قدیم اندونیشیا' کی ہندو تاریخ میں نہایت درجہ دولتمند اور صاحب وقار بنا دیا، اسی کے کارناموں کے باعث 'ہایم ووُرک' ایک بڑا راجہ شمار کیا جاتا ہے۔

"غرض گجا مُدّ" کی غیر معمولی سیاست اور بلند حوصلہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں مجاپائٹ کی سلطنت کو مشرقِ بعید کی ایک زبردست اور شاندار طاقت بنا دیا، اور وہ ممالک جن سے اب تک محض سفارتی اور تجارتی تعلقات قایم کئے گئے تھے وہ سب رفتہ رفتہ ممالک محروسہ میں شامل کر لئے گئے۔ ہندو چین کے بعض حصے، فلیپائن، نیوگنی[۱] (پاپواتک) فارموسا، مالوکو[۲] (ملوکس) سلیبس[۳]، بورنیو[۴]، سماترا[۵]، بالی، لمبوک، مدورا

---

[۱] و[۲] و[۳] و[۴] و[۵] اندونیشیا کی قدیم کتاب "پرارتون" کی تفصیلات سے پتہ چلایا گیا ہے کہ اندونیشیا کی پوری قدیم تاریخ میں یہ دوسرا موقع تھا کہ یہ تمام جزائر جو نسلی اور لسانی اعتبار سے

سینگاپور (ملایا میں شامل ہے) اور سیلون بھی حکومت میں شامل کر لیا گیا، اور اسی طرح جزیرۂ میڈاغاسکر میں بھی جاوائی سلطنت (مجاپائت) کا اثر پہنچا دیا، اس طرح 'ہایم وُرک'، پوری قدیم تاریخ انڈونیشیا میں ایک بہت عظیم اور زبردست شہنشاہ بن گیا، اور گجامَدَ نے بھی لافانی شہرت حاصل کرلی۔ اور جزیرۂ جاوا ابھی جو مرکز حکومت تھا عروج پر پہنچ گیا۔

---

عہد قبل تاریخ سے آپس میں ایک تھے اور ایک 'ملائی'، (جسے اب انڈونیشی کہا جاتا ہے) جسد تہذیب کے مختلف دست و پا تھے گجامَدَ کے حوصلہ اور فراست کے سبب اب پھر ایک ہو گئے تھے اور ایک باقاعدہ فتح کے ذریعہ ایک ہی سلطنت کے اعضاؤ جوارح بن گئے تھے، اگرچہ اس دور میں فن تاریخ کے باقاعدہ رائج نہ ہونے کی وجہ سے فتوحات کا سن دار پتہ چلنا تو اب مشکل ہے مگر اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب جزائر ایک ملک اور ایک ہی سلطنت بن گئے تھے اور یہ کارنامہ 'نو سنتارا'، کے بعد عہد مجاپائت میں "وزیر اعظم گجامَدَ" نے انجام دیا تھا۔

## کالیمنتان

جہاں تک جزیرۂ کالیمنتان کا تعلق ہے جسے بورنیو کہتے ہیں۔ گجامَدَ کے عہد ہی میں باقاعدہ طور پر دوسری بار سلطنت جاوا کے تحت میں آیا تھا، اس کا پہلی بار ذکر سنگوساری، کے عہد میں ملتا ہے لیکن تاریخی تفصیلات کا تو اس کے باب میں بھی کتب قصص سے اب تک پتہ نہیں چلایا جا سکا ہے، مستشرقین یورپ نے بھی محض اشارات قلمبند کئے ہیں۔ تفصیلات نہیں لکھی ہیں۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ "ٹی۔ ایچ گومر" اپنی کتاب (The sea Dayaks of Borneo) مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء میں محض اسقدر لکھکر خاموش ہے۔ کہ "یہ جزیرہ ۱۵۰۰ء تک سلطنت مجاپائت کے ماتحت تھا اور "کوتی" (اس جزیرہ میں) حکومت کا صدر مقام تھا۔ جو زوال مجاپائت کے بعد اسی نام کی آزاد اور خودمختار سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔

آثار قدیمہ کے بعض محققین کو اسی "کُوتی" کے مقام پر 'وشنو' کی مورتیاں اور دیگر کتبے دریافت ہوئے ہیں جن سے پتہ چلایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ بھی اس جزیرہ کو مذہبی تعلق تھا، جو غالباً جاوا کی ہندو سلطنت مجاپائت اور اس سے پہلے کی دوسری فاتح

## گجامد کی موت اور ہایم وُورک کا آخری زمانہ

گجا مَدا اب بہت ضعیف ہوچکا تھا، لہٰذا ۱۳۴۶ء میں حرکتِ قلب کے رُک جانے کے باعث اچانک فوت ہوگیا۔ (اس کی اس وقت صحیح عمر کیا تھی کچھ نہیں کہا جاسکتا) البتہ ہایم وُورک اس کے مرنے کے بعد بھی تقریباً ۲۴ سال (یعنی ۱۳۸۹ء) تک زندہ رہا مگر

---

حکومتوں کے ذریعہ یہاں تک پہنچا تھا) انہی آثارِ قدیمہ کا کچھ ذکر سلطنتِ سری وجایا کے باب میں بھی ملتا ہے۔

نیز چینیوں کی کتبِ قصص سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ساحل پر چینی آباد تھے، اسی طرح "منگ خاندان"، (جو چین کا مشہور شاہی خاندان تھا اور عہد مجاپاہت میں چین میں برسرِ اقتدار تھا) کی اکثر تاریخوں میں لکھا ہے کہ ۱۳۷۰ء میں اس جزیرہ کے شمالی ساحل پر "برونی" نام کی ایک سلطنت قایم کی تھی اور چین کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے، اہلِ جاوا کے قبضہ کے باب میں لکھا ہے کہ کالیمنتان (یعنی بورنیو جزیرہ) کے جن علاقوں پر ان کی شہنشاہیت قایم تھی وہ خصوصیت کے ساتھ سُکادانہ (بورنیو کا مغربی ساحلی علاقہ) کوٹا وارنگن، اور مشرقی ساحل پر بنجر ماسین (آجکل یہ بڑا شہر ہے) کے علاقے تھے۔ دریائے کپواس (جو اس جزیرہ کا بڑا دریا ہے) کے بارے میں بحث کرتے ہوئے چینی مصنفین نے لکھا ہے کہ اس دریا کے طاسی علاقہ میں اکثر ہندو خاندان علاقۂ سکادانہ کے ہندو حکام کی نسل سے تھے۔ جو یہاں آنکر بس گئے تھے یہ لوگ تقریباً چودھویں صدی میں ان علاقوں میں آئے تھے۔

بہرکیف ان تفصیلات کے علاوہ اور کوئی تاریخی تفصیل باقاعدہ طور پر دستیاب نہیں ہے اس لئے صحیح طور پر کوئی تاریخی قرینہ یہاں کی سلطنتوں اور ان کے عہد بعہد واقعات کے باب میں قایم نہیں کیا جاسکتا، اتنا ضرور ہے کہ یہ علاقہ وسطی حصّوں کی آبادی کے اعتبار سے اب بھی نیم وحشی اور غیر مہذب ہے، ان علاقوں میں رہنے والے عہدِ قبلِ تاریخ کی یادگار

اسکا آخری زمانہ رفتہ رفتہ باعتبار جلالت وشوکت زوال کی طرف منجر ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ گجا مدٗ کے بعد اتنی وسیع وعریض سلطنت کو صحیح طور پر سنبھالنے والا کوئی دوسرا وزیر اعظم دستیاب نہ ہوسکا اس کے اس آخری ۳۴ سالہ دور حکومت میں یکے بعد دیگرے تین وزرا منصب وزارت پر آتے رہے (جن میں سے ایک شخص گجا انگن کچھ مشہور رہے) مگر وہ سب

---

ہیں، ان کا رہن، سہن، ان کی بود و باش، ان کا طرز عمل، ان کا اندازِ تعلیم تمام قدیم اور جاہلانہ ہے سلطنتیں بھی صرف ساحلی علاقوں پر قایم ہوتی رہیں اور مٹتی رہیں، انہی علاقوں میں ' مجاپاہت ' کا بھی اقتدار پروان چڑھا ہے اور اسلام بھی انہی علاقوں میں پہنچا اور پھر اسلام کی خود مختار چھوٹی چھوٹی سلطنتیں (جن کا ذکر اسلام کے باب میں آگے آئے گا) بھی انہی علاقوں میں قایم ہوتی رہی تھیں۔ آج بھی اس جزیرہ کے انڈونیشی انھیں علاقوں میں بستے ہیں، ان کے چھوٹے بڑے شہر بھی انہی علاقوں میں آباد ہیں۔

## اندلاس یا سماترا

"آغازِ عہدِ مجاپائت" تک مدتوں بلکہ سینکڑوں برس سے اپنی ایک بڑی اور پُرانی سلطنت "سری وجایا" (جسے سلینڈرا نے ختم کیا) کے تحت میں رہا ہے جس کا کچھ ذکر "ہندؤں کی ابتدائی حکومتوں" کے باب میں جزیرہ جاوا کے ساتھ "سلینڈرا" کے عنوان سے گذر چکا ہے۔ جب سری وجایا کو "ماترم" کی سلطنت کے عروج سے جاوا میں شکست ہوگئی تو اس کا بچا کچا اقتدار سماترا، میں سمٹ کر واپس اپنے مقام پر آگیا۔ جہاں مشہور شہر "پلیم بنگ" اس کا صدر مقام تھا، اور بدھ مہایانہ، مذہب کا مرکز تھا، یہ سلطنت بھی کچھ اسقدر تاریکی میں گذری ہے کہ اب اس کے باب میں بھی مورخین تاریخی قرائن قایم کرنے سے قاصر ہیں اور اس لئے کوئی سائنٹفک تفصیل اس کے سلسلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

'گجا مدٗ' کے بارے میں انڈونیشی ادب کے پُرانے قصّے بتلاتے ہیں کہ جب گجا مدٗ نے فتوحات کو فروغ دیا تو اس جزیرہ کے بھی اکثر

گجا مدٗ کے پایہ کے لوگ نہ تھے۔

اس لئے نظم و نسق سلطنت میں روز بروز ابتری پھیلتی چلی گئی یہ ابتری پھر بھی ہایم وُرک کے عہد تک قدرے قلیل مرض دق کے پہلے درجہ کے طور پر دبی رہی کیونکہ بہرحال ممالکِ محروسہ کی سیاسی جماعتیں یا یوں کہئے کہ سیاسی لوگ اس کے دبدبہ سے کسی حد تک خائف تھے اور چوں

---

علاقے سلطنت ' مجاپانت ' میں شامل کئے گئے، اور ان کی چھوٹی چھوٹی ماتحت ریجنسیاں قایم کردی گئیں، البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۴۷ء میں جو گجا مدٗ کے مرنے کے بعد کا وقت ہے۔ وسطی سماترا میں ایک حکمراں " آدتیا ورمن " خود مختار ہو گیا، اس کا دائرہ عمل " مینگ کباؤ " کا علاقہ تھا، انڈونیشی مصنف " سنوسی پانے " نے اپنی کتاب " سجارا انڈونیشیا " کے صفحہ ۱۰۵ پر اسکا لقب " کنا کما دری اندرا " نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ آبنائے ملکا بھی اسی کے قبضہ میں تھی۔ اور " پلیم بنگ " میں بھی ۱۳۷۴ء میں ایک آزاد حکومت قایم ہو گئی تھی جس نے اسی سال چین کو ایک سفارت بھجوائی تھی۔

جہاں تک کچھ اور حالات سے پتہ چلا ہے واضح ہوتا ہے کہ اس جزیرہ میں بھی " سری وجایا " کا زور ٹوٹ جانے کے بعد چھوٹی چھوٹی بہت سی سلطنتیں قایم ہو گئی تھیں چنانچہ شمالی حصہ میں آچیہ اور سمدرا پسائے وغیرہ کے نام بہت مشہور ہیں جو ۱۲۹۲ء (مارکو پولو یورپی سیاح کی آمد کے وقت جیساکہ خود اس کا بیان ہے) اسلام کے اثر میں آتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے کچھ حالات آگے اسلام کے باب میں بیان کئے جائیں گے۔

اب ذیل میں کچھ جزیرہ بالی اور پھر سنڈا پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

## جزیرۂ بالی

جیساکہ سلینڈر ا (ہندوؤں کی ابتدائی حکومتوں) کے باب میں واضح کیا جاچکا ہے چینی تحریرات میں (جو نویں صدی عیسوی سے متعلق ہیں) اس جزیرہ کا نام ' پولی ' لکھا ہے اور اس کے تاریخی حالات قلمبند کرنے کے بجائے صرف اس وقت کے راجاؤں

وحرا کرتے ہوئے ڈرتے تھے مگر جیسے ہی کہ ۱۳۸۹ء میں اس کا انتقال ہوا سلطنت کی قوت بھی برملا طور پر زوال میں آنی شروع ہوگئی۔ اور سارے ملک میں بغاوتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ حتیٰ کہ پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا مضمون ہوگیا۔ خود اندرون جاوا امراء اور رؤسا بلکہ خانوادۂ قلمرانی کے لوگ ہوا و ہوس میں مبتلا ہوکر آپس میں لڑنے لگے۔ اور تخت کے

---

کے طرز بود و ماند، انداز حکمرانی پر ہلکی سی روشنی ڈالی گئی ہے یا پھر مذہب ہنود اور بدھ مت کو بیان کیا گیا ہے جو اس وقت یہاں کے عوام کا مذہب تھا۔ ورنہ حکمرانوں کے شاہی سلسلے اور ان کی حدود قلمرو کے بارے میں اور دیگر ضروری تفصیلات کا اسی طرح فقدان ہے۔ جو کتبے محققین یورپ یا اور دیگر ماہرین آثار قدیمہ کو اس جزیرہ میں دستیاب ہوئے ہیں ان سے صرف راجاؤں کے نام اور ان کتبوں کی تحریر کا سن و سال ملتا ہے اور بس (پھر یہ نام بھی جیسا کہ بعض انڈونیشی مصنفین نے انڈونیشی زبان کی تصنیفات میں دئے ہیں نہایت ہی طویل اور بے ڈھنگے سے ہیں اور حالات کے بغیر وہ غیر ضروری سے بھی ہیں اس لئے اس مقام پر ان کے تحریر کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔)

بہرکیف یہ جزیرہ ہمیشہ سے ہندو اور بدھ مذہب کا جاوا کی طرح بڑا مرکز رہا ہے، کسی زمانہ میں کیدیری، سنگوساری اور پھر مجاپاہت کے عہد میں مشرقی جاوا کا ایک خاص حصہ رہا ہے، اس زمانہ کے بڑے بڑے منادر، اور آشرم اب تک بھی اس جزیرہ میں موجود ہیں۔ جب جاوا میں اسلام کا داخلہ ہوا اور مجاپاہت سلطنت کو ختم کر کے مسلمانوں نے اپنی سلطنتیں قایم کیں تو ہندو اور بدھ کو مذہب اسلام اختیار کرنے سے عار تھا وہ بھاگ کر اسی جزیرہ میں جا بسے تھے، چنانچہ اب بھی وہی لوگ اس جزیرہ میں آباد ہیں، اور ہندو اور بدھ مذاہب کی ملی جلی تہذیب کے حامل ہیں اور اپنی ایک خاص قدیم زبان، بالینی، میں تحریر و تقریر کرتے ہیں۔ اور بڑے کٹر ہندو ہیں۔ ان کی تہذیب آج بھی قدیم ہند و انڈونیشی تہذیب کا نمونہ ہے۔ ان کے قدیم آثار بقول ڈاکٹر خورس (مصنف "بالی صفحہ ۵۰ ۱۹۲۹ء) شہر "وان پیسار" (جسے

دعویدار کھڑے ہو گئے ایک خود اس کا بھتیجا "وکر مادر دانا"، تھا جسے خود راجہ نے اپنے دارالحکومت میں وارثِ سلطنت قرار دیدیا تھا اور دوسرا "ویرا بومی" تھا راجہ کی ایک معشوقہ کے بطن سے ہونے کے باعث قاعدہ کے بموجب تخت و تاج کا حقیقی وارث نہ تھا، جس نے "وکر مادر دانا"، کے تخت نشین ہوتے ہی مشرقی جاوا کے علاقوں

---

مقامی زبان میں 'بڈونگ' کہتے ہیں) میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ شہر جزیرہ بالی کے جنوبی حصہ میں واقع ہے اسی کے پاس ایک اور دوسرا قدیم مقام ہے جہاں 'بالی' کے سابق راجاؤں کے خاندان آباد ہیں، یہ مقام 'کلونگ کونگ' کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو مذہب کے عہد عروج میں خصوصاً زمانۂ مجاپائت میں صنعت و حرفت کا یہ بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کے قریب "پورا دسار" کے قدیم منادر اُس عہد کی شاندار یادگار ہیں۔ اس کے قریب "پور بیساکی" کا وہ مقام ہے جہاں قدیم ہندو تیرتھ کے لئے آیا کرتے تھے، 'بیڈوگول'، کے مقام پر پہاڑوں کے قدرتی چشمہ میں ہندو عورتوں اور مردوں کا برہنہ غسل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر خورس کے بیان کے مطابق اس چشمہ کے قریب کی پرانی ہندو یادگاریں فنِ تعمیرات کا عمدہ شاہکار ہیں۔

چونکہ کتاب ہذا کا اصل موضوع 'تہذیب و تمدن کی تاریخ'، ہے لہذا حکمرانوں کے نامعلوم اور ناقابلِ دریافت سلسلوں سے قطع نظر کر کے ولندیزی اور دیگر مورخین کی بیان کردہ تفصیلات کے حوالہ سے آگے 'تہذیب و تمدن'، کے باب میں بالی کی اس موجودہ تہذیب پر روشنی ڈالی جائے گی جو عہدِ مجاپائت یا اس سے قبل کے ہندو عہد کی مٹی ہوئی سی یادگار ہے جس کے مطالعہ سے زمانۂ مجاپائت کی ہندو تہذیب کا بہت کچھ اندازہ کیا جاسکے گا۔ پہلے اب ذیل میں سنڈا (پجاجاراں) اور دیگر جزائر کے اس دور کے تہذیبی اور سیاسی حالات پر اجمالی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

میں اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد بعض امورِ سیاسی کی مصلحتوں کے باعث کچھ عرصہ تک تو یہ دونوں متحدہ طور پر نظم ونسق انجام دیتے رہے، مگر پھر اک دم ان میں باہمی منافرت کچھ ایسی پھیلی کہ ایک دوسرے کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور بالآخر خونریز طریقہ پر لڑائی کا آغاز کر دیا۔

---

(جیسا کہ صفحہ ۲۰۶ پر بیان کیا گیا ہے)۔

**بجاجاراں:** "بجاجاراں"، بھی اس عہدِ مجاپائٹ میں ایک شاندار سلطنت رہی ہے (بجاجاراں کے معنی بقول انگریز مورخ کرافورڈ نظم ونسق کے ہیں) اس کا صدر مقام جاوا کے شمالی مغربی حصہ میں "سنڈا کلاپا" (جسے اب جکارتا کہتے ہیں اس شہر سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا) بقول ولندیزی مورخین اس سلطنت کے آثار میں کچھ محلات اور قلعوں کے کھنڈرات ملے ہیں

کرافورڈ (اپنی کتاب ہسٹری آف دی انڈین آرچی پلیگو مطبوعہ ۱۸۲۰ء صفحہ ۱۰۳ پر) لکھتا ہے کہ "کوئی کتبہ یا تاریخی سند ایسی دستیاب نہ ہو سکی جس کی شہادت پر اس سلطنت کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکے۔ اگرچہ کچھ قدیم روایات مشہور ہیں مگر وہ سب ایک دوسرے کی تکذیب کرتی ہیں۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ یہ سلطنت دو سو سال کے لگ بھگ قایم رہی ہے۔

ولندیزی مورخ ڈاکٹر خراف نے (اپنی کتاب خذ خذ نیز اندونیشی کے صفحہ ۷۵ پر) لکھا ہے کہ مجاپائٹ کے آخری بڑے تاجدار "ہایم ووُرک"، کے عہد میں جبکہ گجامدہ وزیر اعظم تھا بجاجاراں کے حکمراں کی لڑکی کے ساتھ ہایم ووُرک، کی جب معاشقہ لڑانے میں ناکامی ہو گئی تو ایک خوفناک لڑائی لڑی گئی، جس میں بجاجاراں کو شکست ہوئی اور اس طرح وہ سلطنت ختم ہو گئی، گجامدہ نے اس سلطنت کے علاقوں کو مجاپائٹ میں شامل کر لیا۔ (میں نے گجامدہ کے حالات میں اسکا کچھ مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ (قادری)

سنوسی پانے اور دیگر مورخین کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سلطنت تمام شمالی مغربی جاوا کے اسی علاقہ پر پھیلی ہوئی تھی جسے اب سنڈا کہتے ہیں۔

## پاریگ ریگ کی جنگ ۱۴۰۹ء

ان کی یہ باہمی لڑائی یا خانہ جنگی "پاریگ ریگ" کے مقام پر شروع ہوئی تھی۔ لہٰذا تاریخ میں یہ اسی نام سے مشہور ہے۔ تمام مورخین کا اجماع ہے کہ اس لڑائی میں جاوا کا زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا تھا، بلکہ اسی لڑائی کے آغاز نے 'مجاپائت' کی وسیع و عریض سلطنت کو زوال کے آخری مقام پر پہنچا کر بالکل نحیف وضعیف اور مختصر العمل بنا دیا تھا، نتیجہ کے طور پر 'دیرابومی' ہار گیا اور 'وکرما وردانا' کامیاب ہو گیا لیکن اب سلطنت کی حالت نہایت دگرگوں تھی[ل]۔ بیرونِ جاوا کے جتنے بھی محروسہ ممالک تھے وہ سب آزاد ہو کر مختاری کا اعلان کر چکے تھے، سماترا میں 'مجاپائت' کا ماتحت رئیس 'آدیِ چیاوَرمَن' بھی خود مختار ہو کر باقاعدہ حکمراں بن بیٹھا تھا، کالیمنتان پر البتہ کچھ اثر باقی رہا مگر وہ بھی روز بروز مضمحل ہوتا چلا گیا، لمبوک، مدورا اور بالی بھی اس سلطنت سے منقطع ہو چکے تھے۔ اور ملایا جزیرہ نما بھی جس میں خصوصیت کے ساتھ 'ملکا' (اور اس کا شہر سینگاپور) قابل ذکر ہے سلطنت مجاپائت سے نکل کر ایک آزاد اور خود مختار

---

ل چین میں اس وقت مِنگ خاندان (جنھوں نے ۱۳۶۸ء میں منگولوں کو ہرا کر حکومت حاصل کی تھی) کی حکومت تھی اور ان کا ایک بڑا حکمراں "یونگ لو" برسر اقتدار تھا۔ جس نے مشرقی ممالک کے ساتھ (خصوصاً جاوا وغیرہ سے) تعلقات قایم کرنے کے لئے ایک تجارتی وفد اپنے ایک مشہور چینی عالم "سام پوتو تنگ" کی سرکردگی میں بھیجا تھا اس رئیس وفد کا بیان ہے کہ مجاپائت کی وہ بڑی سلطنت جو کسی وقت مشرق بعید کی سب سے عظیم سلطنت تھی اور جو دور و دراز جزائر تک پھیلی ہوئی تھی اب نہایت ہی ابتر اور خراب و خستہ حال میں صرف جاوا کے کچھ حصوں تک محدود رہ گئی، پھر یہی وفد سماترا جزیرہ میں بھی پہنچا تھا جس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہاں اسلام کا دور دورہ تھا، اور بعض سلطنتیں بھی اس مذہب نے قایم کر لی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

اسلامی سلطنت بن چکا تھا (جس کا ذکر اسلام کے باب میں "سلطنتِ ملکا" کے عنوان سے جداگانہ طور پر کیا گیا ہے)۔

## مجاپائت کا آخری زمانہ

بقول کرافورڈ یہ سلطنت (جس کا صحیح خاتمہ ہایم وُرک کی وفات کا زمانہ سنہ ۱۳۰۹ء شمار کیا جاتا ہے) کم و بیش ۴۲ سال قایم رہی بہر حال ڈاکٹر خراف کے بیان کے مطابق وکرما وردانا کے بعد اگرچہ مدّتوں تک غیر معروف قسم کے حکمراں برسرِ اقتدار آتے رہے کہ جن کے نام سنوسی پانے تحریر میں بھی کافی مل سکے ہیں البتہ ایک زمانہ کے بعد شہر کیدیری کا ایک غیر معروف شخص جس کا نسلی تعلق بعض مورّخین نے کیدیری کے قدیم شاہی خاندان سے بتلایا ہے موقع پاکر سنہ ۱۴۷۸ء میں "گِرِندرا وَردانا" کے نام سے مجاپائت کے تخت پر بیٹھا۔ اس وقت یہ سلطنت نہایت ہی خراب و خستہ اور شکستہ حال ہو چکی تھی اور اس کا رقبہ بھی بہت ہی تھوڑا سا باقی رہ گیا تھا۔ یہ حکمراں اگرچہ مجاپائت کے شاہی خاندان کا نہ تھا مگر پھر بھی چونکہ اس سلطنت کے تخت و تاج کا مالک بن چکا تھا لہٰذا اسے اس ملک کی ہندو تاریخ کا آخری تاجدار سمجھنا چاہئے کیونکہ اس کے عہد میں دیماک اور دیگر اسلامی ریاستوں نے (جواب جاوا کے جا بجا مقامات پر قایم ہو چکی تھیں اور جن کا حال آگے اسلام کے باب میں بیان کیا گیا ہے) سنہ ۱۵۲۰ء میں متحد ہو کر حملہ کیا اور اسے ختم کر دیا اور اس طرح جاوا سے مجاپائت کی ہندو سلطنت مٹ گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ یہ نوسنتارا (انڈونیشیا) کی وہ ہندو سلطنت تھی جس کو ہندو تہذیب، ہندو تمدن اور ہندو مذہب کے اس ملک میں عروج پر لانے کا خاص مدعی قرار دیا جاتا ہے۔ اسی کے خاتمہ سے جاوا میں اسلامی عہدِ حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔

اب ذیل میں اس سلطنت (مجاپائت) کے زوال کے اسباب پر بھی مختصر سی روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

## مجاپائت کے زوال کے اسباب

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز حکمرانوں کا عیش و تنعم میں پھنسنا ہے کیونکہ ہایم ووُرک کے بعد جتنے بھی جانشین آئے وہ سب فراوانیٔ دولت کے سبب نہایت عیاش تھے، اور بجائے جنگ و نبرد کے وہ عورتوں اور اسی قسم کی دیگر لغویات سے زیادہ وابستگی رکھتے تھے، انھیں نظامِ حکومت سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، پھر جانشینی کا کوئی خاص معیار بھی نہ تھا، اہل اور نا اہل سب حکمراں بنجاتے تھے۔ حکومت موروثی تھی اس لئے حکمراں کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، اکثر ان میں خانہ جنگیاں بھی ہونے لگ گئی تھیں جیساکہ آخری دور میں پاریگ ریگ کی لڑائی سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ زوال کے سب سے بڑے ذمہ دار وہ برہمن اور مذہبی پیشوا تھے، جو نہایت درجہ ذات پات کے قائل، چھوت چھات اور اپنے امتیاز کے دلدادہ تھے ان کے ہاتھوں میں قوت تھی لہذا عوام کو ان سے خوف و نفرت پیدا ہوتی چلی گئی اور ان کے سبب حکمرانوں سے بھی وہ متنفر رہنے لگ گئے پھر گجا مَدَ جیسا قابل اور لایق وزیر اور رہنما بھی دوبارہ اس سلطنت کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس لئے آہستہ آہستہ تمام علاقے خود مختار ہوتے چلے گئے جس سے معاشی حالت بھی بگڑ گئی اور تجارت کو بھی نقصان پہنچنے لگا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا سبب اسلامی سلطنتوں کا آغاز ہے جنھوں نے یہاں کی خراب و خستہ زندگی میں صحیح روحانی، اور تمدنی برقی رَو پیدا کی جس کے سامنے ہندو تہذیب کا ٹمٹماتا ہوا دیا قایم نہ رہ سکا۔ اور بالآخر وہ اسلامی عہدِ سلطنت کی ضیاپاشیوں میں مضمحل ہوکر ٹھنڈا ہو گیا۔

## تہذیب و تمدن کی عام کیفیت

جیساکہ پچھلے اوراق میں راجاؤں کے حالات اور ان کے دور حکومت کے بیان میں گذر چکا ہے کہ نوسنتارا یا سورنا دیپا یعنی انڈونیشیا میں عہد مجاپائت ہندو تاریخ کا ان کے تمدن کے ارتقائی لحاظ سے ایک ایسا ہی ترقی یافتہ دور گذرا ہے جیساکہ ہندوستان کی ہندو تاریخ میں راجہ اشوک اور چندر گپت کا عہد حکومت مشہور ہے چنانچہ قدیم ہندو جاوائی اور بالینی لٹریچر اور کتبوں سے اس امر کی مستند شہادت موجود ہے کہ یہ عہد مجاپائت نہایت فاتحانہ تھا اور ہندو انڈونیشیا کی حدود سلطنت جاوا کی سرحدوں سے گذر کر ان دور دراز جزائر تک جا پہنچی تھی جن میں جاوا، مدورا، بالی، لمبوک، سمبا، سمباوا، تیمور، نیوگنی، (پاپوا نک) سماترا، ملایا، بورنیو، سلاویسی، مالوکو، فلپائن، فارموسا، ہندوچینی کے ساحلی علاقے، سیلون اور میڈاغاسکر شامل تھے۔ گجا مدا کی اعلیٰ صلاحیتوں اور دوربینی سیاست نے اس عہد کی تاریخ کو مشرق بعید میں بے مثل بنا دیا تھا اور یہ گویا سری وجایا کے بعد دوسرا موقع تھا کہ ہندو انڈونیشیا کی حدود سلطنت موجودہ انڈونیشیا سے بھی زیادہ وسیع و عریض ہو گئیں تھیں۔

ظاہر ہے کہ جو سلطنت اتنی وسیع و عریض تھی وہ یقیناً نظام حکومت اور انداز سیاست کے اعتبار سے بھی یہاں کی قدیم ہندو سلطنتوں میں بہت زیادہ ترقی یافتہ تھی مگر چونکہ میرے پیش نظر نظام حکومت کے خصوص میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جو وسائل کتب ہیں وہ محدود ہیں ان میں وہ بعض باتیں جو تمدن پر بھی اثر ڈالتی ہیں تفصیل کے ساتھ بیان میں نہ آسکنے کے باعث ناکافی ہیں۔ ابھی حال ہی میں انڈونیشیا کے ایک مشہور جاوی زبان کے ماہر اور ادیب جناب محمد یامین نے ان

تفصیلات پر قدیم جاوائی اور بالینی ہندو لٹریچر کے ماخذ اصلی سے ریسرچ کیا ہے جو نہایت ہی شاندار اور گرانقدر ہے مگر بدقسمتی سے مجھ جیسے دور دست کو یہاں دور دراز حصہ میں موصول نہ ہوسکا۔
اسی لئے نظام حکومت کے ہر پہلو پر یہاں روشنی ڈالنا دشوار ہوگیا ہے۔

البتہ کسی عہد کے تمدن کی حیثیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس عہد میں امور انتظامی، سیاسیات، عمرانیات، انداز حکمرانی، طرز بندگانی، تجارت، معیشت صنعت و حرفت، علم و ادب، لسانیات اور رسم و رواج وغیرہ کس نوع اور انداز پر تھے اور ان سے ایک قوم کس درجہ متاثر تھی وغیرہ۔

امور انتظامی پر کسی حد تک آگے روشنی ڈالی جائے گی۔ سیاسیات کی جھلک پچھلے اوراق کے حالات راجگان میں خود ملتی ہے، عمرانیات انہی سے اخذ کی جاسکتی ہیں، اب رہا سوال اس امر کا کہ لسانی کیفیت کیا تھی، علوم اور لٹریچر کا عام مزاج کیسا تھا، حکمراں کس طریقہ سے رہتے اور جلوس کرتے تھے، ان کے سکے، اوزان، جھنڈے، آلات حرب، فوج اور زمینداری کی کیفیت کیا تھی، مذہب کا اثر، تعمیرات کا کردار، عوام کی سوشیل حالت اور رسم و رواج کا انداز کیا تھا وغیرہ امور پر اجمال کے ساتھ یا کچھ راجاؤں کے ان حالات سے اخذ کرکے جو پچھلے اوراق میں گذر چکے ہیں، یا کچھ میسر آجانے والی کتابوں کی مدد سے یا پھر موجودہ بالی کے ہندوؤں کی اس تمدنی ریسرچ کی کتاب "بالی" سے جو ۱۹۳۹ء میں ایک ولندیزی محقق نورس کا کارنامہ ہے (اور جس میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ عہد مجاپائت کا ہندو تمدن اور تہذیب بھی اسی کیفیت کا گذرا ہے۔ اس لئے کہ 'بالی' کے موجودہ ہندو آج تک انہی روایات کے حامل ہیں وغیرہ) روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ اس عہد مجاپائت کے ہندو تمدن کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

**عام لسانی کیفیت**

اس وقت جاوا میں جاوائی زبان سرکاری زبان تھی، جس نے بتدریج علمی مقامات طے کر کے نہایت ہی اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا تھا، مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جاوائی زبان اپنی لسانی اصل میں تین خاص ناموں سے معروف ہے، مثلاً ایک وہ زبان جو اپنے عالمِ محد میں پرورش پا کر نوسنتاری اور سنسکرت[ل] کے اختلاط سے شعور و شباب میں آ رہی تھی اور وہ بالکل ابتدائی جاوی زبان تھی۔ ماہرینِ لسانیات اب اسے 'جاوا کونو'، یعنی قدیم جاوی زبان کہتے ہیں جس کے الفاظ بھی اب آثارِ قدیمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ پھر عہدِ ماترم میں اسی زبان نے جب علم اور تراجم کے ساتھ ہم کناری کی تو ایک نئے حسن اور شباب کے ساتھ منصہ لسانی پر جلوہ گر ہوئی اور "جاوا منگانُ" (یعنی عہدِ وسطیٰ کی جاوی زبان) کہلائی۔ عہد مجاپاہت میں جب اس کے رخساروں پر اعلیٰ علم و ادب کا غازہ چڑھا تو یہی

---

ل ہندو جب پہلے پہل اس ملک میں وارد ہوئے وہ اپنے ساتھ اپنے مذہب اور اپنے طرزِ رہائش کے ساتھ ساتھ اپنی مذہبی زبان بھی لے کر آئے تھے جو سنسکرت تھی اور اعلیٰ قسم کی علمی و ادبی زبان تھی، اس ملک میں اس وقت ملائی یا ملایو (جسے ملایا کونو یعنی قدیم ملائی) بھی کہتے ہیں رائج تھی، چونکہ اس کا زیادہ تر اثر ملایا کے علاقہ میں تھا لہٰذا 'سماترا' (یا اندلاس) میں اس کو فروغ حاصل ہوا محققین لسانیات کا فیصلہ ہے کہ نوسنتارا کے اکثر حصوں میں اس عہد قبل از تاریخ کے لوگ اسی زبان کو بولتے تھے، اور اسی زبان میں اظہار خیال کرتے تھے۔ مقامی مناسبت سے جس قدر بھی بولیاں بعد میں نکلتی رہیں وہ سب اس شجر کی مختلف شاخیں تھیں جو مختلف چھوٹوں (لسانی) کے ناموں سے معنون ہوتی چلی گئیں، جیسے جاوا میں جاوائی اور بالی میں بالینی وغیرہ چنانچہ ہندو امتزاج سے جس زبان نے جاوا میں پرورش پائی وہ 'جاوا کونو' تھی یا پھر ایک دوسری زبان تھی جسے کاوی کہتے ہیں۔ یہ بھی دراصل جاوی ہی کی ایک شکل تھی۔

زبان اپنے جمال یکتائی کے ساتھ جلوہ گر ہو کر جاوا بارو (یعنی جدید جاوی) بن گئی - یہی اس عہد کی سرکاری زبان تھی، مگر مذہب کی زبان "سنسکرت" تھی جو اب جاوا میں آکر آب و ہوا اور سرزمین کے تغیر سے ہندوستان کی زبان سے بہت زیادہ متغیر ہو چکی تھی" برہمنان "پنڈتاز" (پوجاریوں کا طبقہ) اس زبان میں اظہار خیال کرتے تھے مگر ہم عصر حکومت "پجاجاراں" کے علاقہ کی زبان "سنڈانی" تھی جو اب شمالی مغربی جاوا میں علمی اور ادبی زبان ہے، بالی کے لوگ "بالی" بولتے تھے، اور جاوائی بالی میں اظہار خیالات علمی کرتے تھے، ملائی زبان (جسے آجکل کی اندونیشی زبان کی مادر بزرگ کہنا چاہیئے) "ملایا کونو" کے نام سے قریب قریب سارے سماٹرا اور دیگر جزائر میں ضرور موجود تھی مگر بہت سی شاخوں اور رنگ برنگ ثمرات میں منقسم ہو کر مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے مشہور تھی، مثلاً آچیائی، کاوی[1]، بوگینی، ہلماہیری، وایاک، ایریانی اور پاپوا کی زبانیں، مدوری وغیرہ - جیسا کہ آج بھی ان زبانوں میں قدیم ملائی کے الفاظ ملتے ہیں -

مگر چونکہ "مجاپاہت" کی سلطنت قریب قریب ہر جزیرہ میں جا پہنچی تھی لہذا اس کے ساتھ اس کا مذہب اور زبان کا پہنچنا بھی ناگزیر تھا، یہی وجہ ہے کہ انڈلاس (سماٹرا) کالیمنتان اور دیگر جزائر کی موجودہ زبانوں میں جاوی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں -

## سنسکرت کا اثر

جاوی زبان میں شعر و شاعری کے سلسلہ میں طویل بحروں کا سلسلہ مطلق نہ تھا، یہ سنسکرت ہی کے اثر سے آیا، رزمیہ اور بزمیہ لکھنے کا رواج بھی سنسکرت ہی کے اثر سے پہنچا، سنسکرت کے وہ تمام الفاظ

---

[1] یاد رہے کہ کاوی زبان کے ابجد کا رواج بقول ولنسٹیڈ آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا ہے -

جو مذہبی اصطلاح کا کام دیتے تھے یہاں کی زبان میں داخل ہوکر جزو زبان بن گئے مثلاً گورو. بھاسا، پنڈوا، راجہ، اسنوپ، وغیرہ ہزارہا الفاظ ہیں۔

## علم وادب

اس باب میں خصوصیت کے ساتھ ایک انگریز محقق "ڈاکٹر ریچارڈ ونسٹیڈ"[۱] لکھتا ہے کہ:—

تقریباً ایک ہزار برس اس نواح میں ہندوؤں کا اثر نمایاں رہنے اور پھر بدھوں کے مذہب کے ساتھ ساتھ یہاں کے مذہب کے ہم آہنگ ہوجانے کے باعث اس ملک کے علم وادب پر ہندو علم وادب کا زبردست اثر پڑا اور عقاید مذہبی کے باعث سارا ادب سحر، جادو، ٹونے، ٹوٹکے پر مشتمل ہوگیا، ہندوؤں کے اثر سے اس ملک میں دو خاص قسم کے رسم الخط بھی رائج ہوگئے مثلاً پلاوا، اور پھر نگاری (جو بنگال سے آنے والے پلاز لوگوں کے ساتھ آیا تھا)۔

سنوسی پانے (اپنی کتاب "سجارا اندونیشیا" کے صفحہ ۱۴۳ پر) لکھتا ہے کہ—

"اس عہد میں سنسکرت سے اکثر کتابوں کے ترجمے مقامی زبان میں کئے گئے اور اس طرح ہندو خیالات اور عقائد بہت زیادہ عام ہوگئے۔ مثلاً مہابھارت سے کاوی میں "بھیما" وغیرہ کی کہانیاں۔

---

[۱] ریچارڈ ونسٹیڈ کی کتاب (The Malays) صفحہ ۱۳۹ مطبوعہ لندن۔

یہی مصنف "ملائی زبان" پر قلم فرسائی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "آٹھویں صدی میں دکن کی طرف سے آنے والے سوداگروں کے ساتھ جو تامل بولتے تھے اور سماٹرا میں آکر رہے تھے، ایک مخصوص علم وادب آیا تھا جو بدھ مت کی کہانیوں پر مشتمل تھا۔ اور "منسنیکالائے" کہلاتا تھا جو بتدریج ملائی میں منتقل ہوتا چلا گیا اور تمام سماٹرا میں رائج ہوگیا" مجاپائٹ کے وقت سماٹرا کے اکثر حصوں میں اسی قسم کے علم وادب کا رواج تھا۔

اسی تسلسل میں ونسٹیڈ آگے لکھتا ہے کہ "عہد مجاپاہت میں قدیم ہندو رزمیے بڑی مقبول تھی اور اس کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے اکثر منادر کی دیواروں پر رامائن کے سین اب بھی کندہ ملتے ہیں"۔ چانڈی پناتاران" کے نام سے جو منادر موسوم ہیں وہ اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ زبان" جاوا باروُ" (جدید جاوی) نے بہت ترقی حاصل کر لی تھی، رامائن کے اکثر اشعار اس زبان میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان میں بیان کا اسلوب، تخیل کا انداز اور تمثیلات کا استعمال قریب قریب وہی رکھا گیا تھا جو ہندوستان کی رامائن میں موجود تھا اگرچہ اس کے اثرات یہاں کے ادب میں اب موجود نہیں ہیں۔

اسی دور کے علم و ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور ولندیزی مورخ ڈاکٹر خورس[1] لکھتا ہے کہ:—

"اس عہد یا اس سے قبل کے جاوی علم و ادب کا ایک بڑا ذخیرہ اہل بالی کے پاس بھی موجود ہے جو سب قدیم تاریخی افسانوں کے رنگ میں پایا جاتا ہے۔ اس لٹریچر کی حیثیت رامائن، مہابھارت، شاہنامہ فردوسی اور ہومر کی کتاب الیڈ سے بہت زیادہ مماثل ہے، یہ کتابیں "بھاؤس" اور "رُیمن چنگھا" کہلاتی ہیں۔ ان کے علاوہ علم الادّو اور مذہبیات پر بھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔ مذہبی گروہ کے لوگ جو "پنڈنڈاز" کہلاتے تھے وہ ان کی تکمیل کرنا ضروری سمجھتے تھے چنانچہ اب بھی بالی کے اس گروہ کے ہندوؤں

---

[1] یہ ایک مشہور عالم تھا، حکومت ڈچ ایسٹ انڈیز نے ۱۹۳۹ء میں بالی کے ہندو انڈونیشیوں کے تمدنی ریسرچ پر مامور کیا تھا چنانچہ ریسرچ ختم ہو جانے کے بعد اس نے اپنی مشہور کتاب "بالی" کے عنوان سے باتصویر شائع کی، یہ مواد اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

میں بھی رواج ملتا ہے۔ ہندوستان کی طرح 'وید' بھی تھے جنھیں 'اسادا' (یعنی اُستاد) کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں۔ یہ سب علمِ نجوم سے متعلق ہیں۔"

آگے چل کر سنوسی پانے (اپنی کتاب سجارا کے صفحہ ۱۳۶ پر) لکھتا ہے کہ:—

"شیوا کا لٹریچر ایک مشہور کتاب "بُوانا کوسا" کے ذریعہ سے پڑھا اور پڑھایا جاتا تھا۔" منگ ینگ کاماہایانی" بھی ایک مشہور کتاب ہے۔" گجامدُ کے حالات پر بھی ایک کتاب حال میں دستیاب ہوئی ہے مگر اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب لکھی گئی تھی۔"

"تنتو پنگیران" میں پہاڑوں اور اس کے دیوتاؤں کا ذکر تحریر کیا گیا تھا۔ "پرانا" (ہندوستان کے ہندوؤں کی طرح) بھی ترتیب دئے گئے تھے۔ اور دوسری کتاب "شاسترا" لکھی گئی تھی جس کے کئی حصّے تھے۔ ہر حصّہ جدا جدا علوم پر مشتمل تھا۔ مثلاً ایک میں 'قانون' بیان کیا گیا تھا تو ایک میں اخلاق کا ذکر تھا اور اس طرح جدا جدا طور پر مضامین پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ تہذیب و تمدن کے باب کا نام منی تھا۔

شعر و شعر و شاعری نے بھی بڑا فروغ حاصل کیا تھا۔ چنانچہ "امپو تنتولر" اس عہد کا بہت مشہور شاعر گذرا ہے۔ (جس کے چند الفاظ آج بھی انڈونیشیا کے قومی نشان گروڈا کے متن پر کندہ ہیں)۔

## کتابوں کی تصنیف کا طریقہ

جہاں تک قدیم وسایل کی کر معلوم ہو سکا ہے جاوا میں اس عہد میں کاغذ رائج تھا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کاغذ کہاں سے فراہم کیا جاتا تھا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان یا مصر یا چین سے آتا ہو یا پھر یہیں پر بنتا ہو بہر حال اس سلسلہ

میں تفصیلات کچھ نہ مل سکیں ۔ البتہ کتابیں کاغذ ہی پر لکھی جاتی تھیں مگر بالی، میں کتاب لکھنے کا طریقہ بالکل جداگانہ تھا یعنی "لونتر،، نامی ایک درخت سے (جس کے پتے پام سے مشابہ ہوتے تھے) پتے حاصل کر لئے جاتے تھے، پھر انھیں پانی میں بھگو کر نرم کر لیا جاتا تھا، اس کے بعد اس کو لمبی تختی کی صورت میں اور باقاعدہ سائز کے مطابق کاٹ لیا جاتا تھا، پھر ان کٹے ہوئے حصّوں پر چاقو یا کسی تراش سے حروف اور ان کے الفاظ کھودے جاتے تھے، جب صفحہ تیار ہو جاتا تو اس کے حروف میں باقاعدہ سیاہ روشنائی جو عموماً کوئلہ یا کسی اور اسی قبیل کی چیز سے تیار کی جاتی تھی بھر دی جاتی تھی اور پھر اسے سُکھا دیا جاتا تھا۔ جب ضروری صفحات اکھٹے ہو جاتے تو انھیں باقاعدہ جلد کی صورت میں لا کر لکڑی کے تختہ سے تیار کئے ہوئے سرورق کے ساتھ سی لیا جاتا تھا۔ اور اس طرح کتاب تیار ہو جاتی تھی۔

اکثر سیّاحوں نے اپنے بیانات میں اس قسم کی کتابوں کا ذکر کیا ہے (جو اب بھی وہاں کے عجائب خانوں میں موجود ہیں) مگر ساتھ کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ان کتابوں پر نہ مصنّف کا نام ہے اور نہ سالِ تصنیف درج ہے چنانچہ اس خاص موضوع پر ایک انڈونیشی لکھتا ہے کہ ان کتابوں کی عبارتوں اور الفاظ ہی کے ارتقائی امتیاز سے ان کے زمانۂ تصنیف کا پتہ چلایا جاتا ہے ان میں سے اکثر کتابیں عہدِ مجاپائت، کی بھی یادگار ہیں ۔ 'پانجی، (لٹریچر کا نام ہے) کا عشقیہ لٹریچر بھی اس عہد میں مرتب ہوا ہے۔

**مذاہب** اس عہد (مجاپائت) میں بقول محققین آثارِ قدیمہ ہندو (شیوا) اور بدھ مذہب کے باہمی اختلاط سے مرتّب شدہ مذہب کا رواج تھا کیونکہ ایسے کتبے برآمد ہوئے ہیں جن پر عہدِ مجاپائت کے مذہب کا نام "اگاما شیوا بُدّہا،، درج ہے معلوم ہوتا

ہے کہ یہ اس عہد کے حکمرانوں ہی کی سعی سے ہوا تھا ورنہ اس سے قبل کے عہد حکومت (سنگوساری) میں حکمراں بدھ[1] مذہب کے ماننے والوں کے دشمن تھے جیسا کہ سنگوساری کے حالات میں ایک بغاوت اور سرزنش کے واقعات سے پتہ چلتا ہے۔

**پوجا پاٹ** انڈونیشیا کے عصر حاضر کے بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ اس عہد میں شیوا، مہادیو، کی پوجا ہوتی تھی۔ سری کو بھی مانتے تھے، سورج گرہن اور چندر گرہن کے دن راہو، دیوتاؤں کو پوجتے تھے، برسات میں جب دھنک نکلتا تو اندرا، دیوتا کی پوجا ہوتی تھی گوتم بدھ، کرشن، رامچندر، سیتا، گنیش اور بندر کو بھی پوجتے تھے، سانپ اور

---

[1] **ہندو اور بدھ مذہب کی اس ملک میں ایک دوسرے پر سبقت کے سلسلہ میں مورخین کی رائے**
اگرچہ اس ذیل میں تمام حقیقت تو یہ ہے کہ اب تک یہ صحیح طور سے واضح نہ ہو سکا کہ ان جزائر میں پہلے کون سا مذہب آیا تھا مگر بعض ولندیزی محققین کا بدھ مذہب کے باب میں یہ خیال ہے کہ پہلے ان جزائر میں بدھ ہینا یانہ آیا تھا مگر بعد میں کچھ صدیاں گذر جانے کے بعد (جن کا آج تک صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکا ہے) مہایانہ مذہب آیا جو سری وجایا اور دیگر بعد کی سلطنتوں کے عہد میں بھی رائج رہا ہے مگر مجاپاہت کے عہد میں ہندو اور بدھ دونوں مذاہب کی اکثر باتیں مخلوط کر کے ایک نیا ہندو مذہب بنایا گیا جسے "اگاماشیو ابدھا" کہتے تھے، مگر اسی ذیل میں کلکتہ کا پروفیسر کالیداس ناگ اپنی کتاب (ڈی پیفک ورلڈ کے صفحہ ۱۲۹ پر) لکھتا ہے کہ:۔

"سن عیسوی کے آغاز سے چودھویں صدی عیسوی تک ہندوستانی کلچر نوآبادکاروں یا ہندو مشنریوں کے ذریعہ پھیلا جو برہمن بھی تھے اور بدھ بھی اور برما، سیام، کمبوڈیا، اور جاوا سے تعلق رکھتے تھے۔ ساتویں صدی میں ہندوستان کے پلوو خاندان سے سیاسی تعلقات تھے اور گیارہویں صدی میں چولا خاندان سے تھے۔ لہذا ان سیاسی اثرات کے سبب جنوبی ہند کی تہذیب

کیڑے مکوڑوں کو بھی دیوتا مانتے تھے، چنانچہ جب سانپ کاٹ لیتا تھا تو "کلنتن کرشنا" کے منتر کی پڑھنت کی جاتی تھی۔

مذہبی فرائض برہمنان اور پنڈنڈاں انجام دیتے تھے جن کا احترام راجہ پر بھی واجب تھا۔

## ذات پات کی تقسیم

ڈاکٹر خورس کا خیال ہے کہ اس عہد میں پوری قوم کئی ذاتوں میں تقسیم تھی۔ کیونکہ ہندوستان کی طرح چار ذاتیں آج بھی بالی کے ہندوؤں میں ملتی ہیں (جو بہت تھوڑی تعداد میں پورے انڈونیشیا میں صرف اس جزیرہ میں باقی ہیں)۔ برہمنان ان سب میں معزز سمجھے جاتے تھے، چھوت چھات کا بڑا رواج تھا، جسم کو عبادت کے وقت نیم عریاں رکھا جاتا تھا، مذہبی چشموں پر مرد اور عورت برہنہ نہانا باعثِ برکت سمجھتے تھے، (چنانچہ بقول خورس بالی ہندو آج بھی ایسا ہی کرتے ہیں) برہمن سب ذاتوں کے آدمیوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے، راجہ دوسری ذات کا آدمی ہوتا تھا، اور وہ بھی لوگوں کی عبادات میں شامل تھا۔

پوجا پاٹ عموماً مندروں میں ہوتی تھی (جیسا کہ آج بھی اس دور کے بڑے بڑے جو وہ انڈونیشیا میں بطور آثارِ قدیمہ کے ملتے ہیں اور بہت شاندار ہیں)

## افضل ترین عبادت

مگر افضل ترین عبادت گانا[1] اور ناچنا تھا۔ آواز کو باقاعدہ سُر کے ساتھ ایک مسلسل مشق میں درست کا بڑا اثر پایا جاتا تھا۔ چنانچہ جنوبی ہند کے دراوڑیوں کے نام کے اثرات اب تک باٹاک اور مِننگ کباؤ کے لوگوں کے ناموں میں پائے جاتے ہیں۔

---

[1] **ہندوستان کا ناچ** یہ رواج بھی انڈونیشیا میں ہندوستان ہی سے آیا تھا،

کیا جاتا تھا، جیسا کہ آج بھی بقول خورس بالی میں مروج ہے۔ گانے کے ماہرین کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، برہمن اس کے زیادہ مشاق ہوتے تھے، اور مندروں میں باقاعدہ کتھا کرتے تھے، ناچنا بھی ایک بڑی عبادت تھا، چنانچہ بالی میں آج بھی ناچ اسی طرح جاری ہے چنانچہ حسین و جمیل ہندو لڑکیوں کو خوب نچایا جاتا ہے۔ (بالی کے ہنود، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے قدیم ہندو تہذیب کی یادگار ہیں اس لئے مورخین نے انہی کی موجودہ تہذیب کو "مجاپاہت" عہد کی تہذیب کا صحیح نمونہ قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا حوالہ بار بار دینا پڑتا ہے) آج بھی ان کے ناچ[1] دنیا میں مشہور ہیں۔

---

[1] کیونکہ ہندوستان کے ہندو ہمیشہ سے اسے اپنی عبادت کا جزو سمجھتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں اس کا رواج کب ہوا اس کے متعلق ایک ہندوستانی ہندو ادیب مسٹر اُین۔ دی ایشور" کی زبانی سنئے جن کا ایک مقالہ "ڈانس ان انڈیا" (یعنی ہندوستان کا رقص) امریکہ کے ایک ماہانہ رسالہ (Recreation) مجریہ جنوری ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۴۶۹ پر شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے:—

"ناچنا ہندوستان میں مقدس سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ حسن و دلفریبی ان کی روحانی کیفیت کا ترجمان ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس ناچ کو باقاعدہ جس شخص نے سب سے پہلے فن کا درجہ قرار دیا وہ ہندوستان کا سب سے پہلا حکمراں "بھرت" تھا۔ چنانچہ پچھلی صدیوں تک یہ فن پجاریوں تک محدود رہا مگر اب فنی حیثیت سے اس کے پانچ گروہ ہیں۔ ایک کتھک، دوسرے منی پوری، تیسرے مارواڑی، چوتھے بھرت نتیا اور پانچویں کتھاؤلی"۔

**بالی[1] کے ناچ**

بالی کے موجودہ "مندری ناچ"، ہی بقول خورس عہد مجاپاہت کے ناچ ہیں جو اس وقت بھی شامل پرستش تھے۔ اور آج بھی ہندوؤں کی پوجا میں شامل ہیں۔ انکے ان ناچوں (Temple dances) کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

## مناور اور آشرم

اس عہد کی پرستش گاہیں بت پرستی اور مظاہر پرستی کے بڑے بڑے مندر تھے جن میں قدیم ہندو دیوتاؤں کی مورتیوں کی ہندوستان کی طرز پر پوجا ہوتی تھی، مگر یہ یاد رہے کہ یہ مورتیاں عموماً حکمرانوں کے ہم شکل مجسمے ہوتے تھے جو راجاؤں کے مرنے کے بعد ان مندروں (بتخانوں) میں رکھ دیئے جاتے تھے اور دیوتاؤں کے، نام سے معنون کر دیئے جاتے تھے۔ یعنی اس کا بالفاظ دیگر یہ مطلب ہوا کہ عام لوگوں کی پوجا میں۔ حکمراں اور دیوتا دونوں داخل تھے۔ گوتم بدھ کا بت بھی اس عہد کے ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں داخل تھا۔

---

(صفحہ ۴۰ بہ خورسس)۔

"مندروں میں خاص خاص دیوتاؤں کے مجسموں کے سامنے خاص خاص ناچ تھے، جنھیں مخصوص عمر کی دوشیزہ کیا کرتی تھیں مثلاً ان ناچوں میں ایک ناچ منڈت تھا اور ایک "گبور" تھا۔ ڈمنگ راک، بھی انہی ناچوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

جب ملک میں کوئی وبائی مرض پھیلتا تو اس کے اثرات زائل کرنے کے لئے اور اس کے دیوتا کی منتوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ایک خاص ناچ ناچا جاتا تھا جسے "سانگ بیانگ" کہتے تھے اور اس میں ملک کے سب لوگ شریک ہوتے تھے۔

ایک ناچ مہابھارت کے پانڈوؤں کی یادگار سمجھا جاتا تھا اور اس کو "برادا" کہتے تھے دوسرے کو (جو رام اور سیتا کی عشقیہ سکنات سے متعلق سمجھا جاتا تھا) "ویانگ ڈنگ" کہتے تھے۔

گاؤں کی لڑکیاں جب مندر کو جاتی تھیں تو ایک خاص قسم کا ناچ ناچتی تھیں جسے "لگونگ" کہتے تھے اور عام مرد و عورت کے ناچ کو "جوگڈ" کہتے تھے۔

بتوں پر باقاعدہ چڑہاوے چڑہائے جاتے تھے (جیساکہ آج بھی بقول خورس بالی میں رائج ہے) اور چڑہاوے کی چیزیں عموماً کم عمر اور غیر شادی شدہ عورتیں کسی چھال سے تیار کی ہوئی ٹوکریوں میں سروں پر رکھکرلے جاتی تھیں۔ چیزوں میں ملک کے عمدہ عمدہ تازہ پھل اور دیگر اشیائے خوردنی ہوتی تھیں۔ مندروں میں پوجاری رہتے تھے اور وہی ان چڑہاؤں کو حاصل کرتے تھے۔ مندروں کے بت عموماً سیاہ پتھر یا پھر سنگ مرمر کے ہوتے تھے۔

خانقاہیں آشرم کہلاتی تھیں، جیساکہ بعض کتبوں کی دریافت سے ماہرین اثریات نے پتہ چلایا ہے اور دوسری آشرمیں 'چانڈی' کہلاتی تھیں۔ جن کے آثار اب بھی مشرقی جاوا میں بصورت اصل موجود ہیں، یہ چانڈی عموماً ویران اور غیر آباد حصوں میں بنائی جاتی تھیں کیونکہ ماہرین اثریات نے ان چانڈیوں کے موجودہ آثار اور ان کے گردونواح کو دیکھکر اس امر کا انکشاف کیا ہے یہی اصل میں مرنے والے راجاؤں کی "سمادھی" ہوتی تھیں، اور مرنے والے راجہ کی خاک کے مقام انتشار پر بنائی جاتی تھیں، اندر کی طرف مرنے والے راجہ کے پاؤں کے نشانات سنگِ مرمر یا سنگِ سیاہ پر باقاعدہ بناکر نصب کئے جاتے تھے، عمارات نہایت شاندار اور ایک مربع کمرہ کی صورت میں بنائی جاتی تھیں، جن پر مخروطی شکل کی گمٹی ہوتی تھی اور کمرہ کے چاروں طرف چار دروازے بنائے جاتے تھے۔ (جیساکہ "چانڈی کیجل پُناترَان" کی تصویر سے واضح ہے)۔

بقول سنوسی پانے ان عمارات کو نہایت ہی مقدس سمجھا جاتا تھا، ان کی نگرانی کے لئے باقاعدہ سرکاری ملازمین متعین تھے، جو نیچ ذات یا عام آدمیوں کو

ان تک آنے سے روکتے تھے، صرف بعد میں آنے والا حکمراں سال میں ایک بار ایک جلوس کی صورت میں وہاں ڈھوک دینے کے لئے جاتا تھا اور اس سمادھی پر قیمتی چڑھاوے چڑھاتا تھا جو بعد میں وہاں کے ملازمین میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔

غرض[۱] یہ چانڈیاں ہی دراصل اس عہد کے فن تعمیرات کا شاہکار ہیں۔ انکی سنگین (اور پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی) دیواروں پر جانوروں، دیوتاؤں اور ملک کے بسنے والے لوگوں کی شکلیں تراش کر بنائی جاتی تھیں اور کہیں کہیں عبارتیں بھی کندہ کی جاتی تھیں۔

**حکومت[۲]** مذہب اور منادر کی ان تفصیلات کے بعد اب 'حکومت' پر بھی مختصر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ مگر اس ذیل میں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے آجتک مؤرخین اور محققین کو باوجود کدو کاوش کے ضروری تفصیلات کا پتہ نہ چل سکا،

**حکمراں کی حیثیت** اس لئے یہ بتانا تو دشوار ہے کہ نظام حکومت کی کیا شکل تھی مگر اتنا ضرور معلوم ہوسکا ہے کہ حکومت کے اسٹیٹ کا سربراہ اور آخری ذمہ دار شخص راجہ ہوتا تھا جس کی حیثیت موروثی حکمراں کی تھی اور وہ (بقول "سنوسی پانے"، (سجارہ انڈونیشیا صفحہ ۱۱۶) پورے ملک میں نہایت ہی اہم شخصیت مانا جاتا تھا، اس کا اقتدار مذہبی اور سیاسی دونوں

---

[۱] یہ معلومات چانڈیوں کی تصاویر سے ثابت ہوتی ہے۔

[۲] البتہ اندازِ حکومت کے بارے میں فرنیول لکھتا ہے کہ حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی، اور شاہی خاندان کے لوگ ان کے اشاروں پر عمل کرتے تھے، جن کی حیثیت زمانۂ وسطیٰ کے یوروپ کے فیوڈلزم سے بہت زیادہ مماثل ہے۔

حیثیت رکھتا تھا اس کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے۔

**شاہی القاب** بعض چینی قصص کی روایات سے پتہ چلا ہے کہ جب کوئی حکمراں برسرِ اقتدار آتا تھا تو عام طور پر راجہ، یا مہاراجہ کہلاتا تھا اور تاجپوشی کے بعد "شری"، کا لفظ اس کے نام کے ساتھ لفظِ اول کی حیثیت سے اور بڑھا دیا جاتا تھا تاجپوشی کے بعد اس کا ایک جلوس نکلتا تھا، جلوس میں راجہ عموماً ریشمی لباس پہنکر اور ہاتھی پر سوار ہوکر معہ لوازمہ کے نکلتا تھا، اس کے سر پر زرد رنگ کی ریشمی چھتری سے سایہ کرنے والے ساتھ چلتے تھے، سواری مندر تک جاتی تھی۔ جب کوئی راجہ مرجاتا تو اس کے نام کے ساتھ "پدُو کا بتار اننگ کُماری" کا لقب اور شامل کر دیا جاتا تھا اور ولیعہد عموماً پہلا لڑکا ہوا کرتا تھا جسے 'پوتیرا مہ کوتا'، کہتے تھے۔ راجہ کی بیوی رانی یا مہارانی اور شری (فلاں فلاں) کہلاتی تھی۔

**دربار اور راجہ کی نذر** جب راجہ دربار کرتا تھا تو وہ لکڑی کے ایک مربع تخت پر بیٹھتا تھا، "پرارتوں" اور دیگر کتبِ قدیم کے بیانات سے ثابت ہے کہ اس کی رانی اس کے تخت پر دائیں جانب بیٹھتی تھی، پیچھے کو چھتر بان سایہ دارے کر کھڑے رہتے تھے، محل کے وہ سپاہی جو باینگ کاری کہلاتے تھے۔ دربار کا نظم و نسق قایم رکھتے تھے، اور قطار در قطار کھڑے رہتے تھے، شہزادے، اور رؤسا راجہ کے سامنے فرش پر بیٹھتے تھے، دربار میں داخل ہوتے وقت ہر ایک کو راجہ کے سامنے سجدہ کرنا پڑتا تھا، اور نذر بھی گزرانی پڑتی تھی اور راجہ کی حوالی موالی عورتیں ہوتی تھیں جو اکثر امرا اور رؤسا کی پیش کردہ دوشیزائیں تھیں اور تا مدت العمر راجہ کی خدمت میں رہتی تھیں اور وہ راجہ کے دربار سے تعلق پیدا کرنے کا ایک بڑا

ذریعہ سمجھی جاتی تھیں راجہ بھی جب کسی آمیر کی لڑکی پر فریفتہ ہو جاتا تھا تو اسے اپنے دربار میں بطور نذر کے اس کے باپ سے حاصل کر لیتا تھا اگر کسی امیر کو اس میں تامل ہوتا تو باقاعدہ جنگ کی صورت میں اس کی سرزنش کی جاتی تھی۔ (جیسا کہ ہایم وُوُرک کے باب میں جنگِ بجاجاراں کا واقعہ اس امر پر کچھ روشنی ڈالتا ہے۔

## خطابات اور انعام واکرام

راجہ اگرچہ خود کسی قطعۂ آراضی کا نجی طور پر مالک نہ تھا مگر پھر بھی بحیثیت حکمراں کے اسے اختیار تھا کہ جب وہ کسی سے خوش ہوتا تو زمینوں کے قطعے تقسیم کرتا تھا۔ اس کے درباری (یعنی شاہی خاندان کے لوگ) بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہوتے تھے۔

اعلیٰ فوجی افسران کو "ریڈن[1]" کے خطاب سے نوازا جاتا تھا (جیسا کہ خود مجاپائت کے بانی کے نام ریڈن وجایا سے ثابت ہے جو راجہ بننے سے پہلے فوجی جرنیل تھا)۔

وزیر اعظم یا اور اسی حیثیت کے اعلیٰ لوگ جو اپنے کارناموں کے سبب بہت ہی ممتاز درجہ حاصل کر لیتے تھے انھیں گجَا (یعنی ہاتھی) کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ گجامَدَ یا پھر اس کے بعد آنے والے وزرا مثلاً گجَا انگن وغیرہ کے نام سے ثابت ہے۔ یہ نام نہ تھے بلکہ (غالباً) شاہی خطابات تھے اسی طرح اعلیٰ قسم کے شاعروں کو "امپو" کا خطاب دیا جاتا کیونکہ اکثر ناموں کے ساتھ یہ لفظ بھی اس دور کے

[1] مگر آجکل جو جاوائی باشندے اپنے نام کے ساتھ ریڈن لکھتے ہیں یہ اب کوئی خطاب نہیں ہے بلکہ قدیم خطاب داروں کی اولاد ہونے کی مناسبت ہے جس طرح ہمارے ہاں نواب زادہ یا اور اسی قسم کے موروثی خطابات چلے آتے ہیں۔ (قادری)

شعرا کے ناموں میں ملتا ہے جیسا کہ " ایمپو تنتولر" کے نام سے پچھلے اوراق میں ظاہر ہو چکا ہے۔

**عہدیداران** اب جہاں تک کہ سرکاری عہدوں اور اُن کے حدود و اختیار کا تعلق ہے کسی ملک یا عہد یا سلطنت کی اس وقت کی ایسی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں جو نظم و نسق کو چلانے کے لئے ناگزیر ہیں اور زیادہ تر منتظمہ اور عدلیہ اور عسکریہ پر موقوف ہے لیکن چونکہ قدیم ہند و تمدن ایسی طرز نگارش کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا کہ جس کی وجہ سے اب ان چیزوں کا پتہ چلانا صرف اس ملک کے ماہرین علوم قدیمہ ہی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ وہی اس امر پر بطریق احسن روشنی ڈال سکتے ہیں۔ البتہ اس مقام پر صرف یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ 'وزیر اعظم' ضرور ہوتا تھا، اس لئے کہ گجا مدا کی بڑی شخصیت اس امر کا بیّن ثبوت ہے پھر بقول سنوسی پانے، اعلیٰ فوجی عہدیداروں کے بھی دو سرکاری نام مجاپاہت کی فوجوں کی سر گذشت نقل و حمل کے ساتھ ملتے ہیں مثلاً ایک 'مہا سنوپاتی' (بَرّی فوج کا جرنیل) دوسرا سنوپاتی سرداجالا (بحری فوج کا جرنیل) چونکہ محصولات اور مالگذاری کی وصولیابی کا ذکر ملتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کے باقاعدہ محکمے اور عہدیدار ہوں گے راجہ کے محلات کے باینگ کاری مشہور ہیں، اور چونکہ چانڈیوں کی تعمیرات ہوتی رہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ اس کا بھی کوئی محکمہ اور عہدہ ہوگا۔ تعلیمات، پنڈتوں کے ہاتھ میں تھی اور مخصوص مخصوص طبقات تک محدود تھی اس لئے اس کے محکمہ اور عہدیدار کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، جہاں تک انصاف کا تعلق ہے۔ قدیم ہندو راجاؤں کی زبان قانون ہوتی تھی اور وہی فیصلے انجام دیتے تھے یا برہمن، رہا معاملہ علاج کا سو یہ دیسی طریقوں پر ہوتا تھا۔

**سکہ** سکہ کے متعلق بھی صرف اس قدر معلومات بہم پہنچ سکی ہیں کہ وہ ضرور ہوتے تھے، اور عموماً سونے اور چاندی کے ہوتے تھے۔ مگر ان کا استعمال صرف اندرون ملک ہی تک محدود تھا، غیر ممالک کی تجارت میں یہ سکے کام نہیں آتے تھے کیونکہ تجارت عموماً تبادلۂ اشیاء کے قاعدہ پر ہوتی تھی۔

**تجارت**[1] تجارت کے سلسلہ میں فرنیول کی بھی یہی رائے ہے کہ جنس مبادلہ چاول تھی، سکہ کی قلت کے سبب اس کے ذریعہ سے برآمد درآمد کی تجارت ہوتی تھی، اور چونکہ قیمت کے گھٹاؤ اور بڑھاؤ کا کوئی خطرہ نہ تھا اس لئے لوگ باہر سے خوب آتے تھے اور تجارت کرتے تھے، اور جہازوں کے ذریعہ آتے جاتے تھے یہ جہاز چین سے لیکر ہندوستان اور آگے خلیج فارس تک جاتے تھے۔ ہندوستان سے ہندو، یورپ سے عیسائی اور عرب سے مسلمان اس تجارت کے ذریعہ سے اس ملک میں پہنچے تھے۔

مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تجارت بھی عموماً اعلیٰ ذات کے (ویش) ہندوؤں

---

[1] **معاشی کیفیت** پر روشنی ڈالتے ہوئے مسٹر فرنیول (اپنی کتاب نیدرلینڈس انڈیا صفحہ ۶ پر) لکھتا ہے کہ: ـ" مجاپاہت کا اقتدار ولندیزی حکومت کی طرح تمام جزائر پر حاوی تھا لہذا تجارت کی گرم بازاری تھی۔ دولت کو فروغ تھا بازاروں کو رونق حاصل تھی، سے پارا، طوبان، گرسیک، اور امیل (جسے اب سرابایا کہتے ہیں) کہتے ہیں جہازوں کی آمد و رفت کے بڑے اڈے تھے، باتن کا علاقہ گرم مصالحہ مدورا، نمک کا بلیم بنگ، کھوپرے کے تیل کا، سنڈا خورد، چوب صندل کا، بورنیو ہیرہ کا، ایریان نیلم کا بڑا مرکز تھا یہاں سے یہ مال دوسرے ممالک کو جاتا تھا، اور دوسرے ممالک سے ریشم، کپڑا، مورتیاں وغیرہ آتی تھیں۔"

کے ہاتھوں میں تھی، ورنہ لوگ کاشت کاری اور چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے (جیساکہ آج بھی اندونیشیا کی دیہاتوں کے پیشوں اور ان کی کارکردگیوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے)۔

## غیر ملکی تاجروں کی دیکھ بھال

غیر ملکی تاجروں کی دیکھ بھال کے لئے جیساکہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے مخصوص ممالک کے سرکاری نمایندے مجاپاہت کے مرکزِ حکومت میں رہتے تھے، وہی ان کے معاملات اور قضیئے بھی چکاتے تھے، سفر کی عام اجازت تھی۔ اور مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے سرائیں ہوتی تھیں۔

## عوام کی سوشیل حالت

جہاں تک عوامی زندگی کا تعلق ہے دیہاتوں میں کاشتکاروں پر مملو تھی (کیونکہ مورخین کے ہر بیان سے ملک کا زراعتی ہونا ثابت ہوتا ہے) اور جنگلوں میں غیر مہذب اور نیم وحشی لوگ رہتے تھے (جن کا مذہب مظاہر پرستی تھا جیساکہ آج بھی جغرافیائی ابواب میں آبادی کے سلسلہ میں پتہ چلتا ہے۔ ان نیم وحشیوں کے حالات سیاحوں نے بھی لکھے ہیں اور اثریات کے ماہرین نے بھی بتایا ہے کہ وہ آجتک اپنے اس قدیم تمدن پر کاربند ہیں۔ ان کا مذہب بھی مظاہر پرستی ہے، اگر یہ لوگ کسی عہد میں ہندؤں سے دوچار ہوتے تو یقیناً متاثر ہوتے ہوئے نظر آتے، ان کا اپنے قدیم رواج پر قائم رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ کسی ہندو عہد میں بھی موردِ التفات نہیں سمجھے گئے) شہروں میں آبادیاں مہذب لوگوں کی تھیں جو یا تو سرکاری کارندے ہوتے تھے یا پھر صنعت و حرفت اور تجارت سے اپنا گذر کرتے تھے۔

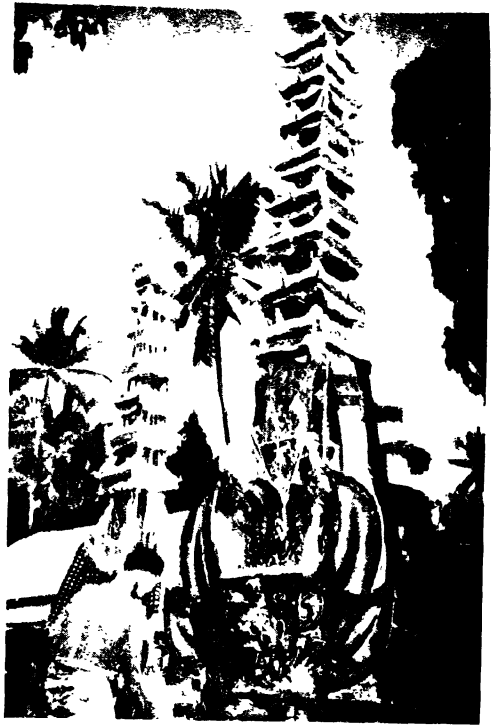
تقسیم عمل تقسیم ذات پر موقوف تھی۔ (جیساکہ خورس کا ایک بیان بالی تہذیب کی موجودہ ذات پات کے سلسلہ میں پیچھے گذر چکا ہے) ہر ذات کا آدمی اپنا مجوزہ پیشہ کرتا تھا جیساکہ آج بھی بالی کے ہندوؤں میں رواج ہے، اور اس کی ذات پھر اسی پیشہ کی مناسبت سے ایک خاص نام سے مشہور ہو جاتی تھی، مگر سوسائٹی میں بڑا درجہ عموماً راجہ کے خاندان، رئیس رؤسا اور مذہبی گروہ (پنڈتوں) کے لوگوں کو حاصل تھا۔ چھوت چھات کا بڑا رواج تھا، اونچ نیچ کا بھی خیال کیا جاتا تھا۔ زمینوں کے مالک شہزادے اور شاہی خاندان کے متعلقین ہوتے تھے، گاؤں کے عام لوگ انہی کی زمینوں میں کاشت کرتے تھے، اور ان کی رعایا سمجھے جاتے تھے۔

**رسم و رواج**[۱]

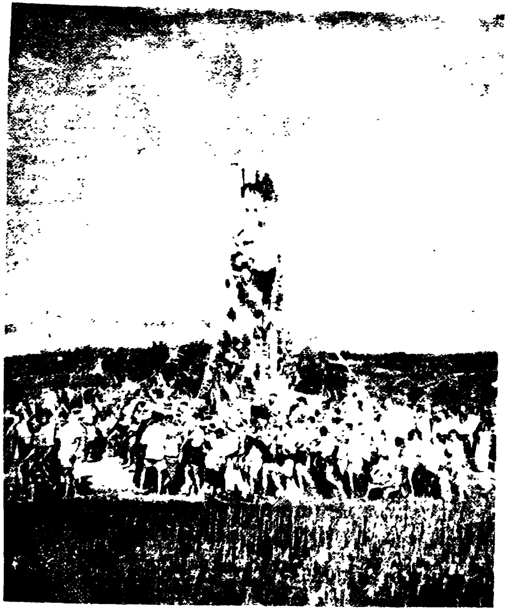
مُردوں کو جلایا جاتا تھا، (جیساکہ خود راجاؤں کے مردہ جسموں کے جلائے جانے کا حال ملتا ہے) مگر ہندوستان کے ہندوؤں کی طرح اس کی ارتھی نہیں بنائی جاتی تھی بلکہ (ایک خاص قسم کا چوبی مینارہ سا بنایا جاتا تھا) تین سے گیارہ منزل تک کا جو کو رنگ برنگ کپڑوں (جو بانس کے ڈھانچے پر منڈھا جاتا تھا) سے تیار کیا ہوا ایک عمارت نما منارہ بنایا جاتا تھا۔ جس کے نچلے حصہ میں ایک بہت بڑا تختہ ہوتا تھا۔ اس تختہ پر جو منزل اس ستون کی بنائی جاتی تھی وہ ایک چھوٹے کمرہ کی طرح گھیردار ہوتی تھی۔ جس میں لکڑی کا ایک بیل کھڑا کیا جاتا تھا۔ اس بیل کے دونوں پہلوؤں کو کیلوں سے

---

۱؎ میت کے یہ حالات ڈاکٹر خورس نے موجودہ بالی کی ہندو تہذیب کے بارے میں تصویروں کے ساتھ لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ عہد مجاپائت میں بھی یہ رسم اسی طرح ادا کی جاتی تھی کیونکہ بالی کے موجودہ ہندو اسی دور کے ہندوں کی یادگار ہیں۔



بالی میں ہندو میت کا میناری جنازہ



بالی کی ایک ہندو میت کا جلوس مرگھٹ پر
(میناری جنازہ)

جڑا جاتا تھا اور جڑنے سے پہلے اس میں (مردہ کو بیل کے پیٹ میں) لٹا دیتے تھے، پھر جلوس کی صورت میں گاتے ہوئے اور ناچتے ہوئے برہنہ سر اور برہنہ پا کندھوں پر رکھکر مرگھٹ کو لیجاتے تھے۔

جب یہ جنازہ جلوس کی صورت میں روانہ ہوتا تو مذہبی سردار (برہمن) چار تیر چار سمتوں میں چھوڑتا تھا، اور پانچواں تیر اس سانپ کی طرف جو زمین کی تاہ میں (ہندو عقائد کے اعتبار سے) رہتا ہے پھر اس جلوس کے آگے آگے ایک سواری ہوتی تھی جسے "بَیل ناگا ہنڈ" کہتے تھے مذہبی سردار اسی سواری میں بھیٹتا تھا اس کے ایک پہلو میں ایک آسیب کا مصنوعی سر ہوتا تھا جلوس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ آگے آگے عورتوں کی قطار چلتی، جن کے سروں پر دریائی تازہ پانی سے بھری ہوئی گاگریں ہوتی تھیں۔ ان کے پیچھے علمبردار چلتے تھے، پھر کچھ قریبی رشتہ کی عورتیں متوفی کے جواہرات لے کر چلتی تھیں۔ (اس جواہر برداری کے لئے اب بھی ایک لفظ اس وقت کی قدیم زبان میں ملتا ہے) پھر مطربان سامعہ نواز اپنے گروہ کی صورت میں گاتے ہوئے اور بجاتے ہوئے چلتے تھے، (مگر یہ جلوس اپنی پوری شان وشکوہ میں اس وقت ہوتا تھا کہ جب کوئی راجہ یا رئیس مرجاتا، ورنہ عام آدمی کی موت پر اس کی حیثیت بہت معمولی ہوتی تھی)۔ مرگھٹ کو "سیما" کہتے تھے، چنانچہ جب یہ جلوس "سیما" کو پہنچ جاتا تو تین بار اس جنازہ کو آگ کے گرد گھومایا جاتا پھر جنوب رُو یہ کہکر دیوتا شیوا کو پکارا جاتا، اور پھر منارہ کے اوپر کے حصّہ کو اتار لیا جاتا تھا اور نعش کو نذر آتش کر دیتے تھے مگر نذر آتش کرنے سے قبل آگ میں مصنوعی جانور جلائے جاتے تھے، جو اس جنازہ کے منارہ ہی کے اندر گھر سے ساتھ لائے جاتے تھے، امیر میّت کی صورت میں ان میں جواہرات بھی

جڑے ہوئے ہوتے تھے، پھر ان جلائے جانے والے مصنوعی جانوروں میں بھی مرنے والے کی ذات پات کا خیال رکھنے کی بڑی تخصیص تھی مثلاً برہمن کی میت کے لئے بیل، اور کمتر درجہ کے آدمی کے لئے شیر (کا مجسمہ جلاتے تھے) اور اس سے بھی کمتر درجہ کے آدمی کے لئے ہاتھی کا مجسمہ استعمال کیا جاتا تھا۔ جب میت کو منارۂ میت سے نکالا جاتا تو کنواری کنواری لڑکیاں جو ساتھ آتی تھیں ایک خاص قسم کا ناچ ناچتی تھیں، جس کا مقصد اگنی یا برہمنگی (دیوتا کا گانا ہے) کو خوش کرنا ہوتا تھا۔ آگ میں مُردے کو اُتارتے وقت برتن، کھانے، زیورات سب زمین پر جما دیئے جاتے تھے اور برہمن منتر پڑھتا تھا اور جب شام قریب آجاتی تو میت کو نذر آتش کیا جاتا، رات کے وقت اسکی خاکستر حفاظت کے ساتھ جمع کرلی جاتی اور برہمن ہی اس کو پڑھنت پڑھتا ہوا متوفی کے گھر پر ایک خاص قسم کے صندوق میں لاتا تھا پھر جب ناخنوں کو سمندر میں بہانے کا وقت آتا تب بھی ایک ایسا ہی جلوس نکالا جاتا تھا، اور خاک چانڈی میں منتشر کر دیجاتی تھی۔ غرض یہ تھی وہ رسمیں جو اس عہد میں رائج تھیں اور بقول خورشؔ آج بھی بالی کے ہندو انڈونیشی ان پر عمل پیرا ہیں۔

راجاؤں کی میت کا منارہ عموماً گیارہ منزلہ ہوتا تھا۔

ریچارڈ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۵۰۸ء تک اس ملک میں عورتوں کے ستی ہونے کا بھی ہندوؤں میں رواج جاری تھا۔

## شادی

شادی عموماً والدین کی مرضی سے کی جاتی تھی۔ اور نیا رشتہ قایم کرنے سے قبل پرانی رشتہ داری یا ذات کے تطابق کو اچھی طرح سے دیکھ لیا جاتا تھا۔ شادی کے فرائض مندر کا پنڈت انجام دیتا تھا، اور دولھا دلھن ایک

خاص قسم کا لباس پہنتے تھے، طلاق و خلا کا کوئی قانون نہ تھا، جیسا بقول بعض مبصرین یہ تمام رواج آج بھی بالی کے ہندوؤں میں ملتے ہیں شادی کے موقعوں پر ناچ رنگ اور دیگر ملھویات کا بڑا زور رہتا تھا۔

## بچّہ کی پیدائش قبل و بعد کی رسمیں

جب شادی ہو جانے کے بعد عورت کے حمل قرار پا جاتا تو بقول ڈاکٹر ریچارڈ ونسٹیڈ[1] ساتویں مہینے دو خاص قسم کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں اور دونوں سے عموماً مراد یہ ہوتی تھی کہ بچہ لڑکا ہو اور لڑکی نہ ہو اور بچہ کی ماں آسیب و اثر سے محفوظ رہے وغیرہ کیونکہ ہندو مذہب کی توہم پرستی نے عموماً یہ نظریہ عام کر دیا تھا کہ ہر وقت ایسی بلائیں پھرتی ہیں جو زچہ کو معرضِ ہلاکت میں ڈال دیتی ہیں اس لئے رسموں اور راگ رنگ کے ذریعہ سے ان بلاؤں کو خوش رکھنا چاہئے وغیرہ چنانچہ اس سلسلہ میں عموماً برہمن گھر پر آتے تھے اور خاص خاص قسم کے منتر گاتے تھے یہ رسم اصطلاحی طور پر " مالانگنگ پاڑوت " کہلاتی تھی۔

جب دردزہ کا وقت آتا تو عورت کو آراستہ و پیراستہ کرتے تھے، اور زیور کافی پہنا دیتے تھے پھر جب بچہ پیدا ہو جاتا تو اس کے (بچہ کے) منہ میں شہد چٹاتے تھے اور شہد چٹاتے وقت مذہبی کتابوں کے خاص منتر دُہراتے تھے۔

مگر برہمنوں میں یہ رسم تھی کہ جب بچہ چار ماہ کا ہو جاتا تو اس کو 'سورج، دیوتا' کی جھلک دکھانے کے لئے باہر نکالا جاتا تھا، اور جھولے میں لٹانے سے پہلے زمین (یعنی دھرتی ) پر سُلاتے تھے، اور دسویں دن جوتشی آتا اور اس کا نام رکھتا تھا)

---

[1] ڈاکٹر ریچارڈ ونسٹیڈ ۔ ڈی ۔ لِٹ کی کتاب (The Malays) صفحہ ۳۸ ۔

اور نام رکھنے کی رسم یہ تھی کہ چپکے سے وہ نام بچہ کے کان میں کہدیا جاتا تھا، پھر چھ ماہ کے بعد ایک خاص تقریب منعقد کی جاتی تھی جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ بچہ کو پہلی بار غلّہ (یعنی چاول) کھلاتے تھے، اور جب بچہ تین سال کا ہو جاتا تو باقاعدہ اس کا سر منڈاتے تھے۔ اور یہ عمل بھی ایک خاص تقریب کے ذریعہ ہوتا تھا، اور بال کاٹنے کا طریقہ یہ تھا کہ قینچی اس طرح چلتی تھی کہ سارے بال سات بار میں کٹتے تھے۔

**تعلیم و تربیت** جب بچہ سن شعور کو پہنچتا تو مندروں کے قریب کے مدرسہ میں پڑھنے کے لئے استاد کے پاس بھیجا جاتا تھا اور استاد کو عام طور پر "گورُد" کہتے تھے، گورُد کی خدمت کو والدین اور رشتہ دار سب اپنا ضروری فرض سمجھتے تھے۔ اس طرح سوسائٹی میں گورُد، کا پوزیشن بہت اعلیٰ تھا۔ مجاپائت کے عہد میں سمندر پار سفر کرنا گناہ نہ تھا، چنانچہ اکثر امیروں کے لڑکے ہندوستان (نالندہ) میں جاکر ہندو مذہب کی تعلیم پاتے تھے مگر تعلیم عام نہ تھی صرف برہمن یا حکومت کے عملہ کے لوگ حاصل کرسکتے تھے۔

**جوان ہوجانے کے بعد** اپنی اپنی ذات کے مطابق ہر نوجوان اپنا پیشہ اختیار کرتا تھا۔ ذاتیں پیشوں کی مناسبت سے قایم تھیں اور اسی نام سے پکاری جاتی تھیں، مگر چار ذاتیں (ہندو آریوں کی طرح) خاص تھیں ہر ذات کا آدمی خود کو دوسرے سے الگ سمجھتا تھا۔ تارک الدنیا ہونے کا بھی بڑا رواج تھا اور یہ ہندو مذہب کی بڑی عبادت سمجھا جاتا تھا، ایسے لوگ ساری عمر[1] عورتوں کے ساتھ مباشرت نہیں کرتے تھے اور شراب سے بچتے تھے چنانچہ ایک مؤرخ "ٹوم پائرس"

---

[1] ملاحظہ ہو (Tome Pires) کی کتاب (The Sumatra Oriental) مطبوعہ لندن ۱۹۴۴ء

لکھتا ہے کہ صرف جاوا ہی میں ایسے لوگوں کی تعداد سنہ ۱۵۱۲ء میں (جو مجاپاہت کا عہدِ زوال تھا) تقریباً ۵۰۰۰۰ تھی۔ یہ لوگ بدھ مذہب کے بھکشوؤں کی طرح کاسۂ گدائی لے کر گھومتے اور اسی پر گذارا کرتے تھے، عام لوگوں پر ان کا احترام کرنا ضروری تھا۔ بیماروں کا جھاڑ پھونک اور منتر کے ذریعہ علاج بھی یہی لوگ کرتے تھے، بھیک مانگتے ہوئے جب گھروں پر پہنچتے تو گھروں کی عورتیں انھیں اندر بلالیتی تھیں اور ان سے جھاڑا پھونکی، اور منتر کراتی تھیں ایسے تارک الدنیا لوگوں کی تعداد اندلاس کے بدھ علاقہ میں زیادہ تھی۔

**چڑھاوے وغیرہ**

انہی لوگوں کے اشاروں سے مندر کے دیوتاؤں پر طرح طرح کی چیزیں بھی چڑھائی جاتیں اُتارے اور خیرات بھی کیجاتی تھیں۔ عہدِ مجاپاہت میں گھوڑے دیوتاؤں کے نام پر مندروں کے سامنے قتل کئے جاتے تھے اور ان کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ بقول خورس "مرغ" قتل کرنا بھی یگیہ میں شامل تھا۔

**مُرغ کی لڑائی**

اس سلسلہ میں خاص بات یہ تھی کہ مرغ کی لڑائی ایک مقدس رواج سمجھا جاتا تھا، یعنی اسے خون کی پیشکش تصور کر کے مندروں کی دعوت کے (جنھیں ساسیہہ کہتے تھے) طور پر ضروری خیال کرتے تھے۔ باقاعدہ ہار جیت پر بازی لگائی جاتی تھی، اور ہارنے والے مرغ کے مالک کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا، اس طرح اس جوا کا بڑا رواج تھا اور عوام سے لے کر حکمراں تک سب اس میں حصہ لیتے تھے، جیسا کہ انوسپاتی کے حال سے ظاہر ہے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رواج بھی ہندوستان[1] ہی سے آیا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے جو الفاظ زبان میں رائج ہیں وہ سنسکرت

---

لہ **ہندوستان کی مرغ بازی** | اس ذیل میں حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی کے

سے ماخوذ ہیں۔

**حرفتیں وغیرہ**

اس عہد میں مورتیوں کی پوجا پاٹ کے باعث سنگ تراشی، مصوری اور پینٹینگ کے کام نے بھی اچھی خاصی ترقی حاصل کرلی تھی کیونکہ یہ چیزیں ہندو مذہب میں خود عبادت تھیں چنانچہ ان کے نشانات اب بھی قدیم منادر کے آثار سے ظاہر ہیں۔ جن کو مورخین نے 'منادر' کے باب میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، چونکہ ہر چیز پر بت پرستی کا اثر غالب تھا لہذا قدیم کتب آثار میں بھی ان منادر کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ منادر ہندوستان کے نمونہ ہائے منادر سے ہمیشہ مختلف رہے ہیں ان کی ساخت اور ان کا طرزِ تعمیر سب اس ملک کا اپنا تھا۔

"مانومنٹل جاوا[1]" میں درج ہے کہ مندر سازی کا فن جو اس عہدِ مجاپاہت یا اس سے قبل کے ہندو دور کا خاص امتیاز ہے وہ مشرقی جاوا میں زیادہ عروج پر پہنچا اور پھر اس 'مشرقی جاوا کے آرٹ' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ شہر 'مالنگ' میں یہ طرزِ خصوصی تیرہویں صدی میں آیا تھا۔ جس کی خاص یادگار 'چانڈی کیجل' ہے۔ اگرچہ ان آثاروں میں فن کارانہ باریکیاں معدوم ہیں مگر پھر بھی یہ کسی حد تک خوبصورت ہیں جو فنِ سنگتراشی کا اچھا شاہکار سمجھی جاتی ہیں بقول "ٹی۔ فان ایراپ"

---

پروفیسر مناظر حسن گیلانی اپنی کتاب ("ہزار برس پہلے" کے صفحہ ۸۰ پر) ہندوستان کے ہندوؤں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

مرغ بازی کے ساتھ جوا کا کھیلنا، ہارنے والے مرغ کے مالک کے ہاتھ کلہاڑی سے قلم کر دینا اور مسئلہ تناسخ پر ایمان رکھنے کے باعث خودکشی کرنے میں دلیر ہو جانا" وغیرہ رائج تھا۔

---

[1] (Monumental Java) سنہ ۱۹۲۶ء میں لندن کی مطبوعہ ہے۔

(T. Van Erap) مجاپائٹ کے حکمرانوں نے اپنے دور میں مندروں کی تعمیر ہی پر زیادہ زور دیا تھا اس لئے عوام کی فن کارانہ کوششیں بھی اسی فن پر صرف ہوگئیں۔

غرض اس عہد میں لوگوں کا بڑا قابل فخر پیشہ بت گری، بت تراشی، سنگ تراشی، اور مندروں کی تعمیر میں محنت و مزدوری کرنا تھا۔

**مُنبّت کاری**

گرم اور مرطوب آب و ہوا کے باعث ہمیشہ سے اس ملک میں سینکڑوں قسم کی عمارتی لکڑیاں پیدا ہوتی چلی آئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لکڑی کے کاروبار نے بھی فنی حیثیت سے اس ملک میں بڑا فروغ حاصل کیا ہے یہ کہنا تو بعض مصنّفین کی زیادتی ہے کہ لکڑی پر مُنبّت کاری اور نقش و نگاری کا کام صرف مجاپائٹ عہد ہی کا کارنامہ ہے اور ہندؤں کی تاریخ کے آغاز سے شروع ہوتا ہے، آج چونکہ عہد قبل تاریخ کی ایسی یادگاریں جو اس فن پر کسی حیثیت سے روشنی ڈالتی ہوں دستیاب نہیں ہیں اسی لئے بعض مورخین نے فقدان معلومات کے باعث ہندوستان کے ہندؤں کے ساتھ اس فخر کا انتساب کر دیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندؤں کی آمد سے پہلے بھی اس ملک کے تعلقات تجارت چین تک پہنچے ہوئے تھے جس کی آج تفصیلات نہ معلوم ہیں اور چین ظاہر ہے کہ صدیوں پہلے ہی سے فنون پر ہندوستان کے مقابلہ میں مسابقت رکھتا چلا آیا ہے خاص طور پر کپڑے، رنگ، اور لکڑی پر نقش و نگاری کا کام چین کے ساتھ مخصوص رہا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ فن ہندوستان کے بجائے چین سے آیا ہو کیونکہ بعض مصنّفین نے قدیم عمارتوں میں جڑی ہوئی نقشین لکڑیوں کے فن کو دیکھکر بتلایا ہے کہ اس کو چین کے فنِ نقش نگاری اور مُنبّت کاری سے زیادہ مماثلت ہے۔ البتہ یہ قابل پذیرائی

ہوسکتا ہے کہ عہدِ مجاپائٹ میں اس فن نے زیادہ رواج پالیا ہو کیونکہ اس دور میں مذہبی آثار زیادہ زیر تعمیر رہتے تھے۔ اور بُت پرستی کا زور تھا۔

بہرکیف لکڑیوں کی مُنبت کاری، بھی اس عہد کے لوگوں کا ایک بڑا پیشہ رہا ہے، اور بقول خورس آجکل بھی اس کے بڑے ماہر بالی کے ہندو ہی ہیں کیونکہ انہیں بت گری، بت فروشی اور دیگر مذہبی (ہندو) مراسم آجتک جاری ہیں۔

## زیورات

یہ بتانا تو مشکل ہے کہ عورتیں یا مرد کون زیور پہنتا (کیونکہ قدیم ہندوستان میں عورتوں کی طرح راجہ مہاراجہ اور بڑے بڑے لوگ بھی زیور استعمال کرتے تھے) تھا اور کس قسم کا زیور پہنتا تھا مگر انڈونیشیا میں آجکل بھی اس کے بنانے کے زیادہ ماہر ہندو ہیں اس لئے یہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ مجاپائٹ میں زیورسازی بھی ایک بڑا پیشہ مانا جاتا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ گجامَدَ کے عہد وزارت میں اس فن نے زیادہ ترقی کی ہو کیونکہ اس کے زمانہ میں فتوحات کی وسعت کے سبب خوشحالی اور دولت کی فراوانی تھی۔ خوشحال لوگ ہی زیورات استعمال کیا کرتے ہیں۔ سونے اور چاندی کے استعمال کے متعلق ضرور شہادتیں ملتی ہیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہاں پر زیورات بھی اس عہد میں سونے اور چاندی ہی کے بنتے ہوں گے اور چونکہ جواہرات (نیلم اور ہیرہ) بھی قدیم چینیوں کی کھانیوں سے اس ملک میں سینکڑوں سال سے ملتا چلا آیا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ ان زیورات میں جواہرات بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہوگا، رواج قدیم سے متوارث ہوتے ہیں اس لئے موجودہ عہد میں زر و جواہر کی عمدہ تیاریاں اور پھر ان کے استعمال کے ذوق و شوق کے انڈونیشیوں میں کثرت سے پائے جانے کے سبب یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد

میں بھی اسکا بڑا زور رہا ہوگا۔

**لباس** یہ خود اہلِ اندونیشیا کی اپنی ایجاد ہے کیونکہ قدیم ہندوستان میں کپڑوں کے سینے کا فن اعلیٰ حیثیت سے موجود نہ تھا (لوگ عموماً دھوتیاں باندھتے تھے یا بہت مختصر لباس پہنتے تھے اور عورتیں بھی نیم عریاں رہتی تھیں کیونکہ ہندوستان کی اکثر پرانی مندروں کی عمارتوں پر جو نقش و نگار ملتے ہیں وہ اس امر اور اس کے رواج پر بیّن دلیل ہیں پھر خود تزک بابری میں پہلے مغل شہنشاہ بابر نے اس کے فقدان کا ذکر کیا ہے) چنانچہ پروفیسر کالیداس ناگ کا یہ خیال کہ ریشم جاوا میں ہندوستان سے پہنچا ہوگا (دیکھو اس کی کتاب دی پیسفک ورلڈ صفحہ ۱۶۲) سمجھ میں نہیں آتا ہے کیونکہ جاوا میں "باٹک[۱]"، کا رواج ہندوؤں کے آنے سے پہلے ہی سے موجود تھا (جیسا کہ خود اندونیشیا کے بعض ان قصّوں سے ظاہر ہے جو عہدِ قبل تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی وقت بھی عہد تاریخ میں قلمبند کئے گئے ہیں)۔

---

**باٹک[۱]** یہ کپڑے کی ایک خاص صنعت ہے جو کپڑے پر گرم موم بچھا کر نقش و نگار اور رنگ آمیزی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ "باٹک" کا لفظ بھی بقول مسٹر ڈی۔ ریل (مصنف کتاب The Batiks of Java) خالص جاوی زبان کا لفظ ہے اگر یہ فن ہندوستان سے آیا ہوتا تو یہ لفظ بھی سنسکرت زبان کا ہوتا۔ جو ہندوؤں کے ساتھ اس ملک میں آئی تھی۔ مگر اس لفظ کا خالص جاوی (یعنی اندونیشی نزاد) ہونا اس امر پر دال ہے کہ یہ فن اندونیشیا کا خود اپنی ایجاد ہے۔ اس کی ابتدائی تاریخ پر قلم فرسائی کرتے ہوئے ایک مورخ "سی۔ ای۔ پیلُو" (اپنی کتاب (Dyes and Dying) صفحہ ۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء پر) رقمطراز ہے کہ اس فن کی ابتدا قدیم زمانہ میں ملک چین میں ہوئی تھی وہیں سے یہ فن اس ملک میں پہنچا ہے۔

قدیم ناچوں کی ایک قلمی تصویر کا عکس انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد دوم صفحہ ۲۰۔

**اور دیگر چیزیں** البتہ راجگان عہد ہنود نے اس فن کی بڑی سرپرستی کی اور اس کے لباس خود بھی پہنے اس طرح اس کو کافی ترقی ہوگئی۔ عہدِ مجاپا یُت میں گھریلوں صنعتوں میں یہ خاص چیز تھی اور اس طرح شیشہ گری کے فن کی (جو بقول گورہان اور ہین گیلڈرین ماہرین آثار قدیمہ) جو ۲۳ سنہ ق۔م میں بھی اس ملک میں رائج تھا اب کافی ترقی ہوگئی تھی۔ سماترا میں لمپونگ کے مقام پر شیشہ کی صنعت خاص تھی جو سری وجایا کے وقت سے چلی آرہی تھی، اور وہاں چٹائیاں بھی نہایت عمدہ بنائی جاتی تھیں۔

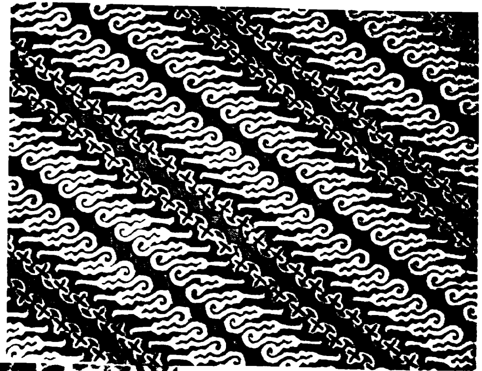
---

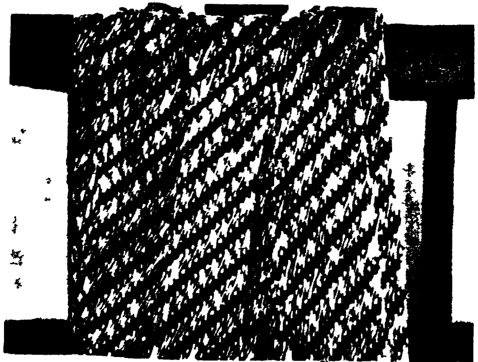
مطبوعہ امریکہ سنہ ۱۹۴۶ء خود میری نظر سے گذرا ہے (قادری) جس میں ڈیڑھ ہزار سال قبل کی جاوائی عورتوں کو باٹک پہنکر ناچتے ہوئے دکھایا گیا ہے یہ تصویر مشرقی جاوا کے کسی مندر کی دیوار پر کندہ کئے ہوئے نقوش سے تیار کی گئی ہے اس کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے بھی یہ فن اس ملک میں موجود تھا۔ حالانکہ اس کی ترویج کی صحیح تاریخ سے مسٹر ٹی ایڈم (صاحب کتاب (Art of Batik in java) باب اول مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۵ء) نے بھی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ مگر اس مقام پر صرف بتلانا مقصود یہ ہے کہ "باٹک" کا لباس انڈونیشیا میں بہت قدیم سے ہے اور مجاپا یُت وغیرہ کے عہد میں اس نے کافی ترقی کی تھی۔ اور آج بھی عمدہ قسم کا لباس اسی کپڑے کا ہوتا ہے۔

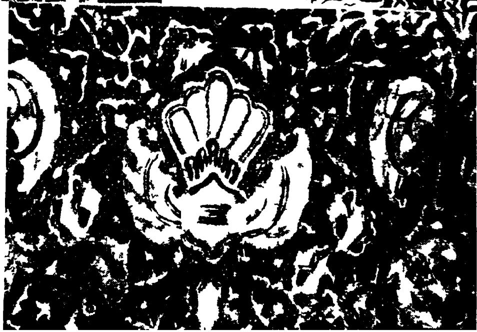
**باٹک کے اوضاعِ لباس** عورتیں خصوصاً اس کی زیادہ شایق ہیں زمانۂ تاریخ میں یا اس سے قبل بھی عورتیں ہی زیادہ پہنتی تھیں۔ ویسے بھی سیاحین کا خیال ہے کہ لباس کے علاوہ گھروں کی آرائش میں بھی یہی کپڑا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے استعمال کا طریقہ جو مستشرقین نے اپنی تاریخوں میں لکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس کپڑے کے چار ٹکڑے ہوتے تھے مثلاً

(۱) پہلا ٹکڑا یا چادر "سارونگ" کہلاتی تھی یہ تقریباً ۹ سے ۱۴ فٹ تک لمبی اور ۳½ فٹ تک چوڑی ہوتی تھی اور جسم پر مختلف حیثیتوں سے لپیٹی جاتی تھی۔ اس کے لپیٹنے کے

باٹک کی صنعت کے مختلف نمونے







**سن و سال** سرکاری طور پر "ساکا" سال کا رواج تھا جس کا ذکر (سری وجایا کے ذیل میں کسی مقام پر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے)۔ یہ بارہ مہینوں یا ۳۵۴ دن کا ہوتا تھا، مذہبی گروہ کے لوگ خصوصاً زوال مجاپایت کے وقت ایک دوسرے سال کو مانتے تھے جو تیس ہفتوں یا ۲۱۰ دن کا ہوتا تھا اور اسے وہ "اُوُدالان" کہتے تھے، خورس کی تحقیق کے مطابق بالی کے ہنود میں اب بھی یہی سال رائج ہے مگر قومی نشان یا پرچم سُرخ و سفید پٹی[۱] کا تھا جیسا کہ آج بھی رائج ہے۔ البتہ ساعتِ نحس اور ساعتِ سعید دیکھ کر کام کا آغاز کیا جاتا تھا، آداب کے

---

فیشن ہر دور میں بدلتے رہے ہیں۔

(۲) دوسری چادر کو "سلینڈانگ" کہتے تھے، یہ ۹ فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی ہوتی تھی اور سر پر دوپٹے کی طرح استعمال کی جاتی تھی، یا پھر عورتیں اس میں اپنے بچوں کو لپیٹ کر لیجاتی تھیں جو بچے والی نہیں ہوتی تھیں وہ اس میں کوئی سامان باندھ لیتی تھیں۔

(۳) اور تیسری چادر کو کیمیان، کہتے تھے اور یہ کمر پٹی کی طرح ہوتی تھی نوجوان دوشیزہ اور شادی شدہ عورتیں اس کو اپنی پستانوں کو ڈھکنے کا کام لیتی تھیں اور دونوں پستانوں کے درمیان گلے کی ٹائی کے طور پر گھٹنوں تک لٹکا لیتی تھیں جو بہت دلکش ہوتی تھیں۔

(۴) اس کا چوتھا ٹکڑا "ساروُنگ کیالا" کہلاتا تھا اور یہ بڑے رومال کی طرح استعمال ہوتا تھا۔

**باٹک کا کپڑا** مگر اس کے استعمال کے طریقے ہر جزیرہ میں جداگانہ تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ چادروں کپڑے نہایت دلکش ڈیزائن سے رنگے جاتے تھے۔ (چنانچہ میں نے قدیم نمونے کتب میں دیکھے ہیں، ان کے ملاحظہ سے ترکی کے قالین کے نمونوں کا شبہ ہوتا ہے۔ ڈیزائن میں عموماً ملک کے درخت، پودے، پھل، پھول، ترکاریاں، گھونگے اور جانور وغیرہ بناتے تھے۔ جنکی تصویریں آج بھی اس ملک کی تاریخ طبعیات کا اچھا خاصہ ریکارڈ ہے۔ (قادری)

اب یہ سمجھنا کہ یہ کپڑا تیار کس طرح ہوتا ہے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

[۱] ملاحظہ ہو "میمبار انڈونیشیا"، اگست ۱۹۴۵ء۔

طور پر سلام کے لئے نمستے کہتے تھے جیسا کہ اب بھی جاوی میں یہ لفظ موجود ہے۔

**تہوار وغیرہ** مگر تہوار قریب قریب وہی تھے جو کیدیری اور سنگوساری، کے زمانوں میں رائج تھے، چراغاں کا تہوار بھی غالباً منایا جاتا تھا کیونکہ اس کیلئے بھی اس عہد کے قصے مشہور ہیں۔

**اوزان وغیرہ** پیمانے اور وزن کیا تھے، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ (مجھے) اس سلسلہ میں باوجود تلاش کے کوئی تفصیل نہ مل سکی۔ نہ ہتھیاروں کے بارے میں کوئی تفصیل مل سکی ہے البتہ "ہین گیلڈرین" ماہر اثریات نے ایک

**باٹک بنانے کا طریقہ** اس کے تیار کرنے کے طریقے آج بھی انڈونیشیا میں ہزاروں سال گذر جانے کے بعد بقول ماہرین تاریخ اپنے اصلی حال پر قایم ہیں چھینیوں کی ایک جماعت نسلاً بعد نسل اس کام پر چلی آتی ہے۔ اور یہ کام ان کی گھریلو صنعت ہے۔ عورتیں زیادہ تیار کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ڈیزائن عورت بناتی ہے، "سٹریل مانز" اپنی کتاب۔

(Batiks and how to make them) صفحہ ۵۵ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۹ء)

لکھتا ہے کہ پہلے کپڑا یا توسوتی ہوتا ہے اور یا ریشمی ہوتا ہے۔ مصالحہ کیمیائی حیثیت سے تیار کیا جاتا ہے، پہلے اس کو گرم پانی میں کئی بار دھوتے ہیں، برتن کو کھوپرے کے تیل سے چکنا کر لیتے ہیں، اور اس میں چاول کی جلی ہوئی راکھ بھی ملاتے ہیں، یہ عمل کئی بار کیا جاتا ہے۔ ہر عمل کے بعد مصالحہ کو دھوپ میں خشک کیا جاتا ہے۔ آخری بار جب وہ مکھن کی طرح نرم ہو جاتا ہے تو اسے سکھا دیتے ہیں، اور موم بتی کی طرح جب خشک ہو جاتا ہے تو اس کا خامہ (قلم) تیار کیا جاتا ہے پھر اس خامہ سے کپڑے پر نقش و نگار بنائے جاتے ہیں مگر اس سے قبل کپڑے پر موم پھیلا دیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ ہے تمام عمل جس کے بعد یہ رنگین کپڑا تیار ہوتا ہے جسے "باٹک" کہتے ہیں اس فن کو یہاں کے مسلمان سلاطین کے عہد میں نسبتاً زیادہ فروغ حاصل ہوا، کیونکہ اسلام نے یہاں بہتر لباس کے استعمال پر بہت زور دیا۔

مقام پر اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ "چھریاں"، اس عہد میں اصطلاحی طور پر "کریز" کہلاتی تھیں ہوسکتا ہے کہ یہ لڑائیوں میں استعمال ہوتی ہوں مگر آتش کا لڑائی میں استعمال (منگولوں کے حملہ کے وقت سے آیا ہے (قبلا قاآن کے حملہ سے مراد ہے) پھر یہ رواج مسلمان سلاطین کے وقت میں عام ہوگیا تھا۔

## ہندو تہذیب کا عام اثر

ان سب باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اِس عہد مجاپائت میں ملک نے ترقی ضرور کرلی تھی اور ہندو تہذیب (جس سے میری مراد محض ہندوستان کی خالص ہندو تہذیب نہیں ہے بلکہ انڈونیشیا اور ہندو دونوں کے اختلاط سے جو اس وقت کے ہندو انڈونیشیوں پر محتوی تھی وہ مراد ہے) ساری قوم پر چھائی ہوئی تھی جس کا اثر یہ ضرور ہوا کہ بت پرستی اور بت گری کے ساتھ ساتھ توہم پرستی اور اہمسا بھی عام ہوگئے مذہب کے توہماتی کردار اور زور نے برہمنوں کے اقتدار کو بڑھا دیا جن کے طرز عمل کے سبب بہت سی ذاتیں پیدا ہوتی چلی گئیں انڈونیشی قوم گجامدٰ جیسے انسانوں کے سبب سیاسی حیثیت سے ضرور ایک تھی مگر توہمات اور کاروبار کی رو سے بہت سے طبقوں میں منتشر ہوچکی تھی، اسی توہم کا نتیجہ ان کے افسانوی قصوں کی تخلیق بھی ہے اور پھر ان کا اثر جو کردار اور اخلاق پر پڑا ہوگا وہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے اہمسا کے سبب اور بدھ وغیرہ کی تعلیم کے باعث تارک الدنیا اور غیر فوجی بن جانا بھی عام ہوگیا تھا، چونکہ برہمن اپنا استیلا چاہتے تھے لہذا انھوں نے ساری قوم کو بت پرستی کی طرف رجوع کردیا پھر بت پرستی خود چونکہ توہمات سے لبریز تھی لہذا ساری قوم دیوی دیوتاؤں کے خوش کرنے میں اور اپنے برہمنوں

اور پنڈتوں کی رضا جوئی میں منہمک ہوگئی آخری حکمراں بھی پھر باہمی منازعات میں معروف تھے لہٰذا اک دم سیاسی اور معاشری دونوں قسم کے زوال ہوتے چلے گئے، بالآخر اسلام آیا اور یہاں کی قوم نے زندگی اور اس کی اصلاح کا نیا لطف پایا، اس کی تاریخ اب اگلی فصل میں ملاحظہ ہو۔

# فصل چہارم

## عہدِ اسلام

اس فصل میں ہندو تہذیب کے زوال کے بعد اسلام کے آغاز اور اسلامی تہذیب کے ارتقائی ادوار پر بحث کی گئی ہے اور مستند شواہدِ تاریخی کی اعانت سے تمدنِ اسلام کے ہر اس انقلابی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس نے اس ملک کی تاریخ میں ایک نئے دور اور نئے زمانہ کا آغاز کیا تھا، اور اپنے اس آغاز سے یہاں کے شعورِ خام کو پختگی کے مقامِ اعلیٰ پر فائز کر کے زندگی کے اس بلند اور اعلیٰ زاویہ پر پہنچا دیا تھا، جہاں کبھی دمشق، بغداد، اور قرطبہ، غزنی کے تمدن نے پہنچکر نوعِ انسانی کو جہاں بانی کے ڈھب ۔ حکمرانی کے اصول، تہذیب کے طریقے، اور ترویج علم و روحانیت کے اسالیب سکھائے تھے جن کی خوشگوار یاد داشت سے آجتک تاریخ کا دل شاد اور انسانی تمدن کا دماغ روشن آباد ہے اور رہاں جس کی بدولت انڈونیشیا کی حوصلہ مند قوم بھی الکاہل کے طوفانوں میں نوعِ انسانی کو ضلالت و بربادی سے بچانے والا روشن منارہ بنی رہی ہے، اس کی ارتقائی منزلیں منصۂ قرطاس پر ابوابِ ذیل کی ترتیب سے ملاحظہ ہوں ۔

(۱) اسلامی تمدن کا آغاز ۔ (۲) مذہب اسلام کی اشاعت اور اسلام کی ابتدائی سلطنتیں ۔ (۳) جاوا میں اسلام کی اشاعت اور مسلمان سلطنتوں کی ابتدا ۔ (۴) اسلامی اقتدار کا عروج ۔ (۵) اس عہد کا نظام حکومت اور عام تمدن ۔

# باب اوّل

## اسلامی تمدّن کا آغاز

**اسلام کا عام داخلہ** اسلامی تمدّن کا آغاز اسلام کے داخلہ سے ہوتا ہے اور ہزارہا جزائر کے اس وسیع و عریض ملک (انڈونیشیا) میں جب تاریخی حیثیت سے "اسلام کے عام داخلہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی اسلام "متحدہ ہندوستان" کی طرح مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں پھیلا ہے پھر اس کے پھیلانے والے بھی کسی ایک ملک اور ایک سرزمین کے رہنے والے نہ تھے، ان میں بعض ہندوستان (علاقہ گجرات) سے تعلق رکھتے تھے

---

**مذہبِ اسلام** دنیا کے تمام مذاہبِ آسمانی کی تاریخ میں سب سے زیادہ آسان، سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ وسیع اور سب سے زیادہ جامع، مذہب ہے، جو ہر دور اور ہر زمانہ، اور ہر قوم اور ہر ملک کے افراد کی تکمیلِ روحانی، ترقیٔ مکانی و زمانی پر پورے طور سے صحیح اترنے کے باعث آخری سچا مذہب ہے۔ جو ایک خدا، ایک رسول ایک قرآن، ایک قبلہ، ایک تمدن اور ایک معیار کی تلقین کے ساتھ ۶۱۰ء میں دیارِ عرب کے اس بیابان میں نمودار ہوا جو جغرافیائی حیثیت سے بنجر زار ہونے کے علاوہ ہر مکارمِ انسانی کے اعتبار سے بھی بنجر زار تھا اور رذائل و ضلائل کا مرکز تھا، جہاں نہ تعلیم تھی نہ علم تھا۔ نہ شرافت تھی۔ نہ شرافت کی طلبگاری تھی، عزّت تھی، نہ ہوائے عظمت

اور بعض کا تعلق خلیج فارس یا کسی عرب ملک سے تھا۔ یہ لوگ صوفیاء اور درویش تھے، جن کا پیشہ تجارت، لین دین اور کاروبار تھا، یعنی یہ لوگ گرم مصالحہ اور دیگر اسی نوع کی ضروری چیزوں کی تجارت کرتے تھے۔ باعلم، باعمل، صالح اور بلند کردار تھے، ان لوگوں کے اس ملک میں وارد ہونے کا زمانہ مختلف بیاناتِ تواریخ سے مختلف ثابت ہوتا ہے مگر سب کا اس امر پر اجماع ہے کہ اسلام ان جزائر

---

دکامگاری تھی، قتل تھا، ظلم تھا، بغض و عناد تھا، خرابی تھی، عداوت تھی اور فتنہ وفساد تھا، انسان انسانیت سے محروم ہو چکے تھے اور جمہورِ عوام مذاقِ جمہوریت بھی کھو چکے تھے، اور عظمتِ انسانی بھی خودساختہ، بتوں کے سامنے پامال تھی، قوم تھی اور نہ قوم کا نظریۂ قومیت تھا، سرداری تھی اور سروری کے دعوے تھے مگر خدمت تھی نہ رہبری کے مداوے تھے، حال تھا نہ استقبال تھا، تہذیبِ حیات کے سارے سرچشمے بھی ریگزاروں میں خشک اور نایاب ہو چکے تھے، مرد و زن، پیر و جواں اور طفلک و دختران سب ایک ہی رسمِ گمراہی کے مختلف طریقوں سے شکار تھے، یہ تو تھی اس ملک کی اس وقت حالت جبکہ جس کے ریتیلے پہاڑوں کی اوٹ سے 'اسلام' کی آواز بلند ہوئی اور اس سے بھی خراب تھی حالت ان ممالک کی جو تہذیب و تمدن کے مدعی، اور علم و فن کے دعویدار تھے، قدامت کا فخر رکھتے تھے، شہامت پر ناز کرتے تھے، اور اپنے آپ کو قدیم تعلیمات مذاہب کا حامل تصوّر کرتے ہوئے شہنشاہیت کی آڑ میں بربریت، اور علم کے چراغ تلے اندھیر مچائے ہوئے تھے۔ جنھوں نے ظلم کا نام دولتمندی، لپستی کا نام اقبال مندی، جہالت کا نام حکمت برائیوں کا نام حقانیت، عداوت کا نام حق پروری اور غارت گری کا نام عدل گستری رکھ چھوڑا تھا، توہمات کو مذہب کہتے تھے، ترکِ دنیا پر اخلاق کو موقوف رکھتے تھے، اور گداگری کے عیب کو روح کی تہذیب سمجھتے تھے، ماں کا پاس تھا، نہ خدا کا سپاس تھا، خدا کے نام کو بھی ہزاروں گمراہیوں کے ناموں میں بھلا چکے تھے، اور طرح طرح کے انقلابات سے اپنے پیغمبروں کی تعلیمات کو بھی بدل ڈالا تھا، پھر افرادِ انسانی

(خصوصاً سماترا کے شمالی مغربی حصہ) میں تیرہویں صدی عیسوی میں داخل ہو چکا تھا بلکہ اس وقت اس جزیرہ میں اسلامی حکومتیں برسر اقتدار آ چکی تھیں جیساکہ خود "مارکوپولو" کے بیان سے ثابت ہے جو ۱۲۹۲ء میں اس جزیرہ سے ہو کر گذرا تھا، اور اس نے شمالی ساحل پر مسلمانوں کی بستیاں دیکھی تھیں اور ان کے امراء سے ملاقاتیں بھی کیں تھیں۔

---

کے احساس کو اس درجہ پست کر دیا تھا کہ ظالمانِ ملک اور خود غرضانِ تہذیب کے خلاف آواز اٹھانا بھی بدعت میں شامل تھا اور سچی بات کہنے کی سزا زندگی گنوانا تھی۔ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر قوم اور ہر مذہب کے شعائر کی یہی کیفیت تھی۔

قومیں تھیں، ملک تھے، دیر تھے، دیار تھے، مگر سب گمراہوں کے شکار تھے، بادشاہتیں قایم تھیں مگر ظلم اور نفس پروری کے لئے، تعلیمات رائج تھیں مگر اشاعتِ ظلمت کے لئے، وسائل تھے مگر اجارہ داریوں کے لئے عوامیت تھی مگر غربت و غلامی میں تڑپنے اور بلکنے کے لئے ہر مذہب ایک مقام اور ایک وقت کے لئے محدود تھا اس لئے اس میں دوسرے مقام اور وقت کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ لہذا ان مذاہب نے انسانوں کو انسانوں سے ملانے کے بجائے منتشر کر دیا تھا، امن و عافیت دینے کے بجائے لڑائیوں میں منہمک کر دیا تھا، اور تعصب کی مشتعل آگ سے خرمن اخلاق کو بھسم کر ڈالا تھا، انسانیت بلبلا اٹھی تھی، اور فطرت کا تقاضہ تھا کہ سچی اللہ کی ہدایت عالمگیر انسانیت کے لئے عالمگیر پیمانہ پر عالمگیر ظرف کے ساتھ شروع ہو تاکہ بھٹکے ہوئے منزل پر پہنچ جائیں اور گمراہ سیدھی راہ پر لگ جائیں، بھائی چارہ پیدا ہو، امن پھیلے اور عافیت ہو تاکہ تہذیب انسان کو پہنچنے کا سہارا مل جائے۔

## سرکارِ دوعالمؐ کی بعثت

چنانچہ قدرتِ خداوندی نے عرب کی سب سے زیادہ بگڑی ہوئی سرزمین میں آپ فتنہ آیات کو طلوع فرمایا یعنی سرکارِ دوعالم سید المرسلین خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

مگر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (صفحہ ۵۷۷ مطبوعہ ہالینڈ) میں ’جاوا میں اسلام‘ کے زیر عنوان روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے کہ جاوا میں سب سے پرانی اسلامی یادگار کے بطور ’سیرن‘، کے مقام پر فاطمہ بنت میمون کی قبر ہے جس پر تاریخی حیثیت سے سنہ ۴۹۵ھ مطابق سنہ ۱۱۰۱ء کا سال کندہ ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے قدم خواہ وہ کسی حیثیت سے بھی آئے ہوں چودہویں صدی سے بہت پہلے آچکے تھے۔ مگر چین کے

---

مبعوث کرکے اپنا بڑا احسان فرمایا۔ آپ تشریف لائے اور آپ نے اللہ کی سچی قرآنی تعلیم سے ایک شاندار تہذیب ایک پرامن تمدن، ایک بڑے کردار اور ایک اعلیٰ معیار کی اساس قایم کردی، صلح جوئی اور اساس الفت ومحبت سے رافت کے سلسلے پیدا کرکے معرفت اور نیکوئی کو رواج دیدیا۔ اور تھوڑے سے ہی زمانہ میں ’مکہ‘، کے ایک گروہ نے اللہ کی ہدایت (یعنی مذہب اسلام) کو قبول کرلیا اور اس طرح نیکوکاری اور عمدہ شعاری ترقی پانے لگے، ’’مکہ‘‘ کے بگڑے ہوئے لوگ اس زخم کی طرح جو تیز قسم کی نفع رساں دوا کے باعث تڑخ جاتا ہے، اک دم چونک پڑے اور خون بہانے پر آمادہ ہوگئے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے آپ پر بڑے بڑے ظلم کئے اور عرصۂ حیات تنگ کردیا۔ بالآخر آپ معہ اپنے مقدس صحابہ کے مکہ کو چھوڑکر مدینہ کو ہجرت فرماگئے اور وہاں پہنچکر باقاعدہ رشد وہدایت کا سرچشمہ جاری کردیا اسلام کی تاریخ میں یہ واقعہ ’ہجرت‘، کے نام سے مشہور ہے اسی واقعہ کی تاریخ سے اسلامی سال کا آغاز ہوتا ہے جسے سال ہجری کہتے ہیں۔

## ہجرت اور اسلام کا تمدن

ہجرت کے بعد ہی آپ نے اسلام کے صحیح اور حقیقی تمدن کی بنا ڈالی، لوگوں کو باقاعدہ بھائی چارہ اور اخوت کی تعلیم دی، ایک خدا کی عبادت سے انسانی عظمت کو بلند کردیا، پتھروں اور بتوں کے سامنے جھکنے سے منع فرماکر ساری کائنات کو شرافت نسبی کے ذات پات اور زمین کے فرق کو مٹادیا، خدا کا خوف دلوں میں بٹھاکر امن پھیلا دیا، حاکم ومحکوم، آقا و غلام، گدا و دولتمند سب کو ایک کردیا۔ اور ایک ہی قطار میں کھڑا کردیا، یہی دراصل،

ایک مسلمان سیاح کا بیان ہے (جو پندرہویں صدی کے آغاز میں جاوا پہنچا تھا) کہ ۱۴۱۶ء تک مقامی طور سے یہاں (جاوا میں) کوئی مسلمان آبادی نہ تھی. جو مسلمان اکّے دکّے آباد بھی تھے، وہ ساحلوں پر بستے تھے اور غیر ملکی تھے یعنی وہ یا تو مغرب کی طرف سے آئے تھے اور یا پھر چین سے یہاں پہنچے تھے، مغرب سے مراد سماترا یا ملکا کے علاقے ہیں (جن پر سلسلے وار آگے چل کر بحث کی گئی ہے) جہاں اسلام سب سے پہلے پہنچا تھا۔

---

"امن وامان، کی سب سے بڑی سعی ہو سکتی ہے۔ جس کے لیے سینکڑوں سال سے انسانیت متمنی اور بے قرار تھی۔ عبادت کے ذوق سے اخلاق کو بلند کیا اور اخلاق کی بلندی سے سوسائٹی کی تعمیر کر ڈالی یعنی ایسی سوسائٹی کی کہ جو ظلم کرنے سے ڈرتی تھی، بد دیانتی سے بھاگتی تھی، حق کو پہچانتی تھی، سچ پر جان دیتی تھی، بے باکی اس کا لر دار ہو گیا، اور ترقی اس کا شعار ہو گیا، یہ آداب سے واقف اور آئین کی پابند تھی، عبادت کے اوقات اور اصولِ عبادت کے طریقوں پر کاربند ہو جانے کے باعث یہ سوسائٹی انصرام وانتظام کی صلاحیت پر فائز ہوتی چلی گئی۔

## آنحضرتؐ کی وفات کے بعد

حتیٰ کہ پھر اس کی قوت کا یہ عالم ہو گیا کہ جب آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں اور آپ کی وفات کے بعد انسانیت کے دشمنوں نے اس کے چراغ کو گل کرنا چاہا تو وہ خود ہی بجھ کر رہ گئے، اسے مٹانا چاہا مگر وہ خود ہی مٹ کر رہ گئے، اسلام بڑھا، پھلا اور پھولا، اور سارے آس پاس کے ملکوں پر چھا گیا، دس سال کے مختصر سے عرصہ میں ظالم ظلم کرنا بھول گئے، گناہ گار خطا شعاری سے تائب ہو گئے، سرداروں نے سروری کا زعم چھوڑ دیا، اور دولتمند بھی غریبوں سے گلے مل گئے اس طرح وہ انسانی تمدن جو مختلف ممالک میں مختلف اقوام کی آغوش میں پلا تھا روحانی اور معاشرتی کمزوریوں کے باعث تاہنوز تشنۂ تکمیل تھا، اب عالمِ شباب میں قدم فرسا ہونے کے لائق ہو گیا اور اس کی تکمیل کی شاہراہیں اسلام کے باعث کھلتی چلی گئیں پھر آپ کے وہ ساتھی جنھیں صحابۂ صالحین اور خلفائے راشدین کہا جاتا ہے انہی تعلیمات پر کاربند ہو کر میدان

حالانکہ یہ علاقہ بدھوں کی تعلیمات اور بدھ سلطنتوں کا صدر مقام ہونے کے باعث بدھ تہذیب کا بڑا مرکز تھا، علوم بھی بدھوں کے اپنے رائج تھے، اہمسا یا تناسخ کی تعلیمات کے آثار بھی بڑی شد و مد کے ساتھ اس نواح میں پائے جاتے تھے۔ وسطی حصوں (یعنی منگ کباؤ) کے علاقوں میں مظاہر پرستی کا زور تھا اور لوگ خدا کے نام سے بھی آشنا نہ تھے، ایسے حالات میں اسلام کا اس نواح میں قدم جمانا اور پھر

---

یں آئے اور رفتہ رفتہ آدھی دنیا کے وارث بن گئے، اور اسلام خود بخود پھیلتا چلا گیا، یہ لوگ اسلامی تہذیب و تمدن کے ایسے سچے نمونے تھے کہ اسلام انکی روحانیت اور اپنی ذاتی صداقت کی اثر سے دور دراز تک جا پہنچا، چنانچہ مصر و شام، عراق و افریقہ، فلسطین اور ایران سب نے اسلام قبول کر لیا۔

## صوفیاء کا دور

ان خلفاء کے گذر جانے کے بعد جب خود غرض لوگوں نے دوبارہ بادشاہتیں قایم کر لیں تو تبلیغ اور اشاعت کا کام جو اسلام کے اعلیٰ نمونۂ زندگی کے اثر سے تعلق رکھتا تھا اک دم پھرک گیا اور خرابیاں پھر پھیلنے لگیں، چنانچہ خلفاء کے کام کو اور اسلام کے مقدس نام کو بلند رکھنے اور روشن کرنے کے لئے اسی نمونہ کے لوگ مصر و شام اور عراق و ایران سے اٹھنے لگے۔ یہ لوگ کمالاتِ ظاہری و باطنی کے لحاظ سے بے مثل اولیاء اللہ تھے اور

## مشرق میں اسلام کی اشاعت

ان کا مقصد محض انسانوں کی ہدایت تھا اسلام کی خدمت، علم کی سربلندی، خدا کے پیغام کو پھیلانے اور اسلامی تمدن کو عام کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ تھا،

لہذا یہ لوگ اپنے اوطان سے نکل کر دور دراز مقامات میں پہنچنے لگے تعلیم و تلقین یا کاروبار کی غرض سے، باقاعدہ وہاں رہنے لگے، اسلام کی تاریخ میں یہ لوگ صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ کہلاتے ہیں چنانچہ ہندوستان میں انہی لوگوں نے اسلام پھیلایا تھا، چین و تبت منچوریہ، منگولیا، ترکستان، اور افغانستان میں بھی اسلام انہی کے ذریعہ سے پہنچا تھا۔ خود انڈونیشیا میں جب اسلام ہندوستان سے پہنچا تو اس کا ذریعہ بھی یہی لوگ تھے۔ جن کی

خود ان علاقوں پر چھا جانا بعض مورخینِ یورپ کے نزدیک نہایت ہی حیرت انگیز ہے۔

**کرافورڈ کی رائے**

چنانچہ مشہور انگریز مورخ کرافورڈ اپنی کتاب میں (History of the Indian Archipelago) (جلد دوم صفحہ ۳۰۴ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء) اسی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس نواح میں اسلام کا پھیلنا تاریخ کا ایک بڑا عجیب اور مہتم بالشان واقعہ ہے"

---

تفصیلات متن پر درج ہیں۔

**سلسلے، طریقت یا تصوف**

ان کی تعلیمات کے بڑے بڑے سلسلے قایم تھے اور یہ سلسلے خود یا تو ان کے ناموں سے یا پھر ان کے مرشدوں کے ناموں سے معنون تھے، مثلاً شتاریہ، چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، جنیدیہ وغیرہ۔ ان لوگوں کی زندگی بڑی سادہ تھی، امور اسلام (یعنی شریعت) پر مشتمل تھی، خدمت خلق کرنا، تعلیم پھیلانا، عبادات کے ذریعہ روح کی تہذیب کرنا، نہ کسی کا کھانا اور نہ کسی سے لینا، بے غرض ہوکر، اخلاص کے ساتھ زندگی بسر کرنا اور اپنی محنت یا کاروبار سے معاشِ زندگی ڈھونڈنا تھا اور فرصت کے وقت اسلام کے اوصاف سے عوام کو روشناس کرانا، جو کرنا وہی کرنا اور ریج پر قایم رہنا وغیرہ ان کا اصل شعار تھا جسے ایک حدِ معنی تک طریقت کہتے ہیں۔ اسی طریقت کے اوصاف کا نام 'تصوف' ہے۔ اور اس تصوف پر عمل کرنے والے صوفی یا صوفیار کہلاتے ہیں۔

چنانچہ دیارِ مشرق میں اسلام انہی صوفیار کے ذریعہ سے پھیلا اور اسقدر تیزی کے ساتھ پھیلا کہ آج ایشیا کے بڑے بڑے ممالک اسلام کی بستیاں ہیں۔ اسلامی تہذیب، اسلامی رسم و رواج اور ثقافت و تمدن کے حامل ہیں، اور آج ان بزرگوں کی یادگاریں بڑی بڑی خانقاہوں کی صورت میں موجود ہیں اور ان ممالک کے آثارِ مقدسیہ کا ایک بڑا اور گرانقدر سرمایہ ہیں۔ اور فیضانِ روحانی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

پھر یہی مورخ آگے چل کر (صفحہ ۲۱۳ پر) اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"مذہبِ اسلام خود بخود پھیلا ہے، اس مذہب کا اس نواح میں پھیلنا ایسے وقت عمل میں آیا تھا کہ جب یہ یورپ (اسپین) سے خارج کیا جا رہا تھا۔ مگر اس نواح میں اس کی اشاعت کے سلسلہ میں اہلِ یورپ کو جو استعجاب لاحق ہوئی ہے۔

## اسلام کا اس نواح میں پھیلنا حیرت انگیز کیوں ہے؟

غالباً اس کے وجوہ یہ ہو سکتے ہیں۔ یعنی اول یہ کہ اسلام نے سب سے پہلے اس نواح میں اپنی عادت کے خلاف راجاؤں حکمرانوں، زمینداروں اور بڑے بڑے صاحبِ سطوت و ثروت لوگوں کو حلقہ بگوش کیا تھا حالانکہ خود عرب اور عرب کے بعد دیگر ممالکِ مشرقِ وسطیٰ میں اسلام سب سے پہلے غریبوں میں پھیلا تھا خود ہندوستان میں اس کے قبول کرنے والے پہلے لوگ طبقۂ غربار کے افراد تھے، دوسرے اسلام ان لوگوں کے ذریعہ سے پہنچا جو سوداگر تھے اور سوداگری میں ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ تاجر لوگ افسروں اور حاکموں سے خود متاثر و مرعوب رہتے ہیں چہ جائیکہ وہ انھیں اسقدر مرعوب کر دیں کہ وہ بالآخر انہی کے مذہب اور تمدن میں رنگ جائیں۔

ابن بطوطہ نے تو اپنے سفر نامہ میں اس سلسلہ میں آنے والے مبلغین کے کراماتِ روحانی کو بیان کیا ہے اور پھر انہی کرامات کو نفوذ اثر کا اصلی ذریعہ قرار دیا ہے جو فی الحقیقت ان کی عظیم خدمات کے نتائج سے خود ثابت ہے ایک زمانہ سے انڈونیشیا اس وقت ایک بڑے روحانی خلفشار میں مبتلا تھا، جس کی وجہ سے اخلاقی گراوٹ اور تمدنی کمزوریاں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ تمام معاشرہ خراب و خستہ ہو کر متسکرتب ہو گیا تھا۔ اور اس کا زیادہ تر اثر یا تو حکمرانوں پر تھا یا پھر ان کے

اعزاداقربا پر چھایا ہوا تھا یا پھر اس سے متاثرہ لوگ بھی تھے جو کاروبار اور سوداگری کا پیشہ کرتے تھے، ورنہ غریب طبقہ کے لوگ اپنے اصلی حال پر بلا ہندو تہذیب کے کثیر تاثر کے دیہاتوں میں بستے تھے، اور مجبوری اور فلاکت کی زندگی بسر کرتے تھے، حالانکہ اسلام میں یہ لوگ بھی بعد میں بڑی کثیر تعداد میں شامل ہوتے رہے ہیں۔

## اسلام کے داخلہ کے وقت یہاں کے عقائد اور معاشرہ کی عام حالت

تاریخ کے سیاسی نقطۂ نظر سے اس وقت (یعنی ۱۲۹۲ء[۵۱] کے بعد جبکہ سُمدرا پَسَائے یا سُماترا میں اسلام داخل ہو چکا تھا) جاوا کی آخری اور سب سے طاقتور ہندو سلطنت "مجاپائت"، برسرِ اقتدار آرہی تھی (اور یہ زمانہ جاوا میں اسلام کی اشاعتِ عام کی مدت سے سوا سو یا ڈیڑھ سو سال قبل کا دور رہے) اور ۱۳۴۰ء میں وزیرِ اعظم گجا مدہ کی ماتحتی میں عروج کی انتہائی بلندی پر جا پہنچی تھی کہ اک دم ۱۳۴۶ء میں وہ مر گیا اور اس کے بعد اس سلطنت کا بھی زوال شروع ہوگیا۔ یہ دور اس نواح کے ہندو تمدن کا سب سے شاندار دور خیال کیا جاتا ہے، چنانچہ اسلام کے تمدن کو بھی سب سے پہلے اس اطراف میں اسی تمدن سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس تمدن کی تفصیلات عہدِ مجاپائت کے باب میں بیان کی جا چکی ہیں، مگر پھر بھی ایک سرسری سا جائزہ اختصار کے ساتھ بطور ریویو، ذیل کی سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔

مورخین (جنھیں حالانکہ اب تک تمدن کے باب میں اس عہد کی بہت سی باتیں معلوم نہیں ہو سکی ہیں مگر پھر بھی مذہب، اور اس کے اثرات کے ساتھ ساتھ

---

۵۱ ہندوستان میں اس وقت خلجیوں کا زمانہ تھا۔

نتیجہ کے طور پر ڈھلنے والی سوسائٹی اور اس کے عام معاشرہ کا حال قصّوں، کہانیوں اور مذہبی حکایتوں کے ذریعہ سے ضرور پہنچ چکا ہے) نتیجہ کے طور پر کچھ بھی کہتے رہیں۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ سوسائٹی متناقص تھی، اصلاح طلب تھی، اخلاقیات، روحانیات اور معقولات ہر حیثیت سے کمزور تھی، " دور ترقی یافتہ تھا" کے کہنے سے مراد صرف حکومت کی وسعت، سیاسی دبدبہ، راجاؤں کا عروج اور مشیران سلطنت کی کرو فر لی جا سکتی ہے، عام معاشرہ پر اس کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حکومت کا طبقہ پورے ملک کی بڑی سوسائٹی کا ایک جزو ہوتا ہے اگرچہ ضروری اور اہم جزو ہوتا ہے مگر اس کو کل نہیں کہہ سکتے ۔"کل" میں خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی شامل ہوں گے، اور اس طرح پوری سوسائٹی، کے کہنے میں وہ سارے طبقات شمار کئے جائیں گے جن کا تعلق پوری آبادیٔ ملک سے ہوا کرتا ہے۔ لہذا جہاں تک آبادی کا تعلق ہے پوری سوسائٹی دو خاص طبقات میں منقسم تھی یعنی طبقاتِ خواص اور طبقاتِ عوام۔ اور پھر یہ دونوں طبقے بھی متعدد ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے، چنانچہ پہلے طبقہ میں حکمراں اور اس کے اہلِ قلم (جن میں عموماً برہمن وغیرہ مذہبی لوگ ہوتے تھے) شامل تھے جن کے ہاتھ میں سطوت و جلالت تھی، دولت و ثروت تھی، اقتدار تھا اور مذہب تھا، دوسرے طبقہ میں عوام تھے جو دو بڑی ذاتوں (ویشیا اور ستودر) کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ذاتوں میں کاروبار اور پیشوں کی مناسبت سے منقسم تھے (حالانکہ ان میں ہندوستان کے ہندوؤں کی طرح سینکڑوں اور ہزاروں ذاتیں نہ تھیں)۔

لہذا ذات پات کی تقسیم کے باعث امتیاز، فرق، اور احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کافی پیدا ہو گئے تھے چھوت چھات کے اثرات بھی آنا لازمی تھا،

لہذا وہ بھی آئے حتیٰ کہ عام طبقے کے لوگ حکمراں طبقے کے منادر اور خانقاہوں میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے کیونکہ برہمنوں اور راجاؤں کے علاوہ ایسے مقدس مقامات پر کسی اور طبقہ کے فرد کا آنا حرمت کے خلاف سمجھا جاتا تھا، راجاؤں کے سامنے عام جلوس کے وقت چلتے پھرتے آدمیوں کو سربسجود ہو جانا پڑتا تھا، (بلکہ ابن بطوطہ نے تو اپنے سفر کے حالات میں ایسے قصّے بھی لکھے ہیں جن سے بتوں کے سامنے انسانی قربانی کا بھی پتہ چلتا ہے) یہ امور سب جمہوری احساس کے بالکل خلاف ہیں، مگر جب عقائد ہی میں یہ چیزیں داخل ہوں تو پھر طبقاتِ جمہور کا کون شخص ان سے انکار کر سکتا ہے۔

ذات پات کے بندھن صرف اس ایک طبقہ کو تو خوش آیند ہو سکتے ہیں جو مذہب کا اجارہ دار ہو یا بادشاہت اپنے خاندان میں رکھنے کا حقدار ہو، ورنہ اور دیگر طبقہ کے لوگوں کے لئے تو یہ کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتے کیونکہ ان سے صلاحیت، اور ترقی کے جذبے دونوں پامال ہو جاتے ہیں، 'ملت' وجود میں نہیں آ سکتی، افتراق و انشقاق کے باعث خطرات کے موقعوں پر دفاعِ ملک کے لئے بھی سب ایک ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے اور اگر کھڑے بھی ہو جاتے ہیں تو اپنا مستقل مفاد نہ پا کر تن دہی سے حب الوطنی کے شایانِ شان خدمات نہیں کر سکتے، اور زیادہ عرصہ کے بعد پھر امن و عافیت کا نظام بھی درہم برہم ہوتا چلا جاتا ہے، جس سے بالآخر تمدن کو نقصان پہنچتا ہے (مجاپائت کے آخری دور میں ہائم وُرک راجہ کے مرنے کے بعد یہی تو ہوا تھا، اور پھر کم و بیش پچاس سال تک یہی تو ہوتا رہا تھا) اسلام کے داخلہ کے وقت بالفاظ مختصر معاشرہ کی یہی عام کیفیت تھی۔

چونکہ اس وقت کا مروجہ مذہب 'بت پرستی' پر مملو تھا، اور بت پرستی خود توہمات کی ماں ہے لہذا سیکڑوں اور ہزاروں قسم کے توہمات افراد کے دماغ پر مستولی تھے، تبخانوں میں بت ہمیشہ ایک نہیں ہوتا، بلکہ سیکڑوں اور پچاسیوں بت ہوا کرتے ہیں ۔ جن سے صنم پرستوں کی مراد دیبی دیوتاؤں کا حصول خوشنودی ہے لہذا وہ ہر بت کی پوجا کے سلسلہ میں ایک علیحدہ ہی سلسلۂ توہم رکھتے ہیں ۔ اور بتوں کی کثرتِ تعداد کے ساتھ ساتھ یہ توہمات بھی کثیر التعداد ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر ان توہمات کو پورا کرنے کے لئے مراسم یا طرق بھی کثیر التعداد ہوتے ہیں صنم پرست ہر وقت ان توہمات کے ماتحت اسی الجھن میں پڑا رہتا ہے کہ آیا اس کے دیوتا اس سے خوش ہوتے ہیں یا نہیں، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ اگر دیوتا ناراض ہو جائیں گے تو اس کو تھیس نہیس اور غارت و برباد کر دیں گے، چنانچہ وہ پتھروں، درختوں پہاڑوں، جانوروں، غرض کائنات خلق کی ہر چیز سے ڈرنے لگتا ہے، اور ان چیزوں کو بجائے اپنے لئے پیدا کی ہوئی سمجھنے کے وہ خود کو ان کے لئے پیدا کیا ہوا سمجھنے لگتا ہے، بھوت، پریت، اور آسیب کا قائل رہتا ہے، لہذا اس میں انسانی برتری، انسانی عظمت اور انسانی اقدار ختم ہو جاتی ہیں، اور رات و دن ان توہمات کی الجھنوں کے سبب طرح طرح کی رسموں میں مقید رہتا ہے ۔ چونکہ یہ رسمیں زیادہ پیچیدہ اور طول طویل ہوتی ہیں لہذا وہ انجام دلانے والے یعنی برہمنوں کا بھی بہت زیادہ ممنون رہتا ہے لامحالہ انکی عظمت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ انھیں الرفع و اعلیٰ تصور کرنے لگتا ہے، بلکہ انھیں دیبی دیوتاؤں کی اولاد گردانتا ہے، اور ان کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو

پورا کرنا فوزِ عظیم سمجھنے لگتا ہے اس طرح برہمن پوری سوسائٹی پر چھا جاتا ہے اسلام کے داخلہ کے وقت اس ملک کے معاشرہ کا بھی یہی حال تھا، بت پرستی چھائی ہوئی تھی، بات بات کی ایک رسم قایم تھی، توہمات کا زور تھا، برہمن سارے معاشرہ کے اجارہ دار تھے اور چونکہ وہ راجاؤں کے درباروں میں بھی بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے لہذا ان کا وقار بہت بلند تھا، ان کی بدعنوانیوں پر ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کرسکتا تھا۔ اس طرح اونچ نیچ کا تصور بھی عام معاشرہ میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔

بہرحال چونکہ ہندو مذہب کا زیادہ تر جاوا میں اثر تھا لہذا جاوا کے معاشرہ کی عام یہی کیفیت تھی، ورنہ بورنیو، سیلبس، نیوگنی، ہلماہیرہ، فلورس، سمبا، سمباوا، ترناتے، تدورے، سیرام، اور دیگر جزائر کے اندرونی حصوں میں جہاں لوگ قدیم تہذیب پر قایم تھے، مظاہر پرست تھے، ساحلوں پر (سری وجایا مجاپائت کی حکومتوں کے اثر سے) کہیں لوگ بدھ مذہب کے قائل تھے اور کہیں ہندو اور بدھ دونوں کے ملے جلے عقائد رکھتے تھے اور چونکہ یہ ہندو اور بدھ مذہب میں آجانے والے بھی پہلے مظاہر پرست رہ چکے تھے لہذا ان میں مظاہر پرستی کے اثرات بھی پائے جاتے تھے، مثلاً عناصرِ اربعہ آب، آگ، خاک اور باد کی برتری اور ان کے دیوتاؤں کی عظمت موجود تھی۔

سماترا (جہاں اسلام سب سے پہلے پہنچا) بمعہ آس پاس کے جزائر اور جزیرہ نما ملایا کے بدھ تہذیب اور بدھ عقائد کا حامل تھا مگر وسطی حصوں میں مظاہر پرست رہتے تھے شمالی حصہ میں ہندو مذہب کے اثرات تھے جہاں اسلام نے

سب سے پہلے قبولیت حاصل کی اس قبولیت کے اسباب ذیل میں ملاحظہ ہوں، اشاعت اور تبلیغ کے قرینوں کو بعد میں بیان کیا جائے گا۔

## اسلام کی مقبولیت کے عام اسباب

مذہب اسلام اپنی تعلیمات کے اعتبار سے نہایت سادہ اور سلیس ہے، ایک خدا کی عبادت، ایک رسول کی اتباع اور ایک آسمانی کتاب (قرآن) کی عام تعلیم کے سبب بیجا رسومات کی پیچیدگیوں سے پاک ہے' اس کی عبادت کے طریقے بھی دلنشین ہیں اور صحیح روحانیت کے خلاق ہیں، اور معاشرہ کی عام اصلاح کا بھی بڑا ذریعہ تھے۔

اسلام کی پیش کردہ سوسائٹی میں چھوٹے بڑے، امیر و کبیر، شریف و رذیل اور حاکم و محکوم کا کوئی تمیز نہ تھا، درجہ کے اعتبار سے سب برابر تھے، ذات پات کی قید نہ تھی، حکمراں یا سردار خدمت گذاری سے معزز مانا جاتا تھا۔

عمل صالح یعنی اخلاق اور عبادت، جس سے صحیح انسانی کردار مرتب ہوتا ہے اور معاشرہ بھی درست ہو جاتا ہے اسلام کی تعلیم کا اصل الاصول ہے، جس کے نتیجہ کے طور پر تنظیم، اتحاد اور یقین محکم خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔

اسلام محدود قومیت اور محدود زمانہ کے قیود سے پاک ہے، اس کی ترتیب دی ہوئی برادری، تمام ہم مذہب مسلمانوں کی ایک اور عالمگیر برادری پر مشتمل ہے سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، یہی وہ نظریہ تھا کہ جس کے سبب یہاں کے عوام جوق در جوق، اسلام کے اثر میں آئے۔ اسلام کے اس روحانی نظام کی تعریف کرتے ہوئے دنیا کے تہذیب و تمدن کا ایک فرنگی

ماہر جان ایس ہالینڈ بھی لکھتا ہے کہ:[۵۱] -

"مسلمانوں نے اسلام کے ماننے والوں کی صفوں میں حقیقی اخوت و مساوات قایم کرنے میں عیسائیوں سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی ہے، چین سے لے کر، مراکو تک مسلمانوں کا برادرانہ احساس خواہ ان کی نسل، یا رنگ، زبان یا قومیت، یا ذات یا پیشہ کچھ بھی ہے۔ انسانیت کے لئے ایک اعلیٰ روحانی تصور پر مبنی عالمگیر برادری کے حصول کے لئے بہت ہی اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسلام جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ تمام مسلمانوں کی عالمگیر برادری کا عقیدہ لے جاتا ہے۔"

مگر اندونیشیا کے حکمرانوں میں اسکی قبولیت کا سبب اپنی سچائی کے علاوہ ان صوفیا کبار کا بلند شخصی کردار ہے جو روحانی اور معاشری ہر حیثیت سے نہایت ممتاز تھے، انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے اس نواح میں سب سے پہلے وارد ہوئے تھے، چنانچہ سماٹرا میں سب سے پہلے حکمراں خاندان ہی آغوش اسلام میں آیا تھا۔ ان کے اتباع میں ان کے اور درباری، رؤسا اور امرا بھی حلقۂ اسلامی میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد تو اسلام پھر اس تیزی کے ساتھ پھیلا کہ بقول جان ایس ہائی لینڈ[۵۲] "کوئی مذہب بھی اس کی ٹکر کو جھیل نہ سکا۔"

اس نواح میں اس کی تبلیغ کس طرح ہوئی اور یہ پہنچا کس طریقہ سے اب ذیل میں ملاحظہ ہو۔

---

[۵۱، ۵۲] جان ایس۔ ہائی لینڈ (پروفیسر کیمبرج) نے اپنی کتاب "مختصر تاریخ تمدن" ترجمہ انجمن ترقی اُردو ہند صفحہ ۵۵-۵۶ مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۴۲ء) میں اسلام کی عام اشاعت کو بیان کرتے ہوئے اس جملہ کو اس طرح سے لکھا ہے۔

"اسلام جس ملک میں بھی پہنچا آگ کی طرح پھیلتا چلا گیا، اور کوئی بڑے سے بڑا مذہب بھی اس کی ٹکر کو نہ جھیل سکا۔

# باب دوم

## مذہبِ اسلام کی اشاعت

اور

## اسلام کی ابتدائی سلطنتیں

### اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلایا گیا

اس سلسلہ میں واقعات اور حقایق پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اس نواح (اندونیشیا) میں اسلام ہرگز تلوار کے زور سے نہیں پھیلا اور نہ

### ایک عام غلط فہمی کا ازالہ

یہ ذیلی عنوان اس مقام پر خصوصیت کے ساتھ محض اس لئے تراش نے کی زحمت گوارا کی گئی ہے کہ اکثر غیر اسلامی ممالک کے غیر منصف، تنگ نظر اور مجہول العلم مورخین نے 'تہذیب و تمدن' پر قلم اٹھاتے ہوئے دنیا میں اسلام کی عام اشاعت کے سلسلہ میں اپنی غلط بیانی اور افترا پردازی کے ذریعہ سے یہ غلط فہمی عام کرنے کی کوشش کی ہے کہ "اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے" ان کے اس لفظ "دنیا" میں سارے ہی ملک شامل ہیں۔ اندونیشیا بھی دنیا کا ایک حصہ ہے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ کوئی ناواقف 'دنیا' کے اس لفظ سے بہک کر کسی غلط فہمی کا شکار ہوجائے اور اندونیشیا کی اشاعت اسلام کے سلسلہ میں بھی اس قسم کا شک گذارنے لگے حالانکہ معترضین اور مخالفین کا جواب دیتے ہوئے یورپ کے خود ایک مورخ کارلائل نے

کسی ملک کی اسلامی فوج اور فوجی مشن تاریخ کے کسی دور میں اسلام پھیلانے یا اس ملک (اندونیشیا) کو فتح کرنے کے عزم سے آیا۔ اور نہ خود کبھی اس ملک کے لوگوں نے اسلام کے حلقۂ اثر میں آجانے کے بعد محض اسلام کو پھیلانے کی غرض سے تلوار ہاتھ میں اٹھائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بڑے بڑے راجہ مسلمان ہوئے اور سلطان کہلائے، انھوں نے بھر لڑائیاں بھی لڑیں۔ اور خونریزیوں کا بھی مقابلہ کیا مگر ان لڑائیوں اور خونریزیوں سے

---

(جو حالانکہ اسلام کا دوست نہ تھا اور نہ غیر انحرافی طریقہ پر قلم اٹھانے والا شخص تھا) اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔" اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو پھر یہ سمجھنا بھی محال ہو جاتا ہے کہ آخر ان اسلام پھیلانے والے پہلے مسلمانوں کو کس تلوار کے زور سے اسلام کا ارادتمند کیا گیا تھا۔"

## اندونیشیا کے آغازِ اسلام کے وقت دنیائے اسلام کا پھیلاؤ اور اس کی سیاسی کیفیت

جیسا کہ آگے کے اوراق میں بیان کیا گیا ہے اندونیشیا میں اسلام کا آغاز "جزیرۂ سماترا" (جسے اسلام سے پہلے اندلاس بھی کہتے تھے) میں بہ لحاظ سن عیسوی تیرہویں صدی کے اوسط سے ہوتا ہے، اس وقت تاریخ کے اعتبار سے دنیائے اسلام میں عرب، یمن، شام، فلسطین، عراق، مصر، سوڈان، شمالی افریقہ، ایران، افغانستان، ترکی، (روسی یا چینی) ترکستان، چین، تبت اور ہندوستان کے ممالک شامل تھے۔ یعنی ان ممالک میں اسلام ایک مسلّم مذہب کی حیثیت سے خواص و عوام میں برسرِ عمل تھا، اور مقتدر سیاسی کی حیثیت سے اس مذہب کے ماننے والے چند خاص سلطنتوں کے حکمراں تھے، مثلاً ممالکِ عرب میں مصر اور افریقہ کے اکثر حصّوں میں بنی فاطمیوں کی حکومت تھی جو اَب کمزور ہو چکی تھی اور اس کے پورے رقبہ میں انتشار پھیلا ہوا تھا، عراق (بغداد) میں خلافتِ عباسیہ کا آخری اور ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل ہونے کے قریب تھا جس کی قلمرو میں عرب، شام، فلسطین، یمن، عراقِ عجم وغیرہ

تمامتر غرض محض ان کے اپنے یا تو سیاسی مصالح تھے یا پھر غیر اسلامی مخالف عناصر کی امن سوز، عافیت برید اور تباہ کن بغاوتیں تھیں جو سلاطینِ اسلام کیخلاف دفاعِ مذہب کے نام سے عوام کو منظم کر کے اٹھائی جاتی تھیں اور بدامنی پیدا کی جاتی تھی، ایسی بغاوتوں کو دبانا اور کچلنا ہر مہذب اور امن پسند حکومت کا فرض اوّلیں ہوتا ہے، یہ ایک امر اتفاقیہ ہے کہ ان بغاوتوں میں مسلمانوں کے فریق مقابل ہنود تھے، اگر ہنود کے علاوہ کوئی اور لوگ بھی ہوتے تو بھی مسلمان حکومتوں کا ردّعمل یہی ہوتا، لہٰذا کرافورڈ، رفلس خراف اور خوجے وغیرہ مورخین نے سرسری طور پر نظر ڈالتے ہوئے ان امور کو الزام کی شکل میں لکھا ہے اور مسلم اندونیشیا کے سلاطین الاولین (مثلاً چرمیون اور ریپائے وغیرہ) کو غیر مسلم حکومتوں کا ختم کرنے والا اور انھیں اسلام لانے پر مجبور کرنے والا قرار دیا ہے جو صریحاً ایک ناانصافی پر مبنی ہے اور کذب و افترا اور بہتان سے زیادہ کوئی

---

علاقے شامل رہ چکے تھے اور اب سب طوائف الملوکی میں مبتلا تھے) ایران (جس میں افغانستان قفقاز اور دیگر بلادِ ایشیائے وسط شامل تھے) مختلف خاندانوں کی سلطنتوں کے اٹھان اور عروج و زوال کا مرکز تھا، ' اسپین ' میں مسلمان اپنی پچھلی روایات کو کھو کر انحطاط کے آخری مقام پر جا پہنچے تھے، اور نصرانی حکومتیں انھیں مارنے اور ختم کرنے کے مشورے کر رہی تھیں، اور ہندوستان میں غلام خاندان ختم ہو کر خلجیوں (یعنی سلطان جلال الدین) کے زیر نگیں آچکا تھا مگر امراء اور رؤسا کی سازشوں کے سبب مبتلائے خلفشار رہتا، البتہ ترک فتوحات کر رہے تھے مگر وہ دشمن کے ساتھ ایسے الجھے ہوئے تھے کہ انھیں خود سر کھجانے کی مہلت نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ ایسے نازک اور خطرناک سیاسی حالات میں کون شخص اپنی فوجیں اس اطراف میں بھیجتا (پھر وہ بھی اسلام پھیلانے کے ذوق سے جو حالانکہ بادشاہوں کی خودغرض اور دنیا طلب طبیعتوں میں کبھی نہیں رہا) اور صرف اسلام ہی پھیلانے کا کام کرتا۔

اور حقیقت نہیں رکھتا، ورنہ دراصل حقیقت یہ ہے کہ ان حکمرانوں (سلاطین الاولین) کو خود ان صوفیا ر نے حلقۂ اسلامی میں شامل کیا تھا جو سوداگر بھی تھے اور معلم اسلامی بھی تھے، پھر عوام بھی آگے چل کر انہی صوفیار کی برکتوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

**تبلیغ اسلام کی پہلی مہم**

تبلیغ اسلام کی سب سے پہلی مہم بھی مغرب کے کسی ملک سے یہی سوداگر[۱] اپنے ساتھ لے کر اندونیشیا

**اس[۱] وقت کے تجارتی مراکز**

اس وقت کے سوداگری اور تجارت کے بڑے مرکز نوسنتارا، یا سورنادیپا، یا اندلاس میں (جو اندونیشیا، جاوا اور سماترا کے پرانے نام ہیں) خاص طور پر شمالی مغربی اور مشرقی ساحلوں پر واقع تھے، جاوا کے ساحلوں پر گرِ یسیک، طوبان امپل اور جپارا، سماترا کے ساحلوں پر سُمُدرا پسائے، بِلِیم بَنگ تھے، اور چونکہ سُماترا مغرب کی طرف سے آنے والے سوداگروں کو ملایا سے بھی زیادہ قریب مقام پڑتا تھا لہذا وہ اسی کے شمالی مغربی ساحل پر (جس پر پسائے اور آچیہ وغیرہ واقع ہیں) قایم کراتے تھے، چنانچہ اس علاقہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

**سیاسی حیثیت**

شاید اس امر کی وضاحت مجاپائت کے آخری دور کے سلسلہ میں کردی گئی ہے مگر اسکا اختصار یہ ہے کہ جاوا میں مجاپائت عروج پر تھی، مگر پھر رفتہ رفتہ زوال میں آکر مختلف ریاستوں میں منقسم ہوگئی تھی، سُماترا کے اسلام کے سو سال بعد تک جاوا میں اسلام نہ پہنچا، بورنیو، سیلبس اور دیگر جزائر میں بھی آزاد ریاستیں قایم تھیں، خود سماترا میں 'پسائے'، (جس کے بعد کا نام سَمُدر پَسائے ہے) مجاپائت کے ماتحت ایک ریاست کا مرکز تھا۔

**سُمُدرا کا قصہ**

پچھلے اوراق میں کئی بار گذر چکا ہے کہ ہندو تہذیب کے زمانۂ عروج میں اور اس سے پہلے قبل از تاریخ کے عہد میں جزیرۂ سُماترا، "اَندَلاس"، کہلاتا تھا۔ اسی اَندَلاس کے شمالی مغربی حصہ میں ایک مقام کا نام "پَسائے"، تھا

میں آئے تھے،

"آرنلڈ (مصنف کتاب" (Preaching of Islam) کی رائے ہے کہ ان تبلیغی مہم پر آنے والوں میں سب سے پہلے شخص" حضرت مولینا برہان الدینؒ" تھے جنھوں نے "سُمُدرا" کے بندرگاہ پر قیام کرکے اپنی تجارت کا آغاز کیا تھا، آپ کہاں کے رہنے والے تھے، متعدد روایتوں کے مشہور ہوجانے کے باعث آجتک، معلوم

---

(جس کو وہاں کے لوگ اَب بھی بقول ماہرین لسانیات "پ" سے "تلفظ کرتے ہیں) یہ قصبہ عہد مجاپائٹ کے زمانہ عروج میں دریائے "پسائے" کے کنارے واقع تھا اور مجاپائت کی ایک ماتحت ریاست پسائے، کا صدر مقام تھا، سجارا ملایو (بزبان ملایا) کے حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بار کا ذکر ہے کہ اس ریاست کا ایک شہزادہ (جس کا نام اس کتاب میں درج نہیں کیا گیا) سیر وشکار کے لئے پسائے سے نکل کر قریب کے ایک دیہاتی مقام پر پہنچا۔ جنگل تھا۔ دریا بہہ رہا تھا، یہ وہیں ٹھہر گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک چیونٹی جو قد وقامت اور جسامت میں "بلی" کے برابر ہے وہاں سے گذر رہی ہے، دیکھکر حیران رہ گیا، لوگوں سے اس جانور کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے سُمُدرا (یعنی چیونٹی) کہتے ہیں۔ لہذا اس شہزادہ نے اس مقام کا نام بھی اس جانور کے نام کی مناسبت سے "سمدرا کر دیا، جب یہ برسر اقتدار آیا تو اس نے اپنا دارالحکومت پسائے سے ہٹاکر "سمدرا" میں منتقل کر دیا اور اس گاؤں کا نام "سمدرا پسائے" رکھ دیا جو بعد میں بہت عرصہ تک سلطنت کے نام پر چلتا رہا۔ علاقہ کا نام آچیہ تھا، لہذا پھر سلطنت کا جب عروج ہوا تو شہر بھی آچیہ کر دیا گیا۔

## سُمُدرا سے سُماترا

چنانچہ اسی سجارا ملایو، میں لکھا ہے کہ ۱۳۴۵ء میں جب مشہور مراقشی عرب سیاح "ابن بطوطہ" چین کی سیاحت کو جاتے ہوئے اس نواح سے گذرا تو اس نے اس کا نام "سمدرا" سے "سماترا" کہا اور یہی نام اپنی تحریروں میں بھی لکھا لہذا جب ہی سے "سمدرا"، "سماترا" کہلانے لگا اور رفتہ رفتہ جب اس (سمدرا کی)

نہ ہوسکا، "آرنلڈ" نے آپ کو غالباً اس لئے کہ آپ شافعی المذہب تھے اور سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے عرب (عراقی) قرار دیا ہے کیونکہ شافعی[۵۱] فقہ اور سلسلہ قادریہ[۵۲] کا بڑا مرکز عراقِ عرب کا خاص شہر "بغداد" رہا ہے مگر کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ آپ ہندوستان سے آئے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہندوستان ہی سے تجارت کا

---

سلطنت نے زیادہ عروج کیا تو پھر پورے جزیرہ کا نام "سماترا" ہوگیا، اور سلطنت "آچیہ" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

**شافعی فقہ[۵۱]** مسلمانوں کے سنی فرقہ میں فقہ (یعنی قانون شریعت) کے چار اسکول مانے گئے ہیں، ایک مالکیہ (جو امام مالکؒ سے نکلا) دوسرا حنفیہ (حضرت امام ابو حنیفہ سے قایم کیا تیسرا شافعی (امام شافعیؒ) اور چوتھا حنبلی (امام احمد حنبل کا) اندونیشیا کے تمام مسلمان فرقہ سنیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور امام شافعی کی فقہ پر عمل کرتے ہیں "امام شافعی" مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا پورا نام "محمد ابن ادریس الشافعی" تھا غازا یا اصقلون کے مقام پر خاندان قریش میں ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے، "بنی ہذیل" میں عربی کی تکمیل کی بیس سال کی عمر میں مدینہ منورہ پہنچکر حضرت امام مالکؒ سے فقہ، تفسیر وغیرہ کے علوم حاصل کئے ۱۷۹ھ میں (یعنی نو سال کے بعد) ان کے وفات پا جانے کے آپ بغداد آئے اور حضرت امام ابو حنیفہ سے بھی استفادہ کیا پھر مصر چلے گئے اور قاہرہ میں مقیم رہے اپنے وقت کے بہت بڑے امام تھے، وہیں آپ نے ۲۰۴ھ مطابق ۸۲۰ء انتقال فرمایا آپ کا اصول فقہ شافعی کہلاتا ہے۔

**سلسلہ قادریہ[۵۲]** "تصوفِ اسلام" کی تاریخ میں یہ نہایت ہی تبلیغی اور اصلاحی سلسلہ مانا گیا ہے، اس سلسلہ کے لوگ ہی قادری کہلاتے ہیں۔ اس سلسلہ کے بانی حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ المعروف بہ غوث الاعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ کا دور خاندانِ بنی عباس کے عہدِ حکومت میں گذرا ہے جبکہ تمدنِ اسلام خود غرض بادشاہوں کی

زیادہ سلسلہ قایم تھا، اہلِ فارس کا آنا "ابنِ بطوطہ" [۱] کے سفر یعنی ۱۳۴۶ء کے بعد سے ثابت ہوتا ہے۔ گجرات اور ملابار سے مسلمان سوداگر کثرت کے ساتھ دیارِ مشرق کو جاتے تھے اور گرم مصالحہ کی تجارت کرتے تھے۔ مذہباً یہ لوگ بھی شافعی اور قادری ہوتے تھے جیساکہ آج بھی گجرات میں میمن اور ملابار میں موپلا مسلمانوں کے عقاید سے

---

نفس پروریوں کے سبب بہت ہی زیادہ نظر انداز کر دیا گیا تھا، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے عام مسلمانوں میں بڑی ابتری پھیل گئی تھی۔ چنانچہ آپ نے اسلامی تصوف کے ذریعہ سے عوام وخواص حتیٰ کہ امراء اور بادشاہ سب کی اصلاح فرمائی۔ آپؒ کا یہ سلسلہ نام کی مناسبت سے قادریہ کے نام سے مشہور رہوا۔ آپؒ ایران کے شہر "ہمدان" کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں گیلان یا جیلان کے باشندہ تھے، بغداد کی مشہور نظامیہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اور ۵۵۹ھ میں بمقام بغداد وفات پائی وہیں آپ کا روضہ پاک ہے۔ اسلام کی غیر معمولی اشاعت آپؒ کا اور آپؒ کے مریدوں کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ آپ بھی انسانیت کے بڑے محسن ہیں۔

**[۱] ابنِ بطوطہ** یاد رہے کہ ابن بطوطہ پہلے ہندوستان آیا تھا اور ۱۳۳۲ء میں ہندوستانی شہنشاہ سلطان محمد تغلق کے دربار میں تھا، پھر گجرات بھی آیا تھا جیساکہ اس نے گجراتی عورت، کے حسن اور نزاکت پر باقاعدہ تفصیلات لکھی ہیں، غالباً وہ چینی جانے والے سوداگروں سے "سَمُدْرا (سُماترا) کا حال سنکر سفر پر روانہ ہوا ہوگا۔ (اس کے مختصر حالات یہ ہیں:- یہ مراقش کا رہنے والا تھا۔ اس کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ تھا۔ ۱۳۰۴ء میں ایک چھوٹے سے گاؤں طنجہ میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کرنے کے بعد ۲۲ سال کی عمر میں حج کو گیا، حج سے لوٹنے کے بعد ہی سے اسے سیر و سیاحت کا شوق ہوا، چنانچہ وہ آس پاس کے تمام عربی ممالک ہوتا ہوا ہندوستان آیا، اور پھر یہیں سے اندونیشیا (سمدرا) پہنچا اور وہاں سے ۱۳۴۵ء میں چین گیا۔ ۱۳۴۶ء میں واپسی پر پھر سمدرا کے سلطان کے ہاں مقیم ہوا اور وہاں کے حالات دریافت کئے۔ اور پھر وطن کو لوٹ گیا)۔

پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک ولندیزی مورخ ایم۔ جے۔ ڈی خوئیجے[1] (آچیہ، کے اسلام پر ہندوستانی اسلام کا اثر بتلاتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

محرم میں ہندوستانی مسلمانوں کی طرح باقاعدہ پٹے بازی کرتے ہیں، شہادتِ حسینؑ (علیہ السلام) کا ذکر سنتے ہیں، ان میں قوالیاں بھی ہوتی ہیں، وغیرہ اور یہی رواج ہندوستانی اسلام کے تمدن میں بھی ملتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک ولندیزی مورخ[2] کی بھی رائے یہ ہے کہ اس نواح (جاوا سماترا) میں جو قدیم قبریں ملتی ہیں ان کے لوحِ بالین کے کتبوں کا رنگ ڈھنگ اور عربی خط کی تحریر کا انداز بھی ہندوستان (خصوصاً گجرات یعنی احمد آباد وغیرہ) کے قدیم مقبروں کی لوحِ بالین کی تحریر سے بہت زیادہ مماثل ہے (چنانچہ ایک قدیم جاوائی قبر کی لوح بالین کا نمونہ میں نے بھی حکومتِ اندونیشیا کے اس سفارتخانہ کراچی کے توسط سے حاصل کر کے اس کتاب میں شامل کیا ہے کسی صفحہ پر ملاحظہ ہو۔ "قادری")

لہٰذا اب یہ مسلّم ہو جاتا ہے کہ اسلام اندونیشیا (سماترا) میں ہندوستان سے پہنچا، اس کے پہلے مبلغ خواہ بقول آرنلڈ حضرت برہان الدینؒ ہیں، وہ عرب نہ تھے، ہندوستان کے مسلمان تھے، یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے اجداد عرب ہوں اور وہ مدتوں

---

[1] ولندیزی مورخ (M. J. de Goeje) کا مقالہ (Atch) جو De Nederl (Spectator) کی ۱۸۷۳ء کے جلد کے صفحہ ۳۰۸ پر شائع ہوا تھا۔

[2] اتفاق سے حوالہ لیتے وقت اس ولندیزی مورخ کا نام نقل کرنے سے رہ گیا۔ بہرحال یہ حوالہ اس کی ایک مختصر سی ولندیزی زبان میں لکھی ہوئی کتاب "Islam de Indonesia" سے مسٹر سوماریو کی اعانت سے ترجمہ کر کے نقل کیا گیا ہے۔

سے ہندوستان ہی میں رہتے ہوں۔ لیکن ان بزرگ کے سُماترا میں وارد ہونے کے سن وسال کا کچھ پتہ نہیں چلتا، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ ۱۲۹۲ء سے پہلے کسی وقت سُمدُرا پسائے (سُماترا) میں وارد ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ سن مشہور یورپی سیاح 'مارکوپولو' کی اس نواح میں سیاحت کا بھی سال ہے وہ 'پسائے' کے علاقہ سے گذرا تھا اور اس نے وہاں مسلمان کافی تعداد میں رہتے ہوئے اور کاروبار کرتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کی رائے میں یہ لوگ بہت متمول اور خوشحال تھے، اور حکمراں بھی مسلمان تھا۔ اور "سلطان ملک الصالح" کے نام سے مشہور تھا۔

**پہلا مسلمان حکمراں** اندونیشیا کی تاریخ میں یہ سب سے پہلا مسلمان حکمراں گذرا ہے۔ سنوسی پانے (اندونیشی مورّخ) کا خیال ہے کہ اس سلطان کا مقبرہ بھی سب سے پہلا اسلامی مقبرہ ہے اور (آچیہ میں) "سُمدُرا پسائے" کے مقام پر واقع ہے چنانچہ یہ سلطان اسلام میں جس واقعہ سے متاثر ہوکر داخل ہوا اس کا اختصارہ بحوالہ ابن بطوطہ ذیل کے نوٹ میں حاشیہ پر ملاحظہ ہو۔

---

**مشرف بہ اسلام ہونے کا واقعہ** ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ وہ چونکہ اسی سلطنت کے چوتھے جانشین سلطان زین العابدین سے ملا تھا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ سلطان نے یا اس کے کسی درباری نے اس سے یہ واقعہ بیان کیا ہو، بہرحال یہ ایک نہایت ہی مستند واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب میں ابن بطوطہ سے اختصار کے طور پر نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ یہاں کے اسلام لانے والے پہلے حکمراں سے متعلق ہے اور پہلا مسلمان حکمراں ملک الصالح ہے جس کا حال اوپر متن پر گزر چکا ہے۔ جو سری وجایا کے قدیم حکمرانوں کی نسل سے تھا۔

## سلطنتِ سمدرا پسائے

"ملک الصالح" اس ملک کی اسلامی تاریخ میں یہی سب سے پہلا مسلمان حکمران گذرا ہے اور اسکی سلطنت "سمدرا پسائے" بھی اسی مناسبت سے سب سے پہلی مسلمان سلطنت خیال کی جاتی ہے (جو اگرچہ سنہ ۱۳۵۰ء تک مجاپائٹ کے ماتحت تھی اور خراج ولگان ادا کرتی تھی، مگر اندرونی معاملات میں آزاد تھی اور خود مختار تھی۔ اور رعایا بھی بادشاہ کے عدل و انصاف کے سبب خوشحال تھی۔

اس سلطان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا "سلطان محمد" کے نام سے جانشین ہوا جو حکمراں ہو جانے کے بعد "ملک الظاہر" کے لقب سے مشہور ہوا، یہی وہ سب سے

یہ واقعہ اس وجہ سے بھی زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے کہ اس کا واقعہ نگار ابن بطوطہ خود ان لوگوں سے ملا ہے جنکے قریبی بزرگوں کے ساتھ یہ پیش آیا تھا پھر اسلام پہنچنے سے پہلے اس ملک کے عقاید میں بھوت، پریت، آسیب اور دیوی دیوتاؤں کی عظمت بھی عام تھی۔

**واقعہ** "کہتے ہیں کہ ملک کے بڑے مندر میں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایک زبردست آسیب آتا تھا، اور ملک والوں کو کافی صدمہ پہنچا تھا بالآخر پوجاریوں کے مشورہ سے یہ طے کیا گیا کہ ہر ماہ ایک حسین دوشیزہ اہلِ شہر میں سے اس کی نذر کی جایا کرے گی۔ چنانچہ یہ مقرر ہو گیا کہ اہلِ ملک کے تمام خاندانوں میں سے ایک خوبصورت ناکتخدا لڑکی باری باری سے لباسِ پرتکلف پہنا کر شاہی اہتمام کے ساتھ اس آسیب کی بھینٹ کے لئے مندر میں پہنچا دیا کرے گی۔ اس پر عمل شروع ہوا اور مدتوں چلتا رہا، ہزاروں لڑکیاں اس طرح اس آسیب کے بھینٹ چڑھ کر نذر اجل ہو گئیں دستور یہ تھا کہ جس کی باری ہوتی، سرکاری ہرکارے مقررہ خاندان کے گھر پہنچ جاتے اور لڑکی کو عمدہ لباسِ عروس پہنا کر اچھے اچھے کھانوں اور زیورات کے ساتھ رات کے وقت مندر میں لے آتے اور مورتی کے سامنے مع کھانے پینے کے سامان کے تنہا بٹھا کر مندر کے دروازہ کو بند کر کے چلے جاتے، آسیب آتا اور اس کو برتتا، یہاں تک کہ وہ غریب لڑکی اس کی تاب نہ لاکر جان دے دیتی صبح کے وقت ہرکارے آتے اور اس کی نعش اٹھا کر لیجاتے، اس نعش کا بڑا احترام کیا جاتا تھا"

پہلا حکمران ہے جس نے درویشانہ اندازِ زندگی اختیار کر لیا تھا اور اسلام کی تمام اصطلاحات کو بھی اپنے امورِ سلطنت کے لئے وضع کر لیا تھا اس کا وزیر اعلیٰ 'امیر' کہلاتا تھا امورِ مذہبی کے افسرِ اعلیٰ کو 'مولینا' کہتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔

اس سلطان کے بعد اس کے جتنے بھی جانشین ہوئے وہ سب ملک الطاہر ہی کے لقب سے نمبر وار مشہور رہے۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد ۱۳۲۶ء میں جب اس کا لڑکا سلطان احمد "ملک الطاہر دوم" کے لقب کے ساتھ سریر آرا ہوا تو اسلام نے بڑی ترقی کی۔ علوم فنون، نے بھی کافی فروغ پایا، بڑے بڑے اسلامی

---

اس کے والدین بھی خوشی مناتے کہ ان کی لڑکی نے اپنی جان دے کر آسیب سے اہلِ شہر کو محفوظ رکھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ اس زمانہ میں چند سوداگروں کا ایک جہاز ساحل پر آنے کے لئے قریب کے سمندر میں پہنچا ابھی بندرگاہ دور تھا کہ ایک دم طوفان آیا اور جہاز ٹوٹ کر پاش پاش ہوگیا تمام اہلِ سفینہ ڈوب گئے، صرف ایک نوجوان بچا سو وہ ایک تختہ کے سہارے موجوں کے ساتھ ساحل پر آلگا۔ ماہیگیروں نے اسے باہر نکالا اور کھلایا پلایا اور جنگل کی راہ دکھاکر گاؤں کی طرف کر دیا، چلتے چلتے یہ نوجوان ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا، اس کے سرے پر ایک بوڑھیا کی جھونپڑی تھی جو اپنی ایک نوجوان یتیم لڑکی کے ساتھ بسر کرتی تھی، خوبصورت نوجوان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اسے اپنے ہاں مہمان ٹھہرالیا، اب یہ نوجوان جنگل سے کچھ لکڑیاں وغیرہ جمع کر لاتا اور بیچکر معاوضہ بوڑھیا کو دے دیتا اس طرح مدت تک گزر کرتا رہا، اتفاق سے ایک روز اس بوڑھیا کی لڑکی کا وار بھی آگیا، ماں اس کی رونے لگی، اس نوجوان نے سبب دریافت کیا تو اس نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا، یہ نوجوان ابھی نوجوان تھا اور خوبصورت بھی تھا کہنے لگا کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں مسلمان ہوں اور اس لئے مجھ پر احسان کا بدلہ احسان ہی عاید ہوتا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ جب ہرکارے آئیں تو مجھے اس کا لباس پہناکر روانہ کر دینا، غرض اس لڑکی کا لباس پہنکر یہ جوان اس کے بجائے مندر کو چلا گیا، باوضو تھا اور حافظِ قرآن تھا اک دم خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھنا

مشنری دور دراز کے حصوں میں اسلام کی تلقین کرتے پھرتے تھے اور جہاں جاتے مدرسے، مکاتب کھولتے تھے، اور اس سے اسلام کی بڑی اشاعت ہوتی تھی۔

۱۳۴۵ء میں اس کی وفات ہوگئی، یہ وہ زمانہ تھا (بقول کتاب سجارا ملایو) کہ جب مشہور سیاح ابن بطوطہ چین کی سیاحت کو جاتے ہوئے (قدیم بدہ سلطنت سری وجایا کی جانشین) اس "سمدرا پسائے" سے ہو کر گذر رہا تھا۔ ایک سال بعد یعنی ۱۳۴۶ء میں جب وہ چین سے واپس لوٹ کر "سمدرا پسائے" (جس کو اسی سیاح نے اب سماترا کہنا شروع کیا تھا) میں وارد ہوا تو سلطان مرحوم کے بیٹے

---

شروع کر دیا، اور رات بھر پڑھتا رہا مگر آسیب نہ آیا۔

صبح ہوئی اور سرکاری ہرکارے اس کی نعش لینے کے لئے آئے مگر وہ زندہ تھی۔ اس لئے حیران ہوئے اور راجہ کے پاس لے گئے، راجہ نے حکم دیا کہ دوسری اور تیسری بار بھی اسی کو بھیجا جائے، حتیٰ کہ ہر بار ایسا ہی ہوتا، آخر تیسری بار پھر لوگوں نے دیکھا کہ آسیب دروازہ کے سامنے مرا پڑا ہے۔ اور یہ نوجوان لڑکی صحیح وسلامت ہے تو راجہ نے بلا کر اس کا حال پوچھا، اس نے سارا قصہ کہہ سنایا اور بتلا دیا کہ وہ لڑکی نہیں ہے لڑکا ہے اور ایک مسلمان سوداگر ہے، حافظ قرآن ہے، اس کے ساتھی اس طرح برباد ہوگئے تھے وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ راجہ قرآن مجید کی اس زندہ صداقت و تاثیر کا حال سنکر مذہب اسلام کے متعلق دریافت کرنے لگا اس مرد بزرگ نے اسکو بتایا کہ اسلام ایک اللہ کی تعلیم دیتا ہے جس نے زمین و آسمان و ساری کائنات پیدا کی، وہی عبادت کے لائق ہے، وہی سبکو مارتا ہے، جلاتا اور رزق پہنچاتا ہے، وہ زمین و آسمان کا نور ہے اور لاشریک ہے، اور محمد رسول اللہ اس کے نبیوں میں سب سے افضل اور آخری نبی ہیں، جن پر اللہ نے تمام مخلوق کی ہدایت کیلئے یہ قرآن مجید نازل فرمایا، جو کتب آسمانی میں سب سے آخری اور سچی ہدایت کی کتاب ہے۔ اس پر عمل کرنیوالا ہی مسلمان کہلاتا ہے۔ بس جو بھی اس پر عمل کریگا دنیا میں عظمت و کامیابی اور آخرت میں نجات پائے گا، اور نہ مانے گا تو خسارہ میں رہیگا۔ راجہ پر اس تعلیم کا بڑا اثر ہوا اور وہ اسلام کی صداقت کا قائل ہو کر معہ اپنے درباریوں کے مسلمان ہو گیا، اور ملک الصالح کہلایا، اور یہ بزرگ سری پاوک، کے نام سے مشہور رہے جنکا اصلی نام برہان الدین تھا پسائے میں مزار مبارک ہے۔

اور ولیعہد شہزادہ زین العابدین کی تاجپوشی کی تقریب منائی جارہی تھی، جیساکہ سجارا ملایو میں لکھا ہے سلطان نے سیاح مذکور کو بھی تقریب میں شرکت کے لئے مدعو کیا تھا اور اپنے شایانِ شان اس کی میزبانی کے فرائض کو بھی انجام دیا تھا۔

ڈاکٹر خراف اپنی تاریخ "خِڈ نیز" (بزبان ولندیزی صفحہ ۴۷) میں لکھتا ہے کہ یہ سلطان اتنا قابل اور لایق و فایق انسان تھا کہ اس کا اثر اندلاس کے جنوب تک جا پہنچا تھا، اور تمام جنوبی لوگ اس کے عدل و انصاف سے متاثر ہو کر خود بخود اسلام میں داخل ہوگئے چنانچہ اسی کے وقت سے پورے جزیرہ کے لئے لفظ سماترا، بجائے "اندلاس" کے استعمال ہونے لگا۔ مساجد[۵] اور مدارس تعمیر کئے گئے اور رفاہ عامہ کے کاموں پر بھی توجہ دی گئی۔ یہ حکمراں تاریخ میں 'سلطان ملک الطاہر سوم' کہلاتا ہے۔

---

آپ بلحاظ تصوف سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔

## [۵] حضرت مولینا برہان الدینؒ

ان مساجد اور مدارس کے زیادہ تر کارکن حضرت مولینا برہان الدینؒ کے شاگرد تھے مولینا برہان الدینؒ کے باب میں روشنی ڈالتے ہوئے آرنلڈ نے اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں اس قصہ کا اجمال بیان کیا ہے کہ خود حضرتِ موصوف نے بھی سماترا جزیرہ میں اسلام کا آغاز کرنے کے بعد باقاعدہ نومسلموں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا (جس کا مرکز شروع سمدرا ابھر آچیہ تھا) آپ اس مدرسہ میں باقاعدہ لوگوں کو تبلیغ اسلام کے اصول سکھاتے تھے، قرآن مجید اور شافعی فقہ کی تعلیم دیتے تھے اور عربی زبان بھی رائج کر دی تھی، تصوفِ اسلام پر بھی باقاعدہ مقامی زبان میں تقریریں کرتے تھے رفتہ رفتہ اپنے شاگردوں کے وفود مختلف اطراف میں تبلیغ کے لئے بھیجنے لگے، اس طرح لوگ آپ کے بے انتہا ارادتمند ہوگئے اور آپ کو "شری پادر" (یعنی بزرگ مقدس) کے نام سے یاد کرنے لگے اور اس طرح آچیہ کا تمام علاقہ آپ کی تعلیمات سے اسلام کا بڑا مرکز بن گیا (یاد رہے کہ انگریز مصنفین نے آچین اس آچیہ کے لئے ہی استعمال کیا ہے)۔

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفر نامہ میں سلطان کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دنیاوی مشاغل کے علاوہ سلطان امورِ دین میں بھی بہت زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ ملک بہت زیادہ خوشحال تھا، تجارت کی بڑی ترقی تھی، سیام کے راجاؤں کے ساتھ بھی اس حکمراں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ چنانچہ اسلام کے اثر کو اس ملک میں پہنچانے کے لئے وہاں کے تاجروں کو بھی اپنے ملک میں تجارت کرنے کی عام اجازت دیدی تھی۔ لوگ سیام سے آتے جاتے تھے اور سُماترا میں کاروبار کرتے تھے۔

یہ حکمراں ۱۴۰۰ء تک زندہ رہا ہے۔ اس کے آخری دور میں جاوا کی مشہور سلطنت "مجاپائت" پے در پے بغاوتوں اور برہمن افسروں کے ظلم اور رشوت ستانیوں کے سبب بالکل کمزور ہو چکی تھی لہذا اس نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح "سُمدُرا پسائے" ایک پہلی خود مختار اسلامی سلطنت بن گئی۔

"سجارا ملایو" میں لکھا ہے کہ سلطان ملک الظاہر سوم کے بعد پھر اس خاندان میں ایسا جلیل القدر حکمراں تختِ سلطنت پر نہ آیا، اور اسی لئے سُماترا کے وسیع رقبہ پر پھیلی ہوئی سلطنت کمزور جانشینوں سے نہ سنبھل سکی، نہ یہ جانشین خوش تدبیر اور صائب الرائے تھے لہذا تجارت کو بھی زوال شروع ہو گیا چونکہ افسرانِ آخری مجاپائت" کے ظلم پرور افسروں کی دیکھا دیکھ خود بھی اپنے ساحلوں پر سوداگروں کے ساتھ ظلم سے پیش آنے لگ گئے تھے لہذا غیر ملکی سوداگروں نے "سمدرا پسائے" یا سُماترا کے بندرگاہوں پر آنا کم کر دیا، اور اس طرح آمدنی گرتی چلی گئی اور حکومت کو گھن لگ گیا۔

چونکہ گرم مصالحہ کا بڑا مرکز "ملایا" میں ملکا کا علاقہ بھی تھا لہذا لوگوں نے

'سُمدُرا پسائے' آنے کے بجائے 'ملکّا' میں جانا شروع کر دیا اور اس طرح 'ملکّا' ایک بڑا تجارتی مرکز بن گیا، جیسا کہ ابھی واضح کیا جا چکا ہے 'سیام' کے بدھ لوگوں سے بھی 'سُمدُرا پسائے' کے تجارتی تعلقات وابستہ تھے، لہٰذا سیام کے حکمراں نے اپنے اہلِ ملک کے ساتھ تجارتی نقصانات کو دیکھتے ہوئے 'سلطان پسائے' سے اس کے ساحل پر ایک بندرگاہ حاصل کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ اور اس طرح دونوں حکومتوں کے درمیان مُنازعت کا آغاز ہو گیا 'سُمدُرا پسائے' اس مُنازعت سے اور بھی کمزور ہو گیا، یہاں تک کہ ۱۴۳۵ء میں اس حکومت کا بالکل زوال ہو گیا۔ اور 'ملکّا' [۱] کا اقتدار شروع ہو گیا۔

## ملکّا میں اسلامی تبلیغ اور مسلم سلطنت کا قیام

غرض 'سُماترا' کی سلطنت اور تجارت کے زوال سے متاثر ہونے والے سوداگر اب چونکہ ملکّا میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور ان کے قیام کی وجہ سے یہ علاقہ تجارت کا بڑا مرکز بن گیا تھا، "شہر سینگاپور" [۲] بھی اب معرضِ وجود میں آ چکا تھا

[۱] 'ملکّا' کا علاقہ ملایا جزیرہ نما کے جنوبی مغربی سرے پر واقع ہے۔ جہاں آج ایک بہت بڑا بندرگاہ 'سینگاپور' قائم ہے۔ ۱۲

## سلطنتِ ملکّا کا قیام [۵]

جاوا میں جب اس دور میں تخت نشینی اور حصولِ اقتدار کے لئے شاہی خاندان میں باہمی منازعت شروع ہوئی تو اس خاندان کا ایک شہزادہ جس کا نام 'پرمیشورا' تھا خانہ جنگی سے بھاگ کر 'ملکّا' نام کے گاؤں میں بس گیا تھا، چونکہ 'ملایا' ایک زمانہ سے مجاپاہت کا رقیبہ اثر اور ملکِ محروسہ رہ چکا تھا۔ لہٰذا مقامی آبادی کے لوگ اس کے گرد جوق در جوق جمع ہوتے چلے گئے اور اس طرح یہ وہاں کا حکمراں بن گیا حکمراں بن جانے کے بعد اس نے اپنی سلطنت کا نام بھی "ملکّا سلطنت" رکھا اور شہر کو بھی اپنی توجہ سے

لہذا مسلمان سوداگروں نے اپنا اثر اس طرف پھیلانا شروع کیا۔ مگر اس سے یہ ہرگز اخذ نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ سماترا میں اسلام کا زوال ہو چکا تھا یا اسلام کی سلطنت مٹ چکی تھی بلکہ حکومت بھی قایم تھی اور مذہب بھی برقرار تھا اور یہ مذہب اس جزیرہ کے ایک بہت بڑے رقبہ کے لوگوں کا مذہب تھا اور اس کی تبلیغ برہانی صوفیاء کے ہاتھوں میں برابر ترقی کر رہی تھی) اور بتدریج بہت بڑی آبادی اسلام میں داخل ہوگئی۔

چونکہ جاوا کی سلطنت مجاپائت کا زوال ہو چکا تھا لہٰذا وہاں کے ایک شہزادہ "پرامیشورہ" نے ۱۳۹۶ء میں ملکا پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت قایم کر لی تھی۔ یہ شہزادہ

---

بہت زیادہ ترقی پر پہنچا دیا۔ اس کا رقبۂ اثر جنوب کے جزیرہ اور آبنائے تک پھیلا ہوا تھا، کہتے ہیں کہ اس کے عہد میں ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شیر پہاڑوں سے نکل کر بستی میں جا گھسا۔ اس بستی کا نام ٹوما تھا شیر نے کافی نقصان پہنچایا لہذا لوگوں نے اس شیر کے نام پر بستی کا نام "سنگاپور" کر دیا چونکہ یہ شہر ایک آبنائے کے سرے پر تھا لہذا اسی کو اس نے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اس طرح یہ شہر ملکا کی ہندو سلطنت کا دارالحکومت بن گیا۔ اس کی تجارتی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے "ریچارڈ" اپنی کتاب "ملایا اینڈ اٹس ہسٹری" صفحہ ۳۵ پر لکھتا ہے کہ:۔

سلطنتِ ملکا کے عہدِ اقتدار میں پسائے کے بعد یہی سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ سوداگر لوگ، گجرات اور کارومنڈل سے آتے تھے اور اپنے ساتھ گلاب جل، ترکاریاں، لوہا اور کپڑا لاتے تھے، جزائر ملوکس سے صندل کی لکڑی، سماترا سے کافور، چین سے ریشم، مشک، ململ، چاندی اور جاوا سے برچھے، خنجر، سونا اور چاول آتا تھا اور ان سب کے بدلہ میں ملکا سے گرم مصالحہ یا مونگا، افیون، ہاتھی دانت اور ادویات لے جاتے تھے درآمدی ٹیکس بہت کم لیا جاتا تھا اور آٹھ سوداگروں کا ایک بورڈ مقرر تھا جو ٹیکس کی تشخیص، مال کی قیمت کا تخمینہ کر کے کرتا تھا۔

ملکا کے زمانۂ اقتدار سے پہلے بھی جبکہ ملایا جزیرہ نما کا نام "سمنان جونگ" :۔

بقول ڈاکٹر ریچارڈ ونسٹیڈ ترقیات کا بڑا دلدادہ تھا، ملک کی خوشحالی کا دل سے خواہاں تھا لہٰذا عرب، اور ہندوستانی مسلمان سوداگروں کو اپنے ہاں بلانے لگا، ان کی رہائش اور قیام کے لئے بھی معقول اور مناسب انتظام کئے۔ اس علاقہ کی آب و ہوا بہت زیادہ ملیریائی تھی لہٰذا اس کے آدمی کافی بیمار پڑنے لگے، مسلمان سوداگر عالم دین ہونے کے علاوہ طبیب بھی ہوتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس ملک میں اکثر ایسے مواقع پر بڑی زرّین خدمات انجام دیں امرار، رؤسا اور عوام میں کافی ہر دلعزیزی اور عظمت حاصل کرلی، راجہ بھی ان سے بہت متاثر ہوا اور بالآخر مسلمان ہوگیا۔ اس طرح ملکّا کی ہندو سلطنت اسلامی سلطنت بن گئی رعایا بھی بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوگئی۔

## راجہ اسکندر شاہ
## ۱۳۹۶ء تا ۱۴۱۴ء

راجہ نے بھی اسلام لانے کے بعد اپنا شاہی لقب، راجہ اسکندر شاہ، رکھا ۔ مجاپائت، کے مٹے ہوئے شاہی خاندان کا یہ پہلا حکمراں تھا جو آغوش اسلام میں آکر، اسکندر شاہ، کے نام سے مشہور ہوا، اس کی رانی اور دیگر افراد خاندان سب ہی اس کے اثر سے مسلمان ہوگئے ۱۴۱۴ء میں، اسکندر شاہ، مرگیا۔ اسکندر شاہ کے اسلام میں آجانے سے آس پاس کی بُدھ حکومتوں میں ہلچل سی مچ گئی چنانچہ، راجہ سیام، نے بڑی فوج سے کر سینگاپور پر چڑھائی کردی

---

(بعہد سری وجایا) تھا اور کیدہ، اس کا خاص مرکز تھا، ہندوستان کے ہندو راجہ بکر ماجیت کے ملک کے لوگ بھی تجارت کی غرض سے یہاں آتے تھے۔

ملکّا کے زمانۂ اقتدار میں کئی خاندان جاوا سے بھی آنکر یہاں بس گئے تھے جو بعد میں راجہ اسکندر شاہ اور اس کے جانشینوں کے وقت میں جاوا (گریسیک طوبان وغیرہ) جاتے تھے ان لوگوں نے ملکا میں اسلام قبول کرلیا تھا۔

مگر اس کا کوئی خاص نیتجہ نہ نکلا۔

بہرحال اسکندر شاہ کی وفات کے بعد اسکا ولیعہد شہزادہ احمد ۱۴۱۴ء میں "راجہ محمد سکندر شاہ" کے لقب سے حکمراں بنا، یہ بھی نہایت ہی اسلام دوست اور اپنے باپ کی طرح ترقی کا دلدادہ تھا۔ لہذا اس نے ملک کی تجارت کو بھی فروغ دیا، مسجدیں اور مدرسے بھی تعمیر کئے، اور بحری بیڑے کو بھی تقویت دی، کہتے ہیں کہ یہ راجہ بھی اتحادِ اسلامی کا بڑا حامی تھا لہذا جزیرہ سماترا کے کمزور حکمراں خاندان "سَمُدْرَا پَسَائے" کو بھی مضبوط کرنے کے لئے اپنے خاندان کے ساتھ رشتوں میں منسلک کر لیا اور نتیجہ کے طور پر جیسا کہ "سجارا ملایو" میں لکھا ہے اس نے اپنے ولیعہد محمد کی شادی "پسائے" میں شہزادی کے ساتھ کر کے دونوں سلطنتوں کو متحد کر دیا چنانچہ ۱۴۲۴ء میں اس کی وفات کے بعد جب شہزادہ "محمد" راجہ محمد شاہ کے لقب سے سریرآرائے سلطنت ہوا تو "ملکّا" کی سلطنت کافی مضبوط ہو چکی تھی، اور تجارت و خوشحالی دونوں شانہ بشانہ چل رہی تھیں، "سیام" کے بدھ راجہ نے چونکہ سَمُدْرَا پَسَائے (سُماترا) پر بندرگاہ کے مطالبہ کے ساتھ حملہ کر دیا تھا لہذا ملکّا کے ساتھ بھی جنگ چھڑ گئی، لیکن سیام کے بدھ راجہ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔

۱۴۴۴ء میں محمد شاہ[۱] کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا "راجہ ابراہیم" کے لقب سے تخت نشین ہوا مگر ابھی کچھ ہی روز گذرے ہوں گے کہ اس کے ایک سوتیلے بھائی مظفر شاہ نے سازش کر کے اسے ہلاک کر دیا اور تخت و تاج خود حاصل کر لیا۔

---

[۱] مگر ولندیزی مورخ خراف نے اسی حکمراں راجہ محمد شاہ کے لئے لکھا ہے کہ اس نے سب سے پہلے "سلطان" کا لقب اختیار کیا تھا۔

یہ راجہ آٹھ سال حکمراں رہا ہے۔ "سنوسی پانے" نے لکھا ہے کہ یہ راجہ ملکّا کے مسلمان حکمرانوں میں سب سے پہلا حکمراں تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور "راجہ مظفر شاہ" کے بجائے سلطان مظفر شاہ کہلانے لگا۔ ۱۴۵۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا سلطان منصور شاہ جس نے ۱۴۷۷ء تک حکومت کی، نہایت ہی قابل اور لائق حکمراں گذرا ہے۔ 'سجارا ملایو' میں اسے بہت بڑا فاتح قرار دیا گیا ہے، اس کتاب کی تحریر سے واضح ہے کہ اس نے پورے جزیرہ نما ملایا (تا بحدودِ برما) اور وسطی سماترا (کیمپر، سی ئیک، اندراگری، اور رکین وغیرہ) بھی فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کرلئے تھے۔ مشہور جرنیل 'ہنگ توا'، جسے ملایا کے مسلمان باشندے 'خالدِ ثانی' کہتے ہیں اسی حکمراں کی بحری فوج کا افسرِ اعلیٰ تھا۔

بہر حال سلطان منصور کے عہد میں بڑے بڑے علمائے ربّانی اور صوفیائے کرام پیدا ہوئے، جن کے پاکیزہ اخلاق اور عمدہ کردار کے اثر سے بدھوں اور مظاہر پرستوں نے ہزارہا کی تعداد میں دینِ اسلام قبول کر کے ہدایت کا نور حاصل کیا۔

۱۴۷۷ء میں منصور کی وفات ہوگئی۔ اور اس کی جگہ اس کے لڑکے سلطان علاؤالدین شاہ کو حکمراں بنایا گیا یہ صرف گیارہ سال حکمراں رہا ہے، کہتے ہیں کہ یہ ایک درویش صفت بادشاہ تھا، اور عالم بھی بڑا زبردست تھا، حج کو بھی گیا تھا، واپسی پر اس کے لڑکے نے اسے زہر دے کر ختم کر دیا اور خود ۱۴۸۸ء میں سلطان محمود شاہ اوّل کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ یہ ۱۵۱۱ء تک حکمراں رہا ہے۔ ایک نہایت ہی کمزور اور ناکارہ قسم کا حکمراں تھا، سیاست داں بھی اعلیٰ قسم کا نہ تھا، نہ منتظم تھا۔ چنانچہ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی اور اس کی ناعاقبت اندیشی ہی سے

## پرتگالیوں کی ملکا میں آمد

ناجائز فائدہ اُٹھاکر پرتگیزی جو ترکوں کے قسطنطنیہ فتح کرلینے کے باعث بحیرۂ روم کے راستہ کو چھوڑکر افریقہ کے گرد چکر لگاتے ہوئے یوروپ سے ایشیا آنے کے راستوں کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے 'ملکا' بھی آپہنچے رفتہ رفتہ کے قیام سے 'ملکا' پر قابض ہو بیٹھے۔ (جس کی تفصیلات اقوامِ مغرب کے حملہ میں بیان کی گئی ہیں) جون ۱۵۱۱ء میں سلطان کے ساتھ لڑائی ہوئی، پرتگیزی جرنیل 'البوترق'، کامیاب ہوگیا اور سلطان مُلک چھوڑکر کمپیر (واقع جزیرہ سُماترا) چلا گیا اور یہیں پھر ۱۵۲۸ء میں مرگیا اس کے بھاگ جانے سے پہانگ، جوہور اور دیگر ملائی ریاستیں جو اس کی ماتحتی میں تھیں وہ بھی سب نرغہ میں پھنس گئیں۔

## سلطنتِ ملکا کے عہد میں اسلامی خدمات

بہرکیف سلطنتِ 'ملکا' جو تقریباً ایک سو سال قایم رہی بقول "رچارڈ" انتظامی امور، تجارت اور علم وادب کے اعتبار سے نہایت ہی شاندار تھی، اس سلطنت کے عہدِ اقتدار میں 'ملکا'[1] نہ صرف تجارت ہی کا ایک بڑا مرکز تھا بلکہ علم وادب، اسلامی تہذیب، اسلامی ثقافت، کا بھی بہت بڑا مرکز تھا، کیونکہ

## ملکا[2] یعنی ملایا میں اسلام کہاں سے پہنچا

ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے، مگر جہاں تک اہلِ ملایا کی موجودہ اور اس عہد کی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا ہے ان پر اہل عرب اور مسلمانانِ ہند کا اثر زیادہ نمایاں ہے، مذہب کے اعتبار سے یہ لوگ بھی شافعی المذہب ہیں مگر ان کی اسلامی تہذیب اور ثقافت تمامتر عربی ہے، اس لئے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تو صحیح نہیں بتلایا جاسکتا کہ اسلام کس ملک کے لوگوں کے ذریعہ پہنچا مگر یہ ضرور ہے کہ یہاں کے لوگ اہلِ عرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور علم وادب میں مسلم ہندوستان کے ادب سے متاثر ہیں۔

اس عہد کی ایک تختی دستیاب ہوئی ہے جس پر عربی خط میں ملائی عبارت درج ہے اور ۱۳۸۶ء کا سال بھی اس پر کندہ ہے۔ بقول "رچارڈ" "مشرق (خصوصاً جاوا، بورنیو، سلیبس، اور مالوکو وغیرہ) کی طرف اسلام پھیلانے والے مبلغین بھی سب اس مرکز سے وقتاً فوقتاً جاتے رہے ہیں، چنانچہ حکمران (منصور) نے عربی رسم الخط ملائی زبان کے لئے اختیار کرکے اسلامی ثقافت کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں راجہ پرمیشورا کے زمانہ میں مہابھارت، اور رامائن کے قصے ملک میں رائج تھے لہذا اب رفتہ رفتہ ان کے بجائے اسلامی بہادروں کی داستانیں لکھی گئیں اور ہندوستان کے قدیم مسلم لٹریچر سے عربی ملائی میں ترجمہ کی گئیں حکومت کے لئے باقاعدہ (بقول رچارڈ صفحہ ۳۳) فقہ شافعی کے مطابق اسلامی قانون مرتب کیا گیا، اور ہندوستان کے مسلم علما کی مدد سے دستور بھی اسلامی بنایا گیا جس میں کچھ امور مثلاً بندوبست، لگان، فوج کا انتظام اور ماہیگیری کے قاعدے، قدیم سری وجایا اور مجاپائت کے عہد کے رہنے دیئے گئے حکومت کا پورا انتظام سلطان کے چار بڑے نائب اور ۸ چھوٹے افسر انجام دیتے تھے جنکی ماتحتی میں ۱۶ بڑے اور ۳۲ چھوٹے صاحب اختیار افسر کام کرتے تھے، ملایا کی ماتحت سلطنتوں سے خراج عموماً سونے کی صورت میں لیا جاتا تھا چنانچہ رچارڈ کی تحریر سے واضح ہے کہ جوہور کا سلطان ہر سال ڈھائی سیر سونا سلطان ملکا کو خراج کے طور پر ادا کرتا تھا، مگر سماترا میں واقع ہونیوالے ماتحت اور تحردسہ علاقوں پر خراج معاف تھا، سکے، چاندی اور سونے کے رائج تھے، مگر مجاپائت کی طرح وہ صرف اندرونی ملک میں ہی استعمال ہوتے تھے۔ بعض انگریز مورخین نے لکھا ہے کہ سونے کے بڑی قیمت والے سکے ملایا میں پہلے پہل پرتگیزیوں نے جاری کئے تھے۔

بہرحال "جاوا" میں اسلام کی اشاعت اسی سلطنت کی حدود میں رہنے والے اور کاروبار کرنے والے درویش سوداگروں نے کی تھی۔ جس کی تفصیلات اگلے باب میں ملاحظہ ہوں۔

# باب سوم

## جاوا میں اسلام کی اشاعت

اور

## مسلمان سلطنتوں کی ابتدا

### اسلام کے ظہور کا زمانہ

جاوا کی تاریخ میں اسلام کی اشاعت کا زمانہ بھی اسی طرح غیر معتین ہے جس طرح اس بڑے ملک کی قدیم ہندو تاریخ لاعلمی کے ڈھیر میں دبی ہوئی ہے، انگریز اور ولندیزی مورخین نے اس باب میں کچھ تحقیقات کی لایعنی سی کوشش کی ہے مگر قدیم روایات ملک کے مختلف عنوانوں کے ساتھ شہرۂ آفاق ہو جانے کے باعث یہ مصنفین بھی تشکک واشتباہ میں پڑگئے ہیں اور صحیح طریقہ سے یہ تعین کرنے میں کہ اسلام کا سب سے پہلا قدم جاوا میں کب پہنچا قاصر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم صفحہ ۵۷" پر تحریر ہے کہ "گیرانؔ" (واقع مشرقی جاوا) میں ایک پرانی قبر فاطمہ بنت میمون کی ملی ہے جس پر سالِ وفات ۴۹۵ھ مطابق ۱۱۰۱ء کندہ ہے اور یہ زمانہ تاریخی حیثیت سے مجاپائت کے عہد سے بہت پہلے کا دور ہے مگر ایک چینی مسلمان نے جو جاوا میں

۱۴۱۶ء میں وارد ہوا تھا لکھا ہے کہ اس وقت تک اس جزیرہ میں مقامی باشندے اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے، مسلمان جو اِدھر اُدھر کاروبار کرتے ہوئے نظر آتے تھے وہ یا تو چینی سوداگر تھے اور یا پھر تاجرانِ ہند تھے۔

اسی طرح ایک مشہور پرانہ مزار خانقاہ کی صورت میں حضرت مولینا ملک ابراہیمؒ کا ہے۔ جن کا سالِ وفات ۸۲۱ھ مطابق ۱۴۱۹ء ہے۔ مسلمان چینی سیاح کے بیان کی سچائی عقل میں نہیں آتی (ممکن ہے کہ اس کے بیان کا مرکز مغربی جاوا کا علاقہ ہو جہاں واقعی اسلام بعد میں پہنچا ہے) کیونکہ انگریز مورّخ کرافورڈ نے (جو ان جزائر میں ۱۸۲۰ء سے قبل رزیڈنٹ رہا ہے، اس کی تاریخ جلد دوم ۳۰۶ - ۳۰۷ ملاحظہ ہو) جو تحریر کیا ہے وہ اس بیان سے بالکل متبائن ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"اگرچہ ہندو مذہب نے یہاں پر اپنے اثرات بہت گہرے چھوڑے تھے مگر باوجود اس کے جب اسلام کی تبلیغ کا کام اس حصّہ میں شروع ہوا تو اسلام بہت تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا، جب مغربی جزائر (سُماترا وغیرہ) میں اسلام پہنچا تو جاوا میں ہندو مذہب برسرِ اقتدار تھا، اس کے مشرقی حصّہ میں جو بہت زیادہ آباد اور مہذب تھا اسلام کی تبلیغ کا سب سے پہلا کارنامہ ۱۳۱۳ء (ساکا) مطابق ۱۳۹۱ء میں انجام دیا گیا ہے اور اس کارنامہ کو انجام دینے والا ایک غیر ملکی شخص تھا جو یہاں (حضرت مولینا) ملک[۵۱] ابراہیم کے ساتھ آیا تھا، بعد میں یہ شخص 'راجہ چُرمُن' کے لقب سے مُلقّب ہوا۔"

---

[۵۱] حضرت مولینا ملک ابراہیمؒ | کرافورڈ نے غلطی سے آپ کو عرب قرار دیا ہے اور غالباً اسکے اتباع میں اور دیگر انگریز مصنفین مثلاً آرنلڈ وغیرہ نے بھی

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس جزیرہ میں سب سے پہلے اسلام کو لانے والے حضرت مولیناؒ تھے جن کے باب میں مزید بحث کے لئے موجودہ حکومت اندونیشیا کے شائع کردہ ایک عربی رسالہ "الاِسلام فِی اِندُونِیشیا" کی عبارت بھی ملاحظہ ہو (یہ رسالہ جکارتا کا ۱۳۷۰ھ کا مطبوعہ ہے یہ عبارت اس کے صفحہ ۱ پر درج ہے)۔

بدأ الاسلام ينتشر في الجزائر الاندونيسية في أواسط القرن الثامن للهجرة، أو القرن الرابع عشر للميلاد - وفي بلدة

---

عرب ہی لکھا ہے مگر ("Islam de Indonesia") کے مصنف کی رائے ہے کہ آپ ہندوستان (کے صوبہ گجرات میں احمدآباد) کے رہنے والے تھے۔ مذہباً شافعی اور باعتبار تعلق سلسلۂ قادری تھے مصنفِ موصوف نے اس دعویٰ کے ثبوت میں دلیل یہ پیش کی ہے کہ آپ کے لوحِ مزار کی ساخت اور عربی عبارت کا اندازِ تحریر دونوں ہندوستانی ہیں اور نیز فارسی کے اشعار بھی کندہ ہیں جن کا اس زمانہ میں ہندوستان میں رواج تھا۔

بہرکیف آپ کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے آرنلڈ نے لکھا ہے کہ بہت ہی بلند پایہ عالم اعلیٰ قسم کے صوفی اور باہیبت بزرگ تھے، طبابت سے بھی بڑی واقفیت رکھتے تھے، اور تاجر پیشہ تھے مشرقی جاوا کے بندرگاہ "گریسیک" میں تجارت کرنے کی غرض سے آئے تھے، جب یہاں کا ہندو رئیس سخت بیمار پڑا تو چونکہ آپ کا اثر کافی پھیل چکا تھا۔ اور آپ بہت مشہور ہو گئے تھے لہذا اس نے آپ ہی کی طرف رجوع کیا، آپ کے فیضانِ روحانی اور کمالاتِ طبی سے خدا نے اس کو شفا دی، وہ آپ کا معتقد ہوگیا، اور بت پرستی سے تائب ہوکر حلقہ بگوشِ اسلام بن گیا۔ آپ نے اس رئیس کا نام "رڈین رحمت" تجویز فرمایا جو تاریخ میں اسی طرح مشہور ہے۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا) اور جاوا کے نو اولیاء میں شمار ہے۔

بہرحال آپ کی برکت سے اسلام اس حصہ کا خاص مذہب بن گیا، آپ کا مزار مبارک شہر "گریسیک" میں واقع ہے اور مرجع خلائق ہے۔

"غرسيك" (بالقرب من مدينه سورابايا، بجزيرة جاوة)
يوجد قبر مولانا ملك إبراهيم، أحد كبار المجاهدين الذين سبقوا
إلى نشر الدعوة الاسلامية في إندونيسيا، وكانت وفاته في ١٢ ربيع
الاول سنة ٨٢٢، الموافق ٩ أبريل سنة ١٤١٩"۔

## جزیرۂ جاوا کا پہلا مسلمان حکمران

اسلام کے جاوائی قصر میں داخلہ کے وقت پر بحث کرتے ہوئے عصر حاضر کا اندونیشی مورخ رسنوسی پانے، اپنی کتاب سجارا اندونیشیا کے صفحہ ۶۵ (پر) لکھتا ہے کہ:۔
"اُس عہد کی ایک قدیم تحریر کے مطابق علم میں آیا ہے کہ "چمپو" کی ایک شہزادی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اس کی شادی مجاپائت کے ایک حکمراں کے ساتھ ہوئی تھی

## جاوا کی اس وقت کی عام کیفیت

اس موضوع پر پچھلے اوراق میں کئی بار ذکر گذر چکا ہے اس لئے اب پھر دوبارہ اس کا عادہ کرنا کچھ مناسب نہ ہوگا، مگر یاد داشت کے طور پر یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس وقت سماترا میں اسلام کی سلطنت قایم تھی، راجہ احمد وہاں کا حکمراں تھا، اب ایک خود مختار اور آزاد سلطنت تھی، جاوا کی سلطنتوں سے اس کے تجارتی تعلقات قایم تھے اس لئے یہاں کے سوداگر جاوا کے بندرگاہوں (خصوصاً طوبان، گرسیک اور امپل) میں آتے جاتے تھے، جاوا زوال سلطنت مجاپائت کے سبب سے کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ مگر مذہب "ہندو بدھ" (کے باہمی اختلاط سے بنا ہوا مذہب) کارفرما تھا، کرافورڈ (صفحہ ۲۹ جلد دوم پر) لکھتا ہے کہ "مسلمانوں کی آمد کے وقت یعنی پندرھویں صدی میں جاوا میں بہت سی ریاستیں قایم ہو گئی تھیں اور ایک عظیم بادشاہت کی تھیوری جس کا ہندو برہمن نے اعلیٰ تمدن کے عنوان سے طومار باندھ رکھا تھا زیر عمل تھی۔ اور بالکل لغوی چیز تھی"، انسائیکلوپیڈیا

اس شہزادی کے مقبرہ کے آثار مشرقی جاوا میں اب بھی موجود ہیں اور حال ہی کی دریافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس آثار کی تاریخ ۱۴۴۸ء بتائی جاتی ہے۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام مجاپاہت کے قصر شاہی میں اس وقت موجود تھا، اس شہزادی کی ایک بہن 'ریڈن رحمت' کے ساتھ بھی منسوب تھی۔

(آرنلڈ نے ریڈن رحمت کو پہلا حکمراں لکھا ہے مگر اندونیشی مورخین کی رائے میں پہلا حکمراں "ریڈن پاتح" تھا۔ جو ۱۵۲۰ء میں حکمراں بنا تھا۔ اور صحیح بھی یہی ہے اس کے حالات اگلے صفحات میں بیان کئے جائیں گے)۔

یہ ریڈن رحمت جاوا کے ان مشہور نو ولیوں میں شمار کئے جاتے ہیں جو "سونان" کے نام سے مشہور ہیں اور جنھوں نے اس جزیرہ میں اسلام پھیلایا تھا، حضرت

---

آف اسلام (جلد دوم صفحہ ۶۰۵ پر) جاوا میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ "اسلام ملکا سے آنے والے سوداگر لائے تھے، اور چونکہ ملکا میں مجاپاہت کے پندرہ سو ہندو خاندان آباد ہوگئے تھے لہذا وہ لوگ بھی جاوا آتے جاتے تھے، ان میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا تھا۔"

**سونان (یعنی نو اولیا رام)**

یہ 'سونان' آج جاوا میں اپنے مقامِ مدفن کی مناسبت سے اس نام کے ساتھ مشہور ہیں اور تعداد میں نو ہیں ان کا مختصر سا تذکرہ ذیل میں ملاحظہ ہو:-

۱- **مولینا مغربی**:- یہ حضرت ملک ابراہیم کا وہ لقب ہے جس کے ساتھ جاوی باشندے آپ کو پکارتے ہیں، آپ جاوا کے نسب سے پہلے 'سونان' (یا ولی) مانے جاتے ہیں۔

۲- **سونان نمپل**:- یہ ریڈن رحمت کا لقب ہے۔ جنھوں نے طوبان کے حکمراں کی لڑکی کے ساتھ ۱۴۴۰ء میں شادی کی تھی۔ اور ۱۴۶۷ء میں وفات پائی تھی۔ آپ کا مزارِ مبارک سرابایا کے قریب نمپل کی پہاڑی پر واقع ہے۔

۳- **سونان بونانگ**:- آپ سونان نمپل کے لڑکے تھے ۱۴۶۵ء میں پیدا ہوئے اور

ملک ابراہیم ان سب اولیاء کے سردار تھے اور دیگر اولیاء جیسا کہ ان کے متعلق شہرت پائے ہوئے قصوں سے پتہ چلتا ہے یا تو قدیم ہندو رئیس خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے یا مجاپائت کے برباد شدہ شاہی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، ان سب کی زندگی نہایت ہی صوفیانہ اور سادہ تھی، اسلام کے اولیائے سلف کے نمونہ پر عمل کر کے نہایت ہی صاحبِ قلب اور صاحبِ اثر ہو گئے تھے۔ ان کی زندگیوں کا اثر بھی اس ملک کی اس و قعت

---

طوبان کے شاہی خاندان ہی میں شادی کی بعد میں سردار بھی بن گئے آپ نے ۱۵۲۵ء میں وفات پائی۔ بقول "شنے رگ" آپ کا مزار دو مقامات پر ہے۔

۴۔ سُونان گیری:۔ آپ کا نام رڈین پاکو تھا، گیری کی پہاڑی پر دفن ہیں۔ یہ مقام گریسک ہی کے قریب ہے۔

۵۔ سُونان گننگ جاتی:۔ جزیرہ سماترا کے مقام "پسائے" کے متوطن تھے مگر تبلیغِ اسلام کے شوق میں ترکِ وطن کر کے ۱۵۲۱ء میں جاوا میں آ رہے تھے پھر مکہ مکرمہ بھی گئے اور علوم اسلامیہ کی تکمیل بھی وہیں کی، واپسی پر جاوا میں "دیماک" کے مقام پر قیام فرمایا۔ اور سلطان دیماک کی بہن کے ساتھ شادی کی، اور اپنے سالے کی مدد سے بانتن چلے گئے اور "پجاجاراں" کے ہندو حکمراں سے جو اسلام اور اہلِ اسلام کا بدترین دشمن تھا جنگ کی اور کامیاب ہو کر اقتدار حاصل کیا کچھ زمانہ کے بعد آپ چریبوں چلے آئے اور وہیں مستقل قیام رکھا اور پھر وہیں ۱۵۷۰ء میں انتقال بھی فرمایا آپ کا مزار مبارک مشہور پہاڑ "گننگ جاتی" پر واقع ہے۔

۶۔ سُونان قدس:۔ شہر سیمرانگ کے قریب قدوس کے مقام پر مدفن ہے۔

۷۔ سُونان موریا:۔ جپارا کے میدانوں کے ایک سرے پر دفن ہیں۔

۸۔ سُونان درجات:۔ مزار اب نمیل کے قریب ہے۔

۹۔ سُونان کالی جاگا:۔ کیڈی لینگو میں کالی جاگا کے مقام پر مدفن ہے۔

**بلیم بنگن کے راجہ کا قصہ** " پریچنگ آف اسلام" میں آرنلڈ نے "بلیم بنگن" کے راجہ

کی سیاست میں نہایت ہی غیر معمولی نظر آتا ہے۔ یہ سب اولیا رہم عصر تھے، لہذا انھوں نے بھی اسلام کی مدنی زندگی کا آغاز اسلام کی عبادت گاہ کی تعمیر سے شروع کیا۔

**جاوا کی سب سے پہلی مسجد** اور دیماک (مشرقی جاوا) کے مقام پر باہمی کوشش سے جاوا کی سب سے پہلی مسجد تعمیر کی اس مسجد کی چھت نوں ستونوں پر کھڑی کی گئی تھی جو ان کی اپنی تعداد کا شمارہ ہے یہ مسجد قدس کے نام سے مشہور ہے کہتے ہیں کہ ہر شب جمعہ کو ان نو اولیار کی اس مسجد میں جو کھٹ لگتی تھی، تبلیغِ اسلام کے بارے میں باہمی طور پر مشورے ہوتے تھے، اور وفود آس پاس کے ممالک میں اسی مسجد سے روانہ کئے جاتے تھے، اسلام کے حلقہ میں

---

کے محل میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ بلم بنگن کی ریاست (یاد رہے کہ یہ ریاست بھی زوالِ مجاپائٹ کے بعد ہی مشرقی جاوا میں قایم ہوئی تھی) کے حکمراں (جو بدھ اور ہندو دھرم کا قائل تھا) کی ایک خوبصورت لڑکی تھی، اور لڑکا کوئی نہ تھا۔ اسی لئے اس کو اس لڑکی سے بڑا پیار تھا، جب یہ مہوش جوان ہوگئی تو اچانک ایک بار سخت بیمار پڑ گئی، جوتشی اور انتر منتر والے سب ہی بلائے گئے مگر کسی کی بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی اتفاق سے حضرت ملک ابراہیمؒ کے ایک شاگرد "ابواسحاق"، جو بہت بڑے فقیر ہونے کے علاوہ طبیب حاذق بھی تھے، تبلیغ اسلام کرتے ہوئے اس طرف کو آنکلے اور پند و وعظ کے علاوہ طبابت کے ذریعہ بھی خدمتِ خلق انجام دینے لگے، کچھ ہی عرصہ میں آپ کی شہرت پھیل گئی، راجہ نے ہر طرف سے مایوس ہو کر یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص بھی اس لڑکی کے علاج میں کامیاب ہوگا، اس کے تندرست ہوجانے پر اس کا شوہر بنا دیا جائے گا چنانچہ لوگوں نے آپ سے بھی کہا۔ مولینا ابواسحاقؒ نے علاج شروع کر دیا، دعا بھی کی اور دوا بھی دی، قدرتِ خدا لڑکی تندرست ہوگئی اور بالآخر وعدہ کے مطابق آپ کے ساتھ اس کی شادی کی گئی، آپ نے اسے اسلام میں شامل کرلیا اور شریعت



انڈونیشی خطاط کا لکھا ہوا سب سے پہلا نسخہ
قرآن پاک (الفرقان) جو انڈونیشیا کے آغاز
عہد اسلام کی یادگار ہے۔



جاوا کی سب سے پہلی مسجد
"مسجد قدس"



حضرت مولانا ملک محمد ابراہیمؒ کے مزار کی لوح بالیں

شامل ہو جانے والے نومسلموں کی ضروریات اور مشکلات کا حل بھی اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر بذریعہ فکر و غور تلاش کیا جاتا تھا۔

## جاوا کے سب سے پہلے حاجی

جاوا کی تاریخ میں انہی لوگوں نے سب سے پہلے حج کا بھی عزم کیا تھا، چنانچہ مخدوم ابراہیم (جو سونان نمپل کے فرزند تھے) اور سونان گیری (جن کا شاہی لقب رڈین پاکو تھا) اپنے زمانۂ تبلیغ میں حج کے لئے روانہ ہوئے مگر جب 'ملکّا' پہنچے تو ایک مسلمان عالم سے ملاقات ہوگئی اور انھوں نے پہلے اسلامی تعلیمات کے حصول پر زور دیا چنانچہ یہ کچھ عرصہ وہیں رہ گئے اور ان سے علم حاصل کرتے ہوئے، پھر تکمیل کے بعد حالات کے اقتضا سے مجبور ہوکر واپس اپنے وطن کو چلے آئے اور حج کو نہ جا سکے۔ البتہ "سونان گننگ جاتی"[۵] ۱۵۲۱ء کے بعد حج کو گئے تھے، کہا جاتا ہے کہ یہی سب سے پہلے شخص ہیں۔ جنھوں نے جاوا سے حج کے لئے سفر بیت اللہ کیا تھا۔

---

کے مطابق اس کے ساتھ عقد کر لیا محل میں رہنے لگے، جب کچھ عرصہ کے بعد وہ حاملہ ہوئی تو آپ تبلیغ اسلام کے لئے نواحِ شرق کو چلے گئے اور ہدایت کر گئے کہ اگر بچہ لڑکا ہو تو اس کا نام "پاکو" رکھنا، بہر حال لڑکا پیدا ہوا اور اس کا نام پھر پاکو ہی رکھا گیا، راجہ کے مرنے کے بعد یہی پاکو حکمراں بنا۔ اس طرح بلیم بنگین کی پوری ریاست اسلام میں شامل ہوگئی۔ (یہ قصّہ آرنلڈ کا بیان کردہ ہے انڈونیشی واقعہ نگاروں نے اسی واقعہ کو ایک اور رنگ میں پیش کیا ہے)۔

[۵] **مغربی جاوا میں اسلام کی اشاعت** بھی عموماً آپ ہی کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے آپ کا اصلی نام "پاتح ہلاّ (غالباً عربی نام 'فاتح اللہ' سے جاوی بنایا ہوا نام) تھا جس کو پرتگیزی مورخین نے "پانٹے ہیلان" لکھا ہے انڈونیشی مصنفین کا خیال ہے کہ پرتگیزوں کی تحریریں میں لئے ہوئے نام "پانٹے ہیلان" سے

## اولیاءؒ کا پہلا مجاہدانہ اقدام

بہرکیف اسلام اب روزافزوں ترقی پر تھا۔ ہندو اور بدھ حقانیت اسلام سے متاثر ہو کر کثیر تعداد میں روز بروز

---

آپ ہی مراد ہیں۔ بہرحال بہت بڑے عالم، اور صاحب اوصاف بزرگ گزرے ہیں۔ مغربی جاوا کے لوگ آپکو اپنا سب سے بڑا پیشوائے دین مانتے ہیں، آپکا وطن بقول پرتگیزی مصنف "بروس" جزیرہ سماترا کا علاقہ پسلئے تھا جہاں سے آپ ۱۵۲۱ء میں جاوا چلے آئے تھے۔

---

## اولیاءؒ کی تبلیغ کے طریقے

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں مختصر طور پر اولیاء کے ان طریقہ کار کو بھی واضح کر دیا جائے جو انھوں نے اس نواح میں اسلام کی تبلیغ کرتے وقت اختیار کئے تھے۔ حالانکہ اسی موضوع پر ایک الگ کتاب بھی تحقیقات کے ذریعہ لکھی جا سکتی ہے، مگر اس مقام پر محض اجمالی طور پر ہی بحث کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) مبلغین عام طور پر اپنے معتقد مسلمان سوداگروں کے ساتھ آتے تھے۔ اور جب انہیں سے کوئی بزرگ تبلیغ کی مہم پر کسی علاقہ میں وارد ہوتا تو سب سے پہلا یہ کام کرتا کہ وہاں کی علاقائی زبان سے اپنے چندروزہ قیام کے ذریعہ واقفیت بہم پہنچاتا تاکہ مقامی باشندوں کے ساتھ اظہار خیال کرنے میں دقت واقع نہ ہو، چنانچہ حضرت مولانا برہان الدینؒ اور حضرت مولانا ملک ابراہیمؒ کے حالات سے ان دونوں باتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) تبلیغ عام طور پر پہلے رؤسا، عمائدین اور ذی اثر لوگوں میں کی جاتی تھی، تاکہ جہاں ایک طرف ان بڑی شخصیتوں کے اسلام میں داخل ہونے سے تمدنی اور روحانی انقلاب کو رونما ہونے کا راستہ آسانی کیساتھ مل سکتا تھا، وہاں دوسری طرف ان تمام غفلتوں، اخلاقی کمزوریوں اور عصیاں شعاریوں کو دور کرنے کی راہ بھی نکل آتی تھی۔ جو جاہ و ثروت اور مال و منال کی فراوانی کے باعث امیر طبقہ میں غریب طبقہ کی بہ نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور جنکی اشاعت ہی سے پھر یہ خرابیاں غریب طبقہ میں بھی استیلا پاتی ہیں لیکن تبلیغ کا یہ طریقہ نہایت ہی دشوار تھا۔ کیونکہ طبقہ عمائدین کے بے پرواہ لوگوں کو کہ جو تہذیبی حیثیت سے عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ ذی اثر ہوتے ہیں دوسروں کے اثر کو کم آسانی سے قبول کیا کرتے ہیں، ایسے حالات میں مبلغین کو کہیں اپنے غیر معمولی روحانی کرامات سے کام لینا پڑتا تھا، اور کہیں علمی و فنی اکتشافات کے ذریعہ انھیں راستی کی طرف منجر کرانا پڑتا تھا، اسی لئے اس نواح میں تبلیغ کی مہم پر عموماً ایسے ہی اولیاء اللہ آتے تھے جنھیں باطنی طور پر روحانیت میں کمال حاصل ہوتا تھا اور ظاہری طور پر وہ علم میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور علم دین کے علاوہ خصوصاً طبابت کے فن پر بھی انھیں کافی عبور حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کی مثالیں پچھلے اوراق میں بیان کی ہوئی کہانیوں میں گزر چکی ہیں

(۳) اس نواح میں آنے والے اولیاء اللہ بااثر لوگوں کو ہی پہلے اسلام میں لانیکی سعی کیوں فرماتے تھے یہ یہاں کے مزاج تمدن کو سمجھکر اسکے مطابق تصوف اسلام سے کام لینے کی ایک بڑی عاقلانہ اور کامیاب کوشش تھی۔ بات یہ تھی کہ اسلام سے پہلے یہاں پھیلے ہوئے مذاہب اور ان کے تمدن نے کچھ ایسا نظریہ بلکہ رواج پھیلا دیا تھا کہ عام لوگ خداوند عالم کے تصور رے

حلقۂ اسلام میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ اور تبلیغ کا قریب قریب وہی پیرایہ تھا جو کبھی آغاز اسلام کے بعد کی چند ابتدائی صدیوں میں صوفیائے کبار نے اختیار کیا تھا۔

غرض اسلام کی اس بڑھتی ہوئی اشاعت سے ہندو ریاستوں کے عمال مسلمان سوداگروں کے ساتھ اپنے بندرگاہوں پر سختیاں اور بے حرمتیاں کرنے لگے، ان عمال کے علاوہ اعلیٰ کارپردازان حکومت نے بھی سخت قسم کے قوانین وضع کر کے سخت گیریاں شروع کر دیں۔ مسلمان سوداگروں کو اس سے سخت نقصانات پہنچنے لگے۔ اسلام 'ڈیماک' اور اس کے گرد و

محروم ہونے کے باعث اپنے حکمرانوں یا آقاؤں ہی کو اپنا رازق اور جان و مال کا مالک سمجھتے تھے حتیٰ کہ جن بتوں کی پوجا کرتے تھے وہ بھی انہی آقاؤں اور حکمرانوں کے بت ہوتے تھے، اس لئے اپنے راجاؤں، حکمرانوں اور آقاؤں کی مرضی کے خلاف اقدام کرنا انکی عام وطنی شہری حیثیت سے باہر تھا۔ اسی لئے اسلام کے بزرگانِ دین نے یہاں وارد ہونے کے بعد اپنی روحانی فراست سے سب سے پہلے اسی کو مناسب سمجھا کہ ان راجاؤں، حکمرانوں اور ذی اثر متموّل لوگوں کو ہدایت کا نور دکھائیں جن کے پھندوں میں عام غریبوں کی مجبور زندگیاں پھنسی ہوئی ہیں، ورنہ اگر تبلیغ پہلے ان مجبور لوگوں میں کیجاتی تو بدامنی پیدا ہو جاتی۔ اور حکمراں طبقہ پھر سے فرعون اور نمرود کے زمانہ کی یاد تازہ کر دیتا۔ اور اپنے مظالم سے ان غریبوں کو مشق ستم بنا کر بربادی اور پامالی کے مقام پر پہنچا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان باکمال اہل اللہ نے سب سے پہلے جڑوں کو پکڑا اور شاخوں کو خود بخود آئندہ پھلنے پھولنے اور رنگ بہار لانے پر چھوڑ دیا۔

(۴) اسلام کے اس نواح میں آنے والے اولیاء اللہ امراءمیں اسلام کی تبلیغ کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کرتے تھے کہ ایک عالیشان مسجد تعمیر کراتے، اور پھر وہیں ایک دینی تعلیم کے مدرسہ کی بنیاد بھی رکھتے تھے۔ اور اسطرح مرکز اسلامی قایم ہو جاتا تھا۔ اور نورانیت کا سرچشمہ بہنے لگتا تھا۔ حضرت مولانا برہان الدینؒ، حضرت ملک ابراہیمؒ، پاتح اللہ اور دیگر بزرگانِ طریقت کے پچھلے اوراق میں بیان کئے ہوئے واقعات سے یہ سب کچھ اخذ ہوتا ہے۔

(۵) چونکہ ہندوؤں اور بدھوں میں عام طور پر گانے بجانے کا رواج تھا۔ بلکہ اسکو وہ اپنی ایک بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ لہٰذا صوفیائے کرام نے بھی انھیں دعوتِ اسلامی دینے کیلئے جمع کرنیکا اسی کو ایک کامیاب طریقہ سمجھا اور ہندوستان کے چشتیہ طریقہ کے انداز میں قوالی کا آغاز کرا دیا۔ اور مقامی زبان میں وحدتِ خدا اور نور حق کی تعریف یعنی نعت اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقِ انسانی کو بلند تر کرنے والی روحانی نظمیں گوانی شروع کر دیں، جن کے ذریعہ طالبان حق کو خود بخود ہدایت کی طرف آنے کی ترغیب محسوس ہوتی تھی، جیسا کہ پچھلے اوراق میں کہیں گزر چکا ہے یہ طریقہ آج بھی انڈونیشیا

نواح میں پھیلتا جا رہا تھا۔ بالآخر دیماک کے نو مسلم سوداگروں میں ایک نوجوان دین تورَدَم کو جو سونان گیری کے عقیدت کیشوں میں سے تھا اک دم جوش آگیا، اور اپنے ہم مشرب سوداگروں، اور نوجوانوں کو اکٹھا کر کے ایک فوج تیار کرلی جس میں سوداگروں کے علاوہ ان اولیاء کے عقیدت مند ملکی سپاہی بھی تھے غرض فوج کی کمان دیماک کے ایک جرنیل خاندان کے سربراہ، ریڈن پاتح، کے سپرد کر کے مبارزت شروع کردی، ریڈن پاتح، نہایت ہی آزمودہ کار جرنیل تھا، جنگ کے فنی اوصاف کے علاوہ روح اسلامی سے بھی متصف تھا: مجاپائٹ کی آخری ہندو یادگار ریاست دیماک پہ حملہ آور ہوا اور ایک خونریز جنگ کے بعد کامیاب ہوگیا۔

---

میں پایا جاتا ہے۔

(۶) اس نواح کے مبلغین اسلام کا ابتدائی زمانہ میں کامیاب طریقہ ایک یہ بھی تھا کہ وہ حکمراں خاندانوں کی تردلید و سیاست میں کبھی اپنے آپ کو نہیں الجھاتے تھے ملکہ خاموشی کیساتھ اپنی تبلیغ میں لگے رہتے تھے۔ جیسا کہ بحر ماسین، نواح بورنیو، سیلیبس اور دیگر جزائر کے پرانے حالات سے بظاہر ظاہر ہے۔ امراء جب اسلام میں آجاتے تھے تو خود بخود سیاست کا رخ ظلمات سے نور اسلام کی طرف ہوجاتا تھا۔

(۷) نو مسلم صاحب استطاعت ہونیکے باعث بیت اللہ اور بیت الرسول کی زیارت سے مشرف ہونے کی خاطر حجاز کا سفر حج کرنے اور جب وہاں سے لوٹ کر آتے تو انکے دلوں میں خود بخود دینی روح پیدا ہوجاتی کہ لوٹنے کے بعد وہ اپنے اپنے حلقوں میں تبلیغ کے اس فرض کو انجام دیتے، چنانچہ دمد درا، اور زیادہ مشرقی جزائر میں اسلام کی تبلیغ زیادہ تر نو مسلموں کا کارنامہ ہے۔

(۸) اس میں شک نہیں کہ اس نواح میں پہلے پہل آنے والے غیر ملکی مبلغین اسلام جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اونچی قسم کے عالم ہونے کے علاوہ روحانی کمال کے باعث بے انتہا ہمدرد، بے لوث، بے غرض، سچے اور اچھے کردار کے افراد ہوتے تھے، جنکے ذاتی نمونوں نے بھی عوام سے اپیل کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ مگر سب سے بڑی وجہ اسلام کے پھیلنے کی اور اسکی تبلیغ کی کامیابی کی خود اسکا اپنا وجود ہے۔ جو صاف، سادہ اور عام فہم تعلیمات پر مبنی ہونے کے سبب ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور خوفِ خدا کے ذریعہ اخلاق و کردار کو سنوارنے اور روحانی بلندی سے عزتِ نفس کے مقام عالی پر فائز ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور معرفت الٰہی کے حصول کا طریقہ بتاتا ہے کہ جسکے بغیر انسانی حیات اپنے کمال پر نہیں پہنچ سکتی، امن قائم نہیں ہوسکتا، نیکی اور گناہ کا فرق سمجھ میں نہیں آتا جو انسان اور حیوان کی بین الدرجاتی تمیز پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اس نورانی روشنی کے سامنے بحر الکاہل کے اس نواحی ساحل پر کسی قسم کی ظلمات بھی نہ ٹھہر سکی اور ہر جزیرہ میں اسلام کا اجالا ہوتا چلا گیا۔ جس نے بعد میں یہاں کی سیاست اور سیادت میں بھی ایک عظیم انقلاب پیدا کر کے تمدن کے سرچشموں کو نتھار دیا، جن کی رمق آج یہاں کی بڑی آبادی کیلئے آب حیات ہے۔

اب آگے کے اوراق میں انھیں سیاسی اور تمدنی باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

سپاہِ دشمن کو شکست ہوئی، اور ان کا افسرِ اعلیٰ غائب ہوگیا۔

## جاوا کی سب سے پہلی مسلمان سلطنت

یہ گویا اس نواح کے اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلا معرکہ تھا جو مسلمانوں نے باقاعدہ جیتا۔ اور اس کی جیت کے بعد اپنے سردار "ریڈن پاتح" ہی کو زمامِ حکومت سنبھالا کر اپنا حکمراں تسلیم کرلیا، (اسی عہد کی لکھی ہوئی) ایک اندونیشی کتاب "بَابَت تَانَا جَاوِی" سے واضح ہے کہ یہ جاوا کا سب سے پہلا مسلمان حکمراں گذرا ہے (اس کی یہ جنگ کس سن میں ہوئی کچھ پتہ نہ چل سکا) جس نے نہایت ہی تزک وشان کے ساتھ سنہ ۱۵۲۰ء تک اپنی اس نئی سلطنت "دِیمَاک" (واقع مشرقی جاوا) میں حکومت کی باطل پرست آس پاس کے سارے علاقے خالی کرکے مشرقی جاوا کے انتہائی حصوں مثلاً "پَنَارُوکان" "پسُورُوان"، "بَلَمبَنگَن" (جس کا ایک قصّہ پچھلے صفحہ کے نوٹ میں گذرچکا ہے) میں اپنی طاقت اکٹھی کرنے کے خیال سے چلے گئے۔ اور پھر وہیں سے لڑائی کی تیاریاں کرتے رہے۔

## ریڈن پاتح کے جانشین

البتہ ریڈن پاتح کے جانشین جن میں سب سے پہلا اس کا لڑکا "پَنگیرَان سَب رَنگ لُور" تھا اور سنہ ۱۵۲۰ء میں باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تھا نہایت ہی قابل اور لایق تھا۔ پرتگیزی مورخین نے اس حکمراں کا نام 'پاتح یونس' بھی لکھا ہے۔ اور اسے جپارا کا حکمراں بتلایا ہے۔ ان پرتگیزوں میں مشہور مورّخ "ٹام پائرس" کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حکمراں 'پاتح یُونس' نے پرتگیزوں کو مشرق سے خارج کرنے کے لئے جزیرۂ نما ملکا پر بھی چڑھائی کی تھی۔ مگر وہ اس

لڑائی میں ہار گیا اور اس کے ہاتھ سے جپارا بھی نکل گیا چنانچہ وہ پھر دیماک چلا آیا اور بالآخر ۱۵۲۳ء میں لاولد مر گیا۔

## تخت نشینی کی جنگ

اس حکمراں کی وفات کے بعد اس کے بھائی اور چچا جو ابھی تخت کے دعویدار موجود تھے آپس میں لڑنے لگے چنانچہ اس کا ایک بھائی پنگیران سگار سید دے پن، جو حکمراں بن گیا تھا اپنے چچا "ریڈن ترنگ گانون" کی سازش سے ختم ہو گیا۔ اور اب اس کے بجائے "ریڈن ترنگ گانون" حکمراں ہوا۔ جو نہایت ہی صاحب حوصلہ شخص تھا، اسے پرتگیزیوں کی تبلیغ عیسائیت سے بڑا خطرہ محسوس ہوا لہٰذا اس نے تمام مغربی حصہ جسے علاقہ "سنڈا" کہتے ہیں فتح کر لیا اور اپنا علم نصب کر دیا (اس کا حال آگے بیان کیا جائے گا) غرض یہ فتح ترنگانو نے اپنے مشہور جرنیل اور بہنوئی "پاتح ہلا" کے ذریعہ سے حاصل کی تھی۔

## سلطنت بانتن کا قیام

چنانچہ "پاتح ہلا" نے اس سنڈا کے علاقہ کو فتح کر کے اس کے مشہور تجارتی مرکز بانتن، میں (جو گرم مصالحہ کی

---

## لہ پاتح ہلا کی کہانی

یہ کہانی "مسٹر آر۔ ایم۔ اے" نامی ایک انڈونیشی کی لکھی ہوئی ہے اور حکومت انڈونیشیا کے مشہور پرچہ "انڈونیشین ریویو" ماہ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں (Mystic of Java) کے زیر عنوان شائع ہوئی تھی۔ اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔ (آپ کا حال پچھلے اوراق میں صفحہ ۲۹۸ کے فٹ نوٹ پر بھی گزر چکا ہے)

"آپ ایک بہت بڑے عالم اور صوفی تھے، سیاحت کا بھی بڑا ذوق تھا، اشاعت اسلام کے ذوق میں دنیا کے نوادرات کا مشاہدہ کرتے پھرتے تھے۔ اتفاق سے آپ کا گذر ملک چین میں بھی ہوا۔ شاہ چین نے آپ کے کرامات روحانی کا بڑا چرچہ سن رکھا تھا، لہٰذا امتحان لینے کے لئے دربار میں طلب کیا، اور ایک پر تکلف دعوت ترتیب دی۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اپنی ایک نا کتخدا

تجارت کا مرکز تھا اور پرتگیزیوں کے خطرہ سے خالی نہ تھا) ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی جو "سلطنت بانتن" کہلاتی ہے۔ (یہاں کا سابق حکمراں ہندو تھا لہٰذا اس کی حکومت "پجاجاران" کہلاتی تھی) جس کا دارالحکومت "سنڈا کلاپا" تھا) سلطان نے اب اس شہر کا نام "جایاکرتا" رکھا۔ جو عربی میں "جاکرتا" اور انڈونیشی زبان میں جکارتا تلفظ کیا جاتا ہے۔
۱۵۲۵ء میں "پاتح ہلا" پر مذہب اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کا غلبہ طاری

لڑکی کو مصنوعی طور پر حاملہ کی صورت میں طلب کرکے حضرت سے سوال کیا کہ بتلائیے اس کے بچہ کتنے دن میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ لڑکی ناکتخدا تھی بچہ کے پیدا ہونے کا سوال ہی کیا ہو سکتا تھا، مگر آپ نے فرمایا کہ خدا چاہے گا تو بہت جلد ہو جائے گا، راجہ یہ سنکر بدظن ہوگیا اور آپ کو دربار سے نکلوا دیا۔ بلکہ حدودِ چین سے بدر ہوجانے کا حکم نافذ کردیا۔ آپ جہاز میں بیٹھکر جاوا کو چلے آئے اور چریبون کے ساحل پر قیام فرمایا، اتفاق کی بات ہے کہ ادھر کو شیخ نکالا جارہا تھا اور ادھر لڑکی کے دردِ زہ اٹھنا شروع ہوا، اور ایک لڑکا پیدا ہوگیا، بادشاہ نے لڑکا تو چھین لیا اور لڑکی کو معتوب قرار دیکر ملک بدر کر دیا، چند ہرکاروں کے ساتھ ایک کشتی میں سوار کرا دیا۔ یہ ماہی گیروں کی کشتی تھی، اتفاق سے طوفان اٹھا اور کشتی اس طوفان میں تیزی کے ساتھ بہتی بہتی چریبون کے ساحل پر جا پہنچی، وہاں "پاتح ہلا" ساحل پر گھوم رہے تھے اور غروب آفتاب کا پرلطف نظارہ دیکھ رہے تھے، لڑکی اتری اور آپ کو پہچان کر قدموں پر نثار ہوگئی، اور اپنی سرگزشت سنا کر آپ کی زوجیت میں آنے کی طلب گار ہوئی، بالآخر آپ نے ترس کھا کر اس کے ساتھ عقد کر لیا اور تاحین کی زندگی بسر کرنے لگے، اس عورت کے بطن سے پھر ایک لڑکا پیدا ہوا جو مولینا حسن الدین کے نام سے مشہور ہے۔ اور آپ کے بعد آپ کا جانشین بنا۔ حالانکہ کتبِ تواریخ میں آپ کو سلطان دیماک کا بھنوئی قرار دیا ہے اور اس چینی کہانی سے حسن الدین کی ماں چینی شہزادی ہے۔

اس قدر ہوا کہ تختِ سلطنت چھوڑکر اور اپنی جگہ اپنے لڑکے "مولینا حسن الدین" کو سلطان بانتن بناکر "چریبون" چلے آئے اور اٹھارہ سال تک اشاعتِ اسلام کی زرین خدمات انجام دیتے رہے حتیٰ کہ ۱۵۷۰ء میں وفات ہوگئی، اور "گننگ جاتی کے پہاڑ پر دفنائے گئے، آپ جاوا کی تاریخ اشاعتِ اسلام میں بہت بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔ اور نوا ولیاء میں شمار ہوتے ہیں اب اہلِ جاوا آپ کو "سونان گننگ[۱] جاتی" کہکر پکارتے ہیں۔

بہرحال "سلطان حسن الدین" اس سلطنت (بانتن) کے تخت پر ۱۵۷۰ء تک متمکن رہا۔ نہایت ہی دیندار، قابل اور صاحب علم حکمراں گذرا ہے، خاندان سے چونکہ علم اور درویشی متوارث تھی لہذا حکومت بھی نہایت ہی عدل وانصاف کے ساتھ کی، "لمپونگ" کا علاقہ بھی فتح کیا، اور "اندراپورہ" کی شہزادی کے ساتھ شادی کرنے سے "سالیبار" کی بھی حکومت حاصل کرلی۔ جہاں گرم مصالحہ کثرت سے پیدا ہوتا تھا۔ اس طرح سلطان حسن الدین کے عہد میں تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا، اور بانتن گرم مصالحہ کی بہت بڑی منڈی بھی بن گیا، لوگ ملکا، سیلون، ہندوستان (گجرات)، خلیج فارس اور چین سے بھی تجارت کے لئے آنے لگے، حتیٰ کہ پرتگالی بھی آنے جانے لگے۔

سلطان کو چونکہ دینی امور کی طرف زیادہ رغبت تھی لہذا مسجدیں، مدرسے

---

[۱] کرافورڈ نے اپنی تاریخ جلد دوم کے صفحہ ۳۱۶ پر آپ کے چریبون آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں پر آپ نے اپنے لئے سلطنت قایم کی تھی جو "سلطنتِ چریبون" کہلاتی ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے دوسرے لڑکے نے "جایاکرتا" کی حکومت قایم کی جو سترہویں صدی تک قایم تھی۔ اسی صدی میں ولندیزیوں نے اسے فتح کیا تھا۔

اور سرائیں کثرت سے تعمیر ہوئیں، باغات لگائے گئے۔ علمائے اسلام کی بڑی عزت کی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ سلطان کے زمانہ میں مکہ مکرمہ اور دیگر مقامات سے علمائے اور صوفیاء کثرت سے جاوا کے اس علاقہ میں آنے لگے، تصوفِ اسلام اور عربی علم وادب کو بھی یہاں پھیلنے کا کافی موقع ملا۔ سلطان خود عربی جانتا تھا، لہٰذا مقامی علم وادب پر بھی اس کا کافی اثر پڑنے لگا۔

۱۵۷۰ء میں یہ سلطان (حسن الدین) بھی اپنے باپ کی طرح تخت وتاج سے دست بردار ہوکر مبلغِ اسلام، بن گیا۔ اور اپنے لڑکے 'پنگیران یوسف' کو سلطان یوسف کے لقب سے تخت پر بٹھلاکر خود گوشہ نشین ہوگیا۔ یوسف نے بانتن میں ۱۵۸۰ء تک حکومت کی اس کے زمانہ میں مغربی جاوا کے علاقہ 'پکوان' کے مقام پر برہموں کی ایک چھوٹی سی ریاست قایم تھی لہٰذا اس ریاست نے اِدھر اُدھر کے بھاگے ہوئے ہندؤوں کو جمع کرکے مسلمانوں کے خلاف آویزش شروع کی چنانچہ سلطان خود ۱۵۷۹ء میں اس کے خلاف میدان میں آیا اور لڑائی شروع ہوگئی، یوسف کی طاقت غیر معمولی تھی لہٰذا یہ بدھ اور ہندو اس کے مقابلہ پر نہ ٹھیر سکے اور بالآخر ہار گئے، مورخین نے لکھا ہے کہ یہ اس نواح کی آخری 'ہندو بدھ' ریاست تھی لہٰذا اس کے خاتمہ سے یہاں سے بدھ اور ہندو اثر بھی ختم ہوگیا اور لوگ آہستہ آہستہ خود بخود اسلام میں آتے چلے گئے۔

سلطان یوسف بھی اپنے دادا اور باپ کی طرح نہایت ہی قابل اور لایق حکمراں گذرا ہے اس کے عہد میں 'سلاطینِ بانتن' کی اسلامی روایات برقرار رہیں، نظم و نسق، علم وحرفت اور تجارت کو بھی کافی ترقیاں پہنچتی رہیں۔

۱۵۸۰ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بھائی "پنگیران جپارا" (یعنی جپارا کا شہزادہ) جسے وہاں کی حکمران "راتو کالی نعمت" نے (جس کا حال آگے آئے گا) متبنیٰ کر لیا تھا فوج لیکر بانتن آ پہنچا اور سلطان مرحوم کی تجہیز و تکفین کے بعد زمام سلطنت کا دعویٰ کرنے لگا۔ حالانکہ سلطان مرحوم کا کمسن بچہ "مولینا محمد" موجود تھا، چنانچہ دونوں فریقین کے درمیان جھگڑا ہوا، دربار کے امراء سب "مولینا محمد" کے ساتھ تھے لہذا "شہزادہ جپارا" کی پیش نہ گئی اور وہ بے نیل و مرام بھاگ گیا۔ اور "مولینا محمد" سلطان محمد کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے بعد اس کم عمر سلطان نے اپنا ایک نیا لقب "کنجنگ راتو بنتنگ" اختیار کیا۔

یہ حکمراں بھی نہایت دلیر اور حوصلہ مند گذرا ہے۔ اس کے زمانہ میں بانتن نے بحری بیڑہ کی حیثیت سے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ یہ سلطان یورپیوں کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے مستقر "ملکا" پر چڑھائی کا منصوبہ باندھا اور "ملکا" پہنچنے سے پہلے اپنی آسانی کے لئے سماترا فتح کرنا چاہا چنانچہ ۱۶۰۵ء میں "پلیم بنگ" پر حملہ کر دیا "پلیم بنگ" کے محاذ پر فریق سے خونریز لڑائی ہوئی، قلعہ قریب الفتح تھا کہ اک دم کسی دشمن نے سلطان کو دہوکہ سے قتل کر دیا اور اس طرح اس کی فاتح فوج ناکام ہوکر واپس لوٹ آئی۔ اگر ایسا اتفاق نہ ہوتا تو یقیناً اس نے سماترا کو فتح کر لیا ہوتا اور پھر اس کی فتح سے ملکا پر چڑھائی کر کے اہلِ یوروپ کو بھی بھگا دیا ہوتا مگر کامیابی اس کی قسمت میں نہ تھی۔

**سلطنت کا آخری دور**

بہرکیف اس کی اس موت کے بعد اس کے امراء نے اس کے ایک ۵ ماہ کے بچّہ کو جس کا

نام 'ابو المظفر' تھا سلطان بناکر اپنے ہی گروہ میں سے 'جَاپَاپنگارا' کو اس کا اتالیق مقرر کردیا۔ یہ زمانہ سلطنت بانتن کی تاریخ کا انتہائی خطرناک بلکہ ہولناک ترین دور گذرا ہے۔ کیونکہ اسی زمانہ میں ولندیزی اس نواح میں وارد ہوئے تھے اور خونریز لڑائیوں کے ساتھ اس کو ختم کرنے میں کامیاب ہوکر پہلی بار اسی طرف حکمراں بنے تھے، بانتن کی حکومت ختم ہوگئی اور ولندیزی قابض ہو گئے (جس کی تفصیلات فصل پنجم میں ولندیزی دور کے ساتھ بیان کی گئی ہیں)۔

اب بیان کے تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہوئے مشرقی جاوا کی اس ابتدائی اسلامی سلطنت کے حالات پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے جس کا بیان سلطنت بانتن کے قیام سے قبل 'ترنگ گانوں' کے حملہ سنڈا کلاپا' میں نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا۔

**ترنگانو ۱۵۴۶ء**
**(بہ سلسلۂ دِیماک)**

بہرحال "ترنگانو" (جس کا کچھ حال صفحہ ۳۰۱ پر گذر چکا ہے) سلطنت دِیماک، کے تخت پر ۲۵ سال تک متمکن رہا۔ یہ نہایت ہی دلیر اور قابل حکمراں تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ جاوا کی پہلی مسلمان سلطنت دور و دراز مقامات تک پھیل کر وسیع و عریض ہوجائے چنانچہ اس نے "شوبٹ یورنگ" اور اس کی نواح کے علاقے بھی اپنی مملکت میں شامل کر لئے اور اپنے افرادِ خاندان کو وہاں کی امارت پر متعین کردیا اس حکمراں کا سب سے بڑا لڑکا 'ونگیران موک من' (یعنی شہزادہ مومن) جو علوم اسلامی حاصل کرکے بہت بڑا عالمِ دین ہوا، ایک مبلغِ اسلام بن گیا اور "سونان پراوتو"، کے لقب سے ملقب ہوکر اسلامی خدمات انجام دینے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کے بار ہوگئی۔ بعد میں اس شہزادہ کی شادی مدورا کے رئیس

کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔

بہر حال "ترنگانو" کا ایک اور لڑکا تھا جو "پنگیران تیمور" (شہزادہ تیمور) کے نام سے مشہور تھا یہ بھی اپنے باپ کی طرح نہایت دلیر تھا چنانچہ اس نے اپنے باپ کے حکم سے ایک فوج لے کر "ماترم[1]" پر چڑھائی کر دی اور اسے فتح کر لیا، یہ علاقہ قدیم ہنود اور تہذیب ہنود کا مرکز تھا، یہاں پر اِدھر اُدھر کے بھاگے ہوئے ہندو رؤسا مسلمان حکمرانوں کے خلاف سازش کا ایک جال پھیلا رہے تھے۔ غرض شہزادے نے "ماترم" کو فتح کر کے یہاں پر اپنے خاندان کو آباد کر دیا۔ اسی مقام سے بعد میں ایک اور مسلمان سلطنت عروج پر آئی جو "سلطنتِ ماترم" ہی کے نام سے مشہور ہوئی (جس کا تفصیلی حال آگے کے اوراق میں بیان کیا گیا ہے)۔

بہرکیف "ترنگانو" نے اپنے وقار کو بڑھانے کے لئے اپنی رشتہ داریاں ادھر ادھر کے دیگر مسلمان رؤسا کے ساتھ بڑھانی شروع کیں۔ ان رشتہ داریوں میں اس کی لڑکیوں[2] کی شادیاں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ "ترنگانو" نے ۱۵۴۶ء میں

---

**[1] ماترم کا نام** "ماترم" کا لفظ ایک قدیم خانوادۂ شاہی کے فرد "بُرجی ماترم" کے نام سے نکلا ہے، یہ نام رفتہ رفتہ مقام کا نام بھی بن گیا۔ چنانچہ قدیم ہنود کی تاریخ میں یہ سلطنت کا بھی نام رہا۔ اب پھر اس نام کی مسلمان حکومت قایم ہوئی بات یہ تھی کہ اب اسی عہد سے فتوحات کے بعد "ترنگانو" کے شاہی افراد یہاں رہنے لگے، اور پھر اسی نام سے مشہور ہو گئے۔

[2] "ترنگانو" کی کئی لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی شادی "ہاؤیری" کے شہزادہ "کالی نعمت" کے ساتھ کی تھی جو بعد میں "راتو کالی نعمت" (یعنی ملکہ کالی نعمت) کے لقب سے مشہور ہوئی۔ اس ملکہ نے پرتگالیوں کو "ملایا" سے خارج کرنے کے لئے "جوہور" اور "آچیہ" کے سلاطین

جو اس کے عہدِ حکومت کا آخری سال ہے۔ "پسُورُوان" کی ہندو سلطنت پر حملہ کیا، کیونکہ یہ سلاطین "دِمِاک" کا قدیم وطن تھا۔ چنانچہ اس پاس کے ہندو روسا "پسُورَوان" کے حکمراں کی مدد کے لئے "ترِنگانو" کے خلاف کثیر تعداد میں آپہنچے اور اس طرح ایک خوفناک جنگ شروع ہوگئی۔ "ترِنگانو" فتح پانے ہی والا تھا کہ اسے اسی کے کسی غلام کے ذریعہ ہندو فریقین نے قتل کروادیا اور اس طرح یہ جنگ بے نتیجہ ہو کر رہ گئی۔

## سلطنتِ پاجانگ کا عروج

سلطنتِ دِمِاک کے اس حکمراں کے اچانک طور پر قتل ہو جانے کے بعد تخت نشینی کے سلسلہ میں شاہی خاندان کے افراد آپس میں لڑنے لگے۔ مگر قاعدہ کی رو سے متوفی حکمراں کا سب سے بڑا لڑکا "سونان پراوتو"، جو ولیعہدی کے زمانہ میں "پنگیران موُمن" کے لقب سے ملقب تھا تخت نشین کیا گیا مگر جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے یہ ایک

---

کی مدد کی تھی۔

دوسری لڑکی چربون کے شہزادہ "پنگیران پسُورُوان" کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ "چربون" اس وقت ایک دوسری مسلم حکومت کا مرکز تھا، یہاں پر "پاتح ہلا" کا ایک فرزند برسرِ اقتدار تھا۔

تیسری لڑکی کی شادی "پنجنگ" (جو بعد میں پاجانگ کہلایا) کے ایک رئیس "کِی کے بوکے تونگو" کے لڑکے "پنیتجی ماس آدی پایو" کے ساتھ کی یہ کی کے بوکے تونگو وہ شخص ہے جس کو "سونان قدوس" نے ریڈن پاتح کو اپنا سلطان اعلیٰ تسلیم نہ کرنے کے باعث ایک معرکہ میں قتل کر دیا تھا۔ یہ رئیس ہندو تھا مگر اس کا لڑکا بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔

درویش صفت اور فقیر منش انسان تھا نہایت ہی سادگی کی زندگی گذارتا تھا اور ہر ایک پر اعتبار کر لیتا تھا، بالآخر موقع پا کر ایک روز اپنے ایک بھتیجے "آریوپنیان سانگ" کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے پس ماندگان میں ایک شہزادہ 'آریوپنگیری' تھا جو ابھی کم عمر تھا (مقتول حکمراں سونان پراؤتو کے بھنوئی) "کالی نعمت" کی مدد سے حکمراں بنا یا گیا۔ چنانچہ "آریوپنیان سانگ" نے کالی نعمت اور اس کی بیوی 'راتو کالی نعمت کو بھی موقع پا کر قتل کرا دیا۔ اور کم عمر شہزادہ کو برطرف کر کے خود حکمراں بننے کی کوشش کرنے لگا، مگر چونکہ حالات بالکل بدل گئے تھے لہذا ان بدلے ہوئے حالات میں اس کم عمر شہزادہ کا ایک پھوپھا (یعنی ترنگانو کا داماد) گورنر پاجانگ 'کیمی آدی دیایو' میدان میں نکل آیا اور اس نے 'آریوپنیان سانگ' کی اچھی طرح خبر لی۔ حتیٰ کہ اسے لڑائی میں مار ڈالا۔ اس فتح کے بعد وہ اس کم عمر حکمراں 'آریوپنگیری' کو لے کر "پاجانگ" چلا گیا اور پاجانگ ہی کو مرکزِ حکومت بنوا دیا۔ خود چونکہ اس نواح کا ایک رئیس تھا لہذا اس کا اثر اب اور بھی بڑھ گیا، اس نے پھر اپنی لڑکی بھی اس کم عمر حکمراں کے ساتھ بیاہ دی۔ ادھر دیماک کو خالی اور مرکز سے فاصلہ پر دیکھ کر ترنگانو کا ایک داماد 'ننگر' حاکم بن بیٹھا۔

## وسطی جاوا میں اسلامی تہذیب و تمدن کا نیا مرکز

دیماک کے بجائے اسلامی حکومت اور تہذیب کا بڑا مرکز وسطی جاوا (جہاں یہ پاجانگ واقع تھا) بن چکا تھا اور چونکہ وسطی جاوا اس وقت تک ہندو تہذیب کی روایات کا حامل تھا لہذا سیاسی اعتبار سے ہندو اثر تو کم ہوتا چلا گیا مگر ہندو فلسفہ اور خیالات کے بعض اجزا مسلمانوں کے تمدن میں شامل

ہو گئے۔ تصوف، جو اس طرف اسلام کی اشاعت کا ایک خاص ذریعہ تھا بہت سے ہندو خیالات کے امتزاج سے بالکل نئے رنگ میں تبدیل ہوگیا۔ جس کی روح تو اسلامی رہی مگر ہیئوئی (یعنی اس کی اصطلاحات وغیرہ) مقامی بن گیا۔

غرض پاجانگ کا یہ نیا حکمراں سلطان پاجانگ کے نام سے مشہور ہوا جس نے ۱۵۸۶ء تک حکومت کی۔

اب ادھر 'دیماک' کے مقام پر بھی وہاں کے حاکم 'لنگر' کے خلاف اہل ملک نے بغاوت شروع کر دی۔ اور سلطان 'پاجانگ' سے اس سلسلہ میں مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ سلطان پاجانگ نے آدی ویایو (یعنی اپنے خسر) کے ایک متبنیٰ کئے ہوئے لڑکے "سوتو ویایو" (جو اب فوج میں بڑا افسر تھا اور آگے چل کر 'سنوپاتی' کے نام سے مشہور ہوا ہے اور اس عہد کی تاریخ میں بہت ہی اہم شخصیت شمار کیا جاتا ہے) کو فوج دے کر روانہ کر دیا۔

## سنوپاتی ۱۵۷۸ء تا ۱۶۰۱ء

چنانچہ لڑائی ہوئی اور یہ کامیاب ہو کر اپنے ولی نعمت کے دربار میں پہنچا۔ اس کی کامیابی پر جشن منائے گئے اور خوشیاں کی گئیں، اور اسی طرح اس کا اعزاز بھی بڑھا دیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ جنرل یعنی 'سنوپاتی' مقرر کر دیا گیا۔ تاریخ میں وہ اسی لقب سے مشہور ہے چونکہ اس کا اور اس کے تین جانشینوں کا زمانہ تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے ان کے حالات پر جداگانہ طور سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

بہرحال یہ سنوپاتی آگے چل کر جاوا کے مشہور اسلامی خاندان 'ماترم' کا نامور حکمراں گذرا ہے۔ نہایت باحوصلہ، اولوالعزم، صاحب بصارت، صاحب

بصیرت، باہمت اور اعلیٰ قسم کا جنگجو شخص تھا، باہیبت و بارعب بھی تھا، اور ۱۵۷۵ء سے اپنے باپ "کیائی آگنگ پمانا ہن" (جو خاندانِ ماترم کا سب سے پہلا سردار مانا جاتا ہے اور جو شروع میں اسلام سے قبل مجاپاہت کے ہندو حکمران بردوِجایو کی اولاد ہی سے تھا اور سلطان پاجانگ کا ایک باجگذار حاکم بھی رہ چکا تھا) وفات کے وقت ایک نیا لقب "اِنگ آلوکو سینیڈنگ پانوتوگومو" (جو خلیفہ کے مترادف ہے) اختیار کرکے بہت زیادہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ "آدی وِجایو" (یعنی اپنے قدیم آقائے نعمت اور گورنر پاجانگ) کی نگاہوں میں مشکوک ہوتا چلا گیا اور بالآخر ایک خاندانی نزاع کے سلسلہ میں جلاوطن کر دیا گیا مگر چونکہ سپاہ اس کے ساتھ تھی اور شہر کے لوگ بھی اس کے ہمنوا تھے اک دم بغاوت بھڑک اُٹھی، اور بالآخر "آدی وِجایو" اس بغاوت کے انہراجی حالات میں مارا گیا۔ پاجانگ کے حکمران نے بھی اپنا جانشین ایک دوسرا شخص مقرر کر دیا تھا جو کسی حال میں بھی ہر دلعزیز نہ تھا لہٰذا لوگ اب "سنوپاتی" کے پاس مجتمع ہونے لگے اور شکایاتِ روزگار کرنے لگے آخر اس حاکمِ وقت "پنگیران بونو" نے اپنی نااہلیت کا خود ہی اعتراف کرتے ہوئے تخت و تاج چھوڑ دیا اور "ماترم" کے اس غیر معمولی قابل اور لایق سپاہی "سنوپاتی" کے سپرد کر دیا۔

## ماترم کی سلطنت کا قیام ۱۵۷۸ء

اس طرح "سنوپاتی" ۱۵۷۸ء میں حکمراں بنا وہ خاندانِ ماترم کا چشم و چراغ تھا لہٰذا اس کی یہ تخت نشینی خاندانِ ماترم کی سب سے پہلی حکمرانی ہے۔ جس میں آگے چل کر "سلطان اگنگ" نامور ترین حکمراں گذرا ہے۔

بہرحال "سنوپاتی" نے حکمراں بنجانے کے بعد اپنا دارالحکومت "پاجانگ"

سے بدل کر 'ماترم' کر لیا۔ جو کسی زمانہ میں پہلے بھی عہدِ ہنود کا بڑا گہوارۂ تہذیب رہ چکا تھا" اہلِ ماترم" نے اس کا بڑا خیر مقدم کیا اور حکمراں ماننے کے علاوہ اسے اپنا رہنما بھی تسلیم کر لیا اور خراجِ عقیدت پیش کرنے کے سلسلہ میں صورت یہ کی کہ اسی سال جلوس کے آغاز ہی میں "خور دمرتانی" (دانا ترین افراد) کے خطاب سے مشرف بھی کیا۔

'سنوپاتی' کے باب میں کرافورڈ (صفحہ ۳۳۳ پر) لکھتا ہے کہ "یہ اسلام کا فرزند قدیم ہندو مجاپائت کے خاندان کی تیسری پشت میں تھا، 'سنوپاتی' (یعنی کمانڈر انچیف یا جرنیل) اس کا لقب نہ تھا بلکہ شاہی خطاب تھا جو اسے سلطان 'پاجانگ' کے دربار سے مرحمت ہوا تھا" اب خود بادشاہ بن جانے کے بعد اس نے ایک خاص لقب 'دنیم باہان' اختیار کیا شروع کے دس سال نہایت ہی شان کے ساتھ حکومت کرتا رہا مگر اس کے بعد ۱۵۸۶ء سے ۱۶۰۱ء تک مختلف فتوحات کے سلسلہ میں خوفناک لڑائیوں میں بھی مشغول رہا۔ حتیٰ کہ پھر ۱۶۰۱ء میں مر گیا۔

یہ بہت بڑا فاتح تھا، اس نے تمام مشرقی اضلاع فتح کر لئے تھے،

---

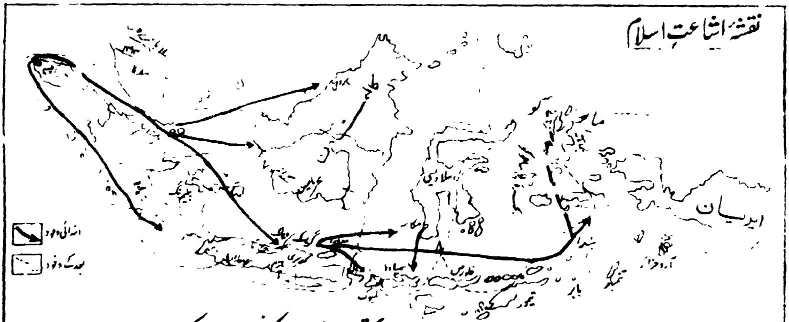
لہ **سلاطینِ ماترم** یاد رکھنا چاہئے کہ قدیم انڈونیشیا کی اسلامی تاریخ میں 'ماترم' نہایت ہی شاندار خاندان گذرا ہے۔ اس خاندان کا عہدِ حکومت وسعتِ سلطنت کے علاوہ اور قریب قریب تمام باتوں میں ہندو مجاپائت کی طرح انتہائی عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، اندرون جاوا میں اس خاندان کے ماتحت فتوحات بھی کافی ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ شروع کے چار حکمراں تو اس پایہ کے گذرے ہیں کہ انھوں نے ایک سو سال کے عرصہ میں ماسوا بانتن کے قریب قریب تمام جاوا اپنے زیر نگیں کر لیا تھا۔ 'چریبون' بھی ان کا باجگذار ہو گیا تھا۔

جنوب میں "کیدیری"، تک جا پہنچا تھا، اس کی حدود ہندؤں کی آخری کمیں گاہ "
"پسوروان" تک جا پہنچی تھی۔ اس کے جزیرۂ مدورا کے خود مختار حکمراں "مڈیون"
اور "پرونوروگو"، کو بھی شکست دے کر اپنی سلطنت میں ضم کر لیا ۱۵۹۹ء میں جزیرۂ بون
کے جنوب میں گاتواہ بھی فتح کر لیا۔ اس اثناء میں "پسوروان" کے ہندو حکمراں نے
سر اٹھایا چنانچہ "سنوپاتی"، خود اس کی سرکوبی کے لئے گیا، بلیم بنگن کا ایک بھاگا
ہوا پرانہ ہندو سردار بھی اس ہندو حکمراں کے ہاں مدت سے پناہ گزیں تھا لہذا
وہ بھی میدان میں نکل آیا، مگر یہ سب ہار گئے اور سب سنوپاتی کے ساتھ صلح
کر کے مل گئے۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ جو اس کے عہدِ حکومت کے عجائبِ واقعات
میں مشہور ہے ایک خطرناک زلزلہ کا آنا بیان کیا جاتا ہے جس کے سبب تین دن تک
جاوا میں سخت طوفان آیا اور ہزاروں آدمی موت کے نذر ہو گئے۔

بہر حال "سنوپاتی"، ۱۶۰۱ء میں مر گیا، اس کی وفات کے بعد اس کے وزیر
"مونڈورکو" نے اس کے چھوٹے لڑکے "مس جولانگ" (خالص سونا) کو تخت پر
بٹھلایا جس کا حقدار اصولِ سلطنت کے اعتبار سے اس لڑکے کا بڑا بھائی (یعنی
سنوپاتی کا بڑا لڑکا) "پنگیران پوگر" تھا۔ مگر وہ مصالحِ وزارت کے باعث محروم
کر دیا گیا تھا۔

بہر حال اس حکمراں نے ۱۶۰۱ء میں تخت نشین ہونے کے بعد "پنیم باہان
کرپ چک" کا لقب اختیار کیا اور صرف ۱۶۱۳ء تک حکمراں رہا ہے، اس کے زمانہ
میں معمولی قسم کی فتوحات اور بغاوتیں ہوتی رہیں۔ یہ سنوپاتی کی طرح زیادہ ہوشیار
حکمراں نہ تھا، اس کے بعد بھی اس کی خود کی تخت نشینی کی طرح بڑے لڑکے

"مسترنگ سنگ"، کو محروم کرکے چھوٹے لڑکے "ریڈن مارتوپورو" کو تخت پر بٹھلا دیا گیا تھا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی "سسترنگ سنگ" "سلطان اگنگ" کے لقب سے اپنے بھائی کو ہٹا کر خود تخت نشین ہو گیا۔ یہ ماترم کی تاریخ کا سب سے بڑا حکمراں مانا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں جاوا کے اسلامی اقتدار کو بھی بڑا عروج ہوا اور اسلام کا تمدن بھی دور دراز کے جزیروں میں جا پہنچا، اسی اعتبار سے اس عہد کے حالات کو ایک خصوصی باب کے ماتحت بیان کیا جاتا ہے۔




انڈونیشیا میں عہد اسلام کے آغاز میں مبلغین اسلام کے تبلیغی وفود کی نقل و حرکت

# باب چہارم

# جاوا میں اسلامی اقتدار کا عہدِ عروج

اور

# مشرقی جزائر میں اسلامی تمدن کی اشاعت

## سلطان اُگنگ کا عہدِ حکومت
## سنہ ۱۶۱۳ء تا سنہ ۱۶۴۵ء

مورخین (جن میں خود اندونیشی، ولندیزی اور انگریز مصنفین شامل ہیں) اس امر پر متفق ہیں کہ سلطان اُگنگ کے تخت نشین ہونے سے جاوا کی وہ وسیع و عریض قلمرو جو متعدد چھوٹی چھوٹی اسلامی اور غیر اسلامی سلطنتوں اور سرداریوں میں منقسم تھی، فتوحات، اثر اور رسوخ و اقتدار کے ذریعہ سے بتدریج ایک شہنشاہ کے ماتحت آگئیں، فتوحات کو کافی فروغ ہوا، تہذیب و تمدن کی بھی مختلف شاخیں پھلی پھولیں اور ایک مستقل انداز میں بار آور ہوئیں۔ اسی لئے یہ عہد جاوا میں اسلامی اقتدار کا عہدِ عروج خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جاوا میں اسلامی اقتدار کو قایم ہوئے اس عہد کے آغاز تک کم و بیش سو سال گذر چکے تھے، مگر تمام جاوا پورے طور سے اسلامی حکومت کا مرکز نہ تھا۔

ہندو عملداریاں بھی قایم تھیں اور وہ خودمختار تھیں، ان کی سازشوں کا سلسلہ[۱] مدتوں قایم رہا، مگر اس سلطان کے عہد میں آکر اُن کا تمام زور ٹوٹ گیا، آس پاس کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتیں بھی رفتہ رفتہ اس سلطنتِ ماترم، کے اثر میں آگئیں اس طرح ماسوا جپارا کے ساحل پربانتن کے اس علاقے کے جہاں ولندیزی آ پہنچے تھے اور وہاں کے حکمرانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر ۱۶۰۲ء میں اپنا تجارتی اڈہ قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، جاوا کا بڑا حصہ اس سلطان کے عہد میں فتح ہو چکا تھا، اسی لئے اس کے حالات ذرا کچھ اجمالی تفصیل سے بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

## پہلی بار عربی لقب کا اختیار کرنا

جیسا کہ پچھلے صفحہ پر گذر چکا ہے اس حکمراں کا نام بعہدِ شہزادگی "مسررنگ سنگ" تھا۔ ۱۶۱۳ء میں تخت نشین ہوا اور ۲۸ سال کے بعد سلطان کے لقب سے ملقب ہوا۔ (کرافورڈ صفحہ ۲۶۷) جبکہ اس کے مورثین اعلیٰ "پنہیم باہان یا آدی ماترم" کہلاتے تھے اور ان کے اخلاف کا روحانی لقب "سوسو ہونان"، (یعنی محافظینِ دین) تھا۔ سجار انڈونیشیا کے مصنف نے (صفحہ ۱۹۰ پر) لکھا ہے کہ تخت نشینی کے وقت وہ پہلے پہل قدیم روایات کے مطابق "پنہیم باہان اگنگ سنوپاتی"، کہلایا۔ مگر ایک عرصہ کے بعد ۱۶۴۱ء میں "سلطان اگنگ" (یعنی سلطانِ اعظم کا لقب اختیار

---

[۱] پسورواَن، پنارُوکان یہ دونوں مجاپاہت کی بچی کھچی ہندو آبادیاں اور سرداریاں تھیں مشرقی جاوا کے انتہائی کنارہ پر بالی کے نزدیک واقع تھیں یہاں پر ۱۶۱۳ء میں اسلامی اثر پہنچا تھا، اور ان کے آس پاس کے علاقے ۱۶۱۴ء میں فتح کئے گئے تھے۔ آجکل بھی ان علاقوں میں کچھ ہندو آباد ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)۔

گیا (جس کو موجودہ زبان میں سلطان رایا بھی کہتے ہیں) اور یہ پہلا موقع تھا کہ ماترم کا حکمراں سلطان کہلانے لگا۔ ڈاکٹر خراف (خرِ خڈ نیز کے صفحہ ۱۰۰ پر) رقم طراز ہے کہ جاوا کے قدیم اسلامی حکمرانوں میں بلکہ آس پاس کے تمام[۱] مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ باوقار تھا اور اس پایہ کا سلطان تھا کہ خود ولندیزی (جو بانٹم میں ساحل جاوا پر آ چکے تھے) اس کے خوف سے لرزتے تھے۔ اور آگے کی طرف پیشقدمی کرتے ہوئے ڈرتے

---

## مشرقی جزائر میں اسلام کی اشاعت اور اقتدار اسلامی کی عام کیفیت

محض اس وقت تک سماترا، ملکا اور جاوا ہی کے اسلام کی عام تاریخی کیفیتوں کو بیان کیا گیا ہے

[۱] آس پاس کے مسلمان حکمرانوں، سے صرف اس نواح کے مسلمان حکمراں مراد نہیں ہیں بلکہ دیگر مشرقی جزائر مثلاً مدورا، بورنیو، سلیبس، مالوکو، اور بندا کے حکمراں بھی مراد ہیں جن کے حالات اب تک پچھلے اوراق میں دقتِ تسلسل کے باعث بیان نہیں کئے جا سکے اب ان کے حالات پر بھی ذیل میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

### مُدُورا

ان جزائر مشرق میں سب سے پہلا جزیرہ مُدُورا ہے جس کے حالات کے بارے میں پہلی فصل (بابِ جغرافیہ) میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ مشرقی جاوا کے اس گوشہ میں واقع ہے جہاں اسلام کا سب سے بڑا مرکز "گریسیک" کا شہر پڑتا ہے (جس کو اہلِ عرب غرسیک لکھتے رہے ہیں) یہ جزیرہ ہمیشہ زیادہ قریب ہونے کے باعث جاوا کی تہذیب کے مراکز کا خاص آماجگہ رہا ہے، ہندو تہذیب کے باب میں بھی اکثر معاملاتِ سیاسی کے تسلسل میں اس جزیرہ کا نام جا بجا آتا ہے، بہر کیف اس جزیرہ میں اسلام گریسیک سے پہنچا اور بہت ہی شروع میں پہنچا، یہاں اسلام لیجانے والے لوگ بھی حضرت ملک ابراہیمؒ کے تھے۔ صحیح سن کا تعین مشکل ہے کیونکہ مختلف مورخین نے مختلف واقعات لکھے ہیں بہر کیف یہ ضرور مسلم ہے کہ حضرت ملک ابراہیمؒ کی وفات کے بعد پندرہویں صدی کے اواسط میں یہاں اسلام

تھے۔ مقامی حکمراں بھی اس سے بہت مرعوب تھے۔

## سلطان کی تخت نشینی کے وقت جاوا کی سیاسی کیفیت

پورا جزیرہ جاوا، چھوٹی چھوٹی بہت سی ریاستوں میں منقسم تھا، ان میں سے اکثر ریاستوں کے حکمراں قدیم مُبلغینِ اسلام کی اولاد تھے، اور اسی مناسبت کے باعث ان کا عوام پر بھی بڑا اثر پہنچ چکا تھا، اس وقت یہاں تین چھوٹی چھوٹی مجاپائت کے سرداروں کی حکومتیں قایم تھیں۔ بقول کرافورڈ (صفحہ ۳۲۲) یہ حکومتیں ماترم کے اقتدار کے زمانۂ آغاز تک ہندو حکمرانوں کے تحت میں برسرِ عمل تھیں، "سنوپاتی" کے عہد (۱۵۷۵ء) میں انھوں نے آدی پاتی سُرا بایا (گورنر سُرابایا) کے اشارہ سے علمِ بغاوت بھی بلند کیا تھا۔ مگر پھر زیر کرلی گئی تھیں، سلطان "اگنگ" کے وقت میں یہ تینوں ریاستیں مسلمان ہو چکی تھیں اور ماترم کی ماتحتی میں آچکی تھیں ان کے ماتحت شدہ حکمرانوں کے سلسلوں کو تمدّن کی تاریخ میں بیان کرنا زیادہ ضروری معلوم نہیں ہوتا اس لئے صرف اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ "مدورا" اس کے بعد سے پورے طور پر اسلام میں شامل ہوگیا، اور اسلام کا بڑا مرکز بن گیا چنانچہ یہاں کے لوگ آجتک پورے ملک میں ایک خاص امتیاز کے مسلمان مانے جاتے ہیں، نہایت جوشیلے، دیندار اور خوش اخلاق مشہور ہیں۔ حج کو بھی زیادہ اور کثیر تعداد میں جاتے ہیں۔

## جزیرۂ بورنیو

یہ جزیرہ جزیرہ نما ملکا اور سُماترا کے جنوبی حصّوں سے نسبتاً نزدیک ہے (دئے ہوئے نقشہ سے پتہ چلے گا کہ) اس جزیرہ میں اسلام مختلف حصّوں میں مختلف اطراف سے پہنچا ہے، مثلاً اس جزیرہ کا وہ حصہ جو اب برطانیہ کے قبضہ میں ہے اور جہاں برونی اور سرواک کی ریاستیں قایم ہیں اسلام ۱۵۰۰ء میں "جوہور" (واقع ملایا) سے پہنچا تھا، کالیمنتانی حصے کے بنجرماسین اور سکادانہ حلقوں میں (جو اندونیشیا کی موجودہ مملکت کا حصّہ ہیں) شمالی جاوا اور پلیم بنگ (جنوبی سُماترا کے شہر)

تھا مگر سیاسی حیثیت سے ان کی کارفرمائیاں کیا تھیں اور کن کن اثرات کے ماتحت چل رہی تھیں فقدان شواہد تاریخی کے باعث پیش نہیں کی جاسکتیں اس لئے صرف ان کے ناموں ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ پھر سلطان کی فتوحات کا مختصر سا جائزہ لیا جاسکے، جاوا کی ان معاصر حکومتوں میں خاص خاص اسلامی حکومتیں بانتن، جریبون، دیماک، اور جکارتا تھیں، مشرق میں لاسم، سپوروان،

---

اور وسطی سماترا کے علاقہ منگ کباؤ سے پہنچا تھا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی جلد دوم کے صفحہ ۴۴۷ پر اس تبلیغ کی تاریخ ۱۵۹۰ء لکھی ہے جو غالباً صحیح نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ اس مدت سے پہلے اسپینی اور پرتگیزی یہاں پہنچ چکے تھے اور انھوں نے یہاں کے سلاطین کے خلاف باقاعدہ سازشیں کی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سن ۱۴۹۰ء کے بجائے ۱۵۹۰ء لکھ دیا گیا ہو، کیونکہ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں شمالی جاوا کے مبلغین برابر تبلیغ میں مصروف تھے، اور اہل ملکا کے دوش بدوش اسلام کی اشاعت کرتے پھرتے تھے۔ لہٰذا پریچنگ آف اسلام کے مصنّف آرنلڈ کا بیان اس سلسلہ میں زیادہ قابل پذیرائی ہے جس نے باقاعدہ نام اور سن کے ساتھ لکھا ہے کہ 'سکادانہ' کے علاقہ میں اسلام پہنچانے والے جاوا کے صوفیا تھے اور یہ لوگ پندرھویں صدی کے اواخر میں وہاں اسلام لے گئے تھے۔ یہ لوگ طبیب تھے اور سوداگر تھے، اور حضرت شمس الدینؒ نامی ایک بزرگ کی سرکردگی میں سکادانہ (واقع بورنیو جنوبی مغربی) میں وارد ہوئے تھے، اس وقت سکادانہ میں مجاپاہت کی ایک ماتحت ریاست قایم تھی جس کا مذہب ہندو اور بدھ تھا چنانچہ اس کے حکمران کے ساتھ اسلامی مشن کا تعارف طبابت اور معالجہ کے توسط ہی سے ہوا تھا۔ جو بعد میں اسلام میں شامل ہوگیا تھا مگر اس کے نام کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ البتہ بعض اور انگریزی مصنّفین نے اس جزیرہ کے سب سے پہلے مسلمان حکمراں کا نام دگیری کوسامہ، لکھا ہے جس کے نام کے مقابل انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ۱۵۹۰ء کا سن درج ہے۔ جو غالباً ۱۴۹۰ء

پنارو کان ، بیلم بنگن ، اور قریب کے جزیرہ کی تین ریاستیں بالی کی تھیں یہ سب ہندو سرداروں کے ماتحت تھیں ، مدورا سُراباَیا کے جرنیل کے ماتحتی میں تھا۔ اور اس میں خاص خاص ریاستیں پماکسان ، سماراَپ ، سُمیانگ ، اور بلاگان تھیں ، ماترم ، خود سلطان اگنگ ، کے زیرنگیں تھیں ۔

چنانچہ تخت نشینی کے بعد ہی جب سلطان نے یہ دیکھا کہ مشرق کی ہندو

---

کے بجائے سہواً لکھدیا گیا ہے چونکہ یہ سکاَدانہ کا علاقہ جاوا کے سلطان بانتن کے تحت میں بھی رہ چکا ہے اس لئے بھی یہ سنہ ۱۵۹۰ء کا سال غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ سنہ ۱۵۹۰ء میں بانتن میں خود حکمرانوں کی حالت خراب تھی اور اس وقت ان میں سے کوئی حکمراں اس طرف کو آنے اور قابض ہو جانے کے قابل نہ تھا لہٰذا یہ قبضہ شروع کے حکمرانوں کے عہد میں ہوا ہے جب بانتن کی سلطنت طاقتور مسلمان حکمرانوں کے زیرنگیں تھی ۔ اسی عہد میں جیسا کہ "ای ۔ ایچ گومز" کی تصنیف (The sea Dayaks of Borneo) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۷ء کے جا بجا مندرجات سے پتہ چلتا ہے بورنیو کے مشرقی ساحل پر بھی اسلام کے مرکز قایم ہو چکے تھے ۔ جہاں کے لوگ "دَایاک" کہلاتے ہیں ، اس علاقہ میں سنہ ۱۵۰۰ء میں (جو اس طرف کو تبلیغ اسلام کا خاص زمانہ ہے) "کوتی" کے نام سے مجاپائت کی ماتحتی میں ہندو سلطنت قایم تھی ، اور اس کا دارالحکومت "تنگارون" تھا ، جو کاروبار اور صنعت و حرفت کے لئے بہت مشہور تھا ۔ سنجر ماسین میں اشاعت اسلام کے بعد جب سکادانہ کی سلطنت اسلامی بن گئی تو یہ کوتی بھی فتح کے ذریعہ سے اس کا ایک حصہ ہو گئی ۔ اس کے علاوہ یہاں قدیم میں چھوٹی چھوٹی سرداریاں ، گننگ تبور ، تمبیلونگ ، بولنگن ، وغیرہ بھی تھیں جو مظاہر پرست سرداروں کے تحت میں قایم تھیں اور غیر مہذب تھیں ۔

سنہ ۱۵۰۰ء کے بعد ہی جب اہل ملکا اور اہل جوہور (یہ دونوں ملایا جزیرہ نما کے علاقے ہیں) پہنچے تو انھوں نے مغربی بورنیو میں سَمباس کے بندرگاہ پر ایک چھوٹی سی اسلامی

سرداریاں راجگانِ جزیرۂ بالی کے اشاروں پر ماترم کے خلاف مہم تیار کرنا چاہتے ہیں اور اسے ختم کر کے قدیم ہندو مجاپاہت کا اقتدار از سرِ نو شروع کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے سلطان نے اور سب امور چھوڑ کر ان کی سرکوبی اور فتوحات کی طرف توجہ دی اور رفتہ رفتہ انھیں کچل دیا۔

**فتوحات** سب سے پہلی بار ۱۶۱۶ء میں لاسم کو فتح کیا اور پھر اپنے ایک جرنیل

---

سلطنت قایم کر لی جو سترھویں صدی کے آغاز تک خود مختار تھی اس مقام سے انھوں نے بُرونی وغیرہ میں تبلیغ کے مشن پہنچائے تھے۔ ۱۶۰۹ء میں ولندیزیوں نے اس ریاست کے ساتھ تعلق قایم کئے تھے، سترھویں صدی میں یہ ریاست وہاں کے حکمران خاندان کے مورثِ اعلیٰ ریڈن سلیمان (المعروف بہ سلطان صفی الدین) کے قبضہ میں آئی تھی جو سابق حکمرانوں کا جرنیل تھا اور وزیر بھی تھا (ان ریاستوں میں ولندیزی اقتدار کا حال آگے بیان کیا جائے گا) اس علاقہ میں چینی بھی کثرت سے آباد ہیں جو بُرونی کی ریاست سے بلائے گئے تھے۔

(پونتیانا‌ک) کی سلطنت جہاں کے آخری حکمران سلطان عبدالحمید دوم نے موجودہ جمہوریہ کے ساتھ غداری کی تھی بہت بعد کی قایم شدہ ہے اس کا سالِ قیام ۱۷۰۹ء ہے اس کا حال عہدِ ولندیزی میں بیان کیا جائے گا)۔

بہرکیف یہ بہت چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اور صرف ساحلی علاقوں کے آس پاس ہی ان کا حلقۂ اثر تھا لہٰذا اب ان کے خاندانی سلسلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلام کی اشاعت دوسرے جزائر میں بیان کی جاتی ہے۔

**جزائرِ سلاویسی (سلیبس)** اس سلسلہ میں جزائرِ سلاویسی میں اسلام کی اشاعت کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں اسلام بہت بعد میں پہنچا ہے ولندیزی مورّخ خُربرانڈی نے لکھا ہے کہ اس سلسلۂ جزائر میں پہلے مسیحیت کی تبلیغ ہوئی تھی اور یہاں کے مظاہر پرستوں کو مسیحیت میں داخل کیا گیا تھا، پھر اس کے

"مرتولویو" کی ماتحتی میں "پسوروان" کی طرف فوجی اقدام کیا، ۱۶۲۲ء میں دس ہزار فوج کے ساتھ "سمبوجا" کا رخ کیا مگر غذا کی قلت اور موسم کی خرابی کے باعث بغیر فتح کئے ہوئے فوجوں کو واپس بلوالیا، اس کے بعد گریسک (علاقہ دیماک) فتح کیا اور پھر جرارتون پر چڑھائی کی، یہاں تک کہ ۱۶۶۴ء میں پانچ بڑے بڑے صوبوں سے ایک لشکر جرار جمع کر کے "کیائی سدھویونو" نامی جرنیل کے ذریعہ سے مدورا کی طرف

---

بعد اسلام پہنچا، اسلام کی اشاعت کے بارے میں آرنلڈ کا خیال ہے کہ جزیرۂ کالیمنتان (بورنیو) کے راجہ سکدانا بر نے مسلمان ہو جانے کے بعد اس نواح میں اشاعت اسلام کا فریضہ ادا کیا۔ مسلمان علماء کا ایک گروہ سترہویں صدی میں سماترا جزیرہ سے بھی تبلیغی مشن لے کر یہاں گیا تھا چنانچہ ان علماء کا عیسائیوں کے ساتھ بڑا مباہلہ ہوا تھا، اس مباہلہ کی کامیابی کے بعد سے اسلام کی اشاعت کو فروغ حاصل ہوا۔ بعض پرتگالی مورخین کا خیال ہے کہ ان جزائر میں سب سے پہلے اسلام لانے والے لوگ گوآ (ان جزائر کا ایک شہر ہے) کے باشندے ہیں۔ جو مکاسری کہلاتے ہیں، یہ لوگ بقول بعض مورخین کے اسلام لانے کے بعد کچھ ایسے وارفتۂ اسلام ہوئے کہ پھر آس پاس کے جزائر مثلاً منولولو، ہوائی، اور پیروس کے جنوبی جزائر مثلاً فارموسا وغیرہ میں بھی اسلام انہی لوگوں نے پھیلایا، سترھویں صدی میں ان لوگوں کی خاص ہی سلطنت گوآ تھی، ان کے اثر سے (اور بقول بعض محققین بورنیو کے سنجر ماسینی لوگوں کے ذریعہ سے) اسی جزیرہ کے بوگی اور ٹولہ وغیرہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے بوگی لوگوں کی خاص خاص حکومتیں بونی، واجو، اور لوو تھیں جو دوسرے جنوبی سرے پر واقع تھیں اس طرح شمال میں ٹولہ لوگ بھی چند حکومتوں کے مالک تھے انکی خاص خاص حکومتیں مینڈو، گورنتالا، ٹومنی وغیرہ تھیں جو بعد میں ۱۶۶۶ء میں ولندیزیوں کی فتح مکاسر کے بعد سے خودمختاری کھوتی چلی گئیں۔

بہرحال جاوا کے مشرق کے جزائر سمباوا، مغربی فلورس، اور تیمور میں بھی اسی صدی

مہم روانہ کی مگر یہ جرنیل مارا گیا، چنانچہ اس کے بعد ایک دوسرے بڑے جرنیل "کیائی جام کیتنگ" کو مقرر کر کے محاذ پر روانہ کیا اور بالآخر مدورا فتح کر لیا اور فتح کرنے کے بعد آدی سرابایا (گورنر سرابایا) کے بھتیجے پرامینو، جو سلطان کا منظور نظر تھا، "پنگیران چکرا ننگرت" کا خطاب دے کر حاکم مقرر کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد ہی "آدی سرابایا" پر بھی چڑھائی کر دی، "آدی سرابایا" سلطانی سپاہ کا مقابلہ نہ کر سکا لہٰذا صلح کرنے پر

---

میں "سلطنت گوا" کے علماء کی بدولت اسلام پہنچا۔

**جزائر مالوکو**

مگر جزائر مالوکو کا اسلام بہت پرانا ہے، علمائے سماترا کی تحریرات سے ثابت ہے کہ ان مقامات پر پندرہویں صدی میں تقریباً ۱۴۴۰ء میں اسلام پہنچا ہے کیونکہ اس زمانہ میں تدورے اور ترناتے (جہاں پرتگالیوں نے ۱۵۲۲ء میں اپنے اڈے قایم کئے تھے) گرم مصالحہ کی پیداوار کے بہت بڑے اور زرخیز علاقے تھے، لہٰذا سماترا جاوا کے مسلمان سوداگروں کے لئے آمد و رفت کا خاص ذریعہ بن گئے اور ان کے اثر سے اسلام پھیلتا چلا گیا، اسلام سے قبل ان جزائر میں مظاہر پرستی کا رواج تھا، لوگ بہت ظلمت زدہ، زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ "ترناتے" کا پہلا مظاہر پرست حکمراں جو اسلام میں داخل ہوا اور اسلامی نام سے مشہور ہوا وہ سلطان زین العابدین تھا جو ۱۴۸۶ء میں گذرا ہے اسی سلطان کی نسل میں "سلطان باب اللہ" (۱۵۶۵ تا ۱۵۹۰ء) اسلام کا بہت بڑا عالم اور مبلغ گذرا ہے کہا جاتا ہے کہ سلیبس کی "سلطنت گوا" کا حکمراں اسی کی تبلیغ سے اسلام میں داخل ہوا تھا، یہ سلطان آخر زمانہ میں درویش ہو کر خدمت اسلام کے لئے وقف ہو گیا تھا اور آس پاس کے علاقوں میں اشاعت اسلام کے لئے گھومتا پھرتا تھا۔

اسی طرح "تدورے" کا سب سے پہلا مظاہر پرست حکمراں جو اسلام میں داخل ہوا وہ "جلیباتی" تھا، اس حکمراں نے اسلام لانے کے بعد اپنا نام سلطان جمال الدین رکھا تھا۔ اس کا آخری زمانۂ حکومت ۱۴۹۵ء ہے۔ پرتگالیوں کا بیان ہے کہ "مالوکو" جزائر میں یہی سب سے پہلا مسلمان

آمادہ ہوگیا، سلطان نے بھی اس کو معاف کردیا اور پھر اپنی دامادی میں قبول کرلیا۔ سلطان کی خوبصورت اور بہادر ترین لڑکی جو اس کے ساتھ منسوب کی گئی "راتو وُنڈان سَارَیْ" تھی جو میدانِ جنگ میں مردانہ لباس پہنکر لڑنے کے لئے افواج کے ساتھ جاتی تھی چنانچہ شادی کے بعد بھی اس نے ایک بار اپنے شوہر کے ساتھ "سُونَان گِیری"، پر بھی چڑھائی کی تھی اور اسے زیر کر کے "مَاتَرَم" میں پہنچا دیا تھا مگر سُونان نے پھر سلطان سے معافی چاہ کر باقاعدہ صلح کرلی۔ اور اس طرح اس کا علاقہ پھر بحال کردیا گیا۔ ۱۶۳۹ء میں سلطان نے "بَیلَم بَنگَن" فتح کیا اور پھر بَالِی کی طرف بھی فوجیں روانہ کیں مگر وہ بَالِی کو فتح نہ کرسکا اور اسے اپنی فوجیں راستہ ہی میں سے واپس بلانی پڑیں اسی اثناء میں اس نے "جَرِیُوَن" اور "پَرمانگان" پر بھی چڑہائی کی اور انھیں فتح کر کے ایک جداگانہ صوبہ بنادیا۔

---

حکمراں تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔

غرض ان جزائر کے بعد اسلام کی اشاعت جزیرۂ لمبوک میں بنجر ماسین (بورنیو) کی طرف سے سُمباوا اور فلورس کے مغرب میں مکاسَریوں کی طرف سے ہوئی اور تیمور، سیرام، آرد، ہلما ہیرا، بورو اور بُوتی وغیرہ میں اسلام پہنچانے والے لوگ تَرنا تے اور تِدورے کے صوفیا رہے یا پھر جزیرۂ جاوا کے علاقۂ دیماک کے مبلغین تھے۔ پرتگیزوں کی آمد کے وقت ۱۵۲۱ء میں ان جزائر کے اکثر حصوں میں اسلام تھا، اسلام کی حکومتیں تھیں۔ جن کا رقبۂ عمل اگرچہ چھوٹا تھا مگر یہ جنگجو لوگوں کے زیر نگیں تھیں۔

سترہویں صدی میں جب جاوا میں اسلامی اقتدار عروج پر تھا تو یہ سب جزائر اپنی اپنی حکومتوں کے زیر نگیں تھے، اور اسلام کے داعی تھے۔ عیسائی پادری بھی ان جزائر کے مظاہر پرستوں میں پرتگیزیوں کے زیر اثر تبلیغ کرتے پھرتے تھے، ولندیزیوں کے عہد میں عیسائیت کو فروغ اور اسلامی سلطنتوں کو زوال ہوا جس کا حال ولندیزیوں کے باب میں آگے آئے گا۔

اور اپنا صوبہ دار "ماس گیڈی" کو مقرر کر دیا۔

غرض سلطان "اگنگ" نے فتوحات کے اعتبار سے قریب قریب جاوا فتح کر کے سلطنتِ ماترم میں شامل کر لیا صرف جپارا کا ساحل جہاں سلطنتِ بانتن واقع تھی اور جہاں ۱۶۱۹ء میں ولندیزی کئی علاقے چھینے تھے سلطان کی حدود سے باہر تھا، جب ولندیزیوں نے ۱۶۱۹ء میں ججکارتا، کی لڑائی کا آغاز کیا تو سلطان کو بھی ان سے جنگ کرنی پڑی کیونکہ سلطان خود انھیں جاوا سے خارج کرنا چاہتا تھا، لہٰذا ولندیزیوں کے ساتھ مستقل جھگڑا شروع ہو گیا۔

## ولندیزیوں کے ساتھ جھگڑا

یہ واقعہ ۱۶۱۹ء سے شروع ہو کر درمیان میں جاری رہنے والے واقعہ کے طور پر گزرا، مگر چونکہ یہ اقوامِ مغرب سے وابستہ ہے لہٰذا ولندیزیوں کے باب میں بیان کیا جائے گا۔

## سلطان اُگنگ کے کارنامے اور اس کی شخصیت

قطع نظر ان تمام لڑائیوں اور فتوحات کے جو اس سلطانِ اعظم کے زمانہ میں انجام پہنچیں ایسے کارنامے بھی تاریخی واقعات کی زینت ہیں جو صحیح معنی میں اس کو "اُگنگ" (یعنی اعظم) کہلانے کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔ اس کے عہد میں جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا گیا وہ پورے جاوا کو ایک سلطنت کے ماتحت لانے اور اس کے نظم و نسق کو مقامِ بلند پر فائز کرنے کے علاوہ (اس کی تفصیلات باب پنجم میں بیان کی گئی ہیں) پورے جزیرہ کی تہذیب اور پوری قوم کے تمدن کو معیارِ اعلیٰ پر پہنچانا ہے، انگریز مورخین (خصوصاً کرافورڈ اور رفلیس نے اس کو

اپنی عادت کے مطابق ظالم اور تباہ کار قرار دیا ہے[1]، وہ ہمیشہ مشرق کے اولوالعزم اور بلند پایہ حکمرانوں کی شخصیتوں پر اپنے ایسے ہی رکیک اور گندے حملوں سے خاک ڈالتے رہے ہیں اور اپنے ملک کے ہنری ہفتم، ہشتم اور جیمیس وغیرہ حکمرانوں کو بھول جاتے ہیں جو ان حکمرانوں سے بھی اکثر اوصاف میں گئے گذرے تھے۔ بہرحال یہ ان مصنفین کی تعصب نگمی اور تنگ نظری ہے جس کی طرف ہمیں نہیں جانا چاہئے۔ اور عدل و انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے کسی کے بُرا کہنے سے اچھا بُرا نہیں بن سکتا، خاک ڈالنے سے چاند کی روشنی مدہم نہیں پڑ جاتی، یہ تاریخ ہے، فسانہ نہیں، واقعات کسی روشنی میں بھی پیش کئے جائیں، حقیقت اور سچائی کی غمّاضی ان کی فطرت سے دُور نہیں کی جاسکتی، عیاں پر جب انکو پرکھا جاتا ہے تو سونا سونا ہی رہتا ہے اور زنانبا خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔

---

[1] ریفلیس نے اپنی کتاب 'ہسٹری آف جاوا' میں ایک مقام پر بورو بودور اور دیگر قدیم ہندو منادر کے آثار پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مسلمان حکمرانوں کی فتوحات سے گھبرا کر اور ان کی فوج کشیوں سے ڈر کر ہندو بھاگ بھاگ کر گمنام مقامات پر چھپنے لگے تو وہ اپنے ان منادر کو جنگلات میں درختوں اور بیلوں کی آڑ میں چھپا گئے تاکہ مسلمان حکمراں انھیں دیکھ نہ سکیں اور برباد نہ کر سکیں حالانکہ مؤرخ موصوف کو یہ غور کرنا چاہئے تھا کہ کیا جنگل آناً فاناً میں اُگائے جاسکتے تھے، اور کیا ان مسلمان حکمرانوں کے علم میں یہ آثار نہ تھے جن کے آباؤ اجداد ہندو اور بدھ رہ چکے تھے، آخر یہ حکمراں کسی بیرونی حملہ آور قوم کی اولاد تو تھے ہی نہیں۔ مقامی لوگ ہی تو تھے جو اب اسلام میں داخل ہو چکے تھے، ان کے عہد میں بنارو کان اور تیسور وان کے علاقے خود ہندوؤں کی وہ آبادیاں تھیں جنھوں نے سلاطین کو بعد میں اپنا شہنشاہ مان لیا تھا، آج بھی چنانچہ وہاں ہندو موجود ہیں اگر سلاطین چاہتے تو کیا انھیں برباد نہیں کر سکتے تھے مگر ان کے عدل و انصاف اور رواداری کے منافی تھا پھر وہ بلاکسی فرق و امتیاز کے رعایا پروری کا احساس بھی رکھتے تھے۔

حق اور جھوٹ میں تمیز ہو جاتا ہے اور کارنامے نہیں چھپتے، یہی معاملہ سلطان اگنگ کے ساتھ ہے وہ اسلامیانِ جاوا کا سب سے بڑا صاحبِ اقتدار، عالی ظرف، باحوصلہ، عدل پرور، کرم گستر، اور دلدادۂ تہذیب حکمراں گذرا ہے جس کے سایہ میں علم و ادب نے پرورش پائی، قوم نے ترقی کی منزلیں طے کیں، تمدن کو عروج ہوا، اور رہیبت وجلال تاریخ کے آسمانوں میں جا پہنچے، وہ ایک ایسا لایق حکمراں گذرا ہے کہ اس کو ہندوستان کے علاءالدین خلجی، شیر شاہ سوری، اکبرِ اعظم اور اورنگ زیب جیسے بلند پایہ حکمرانوں کی قطار میں کھڑا کیا جا سکتا ہے، اس میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ اول درجہ کا دین دار تھا، دین دار کبھی ظالم نہیں ہوتا، اور ظلم کرنے والا کبھی دیندار نہیں بن سکتا، جو خدا کے غضب سے ڈرتا ہے اس کی ہیبت خود بخود جلال بنجاتی ہے، اور ظلم کرنے اور بغاوت کرنے والوں کے لئے نیشۂ خونریز کا کام کرتی ہے بدامنیوں میں امن جب پیدا کیا جاتا ہے تو عناصرِ بد کا مہلکہ خونریزی نظر آنے لگتا ہے حالانکہ وہ خونریزی اور تباہ کاری کے مترادف نہیں ہوتا، یہی تھا جو سلطان اگنگ کے عہد کو پیش آیا تھا، بغاوتوں کا دبانا اس کے لئے بڑا ضروری تھا ورنہ امن نہ ہوتا اور رفقدانِ امن کے باعث نہ تہذیب پھیلتی اور نہ تمدن پھلتا پھولتا اور ملک ترقیات سے بھی محروم رہ جاتا۔

سلطان اگنگ عالم تھا۔ فاضل متبحر تھا، "سستروگنڈنگ"، فلسفہ اور حکمت پر اس نے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی، بڑے بڑے اسکول اور مدارس قایم کئے تھے، تعلیم کی آسانیاں تھیں، طلبا رغیر ممالک میں بھی جاکر علم حاصل کرتے تھے، سلطان خود علمائے وقت اور ماہرینِ فنون کا قدر دان تھا، ملک خوشحال تھا،

آس پاس کے ممالک کے ساتھ بھی اس کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔

اس کے عہد میں جزیرۂ جاوا کے علاوہ دیگر جزائر میں بھی چھوٹی چھوٹی خودمختار سلطنتیں قائم تھیں جن میں سب سے بڑی آچیہ (واقع سماترا) اور جوہور کی سلطنتیں تھیں اور اسلامی روایات کی آئینہ دار تھیں، اسی طرح مشرق کی طرف مالوکو، سلیبس اور بورنیو وغیرہ کے جزائر میں بھی بہت سی مسلم خودمختار حکومتیں برسر اقتدار تھیں۔

## ۵۔ آس پاس کی معاصر سلطنتیں

اس سلسلہ میں اس مقام پر صرف اندونیشی جزائر کی دیگر سلطنتیں مراد ہیں۔ جن کا مختصر حال ذیل میں ملاحظہ ہو۔

### سماترا کی سلطنت آچیہ

یہ اس عہد کی سب سے مشہور معاصر سلطنت تھی جو سماترا کے انتہائی شمالی علاقہ میں سمدرا پسائے، کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھی اور جزیرۂ مذکور کے جنوبی حصے تک پھیلی ہوئی تھی، اسی طرح مغربی ساحل بھی اس کے زیرنگیں تھا، حتیٰ کہ باتاک کے اکثر قبائل اس کے حکمراں کو اپنا آقا سمجھتے تھے، اس عہد میں یہ سلطنت اسلام کی ایک بہت بڑی عافیت گاہ تھی" اسنوک خرونی،، (اپنی تصنیف (Arabie en Oost Indie) کے صفحہ ۸ پر) لکھتا ہے کہ اس سلطنت کا بانی علاقہ" آچیہ (جسے انگریزوں نے اپنی تحریروں میں آچین لکھا ہے) کا رہنے والا تھا لہٰذا اس کی مناسبت ہی سے اس کا نام آچیہ پڑگیا۔ اس ریاست کی حدود میں شمالی ساحل پر مولابوہ، تاپا، توآن، اور سنگ کل تھے۔ اور پاور کی سلطنت بھی شامل تھی، دریائے جامبو آئی اور سوماوی کے درمیان 'پسائے' کی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے حکمرانوں کا شجرہ" انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد اول صفحہ ۵۰ پر) پر اس طرح درج کیا گیا ہے:-

۱۔ علی مغایت شاہ ۱۵۱۴ء تا ۱۵۲۸ء (بانی سلطنت)
۲۔ صلاح الدین ۱۵۳۰ء تا ۱۵۳۷ء
۳۔ علاء الدین القہار ۱۵۳۷ء تا ۱۵۶۸ء
۴۔ حسین ۱۵۶۸ء تا ۱۵۷۵ء

ان سب کے ساتھ سلطان کے تعلقات نہایت اچھے تھے، اس کے سفراء ان تمام ممالک میں رہتے تھے، اور رجاوا کے سوداگروں کی نگرانی رکھتے تھے، اسلامی اقتدار کی تاریخ میں اس سلطان کا کارنامہ تھا کہ اس نے تمام مسلمان سلطنتوں کو ایک قوم اور ایک نسل ہونے کی حیثیت سے تعلقاتِ باہمی کی ایک بڑی لڑی بنا دیا تھا، چنانچہ بعض تاریخوں سے یہ امر واضح ہے کہ ان ممالک میں آنے جانے اور تجارت کرنے میں کوئی دشواری

---

۵۔ سلطان مُودا (چند روز)
۶۔ سلطان سری عالم سنہ ۱۵۷۵ تا ۱۵۷۶ء
۷۔ زین العابدین سنہ ۱۵۷۵ تا ۱۵۷۷ء
۸۔ علاء الدین پیرا کی المعروف بہ منصور شاہ سنہ ۱۵۷۷ تا ۱۵۸۶ء
۹۔ سلطان بُویُونگ سنہ ۱۵۸۹ء
۱۰۔ علاء الدین رعایت شاہ سنہ ۱۵۸۹ تا ۱۶۰۴ء
۱۱۔ علی رعایت شاہ سنہ ۱۶۰۴ تا ۱۶۰۷ء
۱۲۔ اسکندر مُودا المعروف مکوتا عالم سنہ ۱۶۰۷ تا ۱۶۳۶ء
۱۳۔ اسکندر ثھانی سنہ ۱۶۳۶ تا ۱۶۴۱ء
۱۴۔ صفیۃ الدین تاج العالم (دختر اسکندر) سنہ ۱۶۴۱ تا ۱۶۷۵ء
۱۵۔ نقیتہ الدین نور العالم سنہ ۱۶۷۵ تا ۱۶۷۸ء
۱۶۔ عنایت شاہ سنہ ۱۶۷۸ تا ۱۶۸۸ء
۱۷۔ کمالات شاہ سنہ ۱۶۸۸ تا ۱۶۹۹ء
۱۸۔ بدر العالم شریف ہاشم جمال سنہ ۱۶۹۹ تا ۱۷۰۲ء
۱۹۔ پرکار عالم شریف لموتی سنہ ۱۷۰۲ تا ۱۷۰۳ء
۲۰۔ جمال العالم بدر المنیر سنہ ۱۷۰۳ تا ۱۷۲۶ء
۲۱۔ جواہر العالم امین الدین صرف چند روز
۲۲۔ شمس العالم ایضاً
۲۳۔ علاء الدین احمد شاہ سنہ ۱۷۲۷ تا ۱۷۳۵ء
۲۴۔ علاء الدین جوہان سنہ ۱۷۳۵ تا ۱۷۶۰ء
۲۵۔ محمود شاہ سنہ ۱۷۶۰ تا ۱۷۶۴ء
۲۶۔ بدر الدین سنہ ۱۷۶۴ تا ۱۷۶۵ء
۲۷۔ سلیمان شاہ تا سنہ ۱۷۷۳ء
۲۸۔ علاء الدین محمد تا سنہ ۱۷۹۵ء
۲۹۔ علاء الدین جواہر عالم ایک اتالیق کے تحت میں تا سنہ ۱۸۱۵ء
۳۰۔ شریف سیف العالم تا سنہ ۱۸۱۸ء
۳۱۔ جواہر العالم دوم تا سنہ ۱۸۲۴ء
۳۲۔ محمد شاہ تا سنہ ۱۸۳۸ء
۳۳۔ منصور شاہ سنہ ۱۸۳۸ تا ۱۸۷۰ء
۳۴۔ محمود شاہ تا سنہ ۱۸۷۴ء

نہ تھی، لوگ آزادی کے ساتھ جاوا میں بھی آتے تھے اور تجارت کرتے تھے اس طرح ملک بہت خوشحال ہوگیا تھا اور ہر طرف فارغ البالی کا دور دورہ تھا یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے سلطان کی دل کھول کر مدد کرتے تھے ورنہ ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصہ جنگ کے لئے مصارف کس طرح برداشت کئے جا سکتے تھے۔ اس کے زمانہ میں ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے ساتھ بھی گرم مصالحہ کی تجارت جاوا کے ساتھ ہوتی تھی۔

## سلطنت کا دورِ غلامی

اس آخری سلطان کے عہد ۱۸۶۴ء میں ولندیزیوں نے ۱۸۷۳ء میں آچیہ کے سلطان کو غلام بنا لیا وہ شہر آچیہ پر قابض ہوگئے، اور پھر رفتہ رفتہ دیگر اور علاقوں پر بھی قبضہ کرتے چلے گئے آخری حکمران ۱۸۷۴ء میں ملک چھوڑ کر بھاگ گیا اور مرگیا۔ جس سے اہلِ آچیہ غضب ناک ہوکر ولندیزیوں کے خلاف میدان میں نکل آئے۔ اور جہاد پر آمادہ ہوکر سالہا سال تک ان سے جنگ کرتے رہے۔ ان لڑائیوں میں علمائے کبار امام وغیرہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ تیکو عمرؔ زیادہ قابلِ ذکر ہیں ۱۸۷۳ء میں ایک چھ سالہ سلطان پیڈی میں سلطان بھی بنا یا گیا مگر اسکا اقتدار کچھ نہ تھا۔ اس جنگ کی تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔

## ملایا کی مشہور سلطنت جوہور

صفحہ ۳۲۹ پر گذر چکا ہے کہ ملکّا کی پہلی اسلامی سلطنت کا آخری حکمران سلطان محمود شاہ پرتگیزیوں کے ہاتھوں شکست کھاکر کیمپر (واقع جزیرہ سماترا) چلا گیا تھا جہاں ۱۵۲۸ء میں اسکا انتقال ہوگیا اِدھر اس کے لڑکے سلطان علاءالدین رایت شاہ دوم نے ملایا میں اپنے قدیم ماتحت علاقہ میں پہنچکر ۱۵۳۰ء میں جوہور کے مقام پر ایک سلطنت قایم کرلی جو سلطنت جوہور کے نام سے مشہور ہوئی اس حکمران نے ۱۵۶۴ء تک حکومت کی چنانچہ یہ ہمیشہ پرتگالیوں سے جنگ آزما رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ملکّا کا ملک دوبارہ حاصل کرلیا۔ سلطان آچیہ، صلاح الدین کے ساتھ بھی نبرد آزما رہا۔ لیکن ۱۵۶۴ء میں سلطان آچیہ کے ہاتھوں شکست کھاکر کمزور ہوگیا

بہرحال سلطان بحیثیت ایک انسان کے بھی بہت بلند تھا، اس کی زندگی نہایت سادہ تھی، اور خدمتِ وطن اور خدمتِ اسلام کے نظریات کے ساتھ وابستہ تھی چنانچہ اسلامی علوم نے جاوی زبان میں اس کی توجہات کے باعث ہی اسقدر فروغ پایا تھا۔ وہ صوفی منش تھا۔ درویشوں اور اہل اللہ کی صحبتوں سے بھی مستفید ہوتا تھا، اسی کے زمانہ میں عام لوگ کثرت کے ساتھ حج کے لئے مکہ مکرمہ جانے لگے تھے، جس سے ان کے حالات پر بڑا انقلابی اثر پڑا تھا، سرکاری طور پر سب سے پہلے طلبار کو اسلامی تعلیمات کی تحصیل کے لئے مصر، شام، اور حجاز و ہندوستان بھیجنا شروع کیا تھا ورنہ اس سے قبل لوگ اپنے نجی مصارف پر تعلیم کے لئے باہر جاتے تھے۔ اس کے عہد میں جاوا کے کاتبوں نے جاوا کی تاریخ میں سب سے پہلے قرآن مجید کتابت کیا تھا اور سب سے پہلا ترجمہ قرآن بھی اسی کے عہد میں

---

اس لڑائی کے بعد سے اس سلطنت کے حکمرانوں کا آچیہ کے ساتھ رشتہ داری اور سیاست پر بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں یہ سلطنت بھی پہلے ولندیزیوں کے تحت میں اور پھر انگریزوں کے تحت میں آگئی۔ چنانچہ آج بھی یہ سلطنت انگریزوں کی غلام ہے۔ مشہور تاریخ "سجارا ملایو" کا مصنف تان محمود اسی سلطنت کے حکمران عبدالجلیل شاہ اول (سنہ ۱۵۸۰ تا ۱۵۹۷ء) کا وزیراعظم گذرا ہے۔

## دیگر جزائرِ مشرق کی مسلم حکومتیں

"سلطان آگنگ" کے عہد میں سنہ ۱۶۳۹ء میں ترناتے تدورے، سویانگ، لوؤ، بونی، واجو، سیڈان گرانگ، گوا، سکادانا، بنجرماسین، اور کوتی وغیرہ آزاد اور خودمختار چھوٹی چھوٹی مسلم سلطنتیں قایم تھیں جو جزائر مالوکو، سلیبس، اور بورنیو کی حدود میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے حکمران سلطان کہلاتے تھے، اور گرم مصالحہ کی بہت اہم تجارت کے مالک تھے۔ (ان کے خاندان ادوار اور شجرۂ نسب کو بخوف طوالت بیان کرنے سے نظرانداز کیا جاتا ہے) یہ سب حکمراں اندونیشی تھے۔

کیا گیا تھا، غرض اسکا عہد تاریخ جاوا کا ایک ایسا زرین باب ہے کہ جو پھر دوبارہ واقعات و حوادث کے ہاتھوں اس ملک نے لوٹتے ہوئے نہ دیکھا۔

## سلطان اگُنگ کی وفات

وہ ۱۶۴۵ء میں ایک طویل مدت تک حکومت کرنے کے بعد اس عالم کون وفساد سے رخصت ہوکر گوشۂ بقائے دوام میں جا پہنچا اور اس طرح جاوا کی مسلمان سلطنت ایک عظیم ہیرو، ایک زبردست فاتح، ایک لایق حکمراں، ایک فاضل انسان اور ایک ہوشمند سیاست داں سے جس کی غیر ملکی حملہ آوروں سے مقابلہ آرا ہونے کے لئے سخت اور شدید ضرورت تھی، ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ حالانکہ اس کے بعد بھی مدتوں تک اس خاندان کے حکمراں یکے بعد دیگرے اقتدار پر آتے رہے اور حکومت کرتے رہے مگر وہ بات کبھی بھی پیدا نہ ہوسکی جو اس کے ساتھ مخصوص تھی۔ اب اس کے اُٹھ جانے سے جاوا کی مسلمان سلطنت کی ہیبت بھی اٹھ گئی۔ ولندیزی جو اس سے کانپتے تھے، اور اس کی حدود میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اب بے خوف ہوگئے بلکہ اس کے جانشینوں کے دوست بن گئے اور رفتہ رفتہ انھوں نے پھر اپنے قدم کچھ اس طرح سے جمائے کہ وہ سارے ملک پر مسلط ہوتے چلے گئے، اس طرح سلطان اگُنگ کی موت دراصل اس مُلک کے مسلم اقتدار کا زوال ہے، اور مسلم اقتدار کے ساتھ ساتھ خود مختار تہذیب و تمدّن کا بھی زوال ہے جو اگُنگ کے جانشینوں کی معمولی شخصیتوں کے باعث برابر بڑھتا رہا حتیٰ کہ پھر اٹھارہویں صدی میں جاکر مستقل غلامی کا باعث بن گیا۔ چونکہ اگُنگ کی وفات کے بعد نئی جانشینی سے ملک کے تہذیب و تمدّن میں ایک ایسی نئی سیاست کا آغاز ہوتا ہے جو مغربی سامراج کے تاثرات کو منطبق کرنے میں کارفرما رہے ہیں لہٰذا اسکا ذکر ولندیزی عہد کے باب میں کیا جائیگا اب اس عہد کے نظامِ حکومت اور تہذیب و تمدّن پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

# باب پنجم

## اِس عہد کا نظامِ حکومت اور عام تمدّن

جیسا کہ پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے، اندونیشیا کے پورے ملک میں ہر دور اور ہر زمانہ میں سب سے زیادہ اہمیت خواہ وہ سیاسی طور پر ہو یا مذہبی، اخلاقی، معاشری یعنی تمدنی طور پر ہمیشہ جزیرہ جاوا کو نسبتاً زیادہ حاصل رہی ہے، اور اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ہندو عہد میں یہ سری وجایا اور مجاپائت کا مرکزِ حکومت تھا، دیگر جزائر اس کے ماتحت تھے اور مسلمانوں کے عہد میں اس کی اہمیّت کا سب سے بڑا سبب صرف اس کے وہ جغرافیائی حالات ہیں جو پورے ملک کی اکثرِ آبادی، وافر پیداوار اور معدنیات کی افراط وغیرہ پر مشتمل تھے، اسلام کے داخلہ کے وقت جب ہندو تہذیب اور حکومت کا زوال ہو رہا تھا تو یہ پورا جزائری ملک اپنے مرکز سے منقطع ہو کر متعدّد خود مختار سرداریوں، سرداریوں اور حکومتوں میں تبدیل ہو کر پارہ پارہ ہو گیا، ہندو تہذیب بھی اپنے معاشری نقائص کے باعث ملک کے اتحاد اور یگانگت کو برقرار نہ رکھ سکی، اس لئے جہاں جہاں بھی خود مختار سلطنتیں وجود میں آئیں نظامِ حکومت، اصولِ سیاست، انداز اور کردار سب میں ایک دوسرے سے متبائن ہوتی چلی گئیں اور منفرد صورت اختیار کر گئیں۔ یہانتک کہ اسلام سے قبل کے ہندوستان کی طرح ایک حکومت کی برکاتِ تہذیب اور وحدت سے محروم ہو کر ہزارہا ایسے حصّوں میں بٹ گئی جن میں سے ہر ایک کی

زبان، ادب، فلسفہ، اخلاق اور سیاست منفرد تھی، اور ہر حصہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے جداگانہ رقبہ حکومت تصوّر کرنے کے باعث جدا سمجھتا تھا اور اپنے انفرادی وجود کا قائل تھا، چنانچہ خود جاوا ہی میں مختلف حصّوں میں مختلف حکومتیں قایم تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنا نظام اور اپنا دستور جدا رکھتی تھی زبانیں بھی اپنے محدود سیاسی نقطۂ نظر رکھنے کے باعث جدا جدا طور پر اپنے علاقوں میں اپنا اپنا کاروبارِ حکومت چلانے کے لئے اپنی ہی رائج کر لی تھیں، زبانوں کے ساتھ ساتھ اخلاق کردار بلکہ تمدن بھی متاثر اور متبائن ہوتا جا رہا تھا بلکہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسلام نے داخل ہونے کے بعد زاویۂ نظر اور نقطۂ خیال کو بدل دینے کے ساتھ ساتھ، اخلاقی تصوّر اور اندازِ کردار کو بھی درست کر دیا، بلکہ نظامِ حکومت میں بھی اصلاح کر دی مدنیّت اور بین القومیّت دونوں میں ایک اعتدالِ معاشرت پیدا کر کے وحدانی صورت عطا کر دی، حالانکہ پوری قلمرو میں سارے جزائر میں ایک اور واحد نمایندہ قومی حکومت پھر بھی قایم نہ ہو سکی کیونکہ قدیم سیاسی اثرات ہر مقام پر راسخ چلے آتے تھے اور ان کا اکھاڑنا بہت مشکل تھا، سلاطینِ ماترم نے جو نہایت ہی اولوالعزم اور صاحبِ صلاحیت لوگ تھے۔ سترہویں صدی میں (بعہدِ سلطان اگُنگ) سارے ملک میں قومی حکومت کے قیام کے لئے جد وجہد کے ذریعہ وحدتِ ملی قایم کرنے کی سعی کی مگر وہ بھی اہل مغرب کی قزاقانہ روش اور مداخلت کے باعث جاوا اور مدُورا کی حدود سے آگے کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طرح سارے ملک میں باوجود مذہبی (یعنی اسلامی) اور نسلی حیثیت سے ایک قوم (یعنی اسلامی اور ملائی انڈونیشی) ہونے کے نظامِ حکومت کے اعتبار سے مختلف حصّے مختلف نظام کے پابند رہے۔ جن پر وطنیّت کے نقطۂ نظر سے

مقامی رواج کا اثر غالب تھا مثلاً یہ کہ اسلام کے ظہور سے قبل جہاں ہندو اور بدھ تہذیب کارفرما تھی وہاں کے اسلامی فلسفہ، ادب، پر اسی کی باقیات (زبان اور عادات) کا اثر چڑھ گیا اور جہاں شیونِ زندگی مظاہر پرستی پر مملو تھے وہاں کا 'ادب' ان کا اثر پذیر ہوگیا۔ اس طرح اسلام کا تمدن اور تہذیب تو مذہب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ سارے ملک میں اس صدی تک پھیل گئی مگر نظامِ حکومت اور اکثر رواج اصطلاحی ولسانی مقامی طور ہی پر باقی رہے۔

سماترا اور جاوا میں اسلام کو بدھ اور ہندو مذہب کی مخلوط تہذیب سے مقابلہ کرنا پڑا تھا اس لئے وہاں کی زبان اور فلسفہ و ادب اور حکومت کی اصطلاحات بولی کے طور پر مقامی یعنی بدھ ہندوانی رہیں مگر روح اس کی اسلامی ہوگئی۔ اسی طرح مشرقی اطرافِ جزائر میں مظاہر پرستی کو کالعدم کرکے اسلام نے ظہور کیا تھا وہاں پر یہ اثرات اسی جہت سے منطبق ہوئے۔ اور اس طرح قومی تمدن جسے اس وقت تک اسلام کی آغوش میں آجانے کے باعث "مسلم تمدن" کہنا چاہیئے اندازِ زبان اور طرزِ حکومت کے اعتبار سے مختلف مقامات پر مختلف رہا۔ جس کا بڑا حصہ پھر بھی کثرتِ آبادی کے باعث جاوا ہی تھا۔ جو بشمولِ جزیرۂ مدورا مشرقِ بعید کی سب سے بڑی مسلمان سلطنت 'ماترم' کی قلمرو تھا۔ چونکہ اس صدی (سترہویں) کے بعد سے اہلِ مغرب کے استحصال کا وہ دور شروع ہوجاتا ہے جس کے سبب مسلمان حکومتیں زوال میں آنی شروع ہوگئیں تھیں اور زوال کے بعد سے عام زندگی بھی مغرب کے اثرات سے بہت سی خرابیوں کا آماجگاہ بنتی چلی گئی تھی لہذا اسی عہد تک کی عام زندگی اور نظامِ حکومت کو عہدِ اسلام کے خودمختار نظام اور تمدن کا آئینہ دار سمجھنا چاہیئے۔

چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر اس عہد کی تمدنی کیفیات کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے چونکہ نظامِ حکومت جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے مختلف تھا لہذا پہلے اسی کو سلسلہ وار جدا جدا طور پر بیان کیا جاتا ہے اور تمدن کی دیگر شقوق کو ایک ساتھ ہی بیان کر دیا جائے گا۔ نظامِ حکومت کے بیرونِ جاوا کے حصوں کے باب میں زیادہ وسیع قلمرو جاوا کی تھی لہذا خصوصی روشنی اسی پر ڈالی جاتی ہے اور دیگر نظام کو دوش بدوش[1] لانے کے لئے ذیلی نوٹ میں بیان کیا جاتا ہے۔

## سلطنتِ جاوا

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جاوا میں بھی نظامِ حکومت مختلف رہا ہے مگر دیماک کی سلطنت جو جاوا کی سب سے پہلی مسلمان سلطنت تھی سلطان گیری کی ماتحتی میں قریب قریب اسلامی قانون اور تعلیمات کے مطابق عمل پیرا تھی، اس کے حکمراں بھی سلطان کہلاتے تھے اسی طرح علاقۂ سُنڈا

---

### [1] بیرونِ جاوا کی مسلم سلطنتوں کا نظام

اس سلسلہ میں سب سے پہلے سُماترا سلطنت سُمدرا پسائی کے بعد قایم ہونے والی سلطنت آچیہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس سلطنت کے باب میں روشنی ڈالتے ہوئے ایک ولندیزی مورخ "ہاخ" لکھتا ہے کہ:۔

"نظامِ حکومت کے اعتبار سے سلطنتِ آچیہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیشہ مختلف چھوٹے چھوٹے ضلعوں میں تقسیم رہی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کا سربراہ موروثی ہوتا تھا اور "ہولو بلانگ" کہلاتا تھا اور ایک دوسرے کے ضلعدار سے بہت گہرا تعلق رکھتا تھا یہ سب ضلعدار آچیہ کے حکمران کو اپنا مشترکہ آقا مانتے تھے آچیہ کا یہ حکمراں ملائی زبان میں "سلطان" اور اپنی مقامی (یعنی آچیائی) زبان میں راجہ کہلاتا تھا جب کبھی ایک حکمراں کے مرجانے کے بعد دوسرے کے انتخاب کی ضرورت پیش آئی تو تین "ساگی" (آچیہ کی سلطنت میں بہت سے سردار خود مختار ہو گئے تھے ان میں سے

کی سلطنت بانتن بھی حسن الدین رح اور اس کے جانشینوں کے عہد میں اسلامی قوانین اور تعلیمات کے مطابق ہی عمل کرتی تھی۔ مگر ماترم کے عہد میں نظامِ حکومت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو گئیں قانون میں ملکی اور مقامی رسم و رواج کو بھی داخل کر دیا گیا، جو باصطلاحِ عربی 'عادات' کہلاتا تھا۔

چونکہ ماترم کے عہد (سترہویں صدی عیسوی) میں باستثنا رکچھ علاقہ کے قریب قریب پورا جاوا ایک ہی مسلمان سلطنت کی قلمرو میں شامل ہو گیا تھا لہذا پوری سلطنت کو آٹھ یا نو (باختلافِ روایت) صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن میں سے ہر ایک کا اعلیٰ

---

تین رساگی، کہلاتے تھے) سابق شاہ کے افرادِ خاندان میں سے حقدار اور لایق شخص کو حکمراں منتخب کرتے تھے۔ انتخاب میں آجانے کے بعد یہ حکمراں ان سردارانِ قبائل کو نذرانے پیش کرتا تھا۔ انتخاب عموماً خانوادۂ شاہی کے سابق حکمراں کی اولاد میں سے کیا جاتا تھا لیکن اگر اس کی نسل میں کوئی فرد باقی نہ رہتا تو پھر حضراتِ سادات (جو یہاں حضرموت وغیرہ سے آنکر بس گئے تھے) میں سے چن لیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود ان ساگی سرداروں میں سے بھی کوئی لایق آدمی حکمراں بنا دیا جاتا تھا۔

سلطان کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے۔ آچیہ کے "ہُولُوبلانگ" اور دیگر ماتحت سردار سب ہی اس کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ گردانتے تھے۔ سلطان کی طرف سے ان سرداروں کو نشانِ امتیاز کے طور پر ایک خنجر بھی مرحمت ہوتا تھا۔ جسے وہ اپنے پہلو میں آویزاں کر لیتے تھے اور طبقاتِ جمہور میں اسی سے پہچانے جاتے تھے۔ جمعہ کے روز شاہی مسجد میں نماز پڑھانے والا (جسے امام کہتے تھے) بھی سرکاری افسر ہوتا تھا۔ جس کی ماتحتی میں ایک خطیب بھی افسر مقرر تھا، حکمراں سے لے کر رؤسا اور امرا تک سب ان دونوں افسروں کا احترام کرتے تھے امام عموماً بہت بڑا عالم اور غیر ملک میں پڑھا ہوا کامل شخص ہوتا تھا۔ قانونِ اسلام کا ماہر ہونا بھی اس کے لئے ضروری تھا۔ فیصلے عموماً قانونِ عادات (یعنی غیر تحریری روایات) کی رو سے چکائے جاتے تھے، انصاف کا

افسر با قاعدہ گورنر ہوتا تھا اور حیثیت میں وائسرائے کے بالکل مشابہ تھا۔ اور اصطلاحی طور پر "آدِیْ پاتی" کہلاتا تھا۔ اور عموماً شاہی خاندان کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات داخلی طور پر بہت وسیع تھے، سول اور فوج دونوں قسم کے امور پر اس کا پورا پورا اقتدار تھا اس کی ماتحتی میں باقاعدہ ضلعدار رہتے تھے جنھیں نیوکو (Nayoko) کہتے تھے۔ ضلعدار دیہات کے چھوٹے (مثلاً آجکل کے کلکٹر اور تحصیلدار کے مانند) افسروں پر مقتدر ہوتا تھا۔ لگان وغیرہ بھی یہی افسر وصول کرتے تھے۔ لگان کا طریقہ پرانا اور قدیم تھا، یعنی یہ کہ زمینیں باقاعدہ کاشت کاروں کو کاشت کرنے کے لئے دی جاتی تھیں اور کاشتکار لگان کے طور پر کل پیداوار کا نصف حصّہ حکومت کو دیتا تھا۔ اور ٹیکس کی ادائیگی اپنی محنت یا بیگار کے ذریعہ کرتے تھے۔

**حکمراں کی حیثیت** بادشاہ پوری قلمرو کا حاکمِ مطلق العنان ہوتا تھا۔ چنانچہ کرافورڈ

---

بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ سلطنت کا سرکاری مذہب اسلام تھا۔ سلاطین نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہوتے تھے، ہاتھی کی سواری بھی کرتے تھے، مگر ان کی زندگی بڑی سادہ ہوتی تھی، عمامہ اور عبا بھی زیب تن کرتے تھے، تعلیمِ عمومی کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے، علم و ادب کے بھی بڑے دلدادہ تھے "ذکوٰۃ" سرکاری طور پر وصول کی جاتی تھی، اور اس کی وصول یابی کے لئے عید الفطر کا دن مقرر تھا۔ وصول شدہ رقم ایک الگ خزانہ میں رکھی جاتی تھی۔ تعلیم اور تبلیغ کے مصارف اس رقم سے پورے کئے جاتے تھے مگر سلاطین کی درباداری کے مصارف اور حکومت کے اخراجات جیسا کہ پرتگیزی مورخ "ٹام پائرس" نے لکھا ہے ساحلی علاقوں سے وصول کئے ہوئے ٹیکس اور لگان سے وصول کی ہوئی رقوم سے پورے ہوتے تھے اندرونِ ملک کے لوگوں سے "ٹیکس" وصول کرنے کا قاعدہ نہ تھا کیونکہ وہ ضلعداروں کی آمدنی تصوّر کیا جاتا تھا جو سترہویں صدی میں "اختیارات کی حیثیت سے بہت زیادہ کر دئے گئے تھے۔ یہ آزاد شدہ ضلعدار یا سردار جیسا کہ لکھا جا چکا ہے "ساگی"،

(جلد دوم صفحہ ۵۱ پر) لکھتا ہے کہ اس کے اختیارات بہت وسیع تھے اور کوئی امر بھی ایسا مانع نہ تھا جو اس کے افعال و اعمال میں کسی طرح مخل ہوتا۔ اختیارات کی صحیح حیثیت میں وہ ایشیا کے دیگر حکمرانوں کی بہ نسبت زیادہ صاحب اقتدار ہوتا تھا۔ اس کی حیثیت موروثی تھی، صلح و جنگ، جاں بخشی اور سزائے موت کے سارے اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ ماترم سے پہلے کے حکمراں (مثلاً پاتح ہلاّو غیرہ) چونکہ مذہبی پیشوا بھی تھے لہٰذا ان کا اقتدار و اختیار اور وقار و احترام بہت بلند تھا عوام میں ان کی حیثیت اسلامی خلیفہ کے مانند تھی، حکمراں (کبھی) سلطان اور (کبھی) سُوسُو ہُونان، کے شاہی لقب اختیار کرتے تھے۔

**ولیعہد اور ملکہ** بادشاہ کی جائز اور نکاحتا پہلی بیوی کا لڑکا ولیعہد بنایا جاتا تھا۔ جس کا تقرر خود بادشاہ کرتا تھا۔ یہ ولیعہد عام طور پر "پنگیران" کہلاتے تھے۔ ان 'ساگی'، سرداروں میں تین بہت اہم تھے جن کا ایک باقاعدہ وِفاق تھا اور اس وِفاق کا سردار 'پنگ لیماساگی'، کہلاتا تھا۔

سرکار کی زبان 'آچیائی'، تھی جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی مگر عوام کی ادبی زبان 'ملایو'، ہی تھی جس کے دوش بدوش مذہبی مدارس میں عربی کا رواج تھا۔

**سلیبس اور مالوکو** جنوب مشرق کی اس نواح میں جہاں چھوٹی چھوٹی حکومتیں لاتعداد تھیں سلاطین 'ترنلتے'، 'تدورے'، اور گوا وغیرہ کے ماتحت تھیں۔ یا پھر ان کا اپنا جدا جدا وِفاق قایم تھا۔ وِفاق میں آنے والے چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے حکمراں بھی سلطان ہی کہلاتے تھے، خواہ ان کا رقبۂ عمل کتنا ہی چھوٹا اور کم آمدنی کا کیوں نہ تھا۔ اور یہ سلطان بھی اپنے خاص علاقہ میں موروثی ہوتا تھا، بعض علاقوں میں وفاقی حکومت کے نظام کو چلانے کے لئے جو وزیر ہوتا تھا اس کی معاونت کے لئے ایک باقاعدہ کونسل ہوتی تھی جیسے 'باداٹ'،

کہلاتا تھا۔ اور ایک مقررہ علاقہ کا حاکم بنادیا جاتا تھا جہاں اس کی حیثیت بادشاہ ہی کے مانند ہوتی تھی عالمِ شہزادگی میں بادشاہ بننے کے ہنگام تک وہ اس مقام کا "پنگیران" کہلاتا تھا (شلاً "پنگیران لوکر" یا اور اسی طرح) وغیرہ وغیرہ بادشاہ کی نکاحتا بیگم "دراتو" کے لقب سے مشہور ہوتی تھی ۔ وہ کبھی کبھی میدانِ جنگ میں بھی سپاہ کے ساتھ لڑنے کے لئے جاتی تھی اور اکثر فوجوں کی کمان بھی کرتی تھی ، جیساکہ خود سلطان اگنگ کے حالات میں پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے ۔

سلطان اور شہزادے کنیزیں رکھتے تھے مگر یہ دستور تھا کہ کنیز کے بطن سے پیدا ہونے والا لڑکا حکمراں نہیں بنایا جاتا تھا ۔ سلطان اور شہزادے اعلیٰ قسم کے محل میں رہتے تھے اور یہ محل کبھی "کراطون" ، اور کبھی "دآستانہ" ، کہلاتے تھے ، ایک خاص فوج کا دستہ دروازہ پر نگرانی کے لئے متعین ہوتا تھا ،

---

(Hadaat) کہتے تھے ۔ اس کے اراکین کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے مثلاً یہ کہ یہ اراکین نااہل منتخبہ امیر کو الگ بھی کرسکتے تھے اور اس کے بجائے پھر اپنے ہی میں سے کسی دوسرے لایق آدمی کو امیر بنا لیتے تھے ، یہ تعداد میں سات ہوتے تھے حکومت کے تمام عہدے بھی انہی سات آدمیوں میں منقسم کئے جاتے تھے مگر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ عورت بھی اس انتخاب میں آسکتی تھی مگر اس کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ اس مخصوص خاندان ہی کی فرد ہو جس خاندان سے امیر کا انتخاب مخصوص ہوتا ، نیز یہ ضروری تھا کہ اس کے علاوہ اس خاندان میں کوئی مرد باقی نہ رہا ہو عورت کی طرح کمسن بچہ بھی وفاقی حکومت کا امیرالامرا بنایا جاسکتا تھا اور ان دونوں صورتوں میں ایک نگراں افسر یا اتالیق بھی مقرر کیا جاتا تھا ۔ یہ نگراں افسر یا اتالیق "مڈینگ رنگ" کہلاتا تھا ۔ جس کے معنی ستون کے ہیں ۔ کونسل کے افراد بادشاہ کے ساتھ دورہ پر بھی جاتے تھے اس صورت میں شاہ اور ان کا ایک ایک نمایندہ قائم مقامی کے فرائض انجام دیتا تھا ۔ یہ

## دربارداری کا طریقہ

(بحوالہ بستان السلاطین نقل کیا جاتا ہے جو ۱۶۳۷ء کے بعد یا اسی وقت کی تصنیف ہے) سلطان تاج اوڑھتا اور شاندار تخت پر بیٹھتا تھا جو سونے چاندی کے زرنگار سے منقش ہوتا تھا۔ چھتری والے چھتر لئے ہوئے بادشاہ کے عقب میں کھڑے رہتے تھے اور سایہ کرتے تھے، اہلِ دربار میں وزرا، گورنر اور فوجی افسر تھے، دربار میں حاضر ہونے کا ایک خاص لباس اور آئین تھا، جب کوئی دربار میں باریاب ہوتا تو دونوں ہاتھ سینہ پر رکھکر ادب کے ساتھ جھکتا اور بادشاہ کی صدر نشین کے پاس پہنچکر جھک کر چلتا تھا، سیدھا کھڑا ہونا آئین دربار کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ یہ رسم ہندوستان کے مغلوں کے آئین کورنش و تسلیم سے کچھ ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔

جب کوئی درباری بادشاہ سے مخاطب ہوتا تو "بگندا" کہکر آداب بجالاتا جو جہاں پناہ کا مترادف ہے۔ اور بات بات میں اپنے آپ کو "آپ کا غلام یا خادم" (پاتک ہمبا یا

قائم مقام "سوکے واتانگ" کہلاتا تھا۔

کرافورڈ لکھتا ہے کہ تمام جزائر مالوکو میں یہی طرزِ حکومت جاری تھا اور یہ ۱۸۱۴ء تک (جبکہ کرافورڈ کو برٹش بورنیو کی طرف سے ایک معاملہ میں جانا پڑا تھا) برابر جاری رہا چنانچہ یہی کرافورڈ آگے لکھتا ہے کہ سلیبس (سلاویسی) میں بھی اسی قسم کا طرزِ حکومت قایم تھا جس میں فرق کی بات صرف یہ تھی کہ یہاں بادشاہ کو چننے والے دس انتخاب کنندگان ہوتے تھے اور وہ "بچالایا" کہلاتے تھے پہلا وزیر بھی انہی میں سے مقرر کیا جاتا تھا جسے "بچارا بوتاہ" کہتے تھے۔ مگر اس وزیر کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے حتیٰ کہ وہ منتخبہ بادشاہ کو بھی اس کی نااہلی یا ظلم پروری پر معزول کرسکتا تھا۔ اپنی منتخب کرنے والی جماعت کو بھی اپنے اقتدار پر آنے کے بعد ہدایت کرسکتا تھا نیز کونسل کے اراکین میں سے نااہل رکن کو ہٹا بھی سکتا تھا۔ کونسل کے یہ اراکین "بوتا سالانپ" کہلاتے تھے۔

جزیرۂ سلیبس (سلاویسی) کے جنوب میں "دوالو" کی لوگ مسلم سلطنت کے بارے میں کیفیت

دنیپر ہمپا سایا) کہکر سلسلۂ کلام جاری رکھتا تھا، مگر بادشاہ جب کسی درباری کو مخاطب کرتا تو "ساؤدارا" یعنی رفیق یا بھائی کہکر پکارتا تھا۔ دربار میں کنیزیں بادشاہ کے سامنے تخت کے جلو میں مبیٹھی تھیں۔ اور چوبدار چوب، نیزے اور تیر و کمان لئے ہوئے ادب سے ساتھ کھڑے رہتے تھے، بادشاہ سر کے اوپر لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔ (ایک اسی قسم کی قلمی تصویر میری نظر سے گذر چکی ہے۔ قادری)

**شاہی خطابات**

جب بادشاہ اشراف یا امراء میں سے کسی سے خوش ہوتا تو، "بوپاتی" کا خطاب عطا کرتا، کبھی کبھی اعلیٰ فوجی افسروں کو ان کے کارناموں کے سبب "سینوپاتی" کا خطاب بھی دیا جاتا تھا جس کے معنی جنرل کے ہیں۔ اس طرح "سیروپاتی" بھی ایک فوجی خطاب تھا۔ یہ خطابات اگرچہ

---

کچھ اس سے مختلف تھی یعنی یہ کہ اس اسٹیٹ میں قومی کونسل کے ارکین ملک کے چالیس شہزادے ہوتے تھے اور پوری کونسل تین ایوان پر مشتمل تھی۔ آخری ایوان کے رکن دو شہزادے ہوتے تھے یہی شہزادے امیر کا انتخاب کرتے تھے، جو اقتدار پر آنے کے بعد "ماتوا" (Maruwa) کہلاتا تھا اس کے ماتحت کونسل کے ارکین ایک پارلیمنٹ کی صورت میں ہوتے تھے، یہی کونسل اعلانِ جنگ کرتی تھی۔ امن و صلح کی تجاویز قبول کرتی تھی۔ تجارتی معاہدے بھی اسی کے ذریعہ سے طے ہوتے تھے، حکومت کا کاروبار بھی اسی کو انجام دینا پڑتا تھا لیکن آخری منظوری "ماتوا" (یعنی امیر الأمرا) سے لینی ضروری تھی۔

مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان سب حکومتوں کا سرکاری مذہب اسلام تھا۔ حکمراں مذہب کے بڑے پابند تھے، مبلغین اسلام کا احترام کرتے تھے، قرآنِ مجید کی تعلیم عام تھی، اور مفت تھی، آمدنی کے بڑے صیغے بندرگاہوں اور ماہیگیروں کا ٹیکس تھا۔ علمائے اسلام کا بھی بڑا پوزیشن تھا، غرض اسلام نے یہ جمہوری نظام حکومت اس نواح کو عطا کیا تھا۔

قدیم ہندوانی خطابات سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں مگر لسانی، حد تک ہی ان کا اثر تھا۔ ورنہ کرافورڈ (جلد دوم صفحہ ۲۵ پر) لکھتا ہے کہ:۔

"اگرچہ بادشاہوں اور امیروں کے نام، القاب اور خطابات ہندؤں کے قدیم لسانی اثر سے متاثر تھے مگر اصول میں ہیئت مشرق کے مسلمان سلاطین سے مشابہت رکھتے تھے"۔

**جلوس** خاص خاص مواقع پر سلاطین باقاعدہ جلوس کے ساتھ نکلتے تھے، اس وقت ان کی سواری کی خاص چیز یا تو ہاتھی ہوتا تھا اور یا پھر گھوڑوں کی بگھی ہوتی تھی، بادشاہ تیراکی، شہ سواری، اور فنون حرب کا ماہر ہوتا تھا، علم وادب سے بھی اسے بڑی وابستگی ہوتی تھی اکثر میدان جنگ میں خود ہی فوج کے ساتھ لڑنے کیلئے بھی جاتا تھا۔ (سلطان اگنگ کے حالات سے ان سب باتوں کا پتہ چلتا ہے) ان کے ساتھ اکثر اس کی ملکہ بھی میدان میں لڑتی تھی اور فوج کی افسر ہوتی تھی۔

**غلامی کا رواج** غلامی کا بھی رواج تھا مگر یہاں کی غلامی ایشیا کے دیگر ممالک کی غلامی سے مختلف تھی، ہندؤں کے زمانہ میں غلام کا کوئی پوزیشن نہ تھا مگر اس عہد میں بقول "ہمبولڈ[1]" جزائر کے ہر حصہ میں غلام رکھے جاتے تھے اور غالباً ان کا رواج ہندوستان کے ہندو اپنے ساتھ لائے تھے مگر اسلام نے یہاں پہنچکر غلاموں کو بہت حد تک آزاد کرا دیا تھا مثلاً یہ کہ جو غلام امراء اور سلاطین کے ہاں رہتے تھے وہ محض خدمت گذار کی حیثیت رکھتے تھے کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے، چلنے اور بات کرنے میں انھیں بڑی آزادی تھی۔ ان کی خرید و فروخت قانوناً جرم تھی۔ البتہ جب کوئی حکمراں کسی

---

[1] ہمبولڈ کی کتاب بعنوان (Humboldt's Political Essay on New Spain Book II Part VI) مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۲۰ء۔

دوسرے کے مقابلہ پر لڑائی میں ہار جاتا اور اس کی حکومت بھی چھن جاتی تو یہ نیا فتح والا حکمراں مفتوح کے غلاموں کو بھی کسی دوسرے جزیرہ میں منتقل کر دیتا تھا اور رکھوا دیتا تھا، البتہ بالی کے ہندو راجاؤں میں مرد اور عورت دونوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی، سنوسی پانے (سجارا صفحہ ۱۴۷) کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان آگنگ کے حرم میں صرف سات کنیزیں تھیں۔ اگر اس تعداد کا مقابلہ قدیم عہد ہنود کے مجاپائت حکمرانوں کی تعداد کنیزگان سے کیا جائے تو یہ کچھ نہیں کے برابر ہوتی ہے۔

## اشرافیت

البتہ اشرافیت کو بڑا اقتدار حاصل تھا اشراف عموماً خانوادۂ شاہی کے مختلف افراد ہوتے تھے۔ اور تین خاص طبقوں میں منقسم تھے مثلاً (۱) دامانگ۔ (۲) رونگو اور (۳) اگنا ہی۔ پھر ان میں سے ہر طبقہ تین درجوں میں تقسیم تھا۔ اور ہر درجہ ایک خاص امتیازی نام کے ساتھ معنون تھا مثلاً (۱) ماس۔ (۲) کیائی۔ (۳) ریڈن۔

پہلے طبقہ کے امرا بادشاہ کے بھائی بھتیجے، داماد، بھنوئی، چچا اور لڑکے وغیرہ ہوتے تھے "آدی" (یعنی گورنر) اسی طبقہ میں سے مقرر کیا جاتا تھا۔ حکومت کے وزرا (یعنی پاتھ اور منتری) بھی انہی میں سے ہوتے تھے ان کے ماتحت افسر اور منصبدار دوسرے طبقہ میں سے ہوتے تھے اور دیہاتوں کے افسران کا تقرر تیسرے طبقہ کے امرا میں سے کیا جاتا تھا مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان طبقات کے امراء میں سے ہر طبقہ کے لوگ فوجی خدمات پر بھی مامور ہو سکتے تھے اور سول کے مناصب پر بھی مقرر کئے جا سکتے تھے، نہ کاملاً فوجی ہوتے تھے اور نہ کاملاً سول کے، بلکہ ہنگام ضرورت پر بادشاہ جیسی چاہتا ویسی خدمت انکے سپرد کر دیتا تھا۔ بقول ایک اندونیشی دوست

جاوائی مسلمانوں میں یہ نام اکثر گوت کے ساتھ آج کل بھی رائج ہے۔

**حکومت کی تشکیل** جاوا کے اس بڑے حکمراں کے نظامِ حکومت میں اس کا خاص مشیر کار وزیر ہوتا تھا، جو عموماً مذہبی اور دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ متبحر قسم کا عالم بھی ہوتا تھا، اس وزیر خاص یا وزیر اعظم کو 'پاتھ' کہتے تھے جو چار وزیروں کی ایک مجلس کے ساتھ کاروبارِ حکومت کو انجام دیتا تھا، اس مجلسِ وزرا کا ہر رکن 'منتری'، کہلاتا تھا (ان نائبین یا وزرا کی تعداد میں چار کی تخصیص بقول بعض روایاتِ اسلام کے چار خلفائے راشدین کی تعداد کی مناسبت سے تھی) ان منتریوں میں سے دو منتری نظم ونسقِ مملکت کو انجام دیتے تھے اور دو کا کام حکمراں کے محل اور خاندان کی دیکھ بھال اور امور کو انجام دینا ہوتا تھا اور ان (چاروں) کی مجلس یا کابینہ کو "کمنتریان" کہتے تھے۔ حکومت کا نظام مختلف شعبوں میں تقسیم تھا نظام کی پوری تقسیم اور شعبہ جات کی پوری دیکھ بھال کمنتریان کے دو ارکان یا وزرا کے تفویض تھی۔ چنانچہ شعبۂ فوج کا سارا نظام 'سینوپاتی'، انجام دیتا تھا اور امورِ مذہبی کا حاکمِ اعلیٰ 'پنگھولو' (یعنی صدر الصدور) کہلاتا تھا، طلاق وخلار، حقِ وراثت اور حقِ شفاعت کے سارے مقدمے اسی کے فیصلوں سے طے پاتے تھے، اور شافعی فقہ سے خاص مدد لی جاتی تھی (خلافتِ راشدہ کے اتباع میں) اس کی عدالت مسجد ہی کے ایک گوشہ میں ہوتی تھی جسے سرامبی کہتے تھے، سنگین جرائم کے مقدمات دربارِ سلطان میں پیش کئے جاتے تھے جو 'پاتھ' کی تجویز سے فیصل ہوتے تھے، مقدمۂ قتل کا فیصلہ بادشاہ خود کرتا تھا۔

بادشاہ کے وزرا اور 'پاتھ' کی طرح صوبہ کے گورنر (آدیپ) بھی اپنے ہاں 'پاتھ'

اور 'منتری'، رکھتے تھے، اور ان کی تعداد بھی چار ہی ہوتی تھی، اسی طرح ڈیسا (گاؤں) کے نظم و نسق میں بھی ضلعداروں کے ماتحت چار ہی افسر مقرر تھے (لگان وغیرہ کے متعلق شروع ہی میں بیان کیا جا چکا ہے) شاہی مسجد کا امام مولینا کہلاتا تھا، اور شہر قاضی کو 'کالی' کہتے تھے جو 'پنگھولو' کا ماتحت ہوتا تھا نمازِ جنازہ اور نکاح پڑھانا، وغیرہ اسی کے فرائض میں شامل تھا۔

حکومت کی آمدنی کے بڑے صیغے زمینوں کا لگان، بندرگاہوں کا ٹیکس اور ذکواۃ کی وصول شدہ رقم تھی۔ ہر بندرگاہ پر مختلف ممالک کے نمایندوں کا ایک بورڈ مقرر تھا جو بعض روایات کے مطابق آٹھ اور بعض کے مطابق ۱۶۔ ارکان پر مشتمل تھا۔ یہ ارکان اپنے ملک کے سوداگروں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور ان کے مال پر ٹیکس کی شرح عاید کر کے سرکار کے افسر ٹیکس کی خدمت میں فہرست پیش کرتے تھے، ٹیکس اسی فہرست کے مطابق وصول کیا جاتا تھا، اور یہ ٹیکس وصول کرنے والا افسر 'شاہ بندر' کہلاتا تھا۔

**فوج** اگرچہ بعض یورپین مؤرخین نے فوجی نظم و نسق کو کمزور اور ناقص بتلایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ فوج کثیر التعداد تھی اور مضبوط تھی چنانچہ 'سینوپاتی' اور 'سلطان آگنگ' کی فتوحات اور معرکہ آرائیوں سے صاف ظاہر ہے کہ تیس تیس اور چالیس چالیس ہزار فوج بیک وقت میدان میں اُتار دی جاتی تھی، اور فاتح ہو کر اپنے مرکز پر لوٹتی تھی، فوج کا صدر مقام 'طوبان' تھا۔ جو جاوا کے شمالی مشرقی ساحل پر بہت بڑا بندرگاہ تھا۔ بحری بیڑہ بھی اسی مقام پر رہتا تھا۔ بری فوج پیادہ اور گھوڑ اسواروں پر مشتمل تھی، تیر، نیزے اور تلواروں کے علاوہ منجنیق کی قسم کا آتشی

حربہ بھی استعمال کیا جاتا تھا جو عہدِ مجاپاہِت میں چینیوں کے حملہ کے وقت سے اس ملک میں رائج ہوا تھا، اور جاسوس دشمن کی خبروں کا پتہ چلانے کا کام کرتے تھے (جیسا کہ خود سینوپاتی کے حال سے ظاہر ہے)۔

اس طرح حکومت (بقول کرافورڈ کی جلد دوم صفحہ ۲۷) نہایت ہی باقاعدہ اور مضبوط تھی بلکہ اس درجہ طاقتور تھی کہ داخلی طور سے باشندوں کو انحراج پیدا کرنیکا موقع بھی کم ہی ملتا تھا۔

**پرچم** پرچم کے لئے چاند اور تارہ کا نشان مخصوص تھا مگر اس چاند تارہ کے لئے جھنڈہ کا پس منظر مختلف حکمرانوں کے عہد میں مختلف رہا ہے، کبھی پس منظر کا رنگ ہرا اور کبھی زرد رہا ہے (پرچم کا یہ نشان ۱۸۳۰ء میں ماترم کے مشہور مجاہد اسلام حکمراں "دیپونگورو" کے وقت تک رہا ہے کیونکہ اس قسم کے پرچم کو ہاتھ میں لئے ہوئے اس کی تصویر میری نظر سے گذری ہے "قادری")

**سکّے** سکے سونے اور چاندی کے ہوتے تھے (مگر ان کے نام مجھے دستیاب نہیں ہو سکے البتہ صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ ان کی قیمتیں ہر حکمراں کے عہد میں مختلف تھیں) لیکن ان کا رواج داخلی ضروریات ہی تک محدود تھا۔ تنخواہیں انہی سکوں میں ادا کی جاتی تھیں اور انعامات کے لئے جواہرات بھی استعمال ہوتا تھا۔ (تنخواہوں کی شرح کیا تھی یہ کچھ معلوم نہ ہو سکا)۔

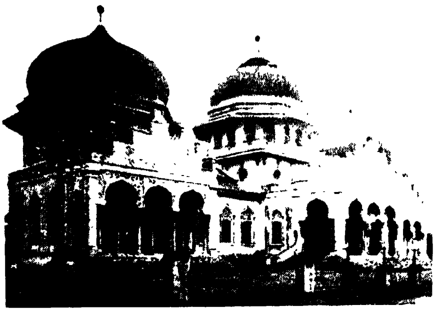
**سرکاری زبان** ماترم کی عدالت میں "جاوی" تھی اور ریاستن کے دفاتر میں "سنڈانی" کا رواج تھا، (ذیلی نوٹ میں جہاں بیرونِ جاوا کے نظم ونسق پر روشنی ڈالی گئی ہے اس تسلسل میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر علاقہ




قرآن مجید کا تین سو سال پرانہ قلمی نسخہ جو پلیم بنگ (سماترا)
میں ملا ہے



سلطان اگنگ کے عہد کی ایک
شاندار تاریخی مسجد سراکرتا
(وسطی جاوا)



میڈان (سماترا) کی شاندار قدیم تاریخی مسجد

کی آزاد مسلمان سلطنت یں وہاں کی مقامی زبان عدالت کی زبان رائج تھی مثلاً بورنیو میں سُکدانی، نجرماسینی، سلیبس یں بوگینی، گورنتالو اور ٹولہ زبانیں وغیرہ، سُماترا کے علاقہ آچیہ میں آچیہ کی زبان اور ملائی تھی جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی) مگر جاوی کا رسم الخط قدیم کاوی رسم الخط تھا، البتہ عربی کے بے انتہا الفاظ اور اصطلاحات کی آمیزش سے اس کا رنگ بالکل جدید ہوگیا تھا۔ اور یہ اب بہت ہی علمی اورادبی زبان تھی۔ تجارت کے لئے مَلایُو (جس سے موجودہ اندونیشی نکلی ہے) زبان کا رواج تھا۔

## فنِ تعمیرات
(مساجد، مقابر، اور قصورِ شاہی)

قدیم تعمیرات کا فن جو ہندو تہذیب اور ذہنیت کا ترجمان تھا اسلامی تہذیب سے متاثر ہوکر اب اس عہد میں بہت زیادہ نکھر گیا تھا ہندو عہد میں سرکاری عمارات اَستوپ، چانڈی، اور راجاؤں کے محلات پر منحصر تھی اور ان کی تعمیرات میں بت پرستی کی تعلیمات اوہام پرستی کے نظریات کے ماتحت سنگ تراشی، اور سنگ آمیزی کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، یعنی بت کھڑے کئے جاتے تھے اور ستونوں کو بھی بُتوں کی صورت میں تراشا جاتا تھا، پھر ان کی چھتری بھی ایک خاص قسم کی ہوتی تھی مگر اسلام کے آنے کے بعد یہ فن بالکل بدل گیا، بُتوں کے بجائے سنگتراشی میں نقاشی، بچّی کاری، گُل کاری، ستونوں کا اُٹھانا، دیواروں کا کھڑا کرنا وغیرہ تو قدیم ہی رہا مگر ان کی ساخت کے نظریات سب اسلامی ہوگئے، اور قرآنی آیات کو طغرائی نقش کے ساتھ کندہ کر کے تعمیرات کو حسین بنانے کا رواج ہوگیا۔ اور اس طرح

ایک نیا فن تعمیرات وجود میں آگیا جسے "مسلم انڈونیشی، فن تعمیرات کہنا چاہیے" بقول ایک انڈونیشی مصنف مسجد قدوس، سلطان آگنگ کا کراطون (محل) اور سونان گننگ جاتی کی "قبوران کرامت" (درگاہ) سولو کا مدرسہ منبع العلوم کی عمارت وغیرہ یہ سب اس آرٹ کے نمونے پر بنائی گئیں تھیں جنھیں بعض ناواقف لوگ ہندو فن تعمیر کا نمونہ" سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ہندو فنِ تعمیر کا نمونہ نہیں ہیں بلکہ یہ ایک نئے آرٹ کا نمونہ ہیں جو محض اس عہد میں پیدا ہوا اور اسے "مسلم انڈونیشی آرٹ، کہتے ہیں، جس میں اسلامی اثرات انڈونیشی آرٹ کے ساتھ مخلوط ہیں۔ اسلام کا اثر اس فن پر ایک یہ بھی ہوا کہ ہر سرکاری اور تاریخی عمارت کے قریب اعلیٰ قسم کا باغیچہ بھی لگایا جانے لگا (جو اہلِ عرب کی تعمیرات میں متداول تھا) ورنہ ہندو راجاؤں کی چانڈیاں عموماً ویرانوں میں بنائی جاتی تھیں جنکے آثار بقول مورخین اب بھی ویرانوں میں موجود ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی عمارات کو اس وقت کی توہم پرستی آبادیوں کے قریب بنانے کی درخور نہ تھی۔ اور ان میں باغ یا باغیچہ کا کوئی اہتمام نہ تھا کیونکہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو باغ اور باغیچوں کے آثار ان میں نہیں ملتے۔

**مسجدیں** | مسجدوں اور مقبروں (قبوران کرامت) پر ماسوا آچیہ (واقع سماترا) کے جہاں "پسائے" کے مقام پر تیرہویں صدی میں (یعنی آج سے پانچسو سال قبل) سب سے پہلی مسجد ہندوستان کے مسلم آرٹ کے نمونہ پر بنائی گئی تھی، عموماً گنبد نہیں بنائے جاتے تھے، بلکہ ایک خاص قسم کی چھتری تعمیر کی جاتی تھی جو مسلم انڈونیشی فن تعمیر کے لحاظ سے مسجد کی خاص علامت ہے، قدیم مسجدوں میں حوض بنانے کا بھی رواج تھا، انڈونیشی انداز کا

ایک منارہ بھی اک پہلو میں کھڑا کیا جاتا تھا، جو اگرچہ متداول نہ تھا۔

خانۂ خدا ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان پورے عالمِ اسلامی میں مسجد کا ادب کرتا ہے۔ مگر اندونیشیا میں اس عہد میں (اور اب بھی جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے) مسجدوں کو بڑی اہمیت تھی، عمارتیں بھی دلکشا بنائی جاتی تھیں، حوض اور باغیچہ کے علاوہ دروازہ کے قریب اندر کو پانی کی ایک عام نہر بھی تعمیر ہوتی تھی جس میں ہر وقت پانی بہتا رہتا تھا، تاکہ مسجد میں داخل ہونے والے کے میلے کچیلے پاؤں اس نہر سے گذرنے میں صاف ہو جائیں اور وہ پاک وصاف پاؤں لے کر اندر کو داخل ہو اور پھر حوض کے قریب بیٹھکر وضو کرکے مسجد کے منارہ کے قریب ایک بہت بڑا نقارہ (جو شکل میں ہندوستانی اور پاکستانی ڈھول کے بالکل مشابہ ہوتا تھا) لگا دیا جاتا تھا، اُسے 'بِدُوک' کہتے تھے۔ وقتِ اذان سے چند منٹ قبل اسے بجایا جاتا تھا، (قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسم بادشاہوں کے شاہی نوبت خانوں سے اخذ کی گئی تھی جس سے مراد خانۂ خدا کی جلالت وشکوہ کے علاوہ عوام کو اوقاتِ نماز سے مُطّلع کرنا بھی تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ رسم اب بھی اسی طرح قائم ہے۔

مسجد کے ایک گوشہ میں ایک خاص قسم کا ہال یا کمرہ بھی بنایا جاتا تھا جسے 'سُرَامبی' کہتے تھے۔ قرآن خوانی کا مدرسہ یعنی "سِکولہ اَگامَا" بھی اسی سُرامبی میں ہوتا تھا جس میں بعد نمازِ ظہر تعلیم دی جاتی تھی، اور صبح سے ظہر کے وقت سے پہلے تک "پنگھولو" (صدر الصدور) کی عدالت کا اجلاس ہوتا تھا۔

پورے ملک (اندونیشیا کے جزائر) میں سرکاری مسجد کے لئے سرکاری طور پر پانچ عہدیدار مقرر تھے۔ یعنی (۱) امام (۲) خطیب (۳) بِلال اور دو خدمت گار (اذان دینے والے کو جاوا میں مُوَذّن اور تمام دیگر جزائر میں بِلال کہتے تھے) 'امام' مسجد کا

افسرِ اعلیٰ ہوتا تھا، سلاطین بھی اسکا ادب اور احترام کرتے تھے، مگر اس منصب پر تعلیمات اسلامی کا کاملِ فن اور عالمِ متبحر مقرر کیا جاتا تھا اور آچیہ میں یہ عہدہ خاندانِ سادات (جن کے خاندان عرب سے آنکر یہاں کافی بس گئے تھے) کے لئے مخصوص تھا مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ 'جاوا' میں 'امام' کو 'کالی' کہتے تھے۔ یہ قاضی کا بھی کام کرتا تھا۔

**مقابر** مساجد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اولیاء (سونان) کی خانقاہوں کو حاصل تھی جو اصطلاحی طور پر "قبوراَن کرامت" کے نام سے موسوم تھیں اور صاحب خانقاہ کی ذاتی عظمت اور تقدس شخصی کے باعث بلند ترین مقامات یعنی پہاڑوں (گننگ) پر بنائی جاتی تھیں، سلاطین بھی ہر شب جمعہ کو حاضر ہوتے تھے، پھول چڑھاتے اور فاتحہ پڑھتے تھے اور "دونگ پوتیہان" (یعنی قوالی جو ہندوستان کے تصوف کے ساتھ ساتھ یہاں پہنچی تھی کیونکہ آغازِ اسلام کے وقت ہندوؤں کو اکھٹا کرنے اور ان پر روحانی اثر ڈالنے کا صرف یہی ایک عام ذریعہ تھا) میں بھی شریک ہوتے تھے، اس مخصوص روز کی یہ حاضری "برزیارت" کہلاتی تھی (میرے اندونیشی دوستوں نے مجھے بتلایا کہ اب تک بھی یہ رسم جاری ہے 'قادری')

**مدارس اور تعلیمات** تعلیمات کا عام رواج بھی اس ملک میں اسلامی فیوض و برکات کا ایک خاص کارنامہ ہے ورنہ اسلام سے پہلے اس ملک میں عام تعلیم کا رواج نہ تھا اگرچہ "نوسنتارا" (ہندو اندونیشیا) 'ہندو بدھ' تعلیم کا بڑا مرکز ضرور تھا مگر تعلیم عام نہ تھی، خاص تھی اور خاص خاص 'پنڈ' اےئے کے گھرانوں تک محدود تھی۔ ذات پات اور چھوت چھات کے رواج نے تعلیم کو بھی قومی بندشوں میں مقید کر دیا تھا۔ اس طرح تمدن کی برکات سے محض خاص خاص

طبقے ہی مستفیض تھے، عام لوگوں کو پورا سالباس بھی نصیب نہ تھا چہ جائیکہ تعلیم، مگر اسلام نے داخل ہونے کے بعد ہر مسلمان مرد اور عورت پر اکتساب علم فرض کر دیا، سلاطین وقت بھی جن میں خصوصاً حسن الدین سلطان آگنگ، (جاوا کے سلاطین) ملک الصالح (سماترا کا پہلا مسلمان حکمراں) سلطان باب اللہ (سلیبس کے حکمراں) علاء الدین شاہ (اسی مشرقی نواح کا حاکم) وغیرہ علم وفضل کے بڑے سرپرست گذرے ہیں، چونکہ ان لوگوں نے خود اسلام کے صوفیا رکبار سے علم حاصل کیا تھا لہٰذا ان کی تعلیمات نے انھیں کیمیا بنا دیا اور پھر اس کیمیا نے یہ اثر دکھایا کہ ساری قوم چمک اٹھی۔ اس عہد کے واقعات سے ثابت ہے کہ بڑے بڑے مدارس قایم کئے گئے تھے، تعلیم عام تھی اور مفت دی جاتی تھی۔ اور علما سب درویش صفت اور فقیر منش ہوتے تھے۔

لیکن بڑے مدارس یا تو جاوا میں قایم تھے یا پھر سماترا میں بنائے گئے تھے، ن مدارس میں عموماً قرآن مجید، فقہ، حدیث، فلسفہ، اور تصوف کی تعلیم دی جاتی تھی عربی زبان کا پڑھنا اور سیکھنا لازمی تھا۔ قرآن مجید کی تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ جماعت بندی کا قاعدہ تھا مثلاً پہلے "ناظرہ" پڑھایا جاتا تھا مگر عربی زبان اس کے ساتھ ساتھ سکھائی جاتی تھی، عربی کے عرب تلفظ کی ادائیگی پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا، اسے "تجوید" کہتے تھے، پھر قرأت اور حفظ قرآن کا سلسلہ شروع ہوتا، اور اس کے بعد حدیث، فلسفہ، تصوف، فقہ وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی (فقہ، کے لئے "اصول شافعی" رائج تھا تصوف میں سلسلۂ قادریہ، شتاریہ اور نقشبندیہ کے اصول سکھائے جاتے تھے۔

"مسٹر سی[1]۔ ایس۔ ڈی کلرک" نے لکھا ہے کہ جاوا میں یہ مدارس "پیسنتران"

---

[1] (C. S. de Klerık) کی کتاب (De Java Oorlog Van) مطبوعہ ۱۹۰۹ء سے منقول ہے۔

کہلاتے تھے (یہ لفظ قدیم ہند و عہد کے مدارس کی سنسکرت زدہ اصطلاح "سنت"، سے نکلا ہے جس کے معنی پاک کے ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر میں مقدس کے ہیں) "پ" کا لفظ جاوی زبان کے اصولِ لسانی کے ماتحت اضافہ ہے "قادری") اور آچیہ میں اس قسم کے مدارس کے لئے ایک خاص اصطلاح رائج تھی یعنی "رنکانگ"، اور جامبی (واقع سماترا) میں "سوراَن" کہتے تھے۔ "پیسنترا اَن" کے ایک گوشہ میں استاد کی رہائش گاہ بھی ہوتی تھی جس کو بشمول عمارتِ مدرسہ "پونڈوک" (Pondok) کہتے تھے۔ اور استاد "گورو" کہلاتا تھا جس کو سماترا میں "توانکو" کہتے تھے۔

حکومت وقت بھی ان مدارس پر زرِ کثیر خرچ کرتی تھی، کیونکہ اس مدرسہ کے فارغ التحصیل آگے چل کر "پنگھولو"، خطیب، امام، "کالی"، "یاتھ" اور "منتری" بنتے تھے بلکہ اسلامی مشنری بھی انہی مدارس سے نکلتے تھے۔ "گورو" اور "پنڈا" اسے اور "علما" کی خاص اصطلاحات تھیں جو جاوا میں علمائے وقت کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ ان کا لباس بھی مخصوص ہوتا تھا یعنی یہ کہ سر پر عمامہ، بدن پر جبہ اور ہاتھ میں عصا۔

بہرحال حکومت کے بڑے بڑے مدارس میں سے جاوا میں خاص طور پر "سولو" کے مقام پر منبع العلوم تھا اور اسی طرح "جومبانگ" (واقع مشرقی جاوا) کے مقام پر بھی بہت بڑا سرکاری "پیسنترا اَن" تھا سماترا میں "پاڈانگ" کے مقام پر "توالد"، بہت بڑی سرکاری درس گاہ تھی۔ ان سب میں عرب، شامی، اور ہندوستانی علماء درس دیتے تھے اور ان کے فیوض و برکات سے مقامی عالم بھی بہت کافی تعداد میں پیدا ہو چکے تھے۔

## غیر ممالک میں جا کر تحصیل کرنا

غیر ممالک میں جا کر تحصیل علم کرنا بھی مسلمانانِ جاوا اور سماترا کے نزدیک اس عہد میں بہت

بڑا جہاد سمجھا جاتا تھا چنانچہ بعض کتب کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے طلبائے جاوا نے مکۂ مکرمہ اور مصر و شام میں تعلیم کے لئے جانا سترہویں صدی میں شروع کیا تھا۔ بعض طلبائ ہندوستان بھی آتے تھے۔ مکۂ مکرمہ میں ان کے قیام کے لئے ایک مخصوص جگہ تھی جو ان کے وطن کے نام کی مناسبت سے "جبلُ الجاوا" کہلاتی تھی۔ غیر ملک میں جاکر (اندونیشی) طلبا کے تحصیلِ علم کرنے کے باب میں "ریچارڈ ونسٹیڈ" (دی ملایا ز صفحہ ۴۸) کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

وہ لکھتا ہے کہ " یہ یہاں کے لوگوں کے نزدیک بڑا کارِ ثواب تھا۔ چنانچہ آج بھی مسلمانوں میں یہ رسم متوارث چلی آتی ہے پہلے قاعدہ یہ تھا کہ غیر ملک میں تعلیم حاصل کرنے والا طالبعلم جب بعد از تکمیل گھر کو لوٹتا تو گھر والے تشکرانہ کا روزہ رکھتے۔ اور شام کو افطار کے وقت ایک شاندار تقریب مناتے۔ یہ رسم جاوا۔ سماٹرا، ملایا اور تمام جزائر میں اسی طرح متداول تھی"۔ "بستان السلاطین" (مصنفہ حضرت نورالدین رحمۃ اللہ علیہ آچیہ ۱۶۳۷ء) سے نقل ہے کہ سلاطین اور حکمراں بھی باہر جاکر تحصیل کرنے والے طلبار کی خاص رعایت ملحوظ رکھتے تھے، وظائف دیتے اور انھیں آسانیاں بہم پہنچاتے تھے طلبار کا مصر و حجاز جانا بھی اس کتاب کی روایت سے واضح ہے۔

## علم وادب اور سلاطین کی علم نوازیاں

اسلام کا اس ملک پر سب سے بڑا احسان یہاں کے علم وادب کے مزاج کی صحت و درستی کرنا ہے کسی ملک کے اعلیٰ تمدن کا دارومدار ہمیشہ صحیح اور صحتمند لٹریچر اور ادب پر ہوا کرتا ہے، غلط اور غلیظ لٹریچر سے قوم اور ملک کے تہذیب و تمدن بھی غلیظ اور خراب ہوجاتے ہیں، قوم پست ہوجاتی ہے اور ملک بگڑ جاتا ہے

اگرچہ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ قدیم عہدِ ہنود میں بھی یہ ملک علم و ادب کا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ مگر جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ذات پات، قوم پرستی، قصہ طرازی اور فسانہ نوازی پر مملو ہونے کے ساتھ ساتھ محدود طبقات تک محدود تھا، اور اس کے عام پیدا کردہ تمدن کی جو کیفیت تھی وہ بقول کرافورڈ (جلد دوم صفحہ ۲۹۷) "محض لغوسی چیز تھی" اور بقول ڈاکٹر ریچارڈ (دی ملایا، صفحہ ۱۴۳) "ایسے عام طلسماتی افسانوں پر چھائی ہوئی تھی جن کا مقصد محض راجاؤں اور امیروں کو خوش کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔"

مگر اسلام نے داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہاں کی اصلاحِ تمدن کے سلسلہ میں یہ کیا کہ یہاں کے علم و ادب کو بھی بدل دیا، قصہ اور کہانیوں میں اخلاق کی روح سمو کر زندگی بھر دی، فلسفہ تصوف کے پاکیزہ خیالات سے تزکیہ پیدا کر دیا، فقہ، حدیث اور قرآنی علوم کے ذریعہ اوہام پرستی کو مٹا کر سارے ادب کے زاویوں کو بلند درجات پر فائز کر دیا۔ اور سب سے بڑھ کر کام یہ کیا کہ خدمات انجام دینے کے لئے شاہانِ وقت کے ذوق میں علم نوازی پیدا کر دی۔ چنانچہ اس عہد کی تاریخ شاہد ہے کہ اس ملک کے سلاطینِ عصر خود بھی بلند پایہ عالم تھے اور علما کے بھی بڑے قدر دان تھے۔ اندونیشی مصنف "سنوسی پانے" (سجارا اندونیشیا جلد اول صفحہ ۱۵۸) کے بیان سے ثابت ہے کہ "سلطان آگنگ" نے خود جاوی زبان میں فلسفہ، اخلاق، تصوف اور سیاست کے موضوعات پر "سَسْتَرُوگُنڈُنگ" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جو اس وقت کے ادب کی جان سمجھی جاتی ہے۔ آچیہ کے توانکو یا سلاطین کی قدر دانیوں کا ذکر کرتے ہوئے مدیران انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نے (جلد دوم صفحہ ۷۰۵ پر) خود اعتراف کیا ہے کہ وہ علماء اور مصنفین کو بڑی عزت

کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علمائے مصر و شام اور عرب و ہندوستان سے آنکر ان کے درباروں میں باریاب ہوتے تھے۔ سترہویں صدی میں مصر کے ایک مشہور ترین عالم حضرت علامہ ابن حجر الحطامیؒ کے بڑے فرزند کا آچیہ میں آنکر بس جانا اور پھر ایک معرکۃ الآرا کتاب "سیرۃ المشتاقین" کے عنوان سے لکھکر سلطان آچیہ کے دربار میں پیش کرنا کتب سے ثابت ہے (یہ کتاب مدت کے بعد ۱۸۹۲ء میں مکہ مکرمہ میں چھپی ہے)۔

اسی طرح آچیہ کے مشہور سلطان "اسکندر ثانی" کے عہد میں ایک اور جید عالم حضرت علامہ نورالدینؒ کا ۱۶۳۷ء میں وارد ہونا ثابت ہوتا ہے (جن کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم صفحہ ۵۰۷ پر گجرات کا اور ریچارڈ نے دی ملایاز صفحہ ۱۴۵ پر رانیر واقع ریاست بیکانیر علاقہ راجستان۔ ہند، کا متوطن لکھا ہے) آپ نے اس وقت (عہد) کی ایک مبسوط تاریخ "بستان السلاطین" کے عنوان سے لکھکر دربار میں پیش کی تھی جو غالباً اس ملک کی سب سے پہلی باقاعدہ تاریخ ہے۔

سلاطین کے علاوہ ان کے وزرا بھی بڑے صاحب علم اور علم نواز ہوتے تھے وہ خود بھی کتابیں لکھتے تھے اور مصنفین سے بھی لکھواتے تھے چنانچہ اس وقت کے مشہور وزیر "تان محمد" (جو سلطان عبدالجلیل شاہ "جوہور" ملایا کا وزیر اعظم تھا) نے "سجارا ملایو" تصنیف کی جس میں ملایا اور سماترا کے سلاطین کا سلسلہ بسلسلہ ذکر ہے۔ پلم بنگن کے مقام پر ۱۷۷۹ء میں حضرت عبدالصمد مشہور ترجمہ نگار گذرے ہیں جنھوں نے حضرت امام غزالی کی کتاب "الاسرار" کا جاوی زبان میں ترجمہ کیا تھا اس طرح بقول ڈاکٹر ریچارڈ ونسٹیڈ (دی ملایاز صفحہ ۱۴۴) سولھویں صدی کے اواخر میں بعض فارسی کی کتب تواریخ

مثلاً سکندر نامہ، مثنوی مولینا روم اور جامی کی تحفۃ الاحرار کے بھی ملائی زبان میں ترجمے کئے گئے تھے۔ چنانچہ انہی ترجموں کا جاوی ادب پر بھی یہ اثر پڑا کہ اخلاقی نظموں کا ایک بیش بہا سرمایہ "دُوڈلانگ راہ" کے عنوان سے شامل ادب ہوگیا۔ یہ تمام سرمایہ فارسی کی اخلاقی نظموں مثلاً مثنوی مولینا رومؒ، اور عطارؒ کی منطق الطیر کے انداز پر مملو ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام نظموں میں جنگل کے جانور، ہرن اور دیگر چھوٹے بڑے ملکی چرندے پرندے بطور کردار کے باندھے گئے ہیں، پھر ان کے ذریعہ سبق آموز اخلاقی نتائج کا استنباط کیا گیا ہے جو مواعظ کے لئے نہایت مؤثر ہے۔ یہ تمام نظمیں دراصل جاوا کے مسلمان سلاطین کی خوش مذاقی اور درباری سرپرستی کے باعث ظہور میں آئیں۔ ان نظموں کی بدولت طریقت اور سلوک کی بہت سی اصطلاحیں جاوی زبان کا جزو بن گئیں۔

**تصوّف** اس میں شک نہیں کہ جاوا کی زبان کا رسم الخط قدیم (یعنی کاوی۔ سنسکرت) ہی رہا مگر قابلِ غور چیز یہ ہے کہ اس کے ادب کا سارا تخیل اور روح بالکل بدل گئی۔ ملائی اور آچیائی زبانیں عربی رسم الخط میں تبدیل ہوگئیں ہزاروں الفاظ جو اسلامی تمدّن کی اصطلاحات اور اسلامی تخیّل کے ترجمان تھے جاوی، ملائی، آچی ساری زبانوں میں پیوست ہو گئے، اور پیوست ہو جانے کے بعد یہاں کے تمدّن اسلام کا ایک بڑا سرمایہ بن گئے، مثلاً وَلِی۔ جَنَازَہ۔ قُرآن، مَسجِد۔ زَکوٰۃ، حَجّ، تَارِیخ، فَلسفہ، تقدِیر، تَوَکّل، تصوّف، سُنّت (ختنہ کے معنی میں) رُوح وبرکت وغیرہ وغیرہ۔ تصوّف سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں مقامی زبانوں میں ترجمہ کے ذریعہ منتقل ہوگئیں مثلاً احیاءالعلوم

(تصنیف حضرت امام غزالیؒ) اور غُنیۃ الطالبین (تصنیف حضور غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ) وغیرہ۔

قدیم بُدھ وادی اور ہندوانی لٹریچر اخلاق کی اس شاندار تعلیم سے جو مدنیت کی بھی حامل تھی بالکل محروم تھے، اب حضرت حمزہؒ فنسوریؒ کی بدولت (جو مانگ حمزہؒ کے دور سے جاوی اور ملائی ادب میں مشہور رہے) متزین ہوگیا۔ مجاپائت کے آخری عہد میں وہ لکھے ہوئے قصے جو "پانجی" اور "چکل وانگ پاتی"، کے نام سے مشہور تھے اور جن میں زندگی کی صحیح قدروں کا فقدان تھا، اب حضرت حمزہ فنسوری کی بدولت تصوفِ اسلام کے رنگ میں آمیز ہوکر اور نکھر کر مجاہدین کے قصوں، اولیاء اور انبیاء کی سبق آموز حکایتوں سے خوشرنگ ہوگئے۔ پہلے بہت کچھ "اہمسا" پر لکھا جاتا تھا اب مجاہدہ، ریاضت اور جہاد پر لکھا جانے لگا، پہلے ترکِ دنیا سے مراد گوشۂ عزلت گزینی تھی اور اسی لئے سنیاس اور جوگ پر مضامین لکھے جاتے تھے جو مدنیت اور اخلاق کی صحیح قدروں کے منافی ہیں اب حمزہ فنسوریؒ اور عبدالرؤفؒ سنکلی نے (ترکِ گناہ، وغیرہ کو "ترکِ دنیا" قرار دے کر دنیا ہی میں رہنے اور کوششوں اور محنتوں سے اس دنیا کو عالم آباد بنانے کی طرف تلقین شروع کی۔ توکل، تقدیر، رضا، تسلیم، مجاہدہ، مکاشفہ، خدمتِ خلق، وغیرہ پر منظوم قصے لکھے جانے لگے اور آخر میں انہی موضوعاتِ تصوف کے مناسب نتائج کا استنباط ہونے لگا جو رشد و ہدایت کا کامیاب طریقہ ہے، راون، رام، سیتا وغیرہ کے قصوں کے مقابلہ پر راجہ پنگان (فرعون و موسیٰ) کا قصہ اور رامائن کے مقابلہ پر داستانِ امیر حمزہ (جو فارسی سے ترجمہ ہوئی) لکھی گئی۔ مزید یہ کہ تلمیحات اور استعارات تو وہی قدیم ہندوانی رہنے دیے گئے مثلاً کورو اور پنڈاو وغیرہ تاکہ عوام سمجھ سکیں اور نتائج۔ اخذ کرسکیں مگر تعلیمات اور نفس مضمون اسلامی کر دیا اسی طرح

حضرت عبدالرؤف رحؒ نے 'مرآۃ الطلاب' کے عنوان سے تصوف پر ایک عظیم الشان کتاب لکھکر اپنی حکمراں سلطان "صفیۃ الدین تاج عالم" (جو عورت تھی) کے دربار میں پیش کی۔ جس سے تصوف کے تخیل میں ایک بڑا انقلاب آگیا۔ اس طرح اس دور کا انڈونیشی علم وادب مالا مال ہوگیا اور عربی زبان کے رواج سے یہانکے لوگونکو اس قیمتی سرمایۂ علمی سے بھی مستفید ہونیکا پورا موقع مل گیا جو کبھی بغداد میں خلفائے بنی عباس کی کوششوں اور کاوشوں نے بہم پہنچایا تھا چنانچہ اس استفادہ سے یہانکے علم وادب کو کافی ترقی حاصل ہوئی۔ جس کا تمدن پر خوشگوار اثر یہ پڑا کہ ساری قوم ماسوا چھوٹے چھوٹے قریوں اور قصبوں کے ترقی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی چلی گئی۔ جس کو بعد میں اہلِ مغرب نے اپنی غلامی کے پھندوں میں جکڑکر مفلس تر اور خراب تر کردیا تھا۔ ورنہ اس عہد میں انڈونیشیا کا مسلم تمدن بڑا شاندار تھا۔ قوم خوشحال تھی، ملک فارغ البال تھا، علم وادب بھی ترقی کے مقامِ اعلیٰ پر فائز ہوچکے تھے متعدد فنون پر اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں تصنیف ہوئیں اور ترجمہ بھی کی گئیں۔

## سب سے پہلا قرآنِ مجید اور ترجمہ

حتیٰ کہ اس ملک کی اسلامی تاریخ میں سب سے پہلا قرآنِ مجید بھی اس عہد میں کتابت کیا گیا۔ چنانچہ ایک انڈونیشی مصنف 'حاجی ابوبکر' نے اپنی کتاب "سجارا القرآن" (بزبانِ انڈونیشی صفحہ ۴۲ مطبوعہ جوگ جکارتا ۱۹۴۸ء) میں لکھا ہے کہ کیدیری کے مقام پر یہ نسخہ (قرآنِ مجید) برآمد ہوا ہے۔ جو اپنی عمر کے اعتبار سے چارسوسال پرانا ہے (اس کا عکس تصویر میں ملاحظہ ہو) اور (حضرت عبدالرؤف رحؒ ہی کے مرید) کسی انڈونیشی

## حضرت عبدالرؤفؒ سنکلی

نیدرلینڈ انڈی کا مصنف ایچ فان ڈرتوک (صفحہ ۴۶۴ پر)

کاتب کا نوشتہ ہے۔ آپ ہی نے سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ اندونیشی زبان میں سنہ ۱۶۴۱ء میں کیا تھا، کہتے ہیں کہ یہ نسخہ بھی جکارتا کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اندونیشیا میں اس عہد کی برکات کا ایک ثمرہ یہ بھی تھا کہ عربی رسم الخط اور کتابت نے بھی اس ملک کی تہذیب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلیا تھا (جو آج بھی اس عظیم جزائری ملک کا طرۂ امتیاز ہے)۔

**لباس** علم و ادب کی اصلاح و درستی کے بعد دوسرا بڑا کارنامہ جو اسلام نے یہاں کے تمدّن کی خدمت کے سلسلہ میں انجام دیا وہ اصلاحِ لباس ہے۔ اس عہد سے پہلے کے دور میں لباس ضرور موجود تھا اور عمدہ سے عمدہ قسم کے باٹک کے کپڑے سے تیار ہوتا تھا مگر نہایت ہی مختصر اور ناکافی ہوتا تھا، پھر وہ بھی صرف راجہ و مہاراجہ اور ان کے اُمراہی کے طبقات تک محدود تھا، عوام اس کی برکات سے محروم تھے، چونکہ راجہ و مہاراجہ عوام کے عقاید میں 'دیوبانی' درجہ رکھتے

---

لکھتا ہے کہ آپ خالص اندونیشی عالم تھے اور نہایت ہی بلند پایہ صوفی اور مصنف بھی تھے۔ آپ نے سنہ ۱۶۰۰ء میں مدینہ منورہ جاکر مشہور بزرگ حضرت احمد کشاشیؒ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔ اور انہی کے اشاروں سے طریقت کی منزلیں طے کرکے سلسلۂ شتاریہ اختیار کیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ اپنے وطن کو لوٹے اور علمی زندگی کا آغاز کیا۔ چونکہ عربی کے بڑے عالم تھے لہذا اپنی زبان میں عربی کی بڑی بڑی کتابوں کے ترجمے کرڈالے اور اس طرح اس ملک کے علم و ادب میں ایک بڑا انقلاب پیدا کردیا۔

**حَمزہ فنسوری** یہ بھی بہت ہی زبردست عالم اور صوفی گذرے ہیں اندونیشی زبان 'جاوی' کے بڑے شاعر بھی تھے، جاوی زبان ان کے اسلامی تصوّف کے تراجم کی مرہُون ہے۔

تھے اور مسجود کا مقام بھی انھیں حاصل تھا لہذا پوری قوم ان کے اور ان کے اہلِ خاندان کے سامنے بہت ہی کم حیثیت رکھتی تھی اور حقیر تھی یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کو غلاموں کی طرح رہنا پڑتا تھا اور اس غلامی کی علامت یہ تھی کہ مرد اور عورت سترسے اوپر کا حصہ ہمیشہ کھلا رکھتے تھے اور اس طرح نیم عُریاں رہتے چنانچہ اب تک بھی بالی کی عام زندگی میں اس کا رواج موجود تھا، اور یہ اس قبل از اسلام کے عہد ہی کی یادگار تھا مگر اسلام نے یہاں داخل ہونے کے بعد اخلاق، شائستگی، ستر پوشی، اور غیرت وغیرہ کی عام تعلیم سے لباس کی ضرورتوں میں اضافہ کر دیا اور سر سے پاؤں تک ہر حصہ کے لئے ہر خاص و عوام کو استعمالِ لباس پر مجبور کر دیا، اس طرح اگر اس عہد کے لباس پر بھی نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ فنِ تعمیرات کی طرح ایک خاص وضع اور انداز میں بنایا اور پہنا جانے لگا تھا جسے "خالص اندونیشی مُسلم لباس" کہنا چاہئے کیونکہ لباس کا کپڑا، کپڑے کے ڈیزائن کے طریقے اور ان طریقوں کے ماتحت بنا کر تیار ہونے والے کپڑے تو وہی قدیم رہے مگر جسم کے اعضا پر ان کا استعمال اسلام کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق ہونے لگا، (عورتیں سروں پر دوپٹہ بھی اوڑھنے لگیں جیساکہ سُماترا کے مختلف علاقوں اور جاوا کے بعض حصّوں میں اسکا رواج آج بھی بتایا جاتا ہے) اہلِ عرب کے اثر سے عمامہ، عبا، قبا، کمر پر پٹکا باندھنا، سروں کو بڑے بڑے رومالوں سے ڈھکنا رواج میں شامل ہو گیا، چونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے اُخوّت اور برادرخواندگی تہذیب کا ایک عمومی کردار ہے۔ جس کی رُو سے چھوٹے اور بڑے سب برابر ہیں، لہذا اس ستر پوشی اور استعمالِ لباس کی مذہبی تعلیم میں بھی سب برابر تھے، یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں لباس

عام تھا، محدود نہ تھا، البتہ مختلف طبقات میں اس کے مختلف طریقے تھے مثلاً عُلَماء کے طبقے کے لوگ سر پر عمامہ، اور بدن پر عبا یا جبہ پہنتے تھے جو ٹخنوں تک لمبا ہوتا تھا اور اس کے نیچے تہمد جسے سَارُونگ کہتے تھے، استعمال کرتے تھے سلاطینِ وقت کا بھی لباس کچھ اس قسم کا تھا البتہ فرق اتنا تھا کہ ان کا عمامہ پھیلا ہوا اور بڑا ہوتا تھا اور عبا کے بجائے قبا ہوتی تھی، کمر پر پٹکا اور پٹکے میں خنجر آویزاں ہوتا تھا (چنانچہ بعض پُرانی تصویر کے عکس سے یہ وضع صاف صاف طور سے واضح ہے) عورتیں بھی پورے بدن پر کپڑا استعمال کرتی تھیں، مگر ان کپڑوں کی وضع ہر جگہ مختلف تھی، لیکن سَارُونگ (یعنی تہمد) باندھنا سب جگہ قدرِ مُشترک تھا جیسا کہ بعض کُتب کے بیان سے واضح ہے، حاجی لوگ عموماً عرب انداز کا لباس زیب تن کرتے تھے، مُسلم ہندوستان کے سے صافہ کا بھی رواج تھا (جیسا کہ دِیپونگورو اور امام بونجول کی تصاویر سے ظاہر ہے) البتہ پَردہ کے متعلق کچھ تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔

**کھانے وغیرہ** اس سلسلہ میں چند خاص تفصیلات کا پتہ چلا ہے مثلاً یہ کہ چاول اور دیگر اجناس سے تیار ہونے والے سب وہی کھانے رائج رہے جو قدیم سے مُروّج تھے البتہ اسلام کی ممنوعہ چیزوں کا رواج ختم ہو گیا مسلمانوں میں گوشت کا رواج اسلام کے ساتھ پہنچا ہے، اس سے پہلے اہلِ ہنود میں گوشت کا کھانا عام طور پر مُروّج نہ تھا۔ بالی کے ہنود اس وقت بھی گوشت نہیں کھاتے تھے۔ اس طرح سلاطین کی چینی[۱] رعایا اپنے ملک کے

---

[۱] **اندونیشیا کے چینی باشندے** کتبِ تواریخ کے مُطالعہ سے یہ امر واضح

کھانوں اور لباس و وضع کی پابند تھی۔

## رسم و رواج اور طرزِ معاشرت

رسم و رواج کے متعلق جن تفصیلات کا ذکر ریچارڈ اور دیگر مصنفین نے کیا ہے قریب قریب سب قدیم وضع اور انداز کے مطابق تھیں مگر ان کی تقریبی حیثیتیں۔ سب اسلامی ہو گئی تھیں مثلاً شادی بیاہ کے طریقے اور ان طریقوں کو منانے

---

ہوتا ہے کہ اس عہدِ اسلام میں باشندگانِ اندونیشیا کے دوش بدوش ان کے وطن میں بہت سے چینی آباد کار آتے جاتے تھے جو چین سے نقلِ وطن کرکے تاریخ کے مختلف ادوار میں یہاں آ بسے تھے۔ عہدِ ہنود میں ان کے آنے کے حالات غالباً سری وجایا کے باب میں اختصار کے ساتھ درج کر دئے گئے ہیں۔ اب اس مقام پر صرف اس عہد میں ان کی آبادی کے مختلف مستقر اور جدید طور پر ان کے آتے رہنے کا سلسلہ، تہذیب اور تمدن سے متعلق امور میں انکا حصہ وغیرہ بیان کیا جائے گا۔

سلاطینِ ماترم کے عہدِ اقتدار میں ان کی سب سے بڑی آبادی بقول پروفیسر وکٹر پرسل (مصنفِ کتاب (The Chinese in South East Asia) مطبوعہ لندن ۱۹۵۱ء صفحہ ۴۸۹) جزیرۂ جاوا کے شمالی مغربی حصوں میں ساحلی علاقوں پر تھی، اور وہ یہاں پر تجارت کے علاوہ بڑھئی کا کام بھی کرتے تھے اس علاقہ میں یہ لوگ غالباً کسی وقت عہدِ مجاپائت میں آکر آباد ہوئے تھے۔ بورنیو میں ان کا آنا پہلے پہل ۱۷۷۲ء میں ہوا تھا جبکہ وہاں پر مغربی علاقہ میں سلطان عمر علاالدین حکمراں تھا۔ سلطان سے ان لوگوں نے باقاعدہ تجارت کرنے کی اجازت لے کر بستیاں بسائی تھیں (مگر ریفلیس نے اپنی تاریخِ جاوا میں ان کے اس عہد میں بورنیو میں وارد ہونے سے انکار کیا ہے) بہر حال یہ چینی تین خاص عقاید کے تمدن میں منقسم تھے۔ (۱) بدھ (۲) کنفوشش اور (۳) کاؤس، ان میں سے اکثر نے اندونیشیا میں آکر اسلام بھی قبول کر لیا تھا چنانچہ بقول وکٹر پرسل جکارتا کے قریب ۱۴۸۶ء میں ان نو مسلم چینیوں نے

کے جشن سب قدیم تھے مگر میت کی تجہیز و تدفین نکاح کا قاعدہ، مہر کا تعین اولاد کی پیدائش کے بعد نام رکھنے کا طریقہ کان میں اذان دینے کا اصول عقیقہ اور ختنہ کے مراسم سب اسلامی ہو گئے، طلاق و خلا بھی اسلامی شریعت کے مطابق انجام دیا جانے لگا، لوگ سولھویں صدی سے کافی تعداد میں حج کو بھی جانے لگے جس سے ان کے تمدنی حالات پر اور بھی اسلامی اثرات زیادہ سے زیادہ منطبق ہوتے چلے گئے، قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی

---

اپنے ملک کے طرز تعمیر کے نمونہ پر ایک بڑی مسجد بھی بنائی تھی۔ یہی اندونیشیا بھر میں ان کی آبادی کا سب سے بڑا مرکز بھی تھا چنانچہ رہتے رہتے انھوں نے یہاں کے مقامی باشندوں میں شادی بیاہ بھی کرنا شروع کر دیا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر ایک مخلوط چینی اندونیشی نسل بڑھتی رہی۔ ان چینیوں کا مقصد بقول ریفلس (Memoir of the life and P. Service) مطبوعہ لندن ۱۸۳۰ء صفحہ ۷۲) صرف دولت جمع کرنا تھا۔ زمینیں جو انھیں حاصل ہو گئی تھیں ان پر وہ اس طرح سے مسلط تھے کہ غریب مقامی باشندے تباہ حال اور برباد ہوتے جا رہے تھے۔ اور ان کا وجود اس ملک کے لئے بجائے فائدہ کے نقصان دہ تھا۔ ۱۶۱۹ء میں جب ولندیزیوں کے ساتھ سلطان جکارتا کی جنگ ہوئی تو انھوں نے بڑا حصہ لیا تھا۔ دونوں فریقین کے مابین مترجم کا کام یہی کرتے تھے۔ جب ولندیزی کامیاب ہو گئے اور انھوں نے شہر بٹاویہ کی بنیاد رکھی تو یہ سب چینی شہر سے دور جنگلوں میں جا بسے اور چاول اور گنا پیدا کرنے لگے اور پھر ۱۷۹۰ء میں بٹاویہ میں آ کر انھوں نے شکر کے کارخانے کھولنے شروع کئے۔ ایک محقق لکھتا ہے کہ بورنیو میں آنے والے چینی چین کے مشہور صوبہ فوکین سے ۱۷۴۰ء میں آئے تھے اور یہ لوگ ہکاز قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان آنے والوں نے اپنی سب سے پہلی بستیاں بورنیو کے مغربی ساحل پر ہی قایم کی تھیں۔ یہ لوگ اہل یورپ کے یہاں پہنچنے سے قبل بڑے زبردست بحری ڈاکو تھے اور سمندروں میں اندونیشی سلاطین کے جہازوں کو لوٹتے پھرتے تھے۔

چنانچہ مسٹر جے۔ وی ملز (اپنے مقالہ Chinese Navigation of South East Asian Waters) شائع کردہ در رسالہ (Frasma) اشاعت دسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۲)۔

شخص حج کو جاتا تو طرح طرح کی تقریبیں منائی جاتی تھیں، مکہ مکرمہ میں پہنچکر اپنے مقامی نام کے ساتھ اسلامی نام بھی (جسے یہاں بعض مصنفین نے عربی نام لکھا ہے) معلم حج سے رکھواتے اور نام رکھوانے کے سلسلہ میں باقاعدہ نذر و نیاز کرتے (حاجی عمر سعید حکرو آمنو توکے ایک سوانح نگار نے اس موضوع پر خاص روشنی ڈالی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خود اکثر بڑے بڑے رہنماؤں کے ناموں کے ساتھ بھی کتابوں میں یہ کیفیت ملتی ہے مثال کے

---

لکھتا ہے کہ :۔ "بحر الکاہل کے سمندری علاقوں میں چینی بحری قزاقوں کی جولانگاہ جیسا کہ خود ان کی تاریخوں سے ثابت ہے سولو، مشرقی بورنیو، بنجر ماسین، اور جاوا کے مشرقی حصّے اور جزائر فلپائن تھے سماترا میں ان چینیوں کے درود کے بارے میں ریچارڈ ونسٹیڈ (اپنی کتاب Malaya and its History) صفحہ ۲۹ مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء) رقمطراز ہے کہ "سماترا کا مشرقی ساحل اور اسکا مشہور مقام پلیم بنگ ان کے قبضہ میں سری وجایا کے زوال کے بعد آیا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ دو سو سال کے لگ بھگ اس شہر پر چھائے رہے اور خوب آس پاس لوٹ مار کرتے رہے۔ چینی مورخین کے بیان کے مطابق جنوبی مشرق ایشیا کے دیگر اطراف میں ان کے خروج کرتے رہنے کے سلسلہ میں ان کا یہ سب سے پہلا مسکن تھا۔"

مگر جہاں تک جاوا میں ان کے وارد ہونے کی تاریخ کا تعلق ہے یہ امر صاف واضح ہے کہ یہ لوگ ۹۶۰ء اور ۱۲۸۰ء کے درمیان کثرت سے جاوا میں آتے رہے ہیں کیونکہ (بقول (Groenvelt) مصنف (T'ang History Part II) صفحہ ۱۴۰ شائع کردہ اکیڈمی آف سائنس سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۱ء) ان کی اس عہد کی تاریخوں میں اہل جاوا کے تمدن پر ان کی نوشتہ تفصیلات ملی ہیں۔

### اندونیشیا کے مسلم عہد میں چینی رعایا

بہر کیف اسی اسلامی عہد میں چینی لوگ جاوا کے شمالی مغربی ساحل، بورنیو، سماترا، جزیرہ بنکا، اور سلیبس کے اکثر حصّوں میں آباد تھے اگرچہ ان کی تعداد قلیل تھی مگر انھوں نے اپنی بستیوں کے ذریعہ، اندونیشیا کے تمدن میں ہندو اقلیت کی طرح ایک خاص درجہ حاصل کر لیا تھا، ان کا انداز رہائش،

طور پر وچکرو دآمنوتو کا نام حج کرنے کے بعد حاجی عُمر سعید چکرو دآمونوتو، ہوگیا تھا جو آخر تک قایم رہا۔ آپ جدید انڈونیشیا کے بہت بڑے رہنما اور مؤسس گذرے ہیں۔ اور کتبِ سیاست میں اسی نام سے مشہور ہیں۔ جاوا میں لوگوں کے نام ہمیشہ سے ان کے اپنے ملکی الفاظ ہی میں رکھنے کا رواج ملتا ہے چنانچہ اسلام کے داخلہ کے بعد بھی ناموں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا رہا کہ مقامی نام اسلامی یا عربی نام کے ساتھ لاحقہ یا سابقہ کے طور پر بھی اختیار کر لیا جاتا تھا لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مقامی ناموں کی معنوی حیثیت خالص مسلم تھی قدیم بُت پرستانہ نہ تھی۔ مگر سماترا میں عموماً نام خالص اسلامی نام (عربی) ہی رکھے جاتے تھے جیسا کہ خود سلطنتِ آچیہ کے سلاطین کے

---

بسائے ہوئے لباس کی وضع، اور طریقِ کارِ زندگی بالکل انکا اپنا تھا۔ وہ چینی جو مسلمان ہو چکے تھے اسلامی وضع پر زندگی گذارتے تھے مگر غیر مسلم چینیوں کے اوضاع و اطوار انڈونیشی تہذیب سے جدا اور چینی تہذیب کا آئینہ دار تھے۔ چنانچہ ان کے تمدنی اطوار پر روشنی ڈالتے ہوئے مسٹر پرسل (اپنی کتاب (Problems of Chinese Education) صفحہ ۳ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۶ء میں) رقمطراز ہے کہ

''چینیوں کے نزدیک چند اہم مذہبی فرائض تھے اور انہی کو وہ انجام دیتے تھے (یعنی 'Fen. I. Li.' (Chich, Hsin) وغیرہ وغیرہ وہ بڑے غلیظ تھے، عورت کا پوزیشن بھی ان میں نہایت نہایت ناقص تھا، یعنی وہ بیوہ ہو جانے پر شادی نہیں کر سکتی تھی اور غلاموں کی طرح زندگی گذارتی تھی، وہ فضول خرچ، اور دلدادۂ نشاط ہوتے تھے، مرنے کے بعد اپنے پس ماندگان کے لئے کوئی ورثہ نہیں چھوڑتے تھے، ہر ساتویں روز سَبَت (سنیچر) کو اپنی عبادت گاہوں میں جاتے اور کچھ دُعائیں پڑھتے تھے، دُعا کے وقت ان کے سر نیچے جھکے رہتے تھے اور وہ زور زور سے روتے تھے۔ رونا ان کے نزدیک عبادت کا جزو تھا۔ اس کے بعد ختمِ عبادت پر گھر چلے جاتے اور شام تک عیش و طرب میں مست رہتے اور شام تک دوسرا کام نہیں کرتے تھے۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی بڑے تند خو اور گرم مزاج ہوتے تھے اپنے ہموطن انڈونیشیوں کا بھی انھیں پاس نہ تھا وغیرہ وغیرہ۔

ناموں کے دیئے ہوئے شجرہ سے (صفحہ ۳۲۵ پر) ظاہر ہے اور اس طرح سلیبس اور مالوکو کے ناموں میں بھی نام اسلامی اور گوت قدیم خاندانی ہوتا تھا۔ (یہ رواج ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں میں بھی ملتا ہے مثلاً بھٹی، راجپوت، جتوئی اور کھوکر وغیرہ اکثر مسلمانوں کے گوت قدیم ہندوانی ہی میں چلے آتے ہیں

**ذات پات یا فرقہ** البتہ ایک چیز جو یہاں کے مسلمانوں کو اہلِ عرب کی طرح دیگر مسلمانانِ اقصائے شرق سے بھی ممتاز کرتی ہے وہ یہاں کے اس عہد کے مسلم تمدن کا ذات پات کی بندش اور فرقہ کی تفریق سے بری اور پاک ہونا ہے۔ سماترا میں دساذات، کا امتیاز کچھ تو اہلِ ہند اور کچھ حضرموت کے عربوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا ورنہ سارے ملک میں اسلام کے پھیل جانے کے بعد ہندوؤں کی قدیم ذاتیں بھی ختم ہوگئی تھیں اور پوری مسلم آبادی ایک قوم اور ایک ہی ذات بن گئی تھی۔

مرزا، مغل، اور پٹھان وغیرہ کے امتیازی ذات پات کے نام جو برِّصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں میں ہندوؤں کی چار ذاتوں یا ہند و تہذیب کے تقسیمِ عمل کی جہت سے تقسیمِ ذات کے قرار و قیام کے اثرات کے باعث رائج ہوگئے تھے یہاں اس دور میں ہرگز نہ تھے کیونکہ کسی کتاب سے بھی اس امر کی اشارت نہیں ہوتی اور نہ آجکل ہی کی انڈونیشی سوسائٹی میں اس کا کہیں وجود ملتا ہے، البتہ طبقۂ اشراف کے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ اشرافیت کے امتیازات خصوصی مثلاً ارجا (راجا) ماس، کیائی اور رڈین (سماترا میں) داتوک، امام وغیرہ نسلاً بعد نسل لکھتے تھے کیونکہ یہ امتیازات سرکاری تھے اور موروثی تھے ورنہ ہندوستان کی مسلم سوسائٹی کی طرح پیشوں کی

مناسبت سے عوام کی کوئی ذات مثلاً رنگریز، موچی، کھانی، دھوبی وغیرہ نہ تھی۔

کتب کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ شادی بیاہ کے سلسلہ میں تعلیمات اسلامی کے مطابق کردار اور اوصاف کو زیادہ ترترجیح دی جاتی تھی، وطنیت اور قومیت کا کوئی لحاظ نہ تھا جیسا کہ خود بنتن کے سلطان حسن الدین کے والد "یا تیح اللہ" کی شادی کے واقعات سے ظاہر ہے، سلاطینِ وقت درویش کے ساتھ بھی اپنے خاندان کی لڑکی کو بیاہ دیتے تھے، اہلِ عرب کے ساتھ تو یہاں کے مسلمانوں کی شادی بیاہ کے رواج کا عام پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ مشہور مجاہد "امام بونجول" خود اسی قسم کے عرب اندونیشی تھے کہ ماں مراقشی عرب تھی اور باپ (خطیب بیان الدین) علاقہ آچیہ کا اندونیشی باشندہ تھا۔

اصولِ فقہ کے اعتبار سے بھی صرف ایک ہی طریقہ تھا یعنی طریقۂ شافعیہ اس کے علاوہ کوئی اور دوسرا اصول پوری قوم میں نہ تھا۔ البتہ لوگ قادری، نقشبندی اور نقش بندی ضرور تھے مگر یہ ان کے فرقے نہ تھے بلکہ صوفیانہ سلسلے تھے جن کا کام اشاعت اسلام اور تبلیغِ دین تھا اور صلح کل کے اصول پر مشتمل تھا۔ تعصب اور تعتب ساری قوم میں نہ تھا، وہ بیسوروان اور بنار دکان کے ہندوؤں کے ساتھ بھی اسی طرح رواداری سے پیش آتے تھے جس طرح ان کا تعلق چینی آبادکاروں یا مظاہر پرستوں کے ساتھ تھا۔ کیونکہ اگر مسلمان سلاطین اور دیگر افراد میں تعصب ہوتا تو بیسوروان اور بنار دکان (مشرقی جاوا) کے چھوٹے سے علاقہ میں ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا مثال کے طور پر سلطان آگنگ نے ان پر فتح حاصل کر لی تھی پھر بھی انھیں اپنے تعصب کا شکار نہ بنایا بلکہ ان کے ساتھ صلح جوئی کا سلوک کیا دریں صلح جوئی

اصل میں اسلام کی اشاعت میں ممد ثابت ہوئی ہے۔

**سن وسال کا رواج** بہرحال اندونیشیا کے اس عہد تمدن میں جہاں اور بہت سی نئی چیزیں اسلام نے رائج کیں وہاں ایک سب سے اہم چیز؛ سالِ ہجری، کا رواج ہے چنانچہ تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان چربیوں، سلطان بانتن کے عہد میں یہی سال سرکاری سال شمار کیا جاتا تھا البتہ اگنگ اور اس کے جانشینوں کے عہد میں ساکا سال بھی پھر دوبارہ رائج ہوگیا تھا، مگر عوام کے شمار کرنے کا سال بھی سال ہجری تھا۔ جس کی رواجی تفصیلات آغازِ عہدِ اسلام کی تاریخ میں متن کے نیچے نوٹ پر درج ہیں۔

**تہوار** مگر بڑے بڑے اور مشہور تہوار اسلامی رائج تھے مثلاً عید الفطر، عید الضحیٰ رمضان کا ختمِ قرآن اور ربیع الاول کا عیدِ میلاد النبی وغیرہ عید میلاد النبی سب سے بڑا قومی جشن ہوتا تھا اور اسے "گریبگ مولود" کہتے تھے عید الفطر، گریبگ پوسا اور عید الضحیٰ گریبگ بسر کہلاتی تھی۔ آج بھی یہ تہوار اسی طرح منائے جاتے ہیں۔ اور قاعدہ تھا کہ نماز کے بعد "سونان" (ولیوں) کی "قبوران کرامت" (درگاہوں) پر فاتحہ خوانی کے لئے خواص و عوام سب جاتے تھے اور "ونگ پوتیان" (یعنی قوالی) سنتے تھے۔

جزیرۂ سماترا کے مغربی ساحل پر "علاقہ پاڈانگ" میں لوگ (بقول کتاب (De Atjebers) صفحہ ۱۴۳) محرم کے زمانہ میں ذکر امام حسین علیہ السلام کی مجالس بھی منعقد کرتے تھے اور تعزیہ بھی بناتے تھے، یہ تعزیہ "تابوت" کہلاتا تھا اور بالکل ہندو پاک کے مسلمانوں کے تعزیہ سے مشابہ ہوتا تھا اس کا جلوس بھی نکالا جاتا تھا اور دس محرم کو

پھر باقاعدہ نذر، نحر کردیا جاتا تھا مگر یہ رسم صرف اسی علاقہ میں محدود تھی جاوا اور دیگر مقامات پر نہ تھی۔ عیدین پر کھانے وغیرہ اپنے ملک کے رواج کے مطابق پکاتے تھے البتہ "گریبک مولود" (عید میلاد النبی) پر خاص قسم کی چاول کے آٹے سے میٹھی ٹکیاں تیار کرتے تھے جو مجلسوں میں حاضرین کو تقسیم ہوتی تھیں۔

## اس عہد کے مسلمانوں کا تمدّن

اس طرح مسلمانوں کا تمدّن مسلم تھا، ہندوانی یا کوئی اور دوسرا تمدن نہ تھا جیسا کہ بعض بے بصیرت اور روح اسلام سے واقفیت نہ رکھنے والے مورخین و مصنفین اور مقالہ نگاروں نے اکثر اس قسم کی غلط فہمی عام کرنے کی کوشش کی ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو اس غلط فہمی پھیلانے والے لوگوں میں عموماً دو قسم کے گروہ شامل رہے ہیں اول تو وہ جو خاص قسم کی سیاسی اغراض اس ملک کے ساتھ وابستہ رکھتے تھے اور اس کے عام ذرائع پر چھائے ہوئے تھے، چنانچہ وہ کبھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو بھی بین الاسلامی حیثیت حاصل ہو اور وہ دنیا کے دیگر ممالک میں رہنے اور بسنے والے اپنے دینی بھائیوں سے مل سکیں، اتحاد و اتفاق اور وحدتِ ملی کے رشتوں میں منسلک ہو کر اسلام کے ایک اور عالمگیر تمدن کا جزوِ عظیم بننے کا ادّعا کرسکیں لہٰذا اس گروہ نے ہمیشہ ایسی گندی اور لایعنی باتیں اندونیشیا کے تمدّن کے خلاف پھیلائیں، چنانچہ وہ باتیں پھیلتی رہیں اور عام ہوتی رہیں، اور اب وہ عام طور پر باشندگانِ ممالکِ اسلامیہ کے نظریات میں راسخ نظر آتی ہیں، دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنھیں فلسفۂ اسلام، فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ تاریخ سے ناواقفیت تھی مگر ذوقِ مقالہ نگاری اور شوقِ نام آوری میں انھوں نے جو چاہا لکھ مارا۔ اور اس طرح

یہاں کے تمدن کے بارے میں غلط فہمیاں پھیل گئیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کا اس وقت کا تمدن اسلامی تھا ثقافت کے اعتبار سے بھی ملایا، سماترا، بنکا، سلاویسی اور مالوکو کی اکثر زبانیں عربی رسم الخط میں منتقل کر دی گئی تھیں، محض جاوا کی زبان بنگال کی طرح قدیم سنسکرت رسم الخط میں لکھی جاتی تھی لیکن مغربی جاوا (سلطنت بانتن) میں جہاں "سنڈانی" زبان کا رواج تھا سلطان حسن الدین کے وقت سے اس وقت تک عربی رسم الخط ہی جاری تھا۔ جاوی زبان کے متعلق بھی جہاں تک واقعات تاریخی کے استقصا سے حکومت وقت کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکا ہے واضح ہوتا ہے کہ سلطان اگنگ، خالص اسلامی ثقافت کے حق میں تھا لیکن واقعات وحوادث نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس طرف توجہ کرتا اور اس زبان کا ہیولیٰ بدل دیتا البتہ صوفیا رکبار (مثلاً حمزہ فنسوری اور عبدالرؤف سنکلی وغیرہ) کے اجتہاد تصوف نے اس زبان کی روح کو ضرور بدل ڈالا اور تخیل واتمثال کے لحاظ سے فارسی کے قریب تر لا کر کھڑا کر دیا۔ جس میں عربی الفاظ کی آمیزش کثرت کے ساتھ تھی اور وہ یہی کر بھی سکتے تھے قطع نظر ان سب امور کے عربی کتابت اور عربی ثقافت پسنتران، سرابی، سوراں وغیرہ نامی تمام مدارس میں ذریعۂ تعلیم مذہبی کی حیثیت سے رائج تھی۔ اور لوگ اس کے ادب کو بھی سیکھتے تھے، اس طرح اسلام کی بین الاسلامیت کے ایک بڑے ذریعہ کے بھی حامل تھے۔

اس کے علاوہ نظام عمرانی میں بھی یہاں کی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر کی حامل تھی، اور سوسائٹی کے تمام شعبوں میں اسلامی روایات کا بے حد احترام کیا جاتا تھا، چنانچہ حج سے لوٹ کر آنے والے عظمت ووقار میں اس درجہ بلند تھے کہ حکمراں طبقہ بھی ان کے احترام واعتبار میں مبالغہ کرتا تھا، اور یہی حال حفاظ قرآن کا تھا۔ جہاں تک نام کا تعلق ہے

یہ بھی اس دور میں اسلامی (جنھیں بعض غلط نظریہ کے باعث عربی کہکر نظر انداز کر جاتے ہیں) تھے یعنی پیغمبروں صحابیوں اور اسمار باری تعالیٰ کے نام پر اختیار کئے جاتے تھے، اگرچہ لاحقہ کے طور پر "گوت"[۵] قدیم ہوتا تھا۔ وسطی جاوا اور کسی کسی مقام پر ان کا رنگ مقامی ہوگیا تھا۔ مگر پھر بھی خالص ہندوانی[۵۲] نہ تھا۔ یعنی یہ کہ پرمیشورا، کمیشورا، وغیرہ نام کے ساتھ ہرگز نہ آتا تھا۔ جو خالص ہندوانی تمدن اور نقطۂ نظر کا حامل تھا۔ "سلطان اگنگ" جس کے معنی "سلطانِ اعظم" کے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خالص ہندوانی لقب ہے۔ اگر یہ خالص اسلامی نہیں تو خالص ہندوانی بھی نہیں ہے، یہ محض مُسلم اندونیشی ہوگا۔ جس طرح "سلطان ملک شاہ" مُسلم ایرانی" ہے اور "شیر شاہ" مُسلم ہندوستانی ہے۔

---

۵ "گوت" یا تو مقام کی مناسبت سے اختیار کیا جاتا ہے یا پھر کسی اہم تاریخی نقطۂ نظر کا حامل ہوتا ہے۔ جس کی حیثیت "صفتِ نسبتی" کی ہوتی ہے جو اسلام میں ازمنۂ قدیم سے رائج رہی ہے (مثلاً ابوہریرہؓ، سلمان فارسیؓ، بلالِ حبشیؓ اور بابلیؒ وغیرہ)۔ اور اس کے اختیار کرنے میں کوئی اسلامی حرج بھی واقع نہیں ہوتا۔

۵۲ نیچر کی چیزوں، وطن کے مقامات ہیتور اور ردتور کے نام کے ساتھ بھی اکثر نام کا جو انتساب کر لیا جاتا ہے ہر ملک اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے، اس کو خالص ہندوانی کہنا بھی غلطی ہے، مثلاً ہندو پاکستان میں اکثر ایسے نام ملتے ہیں جیسے دریا خاں، چراغ خاں۔ انجمن، آفتاب اقبال چاند خاں، وغیرہ، کیا انھیں اسلامی خالص یا ہندوانی کہا جا سکتا ہے، نہیں، تو پھر انڈونیشیوں پر خصوصیت کے ساتھ اس قسم کا اعتراض بالکل بے معنی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر نام کم از کم خالص اسلامی ہو تو زیادہ اسلامی تمدن کا ترجمان ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ ورنہ اکثر اسلام کے سیاسی نقطۂ نظر میں جسے "اتحادِ بین الملی" کہتے ہیں جذبات کی حیثیت سے نتائج پیدا کرنے میں زیادہ مفید نہیں ہوتا کیونکہ عام لوگ اسلامی نام ہی سے اسلامی تعلق کو پہچانتے ہیں۔ اسی لئے نام اسلامی شعائر میں شمار کیا جائے گا۔ جو لوگ اس کو بھی وطنیت میں لانا چاہتے ہیں وہ کم از کم میری رائے میں اچھا نہیں کرتے۔ (قادری)

ایران کا زرتشتی اور ہندوستان کا ہندو حکمراں کبھی ایسا لقب اختیار نہیں کرتا تھا۔

اسلامی مدنیت کے اعتبار سے بھی تعلیمات، اخلاقیات، اور عبادات کے اصول سب اسلامی تھے، شادی غمی، طلاق وخلا، تجہیز وتکفین اور وراثت وشرافت کے قاعدے بھی سب اسی طرح رائج تھے، وطنیت اگر تھی تو صرف کاشتکاری، حرفت انگاری، زیورات کے بنانے، تعمیرات کے اٹھانے، لین دین کرنے اور ملبوسات کو رواج دینے میں تھی۔ جو اسلام کی حدود تمدن سے الگ چیز ہے اور ہر ملک کی جغرافیائی کیفیتوں مثلاً ساختِ ارضی، آب وہوا، پیداوار اور ذخائرِ معدن سے تعلق رکھتی ہے، اور اسی جغرافیائی لحاظ سے پیداوارِ اشیار کے ساتھ ان کے نام اور نام کے ساتھ الفاظ اور زبان وجود میں آتے ہیں لہذا وہ بھی کسی مقام کی مقامیت سے تعلق رکھنے کے سبب اسلام کے حدودِ تمدن سے الگ چیز ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ یہ مقامیت سے تعلق رکھنے والی چیزیں بھی استعمال کے اصول اور انداز میں بہت حد تک اسلام سے خود بخود متاثر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً تعمیرات کا فن، زبان کی اصطلاحیں وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایک عالمگیر مذہب ہونے کی حیثیت سے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ظہور کرنے والے "اسلامی تمدن" میں انہی جغرافیائی (اوطان) اختلافات کے باعث کسی خاص مقامیت کو معیار قرار نہیں دیا بلکہ اس تہذیب کو ہر ملک کے لئے اس کی اپنی حیثیت کے مطابق چھوڑ دیا۔ کھانوں میں بھی ان چند منہیات کو جو یقیناً ہر مقام کی مقامیت کے لئے انسانی معاشرہ کی حیثیت سے مُضر تھیں ممنوعات قرار دے کر ہر پھل پھول، گوشت اور ترکاری کے استعمال کی اِذن دیدی۔ اور اس میں کوئی اختصاص نہ رکھا کیونکہ ایک چیز ایک جگہ پیدا ہوتی ہے دوسری جگہ پر اس کا فقدان ہے خاصیت میں کسی مقام

کے لئے مفید ہے تو وہی دوسرے مقام کے لئے کم مفید ہو سکتی ہے۔ لہذا اسلام کے تمدن کا جہاں تک تعلق ہے وہ صرف دو چیزوں کے مجموعہ افعال کے نتائج کا نام ہے یعنی نیت اور بین الاسلامیت۔ مدنیت میں اخلاقِ حسنہ اور عبادتِ الٰہی (اخلاق نام ہے معاملہ کا اور معاملہ ہی آگے چل کر زندگی کا ہر اصول بن جاتا ہے خواہ وہ حکومت کے انداز اور سیاست ہوں اور خواہ خاندانی تا اہل کے طریقے ہوں اور یا سوسائٹی کے آداب ہوں) شامل ہیں۔ اور بین الاقوامیت یا بین الاسلامیت حج بیت اللہ شریف، ایک قبلہ اور ایک اصول ملت پر کار فرما ہے۔ (یعنی قرآنِ مجید کی زبان، مسلمان یا مومن ہونے کا لقب تبلیغ اصولِ اسلام، قرآنِ کریم، احادیثِ نبویہ اور اسوۂ حسنۂ سرکارِ دو عالم پر عمل کرنا وغیرہ)

یہی دراصل اسلامی تمدن کی روح ہے، جس کو جب کبھی بھی کسی مقام کی مقامیت کے جسم یعنی تہذیب کے ساتھ وابستہ کیا جائے گا تو اس وقت اس مقام کی مقامیت (یعنی جغرافیائی کیفیات) کو بھی اس میں شامل شمار کریں گے اور اس طرح اس مقام کے اسلامی تمدن کو اس مقام کے نام کی شمولیت کے ساتھ پکاریں گے مثلاً انڈونیشیا کا مسلم تمدن، ایران کا مسلم تمدن، پاکستان کا مسلم تمدن وغیرہ۔ جو اپنی روح (یعنی مدنیت اور بین الاقوامیت) کے لحاظ سے ایک ہوگا۔

لہذا اس نظریہ کے ماتحت وثوق کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ مسلمانانِ انڈونیشیا کا اس وقت کا تمدن بھی اسلامی تمدن تھا۔ جس کے ماتحت ظاہری کیفیات کے علاوہ روحانی اثرات کا بھی بین الاقوامی انداز یہ تھا کہ یہاں کے اس وقت کے مسلمان اپنے آپ کو سارے جہان کے مسلمانوں کا ایک جزو، ایک حصہ، بلکہ ایک حقیقی بھائی سمجھتے تھے (اور آج بھی سمجھتے ہیں) چنانچہ ان کے اس احساس کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک عیسائی پادری[اہ] لکھتا ہے کہ :۔

بیرونی دنیا میں جب کبھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو سماترا کے مسلمان اس کا دکھ محسوس کرتے ہیں بلکہ بے تاب ہوکر چیخ اٹھتے ہیں مثلاً ترکوں اور روس کی لڑائی نے ان کے دلوں میں ترکوں کے لئے بڑی بے چینی اور ہمدردی پیدا کر دی تھی "۔

آخر یہ کس چیز کا نتیجہ تھا، صرف تمدن اسلام کی اسی بین الاسلامیت[۵۲] کا اس طرح یہاں کے اس وقت کے تمدن کو اندونیشیا کا مسلم تمدن کہنا پڑے گا اور

---

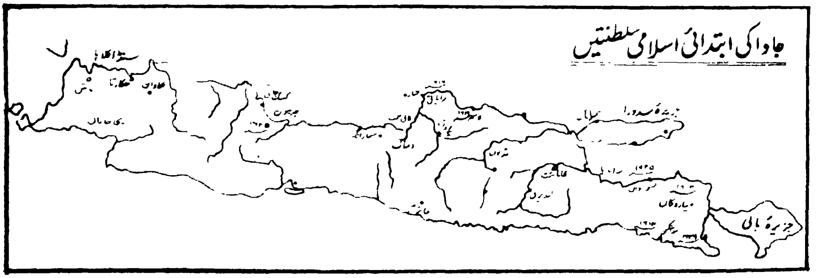
اہ (The Mohammaden world today) مصنفہ (بزبان انگریزی) ایس ایم زیمر صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء (جس میں صفحہ ہذا پر (Islam in Sumatra) کے عنوان سے مشہور ولندیزی پادری (Rev. G. K Sunion) کے عیسائی مشن کی معلومات کے لکھے ہوئے مضمون کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ اس سے میں نے بھی یہ اقتباس کیا ہے۔قادری

۵۲ ــــ جس کو سراہتے ہوئے مشہور امریکی مصنف "ڈاکٹر لوتھر اسٹارڈ" اپنی کتاب "نیو مسلم ورلڈ ان میکنگ" ترجمہ ڈپٹی کلکٹر محمد جمیل الدین بدایونی بعنوان "جدید دنیائے اسلام" (صفحہ ۴ ۔ مطبوعہ ۱۹۲۳ء) میں رقمطراز ہے :۔

" آنحضرت صلعم مسلمانوں کے لئے باہمی برادرانہ اتحاد کے بین الاقوامی اصول کو نہایت اہم سمجھتے تھے اور آنحضرت نے اس کو مسلمانوں کے قلوب میں ایسا راسخ کر دیا کہ تیرہ صدیوں کے دوران میں اس میں کوئی کمزوری نہیں پیدا ہوئی آج ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے رشتہ اس رشتہ سے بہت زیادہ مضبوط ہے جو ایک عیسائی کا دوسرے عیسائی سے ہے۔ بلاشبہ مسلمان آپس میں بری طرح لڑتے ہیں لیکن ان جھگڑوں میں خانہ جنگی کی صورت ہمیشہ باقی رہتی ہے اور مشرکین کی تعدی کے وقت یہ جھگڑے معرض التوا میں آجاتے ہیں۔ اسلام کے عظیم اتحادی احساس سے غالباً سب سے بڑا امر کا پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا اپنے پیروان پر ایسا زبردست

ہندوانی تمدن سے تعبیر کرنا تاریخِ تمدن اور فلسفۂ تاریخِ تمدن سے ناواقفیت کے مترادف ہوگا، البتہ یہ ضرور ہے کہ مقامیت کے نظریہ میں وطنی رواج کا زیادہ اثر جاوا میں اس دور کے بعد ہی سے راسخ ہوا ہے جبکہ ہمنگ کورت اوّل، تختِ ماترم پر متمکن ہوا اور پھر دیگر مغربی اثرات ولندیزی حملہ آوروں کی وجہ سے چڑھے جس کے نتیجہ کے احساس پر "نشاۃِ ثانیہ" کا آغاز ہوا اور قائدینِ سیاست نے میدان میں نکل کر اس میں توازن پیدا کر دیا جس کی تفصیلات اب اگلے ابواب میں آئیں گی۔ اس بیان کو اب اسی منزل پر چھوڑا جاتا ہے اور اقوامِ مغرب کے حملہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

---




---

اثر کیوں ہے۔ ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ جو قوم ایک مرتبہ مسلمان ہوگئی اس نے کبھی بھی ترکِ مذہب کیا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ وہ بالکل مٹ گئے ہوں مثلاً اسپین میں ہوا لیکن مٹ جانا ارتداد نہیں ہے۔ اس اتحاد کے دو اصلی ارکان ہیں جن میں زیادہ اہم حج ہے یہ سالانہ بین الاسلامی کانگریس ہے"۔

# فصل پنجم

## اِنڈونیشیا پر اقوامِ مغرب کا حملہ

یہ فصل اقوام مغرب کے حملہ کی اجمالی تاریخ ہے جس میں کم وبیش سوا چار سو سال کا وہ طویل زمانہ اور اس کی تفصیلات کا اجمال بیان کیا گیا ہے ۔ جو جولائی ۱۵۱۱ء کی تاریخ کو پہلی یوروپی قوم اہلِ پرتگال کی آمد سے شروع ہو کر ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو آخری یوروپی قوم یعنی ولندیزیوں کے اندونیشیا سے چلے جانے اور باضابطہ طور پر ملک کی قومی جمہوری حکومت کے خود مختار ہو جانے تک ایک مخصوص انداز کے ساتھ اس ملک کی "تاریخ تہذیب وتمدن کے ساتھ وابستہ رہا ہے ۔ اس دور میں یوروپ کی مختلف قومیں مختلف اوقات میں یہاں آتی اور یہاں سے جاتی رہی ہیں ۔ اور تاریخ کی ایک مخصوص مدت تک حکمراں رہ کر یہاں کی زمینوں، قدرتی دفینوں، آب وہوا، پیداوار معدنیات حیوانات اور وسائل سے خاطر خواہ، طریقے سے مستفید اور متمتع ہوتی رہی ہیں اور اپنے مخصوص آئینِ حکمرانی اور انداز زندگانی سے یہاں کے اصول حکمرانی، اور طرز زندگانی پہ اثر انداز ہوتی رہی ہیں ۔ ان کا یہ پورا زمانہ جہاں مختلف قسم کی اختراعات کی سرگذشت سے وابستہ ہے وہاں یہ درد وکرب اور جنگ وحرب کی ہولناکیوں سے بھی پورے طور سے آغشتہ ہے ۔ جس کے سبب ظلم اور مظلومیت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں نظر آتی ہیں ۔ اسی نبرد آزمائی نے کبھی ابتدائی حالات میں رہ کر ابتدائی

اثرات پیدا کئے اور کبھی غیر معمولی طور پر مسلّط ہو کر ملک کی قومی آزادی کو بھی قصۂ ماضی بنادیا اسی کے محرکات و عوامل کا بیان اِس چار سو اڑتیس (۴۳۸) سالہ طویل دور کی سرگذشت کا ملخص ہے۔ جو پہلے اہل پرتگال پھر اہلِ ہسپانیہ پھر ولندیزی اور انگریز اور پھر سالماً ولندیزیوں کے تسلط اور حکمرانی پر مشتمل ہے۔

تاریخ کی ضرورتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہی تمام ملحوظات کے پیش نظر اس دور کے ان حالات اور ان کے مؤثرات کو خاص ابواب میں ترتیب دیا گیا ہے یعنی پہلے باب میں صرف اقوامِ مغرب کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ جو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے آئیں۔ اور اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفہ سے زوال میں آکر یہاں کے ماحولِ سیاسی سے رخصت ہوگئیں اور آگے کے چار ابواب میں ولندیزی قوم کی تفصیلات ہیں جو آنے کے بعد پورے تین سو چون سال بے غلط و غش اس ملک سے مستفید ہوتی رہی ہے۔ جس کی بے انتہا بدعنوانیوں نے بالآخر اہلِ ملک کو آمادۂ انقلاب کر کے حصولِ دولتِ گم گشتہ کی طرف ابھارا تھا۔ جس کی جد و جہد کا کامیاب نتیجہ موجودہ دولت جمہوریہ کا قیام ہے۔

اب اسی متذکرہ ترتیب سے ابواب کا آغاز کیا جاتا ہے۔

(۱) اہلِ پرتگال اور اہلِ اسپین کا حملہ۔

(۲) ولندیزیوں کا حملہ اور ان کا ابتدائی عہدِ حکومت۔

(۳) ولندیزی عہدِ اقتدار اور سلاطین۔

(۴) ولندیزی عہد کا نظامِ حکومت اور اندونیشی تمدن پر اس کا عام اثر۔

(۵) نشاۃِ ثانیہ اور (۶) دوسری جنگ عظیم اور ولندیزیوں کا زوال۔

# باب اوّل

## اہلِ پرتگال اور اہلِ اسپین کا حملہ

تاریخی حیثیت سے جہاں تک اس ملک (انڈونیشیا) میں غیر اقوام کی آمد اور ان کے واقعات سیاسی کا تعلق ہے، سب سے پہلے آنے والی قوم پرتگالی تھے جو افریقہ کے گرد گھومتے ہوئے ہندوستان اور اس نواح میں پہنچے۔

**اہلِ پرتگال** پرتگال کے باشندے تھے۔ یہ انگلستان کے جنوب میں نقشہ یوروپ پر جزیرہ نما اسپین، کے مغربی گوشہ میں ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ جو ۳۴۲۲۴ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۳۶۲ میل اور چوڑائی ۱۴۰ میل ہے۔ اور ۱۹۴۰ء کی مردم شماری کے حساب اعتبار سے آبادی ۷۱۸۴۸۹۹ ہے۔ ۱۰۹۵ء تک یہ ملک 'لیون' کی حکومت کا ایک تاریک سا حصہ تھا دنیا میں شہرت کے اعتبار سے بھی اس کا کوئی مقام نہ تھا۔ اور ۷۱۱ء میں مسلمانوں کی حکومت ہسپانیہ کا بھی یہ جزو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تہذیب پر مسلمانوں کی تہذیب کے اثرات بھی بہت کافی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اہل عرب کی طرح چُغے کا رواج تھا ڈاڑھی رکھتے تھے۔ اور سروں پر زلفیں بھی ہوتی تھیں۔ نام بھی عربی آمیز ہوتے تھے۔ مثلاً البوترق، وغیرہ انیسویں صدی تک ان کی نوآبادیاں برطانیہ کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ تھیں۔ مثلاً افریقہ میں ان کے پاس کیپ وردا، پرنس جزائر، پرتگالی گائنا، انگولہ، پرتگالی مشرقی افریقہ، مذبق اور جنوبی امریکہ میں برازیل اور ہندوستان میں گوا، دمن، اور ریو اور انڈونیشیا میں نصف جزیرہ تمور تھا۔ اس طرح کل نوآبادیاتی زمین ۶۰۰۶۰۰ ۱۲ مربع میل ان کے قبضہ میں تھی۔ اب تک علاوہ برازیل کے یہ سب متذکرہ حصے ان کے قبضہ میں بدستور ہیں۔

ویسے تو پرتگالی باقاعدہ طور پر اس ملک میں ۱۵۰۸ء میں پہنچے تھے مگر ان کی آمد کی ابتدا در اصل اس مدت کے دس سال قبل ہو چکی تھی ۔ جب کہ ان کا ایک مشہور بحری محقق یا بحری سیاح "واسکوڈی گاما (Vasco-d -Gama) افریقہ کے جنوبی سرے کے گرد چکر کاٹ کر "تلاش ہند" میں بحری سفر کرتا ہوا اور بڑے بڑے طوفانوں سے گذرتا ہوا ۲۰ رمئی ۱۴۹۸ء کو ان جزائر کے گرد پہونچا تھا ۔ اس سیاح نے "راس امید" کے گرد ہو کر آنے والے بحری راستہ کی دریافت سے مغرب و مشرق کی اس تجارت اور آمد و رفت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا جو کم و بیش پچھلی کئی صدیوں سے بوجوہ چند در چند بڑی بڑی دشواریوں سے دو چار تھی ۔ اور بے فروغ طریقہ سے رائج تھی ۔ انہی دشواریوں کے باعث مشرق مشرق تھا اور مغرب مغرب تھا ۔ اور دونوں اطراف کے مابین آمد و رفت، لین دین، اور اختلاط و امتزاج بھی اسقدر سرعت اور ترقی پذیر نہ تھا ۔ مگر اس راستہ کی دریافت نے اہل مغرب کے لئے مشرق کا دروازہ کھولدیا ۔ رفتہ رفتہ وہ اس طرف کو آنے لگے ۔ اور کبھی سوداگری کے بھیس میں اور کبھی سیاسی انداز میں اس نواح میں رہ کر اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا اثر ڈالنے لگے ۔

## اس اقصائے مشرق میں پرتگالیوں کی پہلی مہم

چنانچہ اس قوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۵۰۰ء میں پرتگال کے بادشاہ "امانول" (Emanvel) نے جب واسکوڈی گاما کی واپسی کے بعد اسی کی زبانی اس عجیب و غریب خطۂ سرزمین کی اس قیمتی پیداوار (یعنی "گرم مصالحہ") کے متعلق سُنا جو یوروپ کے بازاروں میں ایشیاء کے اندرونی اور

خشکی والے حصوں سے گزر کر پہنچنے کے باعث اس وقت کی رائج شدہ سونے کی قیمت کے برابر بکتی تھی۔ اور صرف روساہی کے استعمال تک محدود تھی۔ تو اس نے اسے حاصل کرنے کے لئے ایک چار جہازوں کا بڑا بیڑا تیار کیا۔ اور "ڈیگو لوپیز ڈی سیکوریا" (Diegolopez-di-sequeira) کی ماتحتی میں روانہ کیا جو مجمع الجزائر انڈونیشیا میں اسی سال جزیرۂ سماترا میں "پیدر" (Padir) اور "پسانے" (Pase) کے مقام پر پہونچا اور وہاں سے نکل کر مستقل طور پر جزیرہ نما ملایا کے مشہور شہر "ملکا" میں لنگر انداز ہوا۔ یہاں ایک مسلمان حکمراں "سلطان محمد" فرمانروا تھا۔ اسے ان پرتگالیوں کے ہندوستان کے ساحلوں پر آباد ہو جانے اور وہاں اہلِ ملک کے خلاف کارگزاریاں دکھانے کا علم ہو چکا تھا۔ لہذا اس نے "سیکوریا" کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سیکوریا ایک چالاک آدمی تھا۔ سلطان کی زد سے بچ کر نکل گیا۔ مگر اس کے بعض ساتھی سلطان کی گرفت میں آ گئے۔ اور فی الفور نظر بند کر دیئے گئے۔

اس وقت ہندوستان کے جنوبی مغربی ساحل پر پرتگالی، بعض بعض حصوں میں حکمراں ہو چکے تھے۔ ان کی باضابطہ ایک چھوٹی سی قلمرو قائم تھی اور البوقرق[1]

---

[1] **البوقرق** یہ اس دور کا سب سے قابل پرتگالی محبِ وطن مانا جاتا ہے۔ نہایت ہی پڑھا لکھا مدبر و مدبر اور ہوشیار گورنر گزرا ہے۔ اس کا پورا نام "الفنسو ڈی البوقرق" تھا وہ ۱۴۵۳ء میں پرتگال کے مشہور شہر "لسبن" کے نزدیک "الگزنڈریہ" کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اور شاہ "الفنسو پنجم" کے دربار میں تربیت پائی تھی۔ مذہباً کیتھولک تھا۔ چنانچہ شروع ہی سے اسے ایسی تربیت دی گئی تھی جس کے باعث جوان ہو کر اس نے اپنے وطن کے نام کو روشن کرنے اور مذہب کو پھیلانے کے لئے بڑے بڑے

اس قلمرو کا پرتگالی گورنر تھا۔ چنانچہ جب اس کو "سیکوریا" کی اس سرگذشت کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنے بادشاہ کے حکم سے انتقام کا جذبہ لے کر جون ۱۵۱۱ء کو اس نواح میں عازم سفر ہوا۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے انیس[۹] جہازوں کا ایک مضبوط بیڑا تھا۔ جس میں چودہ سو[۱۴۰۰] جوان تھے۔ چار سو ان میں مالاباری تھے۔ اور ایک ہزار پرتگال کے مشہور بحری قزاق تھے۔ جو فن سپہ گری میں بھی یوروپ کی اس وقت کی تمام فنی باتوں سے واقف تھے۔ "کرافورڈ" لکھتا ہے کہ "البوقرق یکم جولائی ۱۵۱۱ء کو ملکا" کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اس کا اصلی مقصد محض سیکوریا کا انتقام لینا ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ ان علاقوں پر پرتگالیوں کو اس بہانہ سے صاحب اقتدار کرنا چاہتا تھا اور

"کام کئے انھیں کاموں میں سے اس کا ایک بڑا کام اس نواحِ مشرق بعید میں پرتگالیوں کا اقتدار قائم کرنا ہے۔ بہرحال پچاس سال کی عمر میں وہ اقصائے مشرق کو اپنی پہلی مہم پر روانہ ہوا۔ اور واسکوڈی گاما کے دریافت کئے ہوئے راستہ راس امید سے گذر کر ہندوستان آیا اور دکن کے جنوب مغرب میں کوچین کے راجہ زمُّورُن سے اجازت لے کر ایک پرتگالی قلعہ تعمیر کیا اور انھیں یہاں آباد کر کے جولائی ۱۵۰۴ء کو وطن واپس لوٹ گیا۔ مگر جب بادشاہ امانول پرتگال کے تخت پر بیٹھا تو اس نے ہندوستان کی طرف ایک پرتگالی امیرالبحر "ڈی کنیا" کی ماتحتی میں ۹ جہازوں کا بیڑا روانہ کیا۔ جس کا کمانڈر البوقرق تھا۔ اس نے ہندوستان پہنچنے سے پہلے مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر عربوں کو لوٹا اور ۱۵۰۸ء میں خلیج فارس کے ایک جزیرہ ہرمز کو لوٹتا ہوا مالابار ساحل پر پہونچا۔ اور پرتگیزی گورنر الیمڈا کی معزولی کے بعد یہاں کا گورنر بنا اور پھر یہیں سے ۱۵۱۱ء میں مہم لے کر اندونیشیا کی طرف بڑھا۔ اور ملایا جزیرہ نما میں ملکا فتح کر کے دو سال کی حکومت کے بعد واپس پرتگال بلا لیا گیا۔ جہاں اس پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور قتل کر دیا گیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ نصرانیت پھیلانا چاہتا تھا۔"

چنانچہ سلطان محمد کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنی ہمسایہ حکومت، "پاہانگ" کے حکمراں سے مدد طلب کی۔ سلطان پاہانگ تیس ہزار سپاہ لے کر اس کی مدد کے لئے آپہنچا۔ مگر اس کی اس بڑی فوج میں نہ تو ایسے لایق سپاہی تھے جو فنون حرب سے کافی واقفیت رکھتے تھے اور نہ انکے آلاتِ حرب ہی یورپینوں کے مقابلہ میں کامیاب تھے لہٰذا اسے شکست ہوگئی۔ اور بالآخر سلطان محمد پرتگالیوں کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ چوبیس دن تک گفت وشنید ہوتی رہی۔ مگر چونکہ پرتگالیوں کے مطالبات بہت سخت تھے اس لئے یہ گفت وشنید ناکام رہی۔ آخر ۲۴ رجولائی ۱۵۱۱ء کو پرتگالی فوج زبردستی شہر کے اندر داخل ہوگئی۔ اور داخل ہونے کے بعد اس فوج نے بے دردانہ قتل ونہب شروع کر دیا۔ ایک شہزادہ علاؤالدین جو سلطان پاہانگ کا سالہ تھا مقابلہ کے لئے سلطان ملکا کی طرف سے پرتگالیوں کے خلاف نکلا۔ اوپر سے سلطان خود ہاتھیوں کا ایک لشکر لے کر بڑھا۔ مگر پرتگالی لڑائی کے معاملہ میں نسبتاً زیادہ ماہر تھے۔ ہاتھیوں کو بھڑکانے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اتفاق سے اسی اثنا رئیں ان کی ایک مزید کمک جنرل "ڈی لیما" کی سرکردگی میں آپہنچی بارش کا سخت ترین موسم تھا۔ ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ پرتگالی بڑی تعداد میں بیمار پڑجانے کے باعث مصلحتاً واپس ساحل پر جا پہنچے۔ اور کچھ دنوں کے توقف کے بعد دھوکہ دے کر پھر شہر ملکا میں داخل ہوگئے اور تین دن تک خوب قتل و غارت کیا۔ اور سارے شہر کو تاراج کر دیا۔ مال ومتاع جسقدر بھی ہاتھ آیا سب لوٹ لیا۔ سلطان مایوس ہوکر شہر سے 'دریائے سوراے' کی طرف بھاگ گیا۔

اور اس طرح پرتگالی ملکا پر قابض ہو گئے اور باقاعدہ حکومت کرنے لگے ۔

البوقرق ہی ان کا اس نواح میں سب سے پہلا گورنر مقرر ہوا ۔ اس نے یہاں پر ایک مضبوط قلعہ اور ایک بڑا گرجا گھر بھی بنایا ۔ اور شہر کے غیر مسلم آبادکاروں کو عیسائی بنانے کے لئے ایک باقاعدہ مشن اور اسکول بھی کھولا ۔ کرافورڈ نے اس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بہت ہی خودغرض اور متعصب مزاج تھا ۔

## مسیحی مشن اور سینٹ فرانسس زی ویر

چونکہ اس نواح میں عیسائیت کی تبلیغ کا سب سے بڑا محرک سینٹ فرانسس زی ویر ( F Xavier ) تھا ، لہذا اس کے حالات کا اجمال بیان کرنا بھی اس مقام پر ضروری ہے ۔ تاکہ متفحصانِ تاریخ کو فہم حالات میں دشواری نہ ہو ۔ اور مسیحی مشن کی کارکردگیوں کا بھی اندازہ کیا جا سکے ۔

زی ویر ، مشرق کی نصرانی تاریخ میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مبلغ مانا جاتا ہے ۔ بقول کولرج ، مصنف کتاب " دی لائف اینڈ لیٹرز آف سینٹ فرانسس زی ویر ، جلد اول مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء ) وہ پرتگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۵۰۶ء میں پیدا ہوا ۔ اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی پھر میٹرک پیرس سے کیا ، اور وہیں پر پادریوں کی صحبت کے باعث عیسائی مشنری بن گیا ۔ اور پاپائے روم سے اجازت لیکر ۳۵ سال کی عمر میں مشرق کو روانہ ہوا ۔ ۱۵۴۲ء میں گوا ، ہندوستان ) پہنچا ، پرتگالی گورنر البوقرق کے اشارہ پر ہندوستانی جزیرہ نما میں مسیحیت پھیلاتا ہوا کوچین ، اور سیلون ہوتا ہوا ۱۵۴۵ء میں ملکا میں وارد ہوا ۔ حکومت کی مدد سے ہزاروں ماہیگیروں کو عیسائی بنا کر جنوری ۱۵۴۶ء میں امبون آیا ، پھر چند ماہ بعد ترناتے ہوتا ہوا واپس ملکا چلا گیا ، وہاں جاپانی زبان سیکھی اور اس کے بعد ۱۵۴۹ء میں جاپان کے جزائر میں مسیحیت کی تبلیغ کرتا ہوا چین آیا ۔ اور ۱۵۵۲ء میں گوا واپس چلا گیا ۔ جہاں اس نے ایک بہت بڑا مسیحی مشن کی تربیت کا ادارہ کھولا ۔ اور ۳ ؍ دسمبر ۱۵۵۲ء کو رحلت کر گیا ۔

کہتے ہیں گوا میں اب تک اس کا تابوت رکھا ہوا ہے ۔ ہر دس سال کے بعد اس کا باقاعدہ مظاہرہ ہوتا ہے ، مشرق کے عیسائی بھاری تعداد میں آتے ہیں اور اس کے لاشہ کو دیکھتے ہیں ۔ ایک میلہ سا لگ جاتا ہے ۔

گوا ، مدراس ، کوچین ، سیلون ، ملایا ، اندونیشیا ( امبون ، ترناتے ، تدورے ، ہلماہیرا ) جاپان اور چین میں کیتھولک عیسائی زیادہ تر اسی کے بنائے ہوئے ہیں ، وہ جہاں جاتا پرتگالیوں کا اثر بھی پھیلا دیتا ۔ اپنی پرتگالی زبان کی تعلیم بھی عام کرتا

اس کی خود غرضی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ اپنے کسی معاملہ میں اپنے عزیز سے بھی نقصان ہوتا ہوا دیکھتا تو اسی بھی سازش کے بہانہ سے مروا دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے داماد کا قتل اسی سلسلہ کی ایک بیّن دلیل ہے۔ دو سال کے بعد وہ واپس بلا لیا گیا۔ اور اس کی جگہ دوسرے پرتگالی گورنر وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ اور رفتہ رفتہ اندونیشیا کی طرف بھی انھوں نے اپنی توجہ کو مبذول کرنا شروع کر دیا۔

## پرتگالیوں کی آمد کے وقت اندونیشیا کے تمدّن کی عام حالت

اس وقت اندونیشیا میں مذہب اسلام کو پہنچے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا۔ جیسا کہ اسلام کی اس ملک میں اشاعت کی تاریخ سے واضح کیا جا چکا ہے کسی حصہ میں اسلام کو پہنچے ہوئے پونے دو سو سال ہوئے تھے۔ کسی حصہ میں ڈیڑھ سو، اور کسی حصہ میں صرف سو سال کا زمانہ گزرا تھا۔ اور جاوا میں صرف ۳۳ سال ہوئے تھے۔ جاوا میں اس وقت کہیں کہیں قدیم مذاہب بت پرستی کے آثار بھی باقی تھے۔ اسلام کی چھوٹی بڑی سلطنتیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جزیرہ سماترا میں پلیم بنگ اور آچیہ اسلامی سلطنت کے مراکز تھے۔ ملایا جزیرہ نما میں ملکا پاہانگ اور سیام کے قریب چمپا کی اسلامی حکومتیں تھیں جزیرہ جاوا کے مقامی اولیائے اسلام کے مشہور خاندان، ماترم، کی مختلف شاخیں مختلف حصوں میں حکمران تھیں۔ ان کی خاص خاص سلطنتیں مثلاً سلطنت بانتن، چری بون، دیماک، پاہانگ اور جکارتا تھیں جزیرۂ بالی میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے ہندو اور بدھ مذہب کے پیرو راجہ تھے۔ جن کا انداز بھی قدیم

---

۴۴ مقامی زبان میں مہارت حاصل کر لیتا اور مظاہر پرستوں میں اپنی تبلیغ کرتا، ان میں حکومت کے وسیلے سے روپیہ بھی خرچ کرتا۔ اور ان کے لئے مدرسہ بھی کھول دیتا تھا۔ اس طرح اس نے عیسائی تمدن اور پرتگالی اقتدار کی بڑی خدمت کی۔

تھا۔ اور جزیرہ مدورا پانچ خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ بورنیو میں سراواک، بونی اور دوسری اسلامی ریاستیں تھیں۔ مالوکو اور سلاویسی میں بھی مختلف مسلمان سلاطین چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے مالک تھے۔ اور ان کی پانچ پانچ اور چھ چھ ریاستوں کے وفاق سے وفاقیہ مرکز قایم تھا (Federal Central Government) جنہیں جزیرۂ تیمور اور جزیرہ نیوگنی (ایریان) اور امبون، بندا، تمنبار، سیرم وغیرہ سلطان تدور کے علاقے تھے جنہیں زیادہ تر نیم مہذب لوگ آباد تھے، ان کا مذہب بھی مظاہر پرستی تھا، اس طرح سارا ملک سیاسی حیثیت سے چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور یہ سب حکومتیں موروثی تھیں۔ اور ان کے حکمران بھی خود مختار اور مطلق العنان تھے مگر ان تمام جزائری حکومتوں کا مذہب اسلام تھا۔ دفتری کاروبار بالکل سادہ تھا۔ عدالتیں بھی سب اسلامی انداز کی تھیں۔ فن تعمیرات، کاروبار اور تجارت کی بھی کافی ترقی تھی۔ پھر ہر سلطنت کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے امراء اور جاگیردار آباد تھے۔ ان کی حیثیت یوروپ کے زمانہ وسطیٰ کے "فیوڈل لارڈس" سے کچھ کم نہ تھی۔ وہ اپنے اپنے علاقوں میں ایک طریقہ سے حکمرانوں کے انداز پر رہتے تھے۔ ان کی زندگی بڑی مُترفانہ تھی۔ حکومت وقت کے انتظامی معاملات میں بھی بڑا دخل تھا۔ چنانچہ وزیر خاص جسے "پاتھہ" کہا جاتا تھا عموماً اسی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، فوجیں بھی اکثر اسی کے ماتحت ہوتی تھیں۔ دفتر اور خزانہ بالکلیہ اسی کے تحت میں ہوتا تھا۔ جب تک حکمراں طاقتور ہوتا تھا "پاتھہ" وفادار رہتا تھا۔ مگر جب اسے کمزور پاتا تو اپنی حکومت علیحدہ قایم کرلیتا تھا۔ پھر یہ حکومتیں بھی آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اہل یوروپ کو یہاں قدم جمانے میں اس سیاسی حالت اور انتظامی کیفیت سے بڑی مدد ملی۔ چنانچہ "پرتگالیوں" نے ان سلطنتوں کے "پاتھہ"

سے بہت ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ انھیں کی اجازتوں سے انھیں ابتدا میں قدم جمانے کا موقع ملا اور پھر انہی کے ذریعہ سے وہ بتدریج حکومتوں کے داخلی معاملات میں بھی مخل ہوکر مستحکم ہوتے چلے گئے۔

اس زمانہ میں انڈونیشیا اور ملایا کی شہری زندگی بھی بڑی شاندار تھی۔ چنانچہ ملایا میں سنگاپور اور ملکّا بہت بڑے شہر تھے۔ قدیم ہندوؤں کے وقت سے تجارت کے بڑے مرکز تھے۔ البتہ ملکّا کو مسلمانوں نے ترقی دی تھی۔ چنانچہ "فرنیول" لکھتا ہے کہ اس کی آبادی پرتگالیوں کی آمد کے وقت تقریباً دس لاکھ تھی۔ اور مختلف النسل اور مختلف المسالک افراد پر مشتمل تھی۔ افریقی عرب جو "مورس" کہلاتے تھے کثرت سے آباد تھے۔ اور وہ یہاں کا گرم مصالحہ مصر کے بازاروں میں وہاں کے بندرگاہ اسکندریہ کی راہ سے لیجاکر بیچتے تھے۔ اور پھر وہیں سے یہ تمام عرب ممالک کو فراہم کیا جاتا تھا۔ سنگاپور میں چینی اور ہندوستانی سوداگروں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ جاوا میں جکارتا، سولو، سُرابایا، بانتن، سیمرانگ اور سماترا میں پلیم، بنگ اور میڈان سُلاویسی میں مکاسر اور نیدورے، ترناتے اور مالوکو کے بھی بعض بڑے بڑے شہر تجارت کے مرکز تھے۔ اور ان سب سے گرم مصالحہ، شہد، شکر، ہاتھی دانت، اور چوب دنیا کے تمام مشرقی ممالک کو جاتی تھیں۔ خود ملایا کے شہر ملکّا میں بھی یہیں سے مشرق کو جانے کے لئے آتی تھیں۔ پیسہ کی بڑی قلّت تھی۔ اسی لئے لین دین عموماً تبادلۂ اشیاء سے ہوتا تھا۔ مثلاً چین سے سلک اور چینی کے برتن۔ ہندوستان اور مصر سے زر کی صورت میں سونا، کپاس اور دیگر اونی سامان آتا تھا۔

جہاں تک کہ فوج کا تعلق ہے کچھ اچھی نہ تھی۔ تربیت اور تنظیم میں بھی یوروپی

سپاہ کے مقابلہ میں کمزور تھی۔ ہتھیار بھی پرانے اور ناقص تھے۔ سلاطین امیرانہ زندگی گزارنے کے باعث اوّل تو اس طرف توجہ ہی کم کرتے تھے۔ پھر ستم بر بالائے ستم یہ کہ بروقتِ جنگ فوجیں اکھٹی کرتے تھے۔ جو اگرچہ تعداد میں زیادہ ہوتی تھیں مگر افادیت کے لحاظ سے کچھ نہ ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ یورپ کو خصوصاً پرتگالیوں کو آسانی کے ساتھ کامیابیاں ہوتی چلی گئیں۔ اور وہ اندونیشیا کی طرف بڑھنے لگے۔

## اندونیشیا میں پرتگالیوں کا پہلا سیاسی قدم

چنانچہ ملکا پر قابض ہوجانے کے بعد "البوقرق" نے عربی اور ہندی سوداگروں کا زور توڑنے کے لئے بڑی بڑی قانونی بندشیں عائد کیں اور اس کام کے لئے اپنے دو خاص افسر مقرر کئے۔ جن میں ایک مسلمان جاوا کا جلاوطن سردار "راجہ یوتی موتیز (Raja Utimutis) تھا اور دوسرا ایک غیر مسلم افسر "ننیا چی توان (Ninachetuan) تھا۔ ان دونوں کی مدد سے پرتگالیوں نے مقامی نظم و نسق پر بھی کافی غلبہ پالیا۔ اور مقامی، تہذیب، زبان اور تمدن کو سمجھنے میں بھی کافی مدد حاصل کی۔ اور چونکہ ان کی تجارت کی خاص جنس (یعنی گرم مصالحہ) اکثر و بیشتر اندونیشیا سے آن کر ملکا سے دوسرے ممالک کو جاتی تھی۔ اس لئے اس کی گرانی کو بھی محسوس کیا۔ اور یہی احساس ان کی "اندونیشیا" کے جزائر کی طرف سیاسی توجہ کا باعث بھی ہوا تھا۔

بہرحال جیسے ہی کہ جولائی ۱۵۱۱ء میں وہ کامیاب ہوکر شہر ملکا پر حکومت کا سکہ جمانے لگے۔ تو آس پاس کے حکمرانوں نے جن میں سیام، انام، جاوا اور سماترا کے فرمانروا بھی علاوہ ملایا کے شامل ہیں۔ ان کے پاس سفارتیں بھیجنی شروع کیں جاوا اور سماترا سے سفارتیں آنے کا سبب تو اصل میں وہاں کے حکمرانوں کی وہ داخلی کشمکش تھی

جوان میں باہمی آویزش کے انداز میں مدت سے جاری تھی اور انھیں کامیاب کرنے کے لئے وہ جدید آلاتِ حرب کے متلاشی تھے ۔ اور سمجھتے تھے کہ وہ یہ آلات صرف پرتگالیوں ہی سے حاصل کر سکتے ہیں ۔ سیام کا حکمراں چونکہ پاہانگ اور ملکا کے سلاطین کا کسی زمانہ میں شہنشاہ رہ چکا تھا اور اب کچھ زمانہ سے ان کے خود مختار ہو جانے کے باعث ان سے کبیدہ خاطر تھا ۔ اس لئے جب پرتگالیوں نے انھیں شکست دے کر ختم کر دیا تو وہ اک دم خوش ہوکر ان سے آملا ۔ اور اسی لئے اس نے ان کے پاس اپنی سفارت بھی بھیجی ۔ اور ملایا کے بقیہ حکمرانوں نے خوف کے باعث ان سے سلسلۂ ارتباط قایم کر لیا ۔

اس طرح سیاسی بندھن کو مضبوط کرنے کے بعد پرتگالی اندونیشیا کے ان جزیروں کی طرف متوجہ ہوئے ۔ چنانچہ اسی سال (یعنی ۱۵۱۱ء) میں البوقرق نے ایک چھوٹا سا بحری بیڑا "انٹونیا" (Antonia D'Abreu) کی ماتحتی میں مشرق کی طرف جزائرِ مالوکو کو روانہ کیا ۔ کیونکہ یہی علاقہ اندونیشیا میں گرم مصالحہ کا بڑا مرکز تھا ۔ چین کی تجارت کے لئے بھی نزدیک تھا ۔ اور پھر انھوں نے سن لیا تھا کہ سیاسی حیثیت سے بھی جاوا، سماترا اور بورنیو کی بہ نسبت یہ جزیرے زیادہ کمزور اور غیر منظم تھے ۔ اور وہاں کے باشندے بھی زیادہ سیدھے سادھے اور ناخواندہ تھے ۔ مگر "انٹونیا" جزیرۂ امبون ہی میں پہنچا تھا کہ موسم کی خرابی اور بارش کی کثرت نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا ۔ یہاں کے باشندے ہمیشہ سے بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں ۔ اور غیر ملکی لوگوں کے ساتھ رفق و ملاطفت سے پیش آتے ہیں ۔ چنانچہ اپنی روایات کے مطابق انھوں نے انھیں غیر ملکی سوداگر سمجھ کر بڑی آؤ بھگت کے ساتھ اپنے ہاں رکھا ۔ اور کوڑیوں کے دام گرم مصالحہ فراہم کر کے انھیں بہم پہونچایا ۔ چنانچہ "انٹونیا" نے ایک جہاز بھر کر

"فرانسس سرانو (rrancis Serrano) (جو اس کے ساتھی کپتانوں میں سے ایک کپتان تھا) کی ماتحتی میں ملکا کو روانہ کر دیا۔ مگر قریب کے ایک غیر آباد سے جزیرہ کے قریب پہنچ کر یہ جہاز غارتی میں آگیا۔ اور اس کے کپتان اور ملاح کچھ مچھیروں کی مدد سے جزیرہ میں پہنچ گئے۔ اور یہاں سے کافی مال و دولت اکٹھی کر کے پھر "امبون" آئے اور اسی کو مستقر بنا کر باقاعدہ تھوڑے عرصے کے بعد قابض ہوگئے۔ اس طرح انڈونیشیا کی املاک پران کا یہ پہلا قبضہ تھا۔ حتی کہ ۱۵۱۴ء کے شروع تک وہ امبون کے اور بھی ملحقہ جزائر پر قابض ہو گئے۔ سات سال گزر جانے کے بعد اور زیادہ مضبوط ہو کر انھوں نے ۱۵۲۱ء میں "انٹونیو ڈی برٹو (Antonio de Britto) کی کمان میں نو جہازوں کے ایک بیڑے کے ساتھ 'ملوکس' (مالوکو) کی طرف ایک مہم روانہ کی۔ اس طرح یہ لوگ اس نواح میں پہنچے۔ اور اپنا کاروبار تجارت جمانے لگے۔ ملکا کی طرح انھوں نے یہاں آنے کے ساتھ ہی حملہ شروع نہیں کیا تھا۔ چنانچہ "ڈریک" لکھتا ہے کہ "مالوکو کے لوگ بھی آس پاس کے اور دیگر جزائر شرق الہند کے باشندوں کی طرح نہایت ہی خوش خلق اور مہمان نواز تھے۔ لہذا بلا کسی مزید تامل کے ان لوگوں نے ان یوروپینوں کو بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنے ملک میں اتارا۔ اور ان کی بڑی مدارات کیں۔ چونکہ انٹونیو کا مقصد ان جزیروں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے بادشاہ "شاہِ پرتگال"، کے نام سے حکومت کرنا تھا۔ لہذا مالوکو کے سلاطین سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کا بہانہ کر کے ساحل کے قریب بڑی بڑی زمینیں حاصل کرنے لگا۔ اور کوٹھیوں کے نام سے قلعے بنانے لگا۔ چونکہ یہاں کے لوگ بڑے سادہ لوح تھے۔ لہذا انھوں نے اجازت بھی دی۔ اور آسانیاں بھی بہم پہنچائیں۔ چنانچہ ترناتے

(Ternate) کے مقام پر، جہاں مالوکو کے سب سے مضبوط حکمراں کا پایہ تخت تھا قلعہ بنا کر اپنا سب سے پہلا مستقر قایم کرلیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے خلاف سازش کرکے پورے ترناتے پر قبضہ کرلیا۔ اور پھر اسی طرح "تیدورے" (Tidore) پر بھی وہاں کے سلطان 'بولیفے' (Boleife) کو معزول کرا کے اپنا قبضہ جما لیا۔"

یہی مورخ لکھتا ہے کہ 'بولیفے' کے خلاف اِن لوگوں نے ایسی ہولناک خانہ جنگی شروع کرائی کہ ہزاروں آدمی ہلاک ہوگئے۔ اور پورا جزیرہ برباد ہوگیا۔ اور رہے سہے امرا کو خود پھر انھوں ہی نے کچل دیا۔ اور سلطان "بولیفے" کو گرفتار کرکے اس قدر مارا کہ اس کا سارا بدن چھریوں اور برچھیوں سے فگار کر دیا۔ اور پھر ایک جہاز میں بٹھا کر اسے ساحلِ ہندوستان پر خود کے اپنے بندرگاہ "گوا" کو پہنچا دیا۔ "گوا" میں پرتگالی گورنر جنرل نے اپنے ایک خاص حکمت سے ایک چھوٹا سا حوض بنوایا اس کو پانی سے بھروا دیا اور پھر ایک من نمک اس میں گھلوا دیا۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا تو اس زخمی سلطان کو تڑپنے اور بلبلانے کے لئے اس میں ڈلوا دیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ چند گھنٹوں میں تڑپ تڑپ کر اس غریب مسلمان سلطان نے جان دیدی۔ اور چند ہی روز میں اس کی نعش نمک آمیز ہوکر نمک بن گئی۔ کیا تاریخ کسی مہذب قوم کی نسبت محسن کُشی کی آج کوئی ایسی مثال پیش کرسکتی ہے۔ یہ تو ایک بہت ہی عام سی مثال تھی۔ جو یہاں پیش کی گئی ہے۔ ورنہ ان "گرگ دران گوسفند" کے مظالم کی اتنی لمبی فہرست ہے کہ اس کے بیان کرنے کے لئے خود ایک مہلت چاہئے وہ انتہا درجہ کے ظالم، تنگ نظر اور متعصب الخیال لوگ تھے۔ ان کو اسلام کے اِسپین سے مٹ جانے کے بعد مسلمانوں سے سخت دشمنی پیدا ہوگئی تھی۔

چنانچہ اسی دشمنی کے پیش نظر وہ مسلمانوں سے جہاں بھی کہیں موقع ملتا تھا۔ اس قسم کا انتقام لیتے تھے اور ان کی حکومتوں کو اپنے جعل وفریب سے برباد کر دیتے تھے وہی انھوں نے یہاں کیا اور اس طرح ۱۵۱۱ء کے اواخر میں وہ ان جزائر پر پورے طور سے قابض ہو گئے اور تقریباً ساٹھ برس تک قابض رہے۔

اسی طرح ۱۵۹۵ء[1] میں پرتگالیوں نے جاوا کا بھی رُخ کیا۔ مگر اس نواح میں ان کا آنا ایک فاتح یا غاصب کی حیثیت سے نہ تھا۔ بلکہ وہ محض تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ یہ زمانہ جاوا کی تاریخ میں مسلمان سلاطین کی حکومتوں کا ایک

---

[1] ایک انگریز مورخ (Oliver Neost) نے اپنی کتاب (Voyage round the world) مطبوعہ لندن ۱۶۰۲ء میں تحریر کیا ہے کہ پرتگالی لوگ جزیرہ جاوا میں پہلی بار بعہدِ ابوقرق ۱۵۱۱ء میں "فتح ملکا" کے بعد پہنچے تھے۔ اور ان کے پہنچنے کا قرینہ "منصب سفارت" کا ذریعہ تھا بات یہ تھی کہ جب البوقرق نے ملکا فتح کیا تو آس پاس کے ممالک سے اس کے دربار میں سفارتیں پہنچیں جن میں ایک سفارت جاوا کی بھی تھی۔ چنانچہ اس کے جواب میں البوقرق نے بھی اپنی سفارت بھجوائی۔ یہی مصنف پھر آگے لکھتا ہے کہ افسوس ہے کہ آج مستقل طور پر اس عہد کی کوئی باوثوق تحریر نہ ملنے کے باعث سلاطین اور سفراء کے نام کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرتگالی اپنے پہلے سفر میں جزیرہ جاوا کے ایک حصّے کے ایک ہندو حکمراں کے دربار میں پہنچے تھے۔ جس کا دارالحکومت "پسَرُوان" (Passaruan) تھا۔" چنانچہ اِسی مُدّت کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے پرتگالیوں کی آمد کے وقت کی عام حالت" میں جاوا کے سلسلے میں صرف ۴۴ سال آغازِ اسلام کی مُدّت لکھی ہے۔

نہایت ہی شاندار زمانہ تھا۔ خاندانِ ماترَم کے پہلے حکمراں "پنَم بَاہَان سِینُا پَاتیِ" کا آخری دور تھا۔ اور جکارتا، بانتن اور چِرِیبُون میں بھی خود مختار سلاطین فرمانروا تھے چونکہ یہ حکمراں بڑے صاحبِ دبدبہ اور صاحبِ جلال تھے۔ اسی لئے پرتگالی اس نواح پر غاصبانہ نظر نہ ڈال سکے۔ اور سلطان بانتن سے اجازت لے کر خاموشی کے ساتھ "پناروکان" (Panarukan) کے مقام پر تجارت کرنے میں لگ گئے۔ اتفاق سے یہی سال ولندیزیوں کی آمد کا ہے۔ اور اسی زمانہ میں ان کی ولندیزیوں سے لڑائیاں بھی ہوئیں۔ چنانچہ ان کے سارے مقبوضہ بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ اور صرف تجارت ہی کا ایک ذریعہ باقی رہ گیا۔ جسے حاصل کرنے ہی کے لئے وہ جاوا کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

## پرتگالیوں کی تجارت اور جہاز رانی

پرتگالیوں نے اس ملک کی نواح میں کم و بیش ۴۰ سال حکمراں کے طور پر اور قریب قریب ایک سو سال تجار کی حیثیت سے گزارے اور اس ملک کی دولت سے خوب دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ اندونیشیا نے انھیں مالامال کر دیا، اور ان کی ساری مشکلات حل کر دیں۔ اس سے قبل وہ سونا حاصل کرنے کے لئے اقصائے مغرب میں امریکہ کو جایا کرتے تھے، مگر اب اس ملک کی گرم مصالحہ کی تجارت نے انھیں امریکہ کی یاد بھلا دی تھی، کیونکہ اس ملک میں آنے سے قبل وہ اسقدر خوش حال نہ تھے۔ انھیں فراغت حاصل نہ تھی، اب دولت سے ان کا دامن پُر تھا۔ اور اب وہ یوروپ کی ایک خوش حال قوم بن گئے تھے۔

ان کے طریقہ کار کے متعلق کرافورڈ[1] لکھتا ہے کہ ان کا بادشاہ (یعنی شاہِ پرتگال) ہی بحری بیڑوں کا کماندارِ اعلیٰ ہوتا تھا۔ اور اسی کو غیر ملکی تجارت کا اجارہ دار بھی سمجھا جاتا تھا۔ جب اہلِ ملک میں سے کسی طبقہ یا جماعت کو کسی مہم پر جانا ہوتا تو اسی شاہ سے اجازت طلب کرنی پڑتی تھی۔ اور باقاعدہ اس کے خزانۂ شاہی کا تنخواہ دار ہو کر جانا پڑتا تھا۔ تاکہ مہم پر جو کچھ بھی حاصل ہو وہ سب اسی کی ملکیت قرار دیا جا سکے۔ جہازی بیڑہ بھی اسی کا اپنا ہوتا تھا۔ اور جہاز بھی عموماً جسامت کے لحاظ سے کافی بڑے ہوتے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک میں پندرہ سو یا سولہ سو ٹن وزن لادا جا سکتا تھا۔ مگر سپاہیوں اور ملاحوں کا وزن اس کے علاوہ ہوتا تھا۔ جو کسی جہاز میں پانسو اور کسی میں چھ سو کی تعداد میں بیٹھتے تھے۔ ان کے ساتھ کھانے کا راشن، پہننے کے کپڑے، بیماریوں کی دوائیں، اور لڑنے بھڑنے کا پورا سامان ہوتا تھا۔ طوفان کے وقت تیر کر نکل جانے والی کشتیاں بھی ہوتی تھیں انھیں شاہی تجارت کے علاوہ نجی تجارت کی بھی اجازت تھی۔ چنانچہ وہ سامان بھی انھیں جہازوں میں لاد کر لاتے تھے۔ مگر ان پر ٹیکس یا چنگی معاف تھی۔ تنخواہ کے علاوہ انھیں بحری بھتہ ملتا تھا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گرم مصالحہ ان کی اجناسِ تجارت ذاتی میں شامل نہ تھی۔ اس کا اجارہ دار صرف شاہِ پرتگال ہی ہوتا تھا۔ اور اسی کے نمائندے اس گرم مصالحہ کو یوروپ کے دیار و امصار میں جا کر اقوامِ یوروپ کے ہاتھوں بیچتے تھے۔ اور من مانی قیمت اٹھاتے تھے۔ یہی دیکھ کر اسپین والوں کو اور پھر ان کے بعد ولندیزیوں کو اس طرف آنے کی حرص ہونے لگی۔ چونکہ ان کے بعد میں آنیوالی دوسری اقوام

---

[1] جان کرافورڈ کی کتاب "ہسٹری آف دی انڈین آرچی پلیگو" صفحہ ۲۱۵ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

میں سب سے پہلے آنے والی قوم اہلِ اسپین ہیں۔ لہٰذا اب ذیل میں ان کا آنا اور آنے کے بعد پرتگالیوں کے ساتھ جنگ آزما ہونا واضح کیا جاتا ہے۔

## اہلِ اسپین کا حملہ

جغرافیائی حیثیت سے اہلِ اسپین اہلِ پرتگال کے ہمسایہ تھے۔ اور امریکہ اور دوسرے برِّ اعظموں میں ایک دوسرے کے دوش بدوش تجارت کرتے تھے، لوٹتے تھے اور قتل وغارت کرتے تھے۔ ان میں دولت کی حرص اور ملک گیری کی ہوس نے ایک دوسرے کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کر دیا تھا۔ اور اب وہ جگہ جگہ لڑتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو بیدخل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۴۹۰ء میں ان کی یہ آپس کی کینہ پروری اس حد تک جا پہنچی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہنے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۴۹۳ء میں، ان کے مذہبی پیشوا "پوپ الیگزنڈر چہارم" نے اپنے ایک شاہانہ حکم سے ان میں تصفیہ کرانے کی کوشش کی اور یہ طے کر دیا کہ آئندہ سے مغربی ممالک میں اسپین والے جائیں۔ اور مشرقی ممالک میں پرتگالی۔ مگر کچھ عرصہ تک تو یہ سلسلہ جاری رہا اور پرتگالی جو امریکہ میں اسپینوں کے ساتھ ساتھ سونا حاصل کیا کرتے تھے اب مشرق میں آنکر اس نواح میں بس گئے۔ اور مالامال ہو گئے۔ اسپین والوں کو چونکہ انگریز بحری قزاقوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ وہاں بھی آرام سے نہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے بھی پوپ کے حکم کو معطل کر کے مشرق کا رخ کیا۔ اور پانچ جہازوں کا ایک مضبوط بیڑہ "ہرنند دوڈی مغالینس" **(Hernando de Maghallanes)** کی ماتحتی میں مغرب کی طرف (امریکہ) سے نکل کر اس طرف کو بھیجدیا۔ اس کے ساتھ ۲۳۴ آدمی تھے۔ اور اس کے جہاز بھی ۶۰ سے ۱۳۰ ٹن تک کا وزن رکھتے تھے۔

"بقول میجر۔ جی۔ آئی۔ ینگ ہسبنڈ[۵۱]" وہ راس ہارن کے راستے سے چکر کاٹتا ہوا دسمبر ۱۵۲۰ء میں بحرالکاہل میں پہنچا۔ اور چار ماہ کے بعد وہ جزائر "لیڈروس[۵۲]" کو دریافت کرنے کے بعد یکم اپریل ۱۵۲۱ء میں "فلپائین" کے ایک جزیرہ "مغتن" (Magton) میں لنگر انداز ہوا۔ یہاں کے لوگ پہاڑی ہونے کے سبب نیم وحشی اور دلیر تھے۔ ایک چھوٹے سے قبائلی سردار کی ماتحتی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دم اپنے جزیرہ کے ساحل پر انھیں دیکھ کر مقابلہ آرا ہو گئے۔ لڑائی ہوئی اور مغالینس بھی مارا گیا۔ اور اس کے بہت سے ساتھی بھی کام آئے۔

اسپین میں اس وقت مشہور کیتھولک حکمراں، چارلس، کا عہد حکومت تھا۔ اسی کی اجازت سے یہ لوگ اس طرف کو آئے تھے۔ بہرحال شکست کھا کر ان کا یہ بیڑا اسپین واپس لوٹ گیا۔ اور ۱۵۲۳ء میں اسپین جا پہنچا۔ چارلس نے ان کی اس نئے ملک کی دریافت پر بڑی ضیافت کی اور جشن منایا۔ اور انھیں انعام واکرام سے بھی نوازا۔ پھر اسی سال چھ جہازوں کا ایک مضبوط بیڑا تیار کروا کر انھیں اسی مہم پر روانہ کر دیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے فلپائن[۵۳] کے چند جزائر پر قبضہ کرنے کے بعد جزائر "مالوکو" کا رخ کیا اور ۱۵۲۵ء

---

۵۱ (Major G. I. Younghusband) کی کتاب (The Philippine and round about) صفحہ (۱) مطبوعہ امریکہ نیویارک ۱۸۹۹ء۔ ۵۲ (Ladroues) کے جزائر بھی بحرالکاہل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۵۳ اپنی اس کتاب کے صفحہ (۱) پر ینگ ہسبینڈ نے لکھا ہے کہ اہل اسپین ہی نے ان جزائر کا نام فلپائن اپنے شہزادہ 'فلپ' کے نام پر رکھا تھا جو چارلس کے مرنے کے بعد اسپین کا بادشاہ بنایا گیا اور جو اسپین کی کیتھولک تاریخ میں بہت بڑی شہرت رکھتا ہے۔

میں کچھ حصّوں پر قابض بھی ہو گئے۔ چونکہ اس نواح میں پرتگالیوں کی عملداری تھی۔ وہ امبون اور تدورے وغیرہ پر پہلے ہی سے قابض تھے۔ لہٰذا انھیں اہلِ اسپین کا آنا اور آنے کے بعد قابض ہو جانا بہت ہی ناگوار گزرا اور یہ اب آپس میں لڑنے لگے اور اس طرح ان میں باہمی آویزش کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا۔

## پرتگالیوں اور اسپینیوں کی باہمی آویزش

چنانچہ یہ دونوں فریق اب آپس میں لڑنے لگے۔ تین سال کے مسلسل محاربات کے بعد ۱۵۲۹ء میں پرتگال کے بادشاہ "جوب سوم" اور اسپین کے شہنشاہ "چارلس پنجم" کے درمیان چند خاص شرائط پر صلح ہو گئی۔ اور یہ قرار پایا کہ ملوکس (مالوکو) کے کچھ حصّہ پر" اہلِ اسپین" بھی قابض رہیں گے۔ اس طرح ۱۵۳۰ء تک اقوام یوروپ میں صرف پرتگالی اور اسپینی ہی وہ قومیں تھیں جو ان جزائر کے کچھ کچھ حصّوں پر قابض رہیں ورنہ بیشتر مقامات پر اس وقت بھی مقامی سلاطین ہی کی عملداریاں قایم تھیں۔ لیکن جیسا کہ پچھلے اوراق میں شاید واضح کیا جا چکا ہے کہ ان سلاطین میں بھی آپس میں اتفاق نہ تھا۔ چونکہ نظامِ حکومت چند خاص خاص ریاستوں کے باہمی وفاق سے قدرے جمہوری تھا۔ لہٰذا وفاق کی ہر رکن ریاست کا حکمراں "رئیس وفاقیہ" بننے کا متمنّی رہتا تھا۔ اور اکثر و بیشتر دوسرے کو ہٹانے کی سازشیں کرتا رہتا تھا۔ اس طرح ان میں آپس میں بھی بڑی آویزش تھی۔ جیسا کہ ان جزائر میں جزیرۂ باچان، جی بولو، ترناتے اور تدورے کے فرماں رواؤں کی باہمی لڑائی اور جنگ و جدال سے ثابت ہے جو پرتگالیوں کے امبون پر قابض ہونے کے وقت برسرِ پیکار تھے۔ ان کی باہمی جنگ و پیکار سے اِن نو وارد اقوام کو اس طرح فائدہ اُٹھانے

کا موقع مل گیا۔ جس طرح ہندوستان کی تاریخ میں دکن کی لڑائیوں میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ملا تھا۔ دکن اور کرناٹک کی لڑائیوں میں جس طرح ہر فریق دوسرے کو زیر کرنے کے لئے اقوامِ مغرب کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ بالکل یہی اس نواح کے حکمرانوں کا حال تھا۔ ان کی آڑ میں یہاں پرتگالی اور اسپینی ایک دوسرے کے خلاف مدتوں لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ جس طرح ہندوستان میں "کلائیو" نے انگریزوں کو فرانسیسیوں کے مقابلہ میں کامیاب کیا اسی طرح ان جزائر میں ۱۵۸۲ء میں پرتگالیوں کو اہلِ اسپین کے مقابلہ میں ان کے اس وقت کے گورنر "ڈی جارج نیز" نے کامیاب کیا۔ اہلِ اسپین ہر مقام پر ہار کر فلپائن کی طرف چلے گئے۔ اور ان جزائر کو بالکل خالی کر گئے۔ چنانچہ اس کے بعد ۵۴ سال تک اہل پرتگال امبون ترناتے اور تدورے وغیرہ پر آزادی کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

## پرتگالیوں کا نظامِ حکومت

ان کے مقبوضات میں اور کلیدی مقام ملکا تھا۔ جس پر وہ کم و بیش ایک سو تیس برس تک حکمراں رہے۔ اور جزائر انڈونیشیا میں ترناتے تدورے۔ امبون، مکاسر اور مالوکو کے بعض اور چھوٹے چھوٹے جزائر اور پھر جزیرۂ تیمور تھا۔ جس کا نصف حصہ اب تک بھی ان کے قبضہ میں ہے چنانچہ ایک مصنف لکھتا ہے کہ "ان جزائر میں انکی حکومت ۱۵۹۵ء تک پورے چوراسی سال قائم رہی۔ اور اس مدت میں ہمیشہ ان کا صدر مقام "ملکا" ہی رہا۔ جہاں جنگِ ملکا کے بعد ان کا پہلا گورنر "البوقرق" آن کر رہا تھا۔ یہ جزائر مختلف اوقات میں مختلف ریذیڈنسیاں (جو آجکل کے صوبہ اور اضلاع کی مانند ہوتی تھیں) بنتے رہے ہیں۔ جنکا افسر اعلیٰ مدتوں امیر البحر ہوتا تھا۔ مگر بعد میں ان سب کو ملا کر الگ صوبہ بھی قرار دیدیا گیا تھا۔ جاوا، سماٹرا، جمبیا اور سیام کے شعرا انکی بابت انکے شعرا ان

حکمرانوں کے ہاں تعینات تھے۔ یہ سفارتیں عام طور پر گورنر خود مقرر کرتا تھا۔ اور گورنر ایک طریقہ سے وزیر مختار ہوتا تھا۔ اور اس کا تقرر شاہِ پرتگال خود کرتا تھا جنگ کرنا اور صلح نامے طے کرنا بھی اس گورنر ہی کے اختیارات میں شامل تھا۔ وہ اپنی قلمرو کے مشتبہ اور مشکوک لوگوں کو سزائے موت بھی دے سکتا تھا۔ جیسا کہ "البوقرق" کے عہد کے مشہور واقعۂ یوتی" کے قتل سے ظاہر ہے جو خود "البوقرق" کا داماد تھا۔ عدالت بھی ان کی اپنی خاص وضع کی ہوتی تھی مگر دیہاتوں کا نظم و نسق مقامی انداز ہی پر جاری تھا۔ افسر اور عمال یا تو سوداگر ہوتے تھے یا پھر مشنری لوگ تھے۔ سرکاری زبان "پرتگالی زبان" تھی۔ جس کا دائرۂ عمل افسروں کے پرتگالی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ محدود رہا۔ البتہ اس کا زیادہ اثر "ملکا" پر پڑا ہے۔ اور مشن کے مدارس میں بھی یہی زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ ملکا، امبون، مکاسر اور ترنات میں مشن کے مدارس کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔ جو عموماً گرجا گھروں میں قائم کئے جاتے تھے۔ اور انہی کے نزدیک بقول مورخین ہسپتال ہوتے تھے۔ مدارس کے استاد اور ہسپتالوں کے طبیب سب پرتگالی مشنری ہوتے تھے۔ اور بقول "جان کرافورڈ"، ملکا میں باقاعدہ البوقرق نے چاندی اور سونے کے سکے بھی رائج کئے تھے۔

**پالیسی** ان کی پالیسی بھی دو خاص امور پر مشتمل تھی۔ یعنی (۱) گرم مصالحہ حاصل کرنا اور تجارت کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا۔ (۲) اور اپنے مشن کے ذریعہ اپنے مذہب (یعنی کیتھولک عیسائیت کو پھیلانا وغیرہ۔

چنانچہ ان کی تجارتی پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے "جان کرافورڈ" لکھتا[له] ہے کہ "جزائر مالوکو میں انھوں نے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی باہمی لڑائیوں میں حصّہ لے کر سارے جزیروں کو برباد کر دیا۔ گرم مصالحہ کی پیداوار جو اک زمانہ میں ان جزیروں کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان بربادیوں کے سبب بہت کم رہ گئی۔ بلکہ قریب قریب ختم ہوگئی۔ وہ پھر سوداگرانِ فارس اور عرب کے بھی سخت دشمن تھے۔ وہ اپنی سازشوں کے ذریعہ اِن سوداگروں کو بھی اکثر سمندروں کے بیچ میں لٹوا دیتے تھے۔ اور ان کا سارا مال و متاع اپنے بحری قزاقوں یا ملّاحوں کے ذریعہ چھنوا کر اپنے وطن پہنچا دیتے تھے۔ ملایا اور ان جزائر (انڈونیشیا) کی ساری گرم مصالحہ کی پیداوار کی خود ہی تجارت کرتے تھے۔ اس طرح ان کی اس اجارہ داری کے سبب دنیا میں ان اشیاء کی گرانی بھی ضرورت سے زیادہ ہوگئی تھی یہی مصنّف آگے چل کر لکھتا ہے کہ ان کا اندازِ حکمرانی بھی دانش مندانہ منصوبوں پر ملوّنہ تھا۔ ان کے افسر بڑے سخت گیر اور متعصب مزاج ہوتے تھے۔ بہرحال جہانتک ان تفصیلات کا تعلق ہے۔ یہ امر صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ان جزائر میں محض گرم مصالحہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے آئے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کو وہ اپنے ملک میں لیجا کر تمام یورپ کی دوسری اقوام کو زیادہ سے زیادہ منافع پر بیچتے تھے۔ ولندیزی، فرانسیسی، اسپینی اور انگریز گرم مصالحہ

---

[له] جان کرافورڈ کی کتاب "ہسٹری آف دی انڈین آرچی پیلیگو" صفحہ ۲۱۶ طبع لندن ۱۸۲۰ء۔

سب انہی کے ذریعہ خریدتے تھے۔ اور اسی طرح عرب اور ہندوستان کے سود اگر بھی انہی سے لین دین کرتے تھے۔ پھر یہ سب تجارت بھی انہی کے جہازوں سے ہوتی تھی۔ ان کا لڑائیاں لڑنا اور سلاطین کو آپس میں لڑوانا یہ سب کچھ ان کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے ہوتا تھا۔

مذہب کو پھیلانا بھی اپنے ہم فکر اور ہم عقیدہ لوگوں کی اکثریت کو بڑھانے کے نظریہ پر مملو تھا تاکہ ان کا استقلال اس نواح میں کسی وقت بھی کسی مقامی انقلاب سے متاثر نہ ہو۔ چنانچہ جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے وہ اس غرض کو پورا کرنے کے لئے ۱۵۲۶ء میں اپنے ملک کے ایک مشہور نصرانی عالم "فرانسس زے ویر (Francis X'vier) کو بھی بمعہ اس کے عملہ کے لائے تھے۔ اور اس کے مذہبی مشن کو جگہ جگہ تبلیغی آسانیاں بہم پہنچا کر متعین کر دیا تھا۔ اور اس کام کے لئے وہ اکثر فوجی قوت بھی استعمال کرتے تھے۔ ان کے مدارس کے اکثر استاد بھی "زے ویر" ہی کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ "فرینول" لکھتا ہے[۵] کہ:۔

پرتگالیوں نے جزائری باشندوں کو تعلیم دینے کے فریب سے عیسائی بنانے کی مہم شروع کی۔ اور اس سلسلہ میں ۱۵۳۶ء میں "ترناتے" کے مقام پر اپنا پہلا گرامر اسکول کھولا اور اس کی توسیع کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب ولندیزی لیٹ مور (Leitmor) "یولیاسرس (Uliassars) اور جنوبی سیرام میں

---

[۵] فرینول کی کتاب "دی نیدر لینڈ سس" صفحہ ( ۱۷ ) مطبوعہ کیمبرج ۱۹۴۴ء ۱۲-۶

پہنچے تو عیسائی لوگ کافی تھے۔ اور فلورس میں ان کے گرجا گھر بھی قائم تھے۔

اسی ذیل میں کرافورڈ[1] لکھتا ہے کہ "ان پرتگالیوں ہی کی مساعی کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف ۴۳ سال کی مختصر سی مدت میں عیسائی مذہب اس نواح میں غیر معمولی طور پر پھیل گیا۔ (مگر یاد رہے کہ ان عیسائی بننے والوں میں زیادہ تر مظاہر پرست لوگ ہوتے تھے)

غالباً اسی نصرانیت کے ذوقِ وارفتگی ہی نے انھیں تندخو، سخت مزاج اور بے رحم بنا دیا تھا۔ وہ مسلمان سلاطین کے خلاف انقلابی سازشیں کرتے تھے اور اپنے راستوں میں مخل ہونے والے علمائے اسلام پر بھی سختیاں کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ان کا طرزِ عمل نہایت جابرانہ تھا۔ چنانچہ خود انہی کے کسی مورخ کے حوالے سے جان کرافورڈ نے یہ فقرہ اپنی اسی کتاب کی جلد سوم کے صفحہ ۴۰۹ پر لکھا ہے کہ۔ "خود پرتگالی مورخین جزائر ملوکس میں اپنے اہلِ وطن کے شرمناک طرزِ عمل پر شرمندہ ہیں۔ اور ان کے ظلم کا اعتراف کرتے ہوئے خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ محض گورنروں اور ان کے ساتھیوں کا قصور تھا ورنہ وہ خود یہ نہیں چاہتے تھے"۔

بہرکیف یہ ان کی داخلی پالیسی کی مختصر تفصیلات تھیں۔ اب ذیل میں ذرا ان کی خارجی پالیسی بھی ملاحظہ ہو۔

## خارجی پالیسی

جیسا کہ پچھلی سطور میں بیان کیا جا چکا ہے ان کی پالیسی خاص طور پر تجارت اور اشاعتِ نصرانیت پر مملو تھی اور قریب قریب یہی پالیسی اندونیشیا میں آنے کے بعد ان کی خارجی پالیسی کا جزوِ اعظم رہی ہے۔

---

[1] جان فورڈ کی کتاب "ہسٹری آف انڈین آرچی پلیگو" صفحہ ۲۹۸ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء۔

انھوں نے مذہب کے پھیلانے میں تجارت کو سہارا بنایا۔ اور اپنے مشنیریوں کو آس پاس کے دوسرے ممالک میں بھی بھجوایا۔ چنانچہ یہ لوگ "زی پنگو"[1] بھی پہنچے اور وہاں کے صوبہ فرانڈو، میں اپنی ایک چھوٹی سی بستی بھی قائم کرکے یہ رہنے لگے۔ مذہب بھی پھیلاتے رہے اور تجارت بھی کرتے رہے۔ چنانچہ جب ولندیزیوں نے انھیں نکال کر بے اقتدار کر دیا تو وہ یا تو جاوا، سماترا اور تیمور میں جا بسے یا پھر "زی پنگو" میں آگئے۔ چنانچہ ۱۶۳۷ء میں جب "زی پنگو" کے حکمراں کو ان ولندیزیو نے ان کے خلاف شکایت کرکے بھڑکایا تو ان کی اور نئے بنائے ہوئے عیسائیوں کی وہاں چالیس ہزار آبادی تھی۔ شاہ "زی پنگو" نے جب ان کا قتل عام شروع کروادیا کیمپر نے لکھا ہے کہ صرف ایک ہی دن میں ان کے ۳۷ ہزار آدمی تہ تیغ کئے گئے تھے۔ اس طرح یہاں سے نکال دئے گئے۔ اور ختم کر دے گئے۔ بات یہ تھی کہ یہاں بھی انھوں نے مقامی باشندوں سے مذہب کے نام پر لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شاہ کے خلاف ایک گروہ آمادۂ بغاوت کر دیا تھا۔ وہ "زی پنگو" (جاپان) کے جزائر پر بھی قابض ہونا چاہتے تھے۔ بہر حال تقریباً ۷۴ برس انھوں نے اس ملک سے تجارت کی۔ وہ یہاں پر اندونیشیا کا گرم مصالحہ مالابار کا قہوہ اور روئی اور اپنے وطن کا اونی سامان لاکر بیچتے تھے۔ چنانچہ "کیمپر" نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب "زی پنگو" (یعنی جاپان میں ان کا عروج تھا۔

---

[1] مارکوپولو کے حوالے سے (Kempar) نے اپنی کتاب "ہسٹری آف جاپان" کے جلد اول صفحہ ۳۱۰ پر لکھا ہے (Zipangu) جاپان کا قدیم سے نام چلا آرہا ہے۔ جو پرتگالیوں کے قتل کے وقت تک قائم رہا۔

تو ان کی تجارت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے یہاں سے اپنے وطن پرتگال ۲۳۵۰ صندوق چاندی سے لدے ہوئے بھجوائے تھے۔ جس کی مجموعی قیمت ۲،۳۵،۰۰،۰۰۰ تا ہل یا ۷،۸۳،۳۳۳½ اسٹرلنگ کے برابر تھی۔ صرف انڈونیشیا کا گرم مصالحہ ہی جو یہاں لاتے تھے۔ اس کی سالانہ قیمت تخمیناً (بقول کیمپفر) ۱۹ ہزار اسٹرلنگ تھی۔ اور سونا جو یہاں سے لے جاتے تھے وہ ½۲ ملین اسٹرلنگ کی قیمت کا ہوتا تھا۔ چنانچہ ۷۴ سال تک وہ اسی طرح انڈونیشیا اور ہندوستان کا مال یہاں بھیجتے رہے۔ اور یہاں کا سونا اپنے وطن کو بھجواتے رہے۔ ۱۶۳۸ء میں جب ان کا یہاں بھی خاتمہ ہو گیا تو ان کی تجارت کا رو بار سب ختم ہو گئے۔

ان تفصیلات کو واضح کرنے کے بعد اب ذیل میں مختصر طور سے اس امر پر بھی روشنی ڈالنا ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ ان "پرتگالیوں" نے انڈونیشیا کے تہذیب و تمدن پر کیا اثر ڈالا۔

## ملک کے تہذیب و تمدن پر اثر

تحت اس خصوصی ذیل میں قارئین یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ پرتگالیوں نے اپنے قریب قریب ایک سو سال کے مختصر سے قیام میں انڈونیشیا کی تہذیب اور تمدن پر بھی بہت اثر چھوڑا ہے۔ مثلاً مکانات کی تعمیر میں یوروپی طرز سب سے پہلے انہی کے ذریعہ اس ملک میں پہنچا۔ یہاں پر یوروپی طرز تعلیم کے بانی بھی وہی لوگ تھے۔ جہاز سازی کے فن میں اور فوجی نقل و حرکت میں بھی ان کے جہازوں اور ان کی فوجوں سے یہاں کے ملاحوں اور حکمرانوں نے بہت کچھ سیکھا۔ (بقول فرنیول (نیدرلینڈس انڈیا صفحہ ۱۷) وہی سب سے پہلے لوگ تھے۔

جنھوں نے اندونیشیا میں تمباکو، مکئی، شبیریں آلو اور رکوکو کی کاشت شروع کرائی۔ اور چائے بھی انہی کی کوششوں سے افراط کے ساتھ پیدا کی جانے لگی۔ حالانکہ ربڑ کی پیداوار اور ناریل کے تیل کی صنعت کا آغاز ولندیزیوں کا کارنامہ ہے۔

ان کے زمانہ میں ولندیزیوں[1] کی طرح خاص خاص اشیاء کی پیداوار کرنے پر کوئی قانونی پابندی نہ تھی۔ ہر آدمی ہر قسم کی کاشت کر سکتا تھا۔ البتہ تجارت نہ کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود "ملکا" کا شہر جو کسی زمانے میں تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ان کی اس خود غرضانہ پالیسی کے سبب اب اتنا بڑا مرکز نہیں رہا تھا۔ ان کے زمانہ میں یوروپین آبادیاں بھی چونکہ زیادہ تر صرف ساحلوں ہی پر تھیں لہذا یوروپین اثر بھی ساحلوں ہی پر پڑا۔ جزائر کے اندرونی حصے اس اثر سے بچے رہے۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی عیسوی تک ان کے بچے کھچے سوداگر بھی سب ساحلوں پر آباد تھے۔ ان کی حدودِ سلطنت کبھی بھی مشرق سے مغرب کی طرف نہ بڑھ سکی۔ نہ جاوا اور سماٹرا میں انھیں کبھی سیاسی فروغ حاصل ہو سکا۔ ۱۵۹۵ء کے بعد ایک دم ان کا زوال ہو گیا۔ اور وہ ان جزائر سے بھاگ گئے جزیرۂ تیمور میں جا چھپے۔ چنانچہ وہاں نصف جزیرہ میں اب بھی آباد ہیں۔

ان کے اس زوال کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:۔

## ان کے اسباب زوال

(۱) ان کے افسران آخری زمانہ میں راشی اور بد دیانت ہو گئے تھے۔

---

[1] جان کرافورڈ کی کتاب "ہسٹری آف انڈین آرچی پلیگو" صفحہ ۲۱۵ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

حتیٰ کہ ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے بھی انھوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے اب ان میں وہ اتفاق، وہ تنظیم اور وہ استقلال بھی باقی نہیں رہا تھا جس کے سبب وہاں کامیاب ہوئے تھے۔

(۲) اس ملک کی گرم اور مرطوب آب وہوا نے بھی انھیں سست اور کاہل بنا دیا تھا۔ اس لئے اب وہ کاروبار حکومت میں بھی زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

(۳) ان کی متعصبانہ و رتجارتی پالیسی نے بھی اہلِ ملک کے علاوہ غیر ملکیوں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا۔ پھر مقامی لوگ بھی ان کے ظلم اور تعصب سے تنگ آگئے تھے۔

(۴) ان کی اوطانی مرکزی حکومت یوروپ کے سیاسی حالات کے باعث اسقدر الجھی ہوئی تھی کہ اب وہ ان کی وقتِ ضرورت پر مدد بھی نہیں کرتی تھی۔ اور نہ ان سے ان کی کارگردگیوں کا مواخذہ کرتی تھی۔

(۵) یوروپ میں ولندیزیوں سے ان کے تعلقات بہت ناخوشگوار ہو گئے تھے جو خود بہت اعلیٰ درجہ کے ملاح تھے۔ لہذا ۱۵۹۵ء میں وہ انڈونیشیا کی طرف آئے اور ان کو ختم کر کے خود ان کے مقامات پر حادی ہوتے چلے گئے تھے۔ جن کی تفصیلات اگلے ابواب میں بیان کی گئی ہیں۔

# باب دوم

## ولندیزیوں[۱] کا حملہ

## اور

## ان کا ابتدائی عہدِ حکومت

اندونیشیا میں پرتگالیوں اور اہلِ اسپین کے بعد آنے والی اور آنے کے بعد حکمراں ہو جانے والی تیسری یوروپی قوم ولندیزی ہیں جن کا عہدِ حکومت اس نواح میں غلبۂ افرنگ کی تاریخ کا ایک ایسا طویل دور ہے جو نہ دیارِ مشرق میں پرتگالیوں کو نصیب ہوا اور

---

[۱] ولندیزیوں سے مراد ہالینڈ کے باشندے ہیں جنھیں انگریزی میں "ڈچ مین" بھی لکھا جاتا ہے۔ مگر اقوامِ مشرق میں خصوصاً اہلِ عرب، اہلِ ایران، اور اہلِ ہند اور اہلِ پاکستان انھیں ولندیزی کہکر پکارتے ہیں۔ ان کا ملک "ہالینڈ" شمالی مغربی یوروپ میں جرمنی اور فرانس کے درمیان واقع ہے۔ ایک چھوٹا سا ملک ہے جسے بشمول علاقۂ جنوبی "نیدرلینڈس" بھی کہتے ہیں۔ اور ان کی مرکزی حکومت "حکومتِ نیدرلینڈس" کہلاتی ہے۔ بہرحال رقبہ کے لحاظ سے یہ ملک ۱۲،۷۰۰ مربع میل ہے اور آبادی سنہ ۱۹۴۰ء کی مردم شماری کے لحاظ سے ۸۷،۰۰۰۰۰ ہے۔ مذہباً پروٹیسٹینٹ نصرانی ہیں۔ یہ لوگ یوروپ کی ابتدائے تاریخ ہی سے اچھے ملاح اور مشہور بحری

نہ انگریز اور فرانسیسی کبھی کسی ملک میں گذار سکے بلکہ ان کے عہد جنگ و جدال اور زمانہ حکومت کا یہ طویل دور جو اُن کے اس ملک میں ۲ رجون ۱۵۹۵ء کو داخل ہونے کے بعد سے شروع ہوکر ۲۷ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو "اندونیشیا" خالی کرنے کے وقت تک جاری رہا ہے مشرق کی تاریخ کا ایک ایسا دور ہے جو خودغرضی، مفاد پرستی، جور و جفا اور سفاکی کے ہزار ہا ایسے خونی واقعات سے پُر ہے جنھیں عدل و انصاف کی دنیا کسی وقت بھی معاف نہیں کرسکتی۔ اور نہ اندونیشیا کے ذی حس باشندے اسے کبھی بھول سکتے ہیں کیونکہ اس تین سو چوّن سال کے طویل زمانہ میں ہولناک لڑائیوں کے علاوہ وہ فتنہ سامانیاں بھی بروئے کار لائی گئیں جن سے خود بخود اور غیر شعوری طور پر اہل ملک جسمانی، دماغی اور روحانی تمام حیثیتوں سے مجروح ہوکر لاغر ہوتے چلے گئے اور بالآخر دوسری جنگِ عظیم کے بعد سنبھل کر انھیں ایک انقلابِ عظیم کے ذریعہ اپنی شوکتِ رفتہ اور عظمتِ گذشتہ کو بحال کرنے کا موقع بڑی مشکلوں سے مل سکا۔ ولندیزیوں کا یہ دورِ حکومت پرتگالیوں کے عہد سے کسی حال میں بھی کم نہ تھا۔ وہ بھی پرتگالیوں کی طرح سوداگری کے بھیس میں آئے تھے، انھوں نے بھی پرتگالیوں کی طرح آہستہ آہستہ اپنے پاؤں جماکر اس دیار کے سلاطینِ اسلام کو اپنی سازشوں سے پامال کیا تھا۔ ان کی دولت پر قبضہ کیا تھا، ان کی املاک کو لوٹا تھا، اور سارے ملک کو خوانِ یغما بناکر بیگانۂ ثروت کردیا تھا۔ جیسا کہ ذیل

---

لوٹیرے مانے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ لوگ اسی طرح سمندروں میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے اور انھیں سیر و سیاحت سے بھی خاص دلچسپی تھی چنانچہ اسی لوٹ مار اور سیر و سیاحت کی بدولت یہ مشرق میں آئے اور صدیوں تک حکمراں بنے رہے۔

(بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد چودہ صفحہ ۱۰، مطبوعہ نیویارک ۱۹۲۶ء)

کے ابواب کی تفصیل سے خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اب پہلے ان کی آمد کے واقعات پر مؤرخانہ روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ بعد کے حالات آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔

## ولندیزیوں کا انڈونیشیا کی طرف آنے کا تاریخی

بہرحال جہاں تک تاریخ راہنمائی کرتی ہے ان کے اس طرف آنے کے بھی چند خاص اور تاریخی اسباب ہیں۔ چنانچہ اس ذیل میں ایک انگریز مؤرخ "جے۔ ایس۔ فرنیول" لکھتا ہے کہ:[1]

"اتفاق ایسا ہوا کہ ۱۵۸۰ء میں بادشاہ فلپ پرتگال کے تخت پر بیٹھا۔ وہ بہت ہی سخت آدمی تھا۔ اس نے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد ہی اپنے ملک میں کاروبار کرنے والے ولندیزی سوداگروں پر اپنے ملک کی بندرگاہیں خصوصاً "لسبن" بند کر دی اور ان کے انخلا کا حکم صادر کر دیا۔ ولندیزی تقریباً ستّر سال سے پرتگال میں تجارت کرتے تھے اور پرتگال کے سرکاری سوداگروں سے ("انڈونیشیا" کا) گرم مصالحہ وغیرہ خریدتے تھے اور پھر شمالی یوروپ میں جاکر اچھی قیمت پر بیچتے تھے۔ اس طرح اس مخصوص تجارت کا سارا منافع پرتگالیوں کی بہ نسبت انہی کو حاصل ہوتا تھا۔ یہ بات شاہِ پرتگال کو ناگوار بلکہ شاق گزری اور اس نے ان کے خلاف امتناعی احکام صادر کر دئے۔ اور ان کی تجارت کو ختم کر دیا۔ مگر باوجود بندش کے بھی وہ بہت عرصہ تک چوربازاری سے کاروبار کرتے رہے۔ بالآخر جب افسرانِ پرتگال نے ان پر تشدّد کرنا اور انھیں جیل بھجوانا شروع کیا تو اب انھیں بھی نئے بندرگاہوں کی فکر ہوئی۔

---

[1] (J. S. Furnivall) کی کتاب (Netherlands India) صفحہ ۲۰ مطبوعہ کیمبرج ۱۹۴۴ء۔

چنانچہ وہ اسی تجسس میں مغرب کی طرف جا نکلے مگر اس طرف انگریزی بحری قزاق ڈریک ہاکنز، اور فروبشر کا سمندروں میں زور تھا اس لئے ناکام ہو کر اب انھوں نے مشرق کا رخ کیا اور بیڑے تیار کر کے رفتہ رفتہ ادہر کو پہنچنا شروع کر دیا۔

## اندونیشیا میں ان کا پہلا قدم

چنانچہ اس نواح میں ان کے پہلی بار وارد ہونے کے سلسلہ میں جان کرافورڈ لکھتا ہے کہ:[۱]

۲ اپریل ۱۵۹۵ء کو ولندیزی ملاحوں کا ایک بیڑا ہالینڈ کی بندرگاہ "ٹیکسل" (Texel) سے چار جہاز لے کر "کارنی لیوز ہاوٹ مین" (Cornelius Houtman) کی سرکردگی میں (جو تجارتی بندش کے بعد کسی وقت پرتگالیوں کی قید میں بھی رہ چکا تھا اور ان سے جزائر کا حال بھی سن چکا تھا) مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ اور دس ماہ کے طویل سفر کے بعد سمندروں سے گزرتا ہوا ۱۲ جون ۱۵۹۵ء کو 'بانتن' کے ساحل پر لنگر انداز ہوا جو اس وقت جاوا کا بہت بڑا تجارتی مرکز اور بندرگاہ تھا اور جزائر کے گرم مصالحہ کو مغرب کی طرف برآمد کرتا تھا" (سلطانِ بانتن کا دارالسلطنت بھی تھا۔ مذہبی اور تمدنی حیثیت سے بھی اس وقت اس شہر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ پوری آبادی مسلمانی تھی۔ پرتگالی بھی اس شہر میں آبسے تھے۔

بہرحال وہ جاوا میں 'بانتن' ہوتا ہوا اور ساحل کے پاس پاس گھومتا ہوا۔ معلومات کا ایک کافی سلسلہ بہم پہنچا کر ۱۵۹۷ء میں جاوا کے جنوب سے گزر کر وطن کو واپس لوٹ گیا۔ اور وہاں پہنچکر اپنے سوداگرانِ وطن کو اس ملک کی خوشحالی اور

---

[۱] جان کرافورڈ کی کتاب (History of Indian Archipelago) صفحہ ۴۱۲ جلد دوم مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء۔

فارغ البالی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا چنانچہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی پانچ برس کے مختصر سے وقفہ میں "ہالینڈ" میں چھ تجارتی کمپنیاں قائم ہوگئیں جن کا مقصد انفرادی طور پر مشرق کے ساتھ تجارت کرنا اور وہاں کی دولت و ثروت سے بہرہ مند ہونا تھا۔ چنانچہ ان کمپنیوں نے اپنے جہازوں، نمائندوں، سوداگروں کارپردازان کمپنی کو آہستہ آہستہ اس طرف کو بھیجنا شروع کر دیا اور اس طرح کل چودہ بیڑے یکے بعد دیگرے روانہ کئے جو مجموعی طور سے ۶۵ جہازوں پر مشتمل تھے۔ اس آمد و رفت نے ان کو ملک اور اہل ملک کے ساتھ تعارف کرانے کے علاوہ یہاں پر جمنے کے سامان بھی بہم پہنچا دیئے اور رفتہ رفتہ وہ اس ملک میں جمتے چلے گئے[۱]

## انڈونیشیا میں ولندیزیوں کی دیگر اقوام کے ساتھ چشمک

اس طرح مشرق میں انھیں تجارت کو جمانے کا موقع مل گیا مگر حالات کچھ اسقدر پیچیدہ تھے کہ انھیں اپنے جمنے کے لئے بڑے بڑے فریب اور سیاسی چالیں چلنی پڑیں۔ کیونکہ اس وقت ان کے مقابلہ کے لئے اک طرف تو جاوا کے سلاطین ماترم کی عظیم الشان سلطنت تھی اور دوسری طرف یورپ کی

[۱] "مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان سے پہلے انگریز بھی اس نواح میں آچکے تھے۔ چنانچہ سب پہلا انگریز سر فرانسس ڈریک تھا۔ جو ۱۵۷۹ء میں اس طرف جہاز لے کر آیا تھا پھر ۱۶۰۲ء میں سر جیمس لنکاسٹر تھا جو جزیرۂ سماترا کے مغربی ساحل پر آچیہ پہنچا تھا اسی طرح ۱۶۰۴ء میں "سر سری ہڈلٹن" کی سرکردگی میں بھی دوسرے تجارتی وفود آئے تھے۔ اور انھوں نے سلاطین آچیہ سے ملاقاتیں کیں تھیں اور اپنی قومی تجارت کو قائم کرنے کے سلسلہ میں بات چیت بھی کی تھی۔

(بحوالہ تاریخ جان کرفورڈ)

خود ان کی حریف قومیں تھیں جو یا تو پہلے ہی سے اس ملک میں اپنا قدم جما چکی تھیں یا پھر نئے سرے سے اپنے جماؤ کے لئے متفکر تھیں۔ پہلے سے جمی ہوئی قوموں میں یا تو پرتگالی تھے یا پھر اہلِ اسپین تھے۔ اور نئے سرے سے جمنے والوں میں انگریز اور فرانسیسی تھے۔ جن میں خود بھی مدتوں سے باہمی آویزش تھی اور جو سالہا سال سے گرم مصالحہ کی تجارت کرنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے ۱۵۹۹ء میں اپنی تجارتی کمپنی قائم کی اور اس کے دو سال بعد ہی ۱۶۰۱ء میں فرانسیسی بھی ان جزائر میں آن پہنچے۔ اور تین سال تک وہ اِدھر اُدھر گلگشت کرتے پھرے حتیٰ کہ ۱۶۰۴ء میں انھوں نے بھی جزیرہ جاوا کے مغربی شہر 'بانتن' میں اپنا تجارتی اڈّا قائم کر لیا اور اس طرح مستقل طور پر ان سب یورپین قوموں میں باہمی طور پر مناقشہ شروع ہو گیا مگر چونکہ اور دوسری یورپین اقوام کا سلاطین کے دربار میں نسبتاً رسوخ زیادہ تھا اس لئے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی فرانسیسیوں کو تو جاوا سے بے نیل و مرام لوٹنا پڑا البتہ پرتگالی انگریز اور ولندیزی باقی رہ گئے جن میں آگے چل کر خوب مقابلہ رہا

## ہالینڈ میں ولندیزی ایسٹ انڈین کمپنی کا قیام

اور کچھ عرصہ کے بعد وہ جزائر مالوکو کے مقامات 'امبون' اور 'ترناتے' میں بھی جا بسے۔ لیکن اس وقت تک ان کی حالت زیادہ اچھی نہ تھی کیونکہ اول تو خود یوروپ میں 'ہالینڈ' مختلف سیاسی پیچیدگیوں کے باعث خستہ حال تھا، اور ادھر دوسری طرف مشرق میں دیگر اقوامِ یوروپ کی معاندانہ چشمک نے بھی انھیں آگے بڑھنے میں کافی مزاحمت کی چنانچہ اسی دور میں ہالینڈ کے ایک مشہور سیاستدان اور با اثر رہنما

"اولڈن بارن فیلڈٹ" (Oldenbarnveldt) نے قومی تنظیم کو فروغ دینے کے لئے اپنے وطن کے سوداگروں کو یکجا کرنے کی جدوجہد شروع کی اور سب کی رضامندی سے بالآخر ۲۰ مارچ ۱۶۰۲ء میں مشرق سے باقاعدہ تجارت کرنے کے لئے چھوٹی بڑی تمام کمپنیوں کو ملا کر ایک بڑی کمپنی قایم کرادی اور اسکا نام "ڈچ ایسٹ انڈین کمپنی[۵۱]" رکھا۔ خود ولندیزی مورخین کا بیان ہے کہ یہ کمپنی چھ چھوٹی بڑی کمپنیوں کے انضمام سے معرض وجود میں لائی گئی تھی اور اسکا کل تجارتی سرمایہ ۶۴۲۴۵۸۸ فلورنس تھا۔ جس میں ہالینڈ کی شاہی پارلیمنٹ (جو اسٹیٹ جنرل کہلاتی تھی) نے بھی خزانۂ شاہی سے ۲۵۰۰۰۰ فلورنس کا سرمایہ لگایا تھا۔ اور ایک منشورِ عمومی کی رو سے ۲۱ سال تک تجارت کرنے کا اس کمپنی کو اجارہ بھی دیدیا تھا۔ اور اس کی دیکھ بھال کے لئے سترہ افراد پر مشتمل ایک مجلس بھی قایم کردی تھی جو "ہیرین" (Heeren) کہلاتی تھی۔ یہی مجلس ملکِ ہالینڈ میں اس کمپنی کی "مجلسِ منتظمہ" تھی اور اپنی ذمہ داری کی حیثیت سے اسٹیٹ جنرل اور اپنے خود کے دستور ساز ایوان کے سامنے جواب دہ تھی۔ لیکن کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد ایک باقاعدہ دیوان (سکریٹریٹ) کی صورت میں منتقل کردی گئی۔ حتیٰ کہ اس نے ۱۶۰۹ء میں باقاعدہ مشرق کی تجارتی آبادیوں میں حکومت کرنے کا مجاز

---

[۵۱] یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت انگلستان میں بھی انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو قائم ہوئے صرف ایک ہی برس گزرا تھا اور وہاں ٹیوڈر خاندان کی مشہور ملکہ ایلزبیتھ حکمراں تھی۔ جبکہ ہندوستان میں مغل خاندان کا مشہور حکمراں شہنشاہ "اکبر" فرماں روا تھا جس کا سالِ وفات ۱۶۰۵ء ہے۔

بھی اپنی مرکزی حکومت ہالینڈ سے حاصل کر لیا تھا۔ اور پھر اس غرض کو پورا کرنے کے لئے گورنر جنرل اور اس کے معاون مشیر یا کونسلر کے منصب کا بارعب نام بھی حکومت سے منظور کرا لیا تھا۔ پھر اسکا حلقۂ عمل کچھ اسقدر بڑھا کہ بالآخر ۱۷۴۹ء میں تقریباً ایک سو سال کے بعد اس تنظیم نے "اسٹیٹ جنرل" کی بندشوں سے بھی آزادی حاصل کر لی۔

## کمپنی کے سوداگروں کا ابتدائی دورِ سیاست

ابتدا میں اس کمپنی کے نمائندوں نے اپنے قدم مضبوط کرنے کے لئے پہلے آچیہ (واقع مغربی سماترا) کے سلطان سے دوستانہ تعلقات قائم کئے اور پھر آہستہ آہستہ تمام جزیرۂ سماترا میں اپنا اثر پھیلا لیا۔ اور مختلف مقامات پر اپنی فیکٹریاں (جن سے مراد انکی تجارتی کوٹھیاں اور حلقۂ آبادی ہے) قائم کر لیں یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے استحکامات کے بعد "بندا" جزائر کے مقامی بیڑوں کو بھی شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اس طرح گویا اندونیشیا میں یہ ان کا پہلا سیاسی اقدام تھا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے پرتگال سے اپنی قدیم دشمنی کا انتقام لینے کے لئے جزائر "مالوکو" کا رُخ کیا۔ اس وقت "مالوکو" جزائر پر پرتگالی چھائے ہوئے تھے۔ وہاں ان کی باقاعدہ عملداری تھی، اور بڑا استحکام تھا۔ چنانچہ بعض سلاطین اور اُمراء کو اپنی طرف ملا کر ان پرتگالیوں کے خلاف مہم شروع کر دی پرتگالی اس وقت بدنام تھے۔ لوگ ان کی مذہبی پالیسی اور ظلم و تشدد کے باعث بڑے تنگ آئے ہوئے تھے۔ پھر چونکہ ان پرتگالیوں نے بعض سلاطین کے ساتھ بھی بڑا ظالمانہ سلوک کیا تھا اس لئے بھی لوگ دل سے ان کا زوال چاہتے تھے۔ بالآخر ان تمام اسباب و عوامل سے بہرہ مند ہو کر ولندیزیوں نے پے در پے بڑی بڑی خطرناک چالیں چلیں حتیٰ کہ ۱۶۰۵ء میں وہ پرتگالیوں کو جزیرۂ "امبوئنا یا امبون" سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے

انھیں ترناتے سے بھی نکال دیا۔ اور اس طرح پرتگالیوں کا تقریباً سو سال کا جما جمایا کھیل آناً فاناً میں بگڑ گیا حالانکہ اب تک ان کی حیثیت متحکمانہ تھی مگر اب محض مستأجرانہ ہو کر رہ گئی وہ اب صرف یا تو جزیرۂ جاوا کے کچھ حصّوں میں تجارت کرتے تھے یا پھر جزیرۂ تیمور میں جا پہنچے تھے۔ امبون اور ترناتے ان سے بالکل خالی ہو چکا تھا اور ان کی جگہ ولندیزیوں کی آبادیاں قائم ہو چکی تھیں۔ اس طرح 'انڈونیشیا' کی نواح میں ان کی مستقل قرارگاہ جزائر 'مالوکو' میں قائم ہو گئیں۔

سنہ ۱۶۰۴ء میں انگریزی بحری ماہر 'مڈلٹن' بھی امبون اور بندا جزائر میں انگریزی تجارت قائم کر چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا اثر جزیرہ بورنیو کے علاقہ 'سکادانا' میں بھی قائم ہو چکا تھا۔ (سکادانا اس وقت ایک مسلمان سلطان کے زیر نگیں تھا جس سے انگریزوں نے مراعات حاصل کر لیں تھیں) مگر ولندیزیوں نے ان کے خلاف باقاعدہ سازشیں کرا کے دس سال تک لڑائیاں لڑیں اور بالآخر 'ٹیکو' کے مقام پر انھیں مستقلاً ہرا کر 'مکاسر' کا علاقہ بھی حاصل کر لیا۔ اور پھر سنہ ۱۶۰۸ء میں 'جوہور' (واقع جزیرۂ سماٹرا) کے سلطان کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات قائم کر کے اپنی پوزیشن کو اور مضبوط کر لیا، شروع شروع میں 'ان کے معمولی حاکم، مقرر ہوتے رہے مگر جب سیاسیات کا سلسلہ کچھ اور روبہ ترقی ہوا تو بالآخر کمپنی کے ڈائریکٹران نے سنہ ۱۶۱۰ء میں 'پیٹر بوتھ' (Pieter Both) کو اپنا سب سے پہلا گورنر جنرل مقرر کر کے بھیجا۔ یہ گورنر سنہ ۱۶۱۴ء تک برقرار رہا اس کے بعد "خیرت ری رلینسٹ" (Gerlt Reijnst) گورنر مقرر ہو کر آیا جو صرف ایک ہی سال کے بعد معزول کر دیا گیا اس کے بعد سنہ ۱۶۱۵ء میں "لارنیس ریال" (Laurens Reaal) گورنر بنا کر بھیجا گیا جو سنہ ۱۶۱۹ء تک کمپنی کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا رہا یہاں تک کہ

پھر جان پیٹرز کوئن، (John Pieters Coen) گورنر جنرل مقرر ہو کر آیا جو اس نواح میں ولندیزیوں کا باقاعدہ طور پر سب سے پہلا گورنر جنرل اور با اختیار حاکم مانا جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے مقرر ہو کر آنے والے تینوں گورنر محض گشتی گورنر جنرل کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا اصلی صدر مقام بھی جزیرۂ امبون، میں تھا۔ بانتن، اور دیگر مقامات صرف تجارتی مراکز تھے۔ ان کا کام بھی محض تجارت کی دیکھ بھال کرنا۔ مدارس اور گرجا گھروں کو چلانا، مقامی سلاطین سے زیادہ سے زیادہ تجارتی مراعات حاصل کرنا اور دیگر اقوامِ غرب کے اثرات کو اپنی حکمت عملی سے زائل کرنا وغیرہ تھا۔ وہ اک طرح سے محض ایجنٹ کی حیثیت رکھتے تھے حکمراں نہ تھے، نہ ان کے پاس کوئی باقاعدہ بڑی اسٹیٹ تھی اور نہ ان کے تعزیری اختیارات تھے۔ ہر معاملہ ہالینڈ کی تجارتی مجلس سے دریافت کرنے کے بعد طے کیا جاتا تھا۔

## ولندیزیوں کا ابتدائی طرزِ عمل

اب جہاں تک ان کے ابتدائی طرزِ عمل کا تعلق ہے وہ بھی نہایت ملتجیانہ تھا چنانچہ ہملٹن لکھتا ہے کہ[1]: "جب انگریز اور ولندیزی پہلی بار ان جزائر میں وارد ہوئے تو ان کی کیفیت تاجرانہ تھی یا پھر بحری قزاقوں کے مانند تھی وہ ایک نئے ملک میں آئے تھے اس لئے ان کا برتاؤ بھی شروع میں اہلِ ملک کے ساتھ پرتگالیوں اور اسپینیوں کی بہ نسبت زیادہ تملق اور لجاجت پر مبنی تھا۔ مگر انھوں نے رفتہ رفتہ اپنی شہرت پر خود ہی بٹہ لگا دیا وہ تجارت سے ہٹ کر سیاست میں اتر آئے اور تشدد کی پالیسی برتنے لگے چنانچہ ان کے وہ تمام

---

۱؎ (New Accounts of the East indies). جلد دوم صفحہ ۱۴۵ مصنفہ ہملٹن مطبوعہ لندن سنہ ۱۷۱۰ء۔

تجارتی اور صنعتی مستقر جو مقامی دیسی ریاستوں کے مختلف حلقوں میں قائم تھے قلعوں میں بدلتے چلے گئے۔ اور دیسی حکومتوں کے لئے ناسور چشم بن گئے حتیٰ کہ کچھ زمانوں کے بعد ان کے وہ عہدنامے بھی جو مقامی حکومتوں سے طے پاتے تھے سب پیداوار سے متمتع ہونے کی کیفیت پر مملو ہوتے تھے پھر ان میں بھی دھونس اور دھمکی کو بڑا دخل تھا اس کے بعد ہی انھوں نے آپس میں لڑتے لڑتے مقامی حکمرانوں سے بھی تبر دآزمائی شروع کردی۔ اور ان کی بڑی بڑی بستیوں کو بربادیوں کا نمونہ بنادیا۔ اور باشندوں کو بھی غلام بنانے لگے تاکہ اپنی مزروعہ زمینوں میں ان سے مشقت کے مشکل کام لے سکیں اس طرح تھوڑے عرصہ کے بعد ہی ان تمام اہلِ غرب نے مقامی حکمرانوں کا اعتبار کھودیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خلاف ایک عام نفرت اور ایک عام احساسِ دل آزاری پیدا ہوتا چلا گیا۔ انگریز ولندیزیوں کے فریق تھے اور ولندیزی انگریزوں کے پھر یہ دونوں پرتگالیوں اور اسپینیوں کے اور رچاروں ان سوداگروں کے جو ایشیا ر کے مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ ان کے جہاز لوٹ لیتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرادیتے تھے تاکہ وہ تجارت میں کبھی بھی ان کے مقابلہ پر نہ آسکیں اور ان کی اجارہ داری میں بھی کوئی خلل نہ پڑ سکے۔

## وقت کی مقامی سیاسی کیفیت

ان کے اسی ابتدائی طرزِ عمل پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے "جان کرافورڈ" لکھتا ہے کہ[1]

"۱۵۹۵ء میں ان نووارد ان غرب نے بانتن میں پہنچکر کچھ زمانہ کے قیام کے بعد ہی اہل ملک کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کردیں چنانچہ جاوا میں "سرابایا" (SURABAJA) کے مقام پر ایک ایسا ہولناک قتل و غارت کیا کہ جس کی کوئی حد نہیں اور

[1] جان کرافورڈ کی "ہسٹری آف انڈین آرچی پلیگو" جلد سوم صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء۔

اسی طرح پھر مدورا میں بھی اسی قسم کی حرکتیں سرزد کیں تھی کہ وہاں کے حکمراں اور اس کے خاندان کو دوستی کا فریب دے کر اور اپنے جہاز وغیرہ دکھلانے کے بہانے سے مدعو کر کے مروا دیا۔ ان کا ابتدائی رہنما "ہاوٹ مین" بھی نہایت ہی خطرناک قسم کا بحری قزاق تھا وہ جس طرف بھی پہنچتا تھا اسی طرح سیدھے سادھے اہل انڈونیشیا کو دغا اور فریب دیتا تھا۔

بہرحال اس زمانہ میں سیاست کا سب سے بڑا مرکز جزیرۂ جاوا تھا جہاں ہارنے والی اور جیتنے والی تمام مغربی نووارد قومیں اپنا اثر و استیلا قائم کرنے کی فکر میں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اس جزیرہ کی مقامی سیاست کی یہ کیفیت تھی کہ ایک طرف بانتن میں اسلامی سلطنت تھی اور یہاں کا حکمراں "سلطان بانتن" کہلاتا تھا دوسری طرف ماترم کی مسلم سلطنت تھی جس کے حیطہ اختیار میں قریب قریب جاوا کا ماسوا تھوڑے علاقہ کے سب رقبہ شامل تھا، جکارتا اور اسی طرح کے دوسرے چھوٹے چھوٹے امرا برسر اقتدار تھے مالوکو میں پرتگالی اور سماترا اور بورنیو میں جدا جدا چھوٹے چھوٹے سلاطین تھے۔ ان کے علاوہ جزائر میں بھی چھوٹے چھوٹے انڈونیشی قبائلی سردار یا پرانے جرنلوں کے خاندان برسر اختیار تھے۔ اس طرح سارا ملک چھوٹی چھوٹی قوتوں میں منقسم تھا، جو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتی رہتی تھیں اور آپس میں لڑنے بھڑنے کے لئے ان یورپینوں سے بھی مدد لیتی رہتی تھیں اس طرح ان اہلِ مغرب کو جمنے میں بڑی مدد ملی۔ پرتگالی بھی اسی طرح جمے تھے اور اب ولندیزی بھی اسی طرح جمنے لگے۔

## سلاطین کے ساتھ ان کی لڑائیاں

بہرحال جیسا کہ پچھلی سطور میں گزر چکا ہے اس وقت ان کا مطمحِ نظر محض

سوداگری اور تجارت تھا۔ یعنی مشرق کو لوٹنا اور وہاں کی انتشار پذیر سیاست سے ناجائز فائدہ اٹھانا چنانچہ انھوں نے جو جو طریقے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے سلسلہ میں اختیار کئے انھیں کسی طرح بھی تجارت کے اصول سے معنون نہیں کیا جاسکتا بلکہ صحیح معنیٰ میں وہ ایک قسم کی لوٹ تھی اور اہل ملک کو غلام بنانے کی ایک بڑی سیاسی تدبیر تھی۔ چنانچہ کرافورڈ لکھتا ہے کہ: —

"۱۵۹۵ء سے ۱۶۱۰ء تک یعنی تقریباً پندرہ سال ولندیزی شہر جپارا اور بانتن میں سلطان کی اجازت سے نہایت ہی مستدانہ طور پر تجارت کرتے رہے مگر پھر انھوں نے رئیس 'جکارتا' سے اجازت لے کر وہاں بھی اپنی تجارتی فیکٹریاں (یعنی قلعہ بند آبادیاں) قائم کرلیں چنانچہ ۱۶۱۸ء میں جب 'کون' (Coen) گورنر جنرل مقرر ہوکر آیا تو ان کا سلطانِ بانتن کے ساتھ زبردست جھگڑا چل رہا تھا۔ لہذا یہ لوگ 'بانتن' سے نکل کر 'جکارتا' کے تجارتی مستقر میں منتقل ہوگئے جو اس وقت ایک بہت چھوٹی بستی تھا۔"

بہرحال اس قصبہ کے قریب پہنچکر انھوں نے بلا رئیسِ علاقہ کی اجازت کے اپنے استحکامات شروع کردئے۔ اس سے وہاں کے رئیس کو بڑی تشویش ہوئی چنانچہ وہ بھی مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ اور اس طرح ان میں آپس میں لڑائی شروع ہوگئی۔ چونکہ اس وقت انگریز بھی ان کے حریف تھے اور ادہر سلطانِ بانتن کو بھی اپنی ریشہ دوانیوں کے سبب اپنا دشمن بنالیا تھا چنانچہ وہ سب متحد ہوکر ان کے خلاف ہوکر رئیسِ جکارتا کے ساتھ ہوگئے اور لڑائی کا آغاز ہوگیا۔ یہ لڑائی ولندیزیوں کے ساتھ بہت خوفناک لڑائی تھی جو "جنگِ جکارتا" کے عنوان سے تاریخ

میں مشہور ہے۔ اس لڑائی میں اتحادی تونیں سلطان بانتن رئیس جاکرتا، سلطان پچیریبون، اور ان کے حلیف انگریز سوداگر تھے۔ کون، جو ولندیزیوں کا اس وقت گورنر جنرل تھا فوج لے کر مقابلہ پہ آیا مگر ہار گیا اور جزیرۂ امبون میں چلا گیا۔ اتفاق سے مال غنیمت کی تقسیم میں سلطان بانتن اور رئیس جکارتا کے درمیان شقاق پیدا ہوگیا چنانچہ سلطان بانتن کے دو ہزار سپاہیوں نے مدد کے بہانہ سے آگے بڑھ کر سلطان بانتن کے ہاتھ سے ہتھیار چھین لئے اور چھرا گھونپ کر اسے ختم کر دیا۔ اس طرح سلطان مارا گیا۔ اس کے مارے جانے کے فوراً بعد ہی اس کی ساری فوج بانتن کی فوج سے لپٹ پڑی اور آپس میں لڑ بھڑ کر ختم ہوگئیں۔ بھاگے ہوئے ولندیزی یہ حال دیکھکر واپس لوٹ آئے۔ چنانچہ کون، جو ولندیزیوں کے مضبوط مستقر امبون میں چلا گیا تھا ۲۹ مئی ۱۶۱۹ء کو میدان صاف دیکھکر واپس جکارتا، چلا آیا اور اپنے کھوئے ہوئے حلقہ پر پھر قابض ہوگیا اور قابض ہونے کے بعد پھر اپنے قلعہ کا استحکام کرنے لگ گیا۔ شہر کے آدمی ان کے خوف سے بھاگ نکلے اور رہے سہے قتل کر دئے گئے۔

## شہر بٹاویہ کا سنگِ بنیاد

مورخین نے اس باب میں لکھا ہے کہ ولندیزیوں نے پھر وہ مظالم ڈھائے کہ ان کے بیان سے انسان کا دل لرز جاتا ہے۔ مثلاً پورے جکارتا کے قصبہ میں تین دن تک بے دریغ خوب لوٹ مار کی۔ کھیتوں کو جلا دیا، مکانات کو تاراج کر دیا، مسجدیں منہدم کر دیں، شاہی خاندان کے لوگ کچھ تو قتل عام کے ہنگامہ میں کام آگئے اور کچھ روپوش ہوکر دوسرے علاقوں میں نکل گئے جہاں بقول کرافورڈ انھوں نے پھر ماہی گیری کا پیشہ

اختیار کرلیا۔ جب اس طرح قصبہ اہلِ ملک سے خالی ہوگیا تو" ولندیزی گورنر جنرل کوئن" نے کچھ ہی دن بعد اپنے اہل قوم (یعنی ولندیزیوں) کی ایک جدید بستی اسی برباد شدہ قصبہ پر بسادی اور اسکا نام بجائے جکارتا کے "بٹاویہ" رکھا۔ یہاں یورپ کے شہری نمونوں پر اپنے یورپی سوداگروں کے لئے مکانات تعمیر کئے، اپنے دفتر کھولے اور اس شہر کو اپنا پہلا اور آخری دارالحکومت قرار دیا۔ اور خود (یعنی کوئن) ہی[1] پہلا باقاعدہ گورنر جنرل مقرر ہوا اور باقاعدہ ولندیزیوں کے استحکامات میں لگ گیا۔

## سلطان ماترم سے جنگ

چونکہ سلطان بانتن اور جکارتا شکست کھا چکے تھے اور ان کا خطرہ ولندیزیوں کے سر سے ٹل چکا تھا لہذا "کوئن"،

[1] یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کوئن (Coen) ہی ان جزائر کے ملک اندونیشیا میں ولندیزیوں کا پہلا باقاعدہ گورنر جنرل بلکہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قائم کرنے والے پہلے گورنر جنرل کلائیو کی طرح ان کی حکومت کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی کلائیو کی طرح ایک معمولی سے گھرانہ کا آدمی تھا اور شروع شروع میں ہالینڈ میں کمپنی کا ایک معمولی سا کلرک تھا۔ کلرک ہی سے ترقی پاکر وہ سکریٹری اور پھر سکریٹری سے عروج کرکے گورنر جنرل بنا تھا۔ وہ دوبار اس ملک میں گورنر جنرل رہا ہے۔ پہلی بار ۱۶۲۳ء میں اسے واپس بلالیا گیا اور اس کی جگہ "پیرٹ کارپنیٹر" کو گورنر جنرل بناکر بھیجا گیا جو ۱۶۲۷ء تک اس عہدہ پر رہا تھا۔ چنانچہ ہالینڈ پہنچکر "کوئن" ہی نے اپنی سفارش سے کمپنی کے منشور عمومی کی مدت میں ۱۶۴۴ء تک کی توسیع کرائی۔ بہرحال وہ پھر ۱۶۲۷ء میں دوبارہ گورنر جنرل بناکر بھیجا گیا مگر چونکہ اس کی صحت بہت خراب ہوچکی تھی۔ لہذا وہ ۱۶۲۹ء میں مرگیا۔ اس کی تجہیز و تکفین بھی اسی شہر "بٹاویہ" میں کی گئی وہ نہایت ہی چالاک، چال باز اور متفنی قسم کا انسان تھا۔ ولندیزی اسی کی کارستانیوں کی بدولت "اندونیشیا" میں پہلی بار اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی قوم کا نہایت ہی مخلص کارندہ تھا۔ اس نے اپنے اہل وطن کو "اندونیشیا" میں حکمراں کرنے کا ایک بڑا اور تاریخی کارنامہ انجام دیا تھا۔

نے اب ملک کے سب سے بڑے حکمراں سلطان ماترم کے خلاف بھی سازشوں کا جال پھیلانا شروع کیا۔ کیونکہ وہی (سلطان ماترم) اس وقت پورے جاوا میں سب سے بڑا حکمراں تھا (یعنی سلطان اگنگ، (یعنی سلطان اعظم) کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی بڑی تزک وشان اور کروفر تھی۔ بہرحال وہ بھی (کوئن) کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے چونک پڑا اور بالآخر ان ولندیزیوں کو ملک سے نکالنے کی طرف متوجہ ہوا جس کا آخری نتیجہ لڑائی تھا۔ یہ لڑائی انڈونیشیا کی ولندیزی تاریخ میں نہایت ہی اہم لڑائی سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اسی لڑائی سے ملک کے اس وقت کے سیاسی اور اقتصادی حالات پر بڑا اثر پڑا تھا۔

بہرحال واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان نے اس نئے شہر بٹاویہ کو بلا کسی مقاتلہ کے فتح کرنے کے خیال سے اپنے سپہ سالار (باہوراکسُو) کی ماتحتی میں چھ سو جنگ آزما اور منتخب نوجوان پچاس کشتیوں میں بٹھا کر روانہ کئے اور ولندیزی حلقہ میں یہ مشہور کرا دیا کہ وہ ولندیزی سپاہ کے لئے سپلائی بہم پہنچا رہے ہیں۔ ولندیزی اگرچہ بڑے چالاک تھے مگر صورتِ حال سے ناواقف ہونے کے باعث چپ چاپ پڑے ہوئے سپلائی کا انتظار دیکھتے رہے۔ ابھی شہر بٹاویہ کو بسے ہوئے صرف تین ماہ ہی گزرے تھے۔ قلعہ بھی نامکمل تھا۔ بہرکیف (۱۵ اگست ۱۶۱۹ء کو) سلطان کی فوج شہر میں جا پہنچی اور پہنچنے کے ساتھ ہی دشمن سے غٹ پٹ ہوگئی۔ ولندیزی بھی لڑنے کے لئے ہتھیار کس کر میدان میں نکل آئے اور نومبر تک سخت ترین معرکہ رہا۔ سلطان کی فوج بھی قلعہ کا محاصرہ کئے پڑی رہی اور بالآخر اس کو مسمار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں طرفین کے اسی ہزار آدمی کام آئے ولندیزیوں کی فوج میں زیادہ تر ہندوستان سے لائے ہوئے سپاہی تھے جو (کیونکہ اس وقت ولندیزی ہندوستان کے ساحل پر سورت کے بندرگاہ پر بھی قابض تھے)

اسی طرح ایک مدت تک سلطان اگنگ کے خلاف لڑائے جاتے رہے۔ مگر جیسا کہ پچھلی فصل کے ابواب میں لکھا جاچکا ہے سلطان اسقدر مشہور اور عالی حوصلہ حکمراں تھا کہ جبتک زندہ رہا ولندیزی جزیرۂ جاوا میں اپنا اقتدار جمانے میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ ہمیشہ مہاجنوں کی طرح محض خوشامد درآمد سے اپنا کام چلاتے رہے۔ ۱۶۴۵ء میں اتفاق سے سلطان کا انتقال ہوگیا اور جاوا کی سیاست میں بھی اک دم انقلاب آگیا، بلکہ تہذیب وتمدن کا مزاج وکردار بھی بدل گیا۔ یعنی یہ کہ سلطان جس پایہ کا صاحب ہیبت اور صاحب سیاست حکمراں تھا اسی پایہ کا وہ ایک مسلمان اور دلدادۂ اسلام صاحب اختیار بھی تھا، اس نے اپنے طویل عہد حکومت میں انڈونیشیا کی قدیم قومی روایت یعنی ایک قوم، ایک ملک اور ایک مذہب کی سعی میں تمام جزائر کو متحد کرنے کی بھی کوشش کی تھی، وہ پورے ملک کا ایک مسلم تمدن کے نظریہ کا بھی قایل تھا چنانچہ اس کے عہد تک یہاں کا تمدن بھی "مسلم انڈونیشی تمدن" کہا جاسکتا ہے لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی اور اس طرح اسکا خیال مثال بنتے بنتے رہ گیا۔ ۱۶۴۵ء میں اس کی اچانک موت سے پھر وہ افراتفری پیدا پیدا ہوئی کہ مدتوں ملک نہ سنبھل سکا۔ بلکہ نااہل اور کمزور جانشینوں کے باعث ایک طرف ولندیزیوں کا عمل دخل بڑھا اور دوسری طرف تمدن میں بھی قدیم قومیت کا وہ رنگ پیدا ہوتا چلا گیا جس کی اساس گذری ہوئی ہندو تہذیب کے بعض نظریات پر تھی مثلاً فلسفہ کے قدیم انداز کی تجدید، ثقافت، نام کار کھنا اور بعض بعض قسم کے غیر اسلامی رسم ورواج وغیرہ۔

چونکہ کتاب کا موضوع تمدن کی تاریخ ہے اس لئے سلاطین، اور راجاؤں اور ولندیزی گورنر جنرلوں کے ان حالات کی تفصیل بیان کرنا جو ان کی سیرت ذات، کریکٹر اور کردار سے متعلق ہیں، دوراز کار ہوگا کیونکہ یہ سب امور "سلاطین اور حکمرانوں" کی تاریخ کا موضوع ہیں، لہذا اب اس مقام سے ان تمام امور کو حذف کرتے ہوئے صرف ان واقعات کا

اجمال بیان کیا جاتا ہے جنھوں نے امتدادِ تاریخ میں اس ملک کے تمدن (یعنی سیاست، ثقافت، اخلاق، کردار، مذہب، معاشیات اور علم وفن) پر اثر ڈالا ہے۔

چونکہ سلطان اگنگ کی وفات کے بعد سے ولندیزی اثر و اقتدار کا آغاز ہوتا ہے اور تہذیب و تمدن پر ایک نئے طور سے اثر پذیری کی کیفیت شروع ہوتی ہے لہذا واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے اور تاریخی پہلوؤں کو قابلِ فہم بنانے کے لئے آگے کے حالات کا اجمال اب ایک جداگانہ باب کے زیرِ عنوان "تمہید" پیش کیا جاتا ہے۔ اگر زمانہ نے مصنف کو مہلت دی تو سلاطین اور حکمرانوں کی تاریخ بھی کسی وقت ایک جداگانہ کتاب کی صورت میں پیش کی جائے گی۔

## جنگِ جکارتا کے بعد ولندیزیوں کا ۱۶۲۱ء میں بنڈا جزائر میں اقدام

یہ واقعہ ولندیزی آغاز عہد کا اہم ترین واقعہ ہے لیکن اتفاق سے جنگ جکارتا کے پہلے بیان کرنے سے رہ گیا۔ لہذا اب ذیل میں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کو ولندیزی مورخین نے بنڈا جزائر کا "المیہ" لکھا ہے۔

بنڈا جزائر میں انڈونیشیا کے تمام جزائر کی ملی جلی آبادی ہے۔ یہاں پر اس دور میں چھوٹے چھوٹے کئی ایک حکمراں تھے جو آپس میں لڑتے رہتے تھے ولندیزی جب پہلے پہل اس نواح میں تجارت کی غرض سے آئے تو وہ بھی انکی لڑائیوں میں شریک ہوگئے اور کمزور کے خلاف طاقتور کا ساتھ دینے اور اسکی کامیابی کے بعد اس سے مراعات حاصل کرنیکی پالیسی پر عمل کرتے رہے۔ سب سے پہلے ولندیزی جنھوں نے ان جزائر کے حکمرانوں سے معاہدہ تجارتی تعلقات قایم کئے وہ ڈلفیرٹ اور اسٹیوین فنڈر ہاینگن تھے اور بٹاویہ میں گورنر جنرل کون مقرر تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اہل بنڈا نے اس تجارتی تعلق کو ختم کردیا کیونکہ وہ لوگ ولندیزیوں کی چال بازیوں سے واقف ہوگئے تھے۔ چنانچہ ۱۶۰۹ء میں ایک دوسرا ولندیزی کپتان "فرہوف" پہنچا اور اپنی ہوشیاری سے دوبارہ اہل بنڈا کے ساتھ تعلقات قایم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی سال ۲۲ مئی کو یہ کپتان بمعہ اپنے ۴۶ ساتھیوں کے عہد نامہ پر دستخط کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ لیکن وہ راستہ ہی میں تھا کہ اہل بنڈا میں سے کچھ لوگوں نے اپنی کشتیوں میں سوار ہوکر انھیں رستے ہی میں لڑ بھڑ کر ختم کردیا۔ جب یہ خبر ان کے اعلیٰ افسروں کو پہنچی تو انھوں نے باقاعدہ فوج کشی کے انتظامات کئے۔ اور ۱۶۲۱ء میں کون، خود سولہ جہازوں کا بیڑہ لے کر حملہ آور ہوا اور ۸ مارچ ۱۶۲۱ء کو وہ کامیاب ہوا اور ان جزائر پر بھی قابض ہوگیا۔ اس قبضہ کے بعد ہی سے ولندیزیوں کی ہوس بڑھی اور وہ دو سو سال تک برابر اپنے اقتدار کے خاطر پھر لڑتے رہے۔

# باب سوم

## ولندیزی عہدِ اقتدار اور سلاطین

### ہمنگ کورت اوّل

۱۶۴۵ء میں جیسا کہ پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے سلطان اُگنگ نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا لڑکا "ہمنگ کورت اوّل" کے لقب سے اس کا جانشین مقرر ہوا۔ یہ حکمران ہمہ گونہ اوصاف میں اپنے باپ کی ضد تھا، نہ اس کی طرح بڑا عالم وفاضل تھا، اور نہ صاحبِ ہیبت وتدبر تھا، بلکہ حکمرانہ خامیوں کے علاوہ شخصی اوصاف میں بھی ممتاز نہ تھا، سلطنت ماترم کی تاریخ میں یہ پہلا حکمراں گذرا ہے۔ جس کے عہد میں مذہب کے بجائے مقامیت کو سرچشمۂ تمدن قرار دیا گیا اسی حکمراں نے سلطان کا لقب اپنے شاہی نام سے حذف کرکے "سوسوہونان" کا جاوائی لقب اختیار کیا اور طرح طرح کی وہ قدیم روایات جن سے اسلام کے داخلہ کے بعد جاوائی تمدن پاک ہوچکا تھا اسی کی پرانی اور رجعت پسندانہ ذہنیت کے باعث جامۂ تجدید پہن کر پھر جزوِ تمدن بن گئیں حتیٰ کہ اسلامی نام بھی عربی نام سمجھکر مقامی الفاظ کے رنگ میں تبدیل کردئے گئے۔ چنانچہ اسی وقت سے وسطی جاوا کے تمدن میں قبل از اسلام کے بہت سے رسم ورواج دوبارہ زندہ ہوتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ تمدن کا جزو بن گئے، یہی وجہ ہے کہ وسطی جاوا کے علاقہ میں آج بھی جو اصلاح طلب افرادی نام اور مراسم رائج ہیں اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

قطع نظر ان تمام امور کے تمدن کی سیاسی خرابی کا سنگ بنیاد بھی اس حکمران کے عہد میں رکھا گیا۔ یہ اپنے بہادر اور حوصلہ مند باپ کے برعکس اپنے ملک کے دشمنوں (ولندیزیوں) سے صلح کر کے ان کا دوست بن گیا۔ بلکہ عہد و مواثیق کر کے اس نے اُنھیں (ولندیزیوں) اپنے سفیر ماترم کے دربار میں بھیجنے کی اجازت دی اور ۱۶۵۵ء میں ایک خاص عہد نامہ "میثاق جپارا" کے نام سے کر کے انھیں گرم مصالحہ کی پیداوار کا اجارہ بھی دیا اور انھیں ان کا مذہب و تمدن بھی وسطی جاوا میں پھیلانے کی اجازت دی۔ اس طرح جاوا کی سب سے بڑی مسلم سلطنت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ولندیزی اپنے پنجے جمانے میں کامیاب ہوگئے بلکہ پھر کامیاب ہوتے چلے گئے۔

## تورونا جایا

انھی ایام میں ایک نوجوان جو "تورونا جایا" کے نام سے مشہور تھا اور مدورا کے حکمران "چکرانگرت دوم" کا بھتیجا تھا ہمنگ کورت کے دربار میں باریاب ہوا اور ہمنگ کی بیگمات میں ایک بیگم کا خیر خواہ بن گیا جو مدت

---

## ۵۔ بیرون جاوا کے جزائری علاقوں پر ولندیزی تسلط کی تاریخ

۱۶۶۶ء میں جاوا میں اثر و رسوخ بڑھانے کے بعد ولندیزیوں نے بیرون جاوا کے اور دیگر جزائری علاقوں پر بھی اپنا اثر و تسلط جمانا شروع کیا۔ چنانچہ مکاسر (واقع جزائر سُلاویسی) کے علاقہ میں جہاں مقامی سلاطین کے ساتھ وہ بہت پہلے سے عہد مواثیق کر کے اپنا تجارتی اثر قائم کئے ہوئے تھے اپنی ریشہ دوانیوں اور مسیحیت کی بجبر تبلیغ و اشاعت کے باعث بدنام ہوگئے اور غیر مقبول ہوگئے حتیٰ کہ مسلمان سلاطین نے اُن سے بالآخر نقض عہد کر لیا اور انھیں شہر خالی کرنے پر بھی مجبور کیا، چنانچہ ۵ اکتوبر ۱۶۶۶ء کو وہ ایک بڑا بیڑہ لے کر عازم مکاسر ہوئے اور مکاسر کے ان باشندوں کی سازشوں سے جو عیسائی ہوگئے تھے اس نواح کے سلاطین کے ساتھ جنگ کرنے میں کامیاب ہوگئے تین سال تک خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ یہ پھر فتحمند ہو کر اس تمام علاقہ پر قابض ہوگئے، بلکہ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزائر

سے "ہمنگ کورتے" کے غیر مذہبی اور غیر اسلامی افعال و کردار کے باعث کبیدہ خاطر تھی اور مدت سے ایک ایسے مشیر کی متلاشی تھی جو کسی حکمراں خاندان کا فرد بھی ہو اور ساتھ کے ساتھ دانشمند اور جوشیلہ نوجوان بھی ہو تاکہ اس کے ذریعہ ہمنگ کورتے سے بددل ہوجانے والے عوام کی راہنمائی کا کام لے سکے، اتفاق سے یہ سب اوصاف اس ملکہ نے اس نوجوان (نورونا جایا) میں پا لئے، آخر اسے اپنے خاندان کا ایک فرد بنانے کے لئے

---

(خصوصاً جزائر توتان) بھی ان کے قبضہ میں آگئے ان تمام فتوحات کے بعد ان سوداگر پیشہ ولندیزیوں نے ۱۶۶۹ء میں جنوبی سلاویسی کے سلاطین کے ساتھ ایک خاص عہدنامہ بھی کیا جو تاریخ میں "بونگایہ کا عہدنامہ" کہلاتا ہے یہی وہ عہدنامہ ہے جس کے بعد سے اس نواح کے سلاطین ولندیزیوں کے غلام بن گئے۔ یہاں تک کہ بعض ان سلاطین نے کچھ دنوں کے بعد ہی ۲۰ دسمبر ۱۶۶۹ء کو "بٹاویہ" کے ولندیزی گورنر جنرل "مانت سائیکر" کی خدمت میں "ارمغان خلافت" بھی پیش کیا۔ اور اپنی وفاداری کا حلف بھی اٹھایا۔ اور اس طرح ولندیزیوں کا اقتدار اس نواح میں مسلّم ہوگیا۔

## منہاسہ پر یورش

۱۶۵۴ء میں ولندیزیوں نے "منہاسہ" کا رخ کیا۔ اس وقت "بولان منگانڈو" (واقع منہاسہ) میں "لولوڈا" نامی سلطان برسر اقتدار تھا اور اس کا آس پاس کے حکمرانوں کے ساتھ جھگڑا تھا چنانچہ ولندیزیوں نے اپنی قدیم پالیسی یعنی طاقتور کا ساتھ دینا اور کمزور کو کچلنے کے مطابق "لولوڈا" کا ساتھ دیا اور رفتہ رفتہ اپنا ماتحت کرلیا۔ ۱۶۶۳ء میں جب اہل اسپین مالوکو چھوڑ کر چلے گئے تو ولندیزیوں نے "تومنگایہ" کے مقام پر مقامی حکمراں سے ایک عہدنامہ کیا جس کی رو سے اس نواح کا حاکم ان کا دوست بلکہ ماتحت ہوگیا اس طرح ولندیزی اس علاقہ میں مسلّم ہوگئے اور طاقتور ترین حکمراں بن گئے مالوکو کے ولندیزی لفٹنٹ گورنر جنرل "سیمون کاس" نے منہاسہ میں اپنا سب سے پہلا دفتر قایم کیا اور اس طرح ولندیزی اقتدار کے لئے ایک مرکز کھول دیا۔ پھر ۱۰ جنوری ۱۶۷۹ء میں اس نے آس پاس کے تمام دیسی سلاطین کے ساتھ ایک طویل زمانہ تک کے لئے ایک عہدنامہ کیا جس کی رو سے انھیں ان تمام علاقوں میں تجارت کرنے

اپنی لڑکی کی اس کے ساتھ شادی کردی۔ اور تمام امور سیاسی سے باخبر کر کے مستقبل کے انقلاب پر آمادہ کیا۔ ہمنگ کورت سے رعایا بھی بددل ہو چکی تھی، مذہبی گروہ کے لوگوں کے علاوہ سوداگر بھی خلاف تھے کیونکہ اس نے مذہبی اور تمدنی نقص ترقی کے ساتھ ساتھ ولندیزیوں کو اجارہ داریاں دے کر معاشی گراوٹ کے اسباب بھی پیدا کر دیے تھے۔

---

اور عیسائیت پھیلانے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح گویا یہ پہلا موقع تھا کہ منہاسہ کے علاقہ میں عیسائیت کو اشاعت کا موقع ملا۔

**دیگر جزائر پر قبضہ**

جیسا کہ پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے ولندیزیوں نے ۱۶۲۱ء میں پرتگالیوں کو تدورٹے اور ترنائے سے مار مار کر بھگا دیا۔ پھر یہ لوگ جزیرہ تیمور کی طرف چلے آئے جہاں ایک نصف حصہ میں اب تک بھی قابض ہیں۔ ۱۷۹۱ء میں برطانیہ کے کچھ لوگوں نے مغربی ایریان (نیوگنی) پر قبضہ کر لیا تھا مگر چار سال بعد ہی یعنی ۱۷۹۵ء میں وہ اس جزیرہ کے بنجر علاقوں کو خسارہ کا علاقہ سمجھ کر چھوڑ گئے اور واپس چلے گئے لہٰذا ولندیزیوں نے ان کے چلے جانے کے بعد ۱۷۹۵ء میں نیوگنی کے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا (جس کا آجکل جمہوریہ اندونیشیا کے ... جھگڑا چل رہا ہے۔)

۱۸۵۹ء میں انھوں نے (ولندیزیوں) نے جزیرۂ فلورس پر قبضہ کیا اور اس کی صورت یہ کی کہ پہلے اپنے کیتھولک عیسائی مشن بھجوائے۔ ان کے ذریعہ راستہ ہموار کیا پھر رفتہ رفتہ قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اس جزیرہ کے بیشتر لوگ آج بھی کیتھولک عیسائی ہیں۔ پھر لمبوک کی طرف متوجہ ہو ... اس کے بعد ۱۸۹۴ء میں جزیرۂ بالی میں اپنا تسلط جمایا۔ اس سے پہلے وہ سمبا اور سمباوا جزائر فتح کر چکے تھے۔ سب سے مشکل مرحلہ انھیں سماترا میں پیش آیا جہاں "تحریک جہاد" نے مسلمانوں میں ایک زبردست ہیجان اور جوش پیدا کر دیا تھا چنانچہ ۱۹۱۰ء سے پہلے وہ کبھی بھی مکمل طور پر اس جزیرہ پر قبضہ نہ کر سکے۔ انھیں مسلمانوں کے بڑے بڑے خونریز جہادوں سے دو چار ہوتے رہنا پڑا۔ سماترا کی لڑائیاں اہل سماترا کے غیر معمولی جوش اسلامی، شجاعت و جوانمردی اور حریت پسندی کا اعلیٰ کردار ہیں، ان کی تفصیلات آگے کے چند اوراق میں

اسی زمانہ میں اتفاق ایسا ہوا کہ ولندیزیوں نے مکاسر کے جن شاہی خاندانوں کو ختم کر دیا تھا ان کے افراد سُرابایا کے ساحلی علاقوں میں بحری قزاق بن گئے تھے، اور ادہر ادہر تلاشِ غارت گری میں بحر پیمائی کرتے پھرتے تھے چنانچہ "تورُوناجایا" ان سے آملا اور ان کی مدد سے ایک عظیم لشکر اکھٹا کر کے ولندیزیوں کے خلاف نبرد آزما ہوا۔ ہمنگ کورت بھی ولندیزیوں کا حلیف ہونے کی وجہ سے تورُوناجایا کے خلاف میدان میں نکل آیا۔ اور زبردست ولندیزیوں کے بعد تورُوناجایا دونوں کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو گیا۔ سارے علاقے ان سے خالی کرالئے۔ صرف بٹاویہ اور جپارا ہی ان کے قبضہ میں رہ گئے۔ گویا اس طرح ولندیزیوں کے خلاف اہلِ ملک کی یہ پہلی جنگِ آزادی تھی۔ مگر ہمنگ کورت کی غداری کے سبب تورُوناجایا کو کامیابی نہ ہو سکی، اور کچھ ہی عرصہ بعد ۱۳ اپریل ۱۶۷۷ء کو ولندیزیوں نے پھر پلٹ کر سُرابایا پر چڑھائی کی لڑائی ہوئی مگر اس بار تورُوناجایا ہار گیا اور قلعہ بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا، جان بچا کر وہ کیدیری چلا آیا اور اپنی خوشدامنہ (ہمنگ کورت کی ملکہ) سے طالب مدد ہوا۔ اس نے افرادی قوت کے ساتھ ساتھ روپیہ پیسہ سے بھی بڑی مدد کی بالآخر تورُوناجایا نے سُرابایا پر پھر چڑھائی کی اور ہارا ہوا علاقہ پھر سے واپس لے لیا، ولندیزی بڑے چالاک تھے۔ ادہر سے بھاگ کر مدُورا پہنچے اور وہاں کے دار الحکومت "آرسن بایا" (جو اس شہزادہ کا خاص علاقہ تھا) پر قبضہ کر لیا مگر تورُوناجایا نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی بلکہ وہ آگے کو بڑھتا

---

امام بونجول اور تیکو عمر کے حالات میں بیان کی جائیگی۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ ولندیزیوں نے اس جزیرہ کے غازیانِ اسلام پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے اور انھیں اپنا غلام بنانے کے لئے کیسی کیسی خوفناک فریب کاریاں چلیں۔

رہا تھی کہ اس نے ہمنگ کورت کے دارالحکومت ماترم پر قبضہ کر لیا، اور ہمنگ کورت کو مار پیٹ کر نکال دیا اس طرح ہمنگ کورت شکست کھا کر ولندیزیوں کے پاس جا پہنچا مگر اتفاق سے اسی اثنا میں کسی مہلک بیماری کا شکار ہو کر راہی ملک عدم ہوا، اور اپنی جگہ اپنے ایک لڑکے "پنگیران آدی پتی انوم" (یعنی شہزادہ گورنر انوم) کو چھیتے ہوئے ملک کا جلاوطن حکمراں بنایا گیا۔

**ہمنگ کورت دوم** یہ حکمراں "سوسونان ہمنگ کورت دوم" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی سیاسی پوزیشن یہ تھی کہ یہ ایک بے ملکی نواب تھا۔ اس کے ملک پر اندونیشیا کے بہادر ترین نوجوان تورونا جایا کی حکومت تھی اور یہ خود ولندیزیوں کے رحم وکرم کا امیدوار تھا۔

جیسے ہی کہ ولندیزی مدورا کو تاراج کر کے جپارا واپس لوٹے یہ نیا حکمراں (ہمنگ کورات دوم) اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اپنے باپ کی وفاداری کا یقین دلا کر کھوئے ہوئے اقتدار کی بحالی کے لئے ان کی مدد طلب کی بھلا ولندیزی بلا وجہ کس کی مدد کرنے والے ... وہ موقع غنیمت جان کر اس کے ساتھ ایک عہد نامہ کرنے پر آمادہ ہو گئے جس کی رو سے انھوں نے یہ طے کیا کہ اگر وہ اسے گدی دلانے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اس کا فرض ہوگا کہ وہ انھیں ہر ماہ ایک رقم خطیر (جس کی تعداد اس وقت کے ولندیزی سکہ کے مطابق بیس ہزار رنگت تھی (جبکہ ایک رنگت ۲½ روپے کے برابر ہوتا تھا) دیتا رہے گا۔ یہ عہد نامہ ۱۶۷۷ء کا عہد نامہ جپارا، انگ کہلاتا ہے۔ عہد نامہ قرار پایا اور کچھ عرصہ کے بعد ہی اگست ۱۶۷۸ء میں ایک بڑی فوج لے کر انھوں نے تورونا جایا پر حملہ کر دیا۔ یاد

رکھنا چاہئے کہ ولندیزی نہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے اس وقت حملہ کر رہے تھے اور نہ ہمنگ کورت کی پاسداری مقصود تھی بلکہ وہ تورونا جایا کی ہمت و بسالت سے اس درجہ خائف تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد اسے ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں ورنہ وہ انھیں پورے اندونیشیا سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اسکی حب الوطنی شجاعت، دینداری اور اعلیٰ قابلیت کے باعث پورے جاوا کا مسلمان طبقہ اس کی پشت پناہی کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے آمادہ و تیار تھا۔

چنانچہ ان ولندیزیوں نے جزائر امبون، ترناتے، تدورے، اور مکاسر کے عیسائی ہو جانے والے اندونیشیوں کی ایک فوج تیار کی اور مشہور غدار "آرو پلاکا" (جو مکاسر کا ایک عیسائی تھا) کو سرغنہ بنا کر حملہ آور ہوئے۔ (یہ آرو پلاکا ہی وہ شخص تھا جس کی غداری سے مکاسر میں انھیں کامیابی ہوئی تھی) ڈاکٹر خراف اپنی کتاب "خذ خلہ نیز" (صفحہ ۲۰۰) پر لکھتا ہے کہ "ایشیا کے تمام ممالک کی تاریخ میں یہ پہلی یورپین فوج تھی جس نے کسی ملک کے ساحلی علاقوں سے ہٹ کر اندرونی علاقوں پر چڑھائی کی ورنہ اس سے قبل ان کی یورش محض بندرگاہوں تک محدود تھی"۔

غرض یہ فوج ہمنگ کورت کی مدد کے بہانہ سے آگے بڑھتی ہوئی "کیدیری" تک جا پہنچی اور ۲۵ نومبر ۱۶۷۸ء کو اس نے تورونا جایا پر حملہ بول دیا۔ تورونا جایا بہادری کے ساتھ لڑا مگر آخر میں ہار گیا اور جان بچا کر کلوت کے پہاڑوں میں جا چھپا، ولندیزی اس کا تعقب کرتے ہوئے پہاڑوں میں بھی پہنچ گئے اور اسے قید کر لائے اور ہمنگ کورت دوم کو دوبارہ حکمراں بنا کر اس کے حضور میں اس بہادر اندونیشی جانباز کو پیش کر دیا۔ ہمنگ کورت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تلوار کھینچ کر

اس کے دو ٹکڑے کر دئے اور اس طرح اپنے ملک کی پہلی جنگِ آزادی کے گلے پر خود اپنے ہاتھ سے چھری چلادی، یہ واقعہ بھی (جس کی آخری تاریخ ترونا جایا کے قتل کے ساتھ ۲ جنوری ۱۶۸۰ء ہے) اندونیشیا کے تمدن پر غیر معمولی اثر ڈالنے والے واقعہ کی حیثیت سے بہت زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس واقعہ کے بعد سے ولندیزیوں کو اپنے تمدن اور مذہب کو پھیلانے اور من مانے طریقہ پر یہاں کے قدرتی وسائل پر چھا جانے کا موقع نصیب ہوا تھا۔

## بانتن سلطہ ۱۶۸۲ء

اس وقت بانتن بھی اپنی تجارتی اہمیت کے اعتبار سے بہت ہی اہم سمجھا جاتا تھا (اسکا کچھ حال فصل چہارم میں گذر چکا ہے یہاں پر فرانسیسی، انگریز، ڈین، پرتگالی اور ولندیزی وغیرہ یورپ کی مختلف اقوام کے سوداگر تجارت کرتے تھے۔ نیز اسلامی تہذیب کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ پورے جاوا میں ایک بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ بانتن میں سلطان اگنگ (یاد رکھنا چاہئے کہ ماترم میں بھی اسی نام کا ایک بڑا حکمراں گذرا ہے مگر اس کا نام اُگنگ تھا) حکمراں تھا (جس کا دورِ حکومت ۱۶۵۰ء سے ۱۶۸۲ء تک گذرا ہے) یہ بھی ولندیزیوں کا سخت مخالف تھا۔ مذہب اسلام کا بھی بڑا پابند تھا۔ بلکہ اسکی دینداری کا یہ عالم تھا کہ کسی غیر اسلامی اثر کو اپنے ملک میں داخل نہیں ہونے دیتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ جس درخت پر بیٹھتے ہیں اس کی جڑوں کو کھوکلی کر دیتے ہیں اور پھر اپنے مقاصد کے پیش نظر سیاسی چالیں چلتے ہیں جس سے ملک اور قوم دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ ۱۶۵۶ء میں ولندیزیوں کے ساتھ اس کو ایک خونریز لڑائی بھی لڑنی پڑی کیونکہ ولندیزیوں نے بغیر اس کی اجازت کے بڑے بڑے پروگرام شروع کر دئے تھے۔

بانتن میں اس وقت یہ رواج قائم تھا کہ سلطنت کا ولیعہد نائب السلطنت ہوتا تھا، اور اصطلاحی طور پر "راجہ موُدا" (وائسرائے) کہلاتا تھا اور وہ حج کے لئے بھی جاتا تھا۔

چنانچہ اس وقت بانتن میں سلطان کا لڑکا "راجہ موُدا" تھا اور رواج کے مطابق وہ بھی حج کو گیا، جب حج سے لوٹ کر آیا تو "سلطان حاجی" کہلایا۔ اگرچہ ملک کی عام حالت

## سُرَاپَاتِی کی جنگ ۱۷۰۳ء

ادھر بانتن کے سلطان اَگنگ کا دوسرا لڑکا "پنگیران پُورَبَایَا" اپنے بھائی سلطان حاجی کے باپ کے ساتھ جنگ کے زمانہ میں بھاگ کر وسطی جاوا میں چلا آیا تھا۔ یہ شہزادہ بھی اپنے باپ کی طرح ولندیزیوں کا سخت دشمن تھا۔ ۱۶۸۳ء میں اس نے ولندیزیوں کے ساتھ ایک عہدنامہ کیا جس کی مختلف شقوق میں ایک شق یہ بھی تھی کہ وہ ایک اپنا نمائندہ اس کے دربار میں بھیجیں گے چنانچہ اس شرط کے مطابق انھوں نے بالی کے ایک ہندو نوجوان کو

---

نہایت ہی پرامن اور خوشحال تھی لیکن خانوادۂ شاہی کے لوگ اکثر آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے اور حصولِ تخت و تاج کے خاطر سازشیں کرتے رہتے تھے۔ ولندیزی جن کی پالیسی "نفاق ڈالو اور حکومت کرو" تھی ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ڈھونڈھ لیتے تھے۔ چنانچہ سلطان اَگنگ کے خلاف بھی انھیں سازش کا موقع مل گیا یعنی اس طرح کہ اس کا لڑکا سلطان حاجی جوان کا دوست بن گیا تھا مدد دے کر اپنے ہی باپ کے خلاف میدانِ مُبارزت میں نکل آیا اور سلطان اَگنگ کو شکست دے کر خود حکمراں بن بیٹھا اور بوڑھے سلطان کو جلاوطن کر دیا۔ مگر یہ سلطان بھی نہایت ہی ہوشیار اور تجربہ کار تھا ایک دم اپنے ساتھیوں کے ایک گروہ کو اکھٹا کر کے جنگ آزما ہوا۔ ۸ رمارچ ۱۶۸۲ء کو ولندیزی ایک بڑا بحری بیڑہ لے کر سلطان حاجی کی مدد کیلئے بانتن پہنچ گئے، لڑائی ہوئی کامیاب ہو گئے، سلطان حاجی نے اپنی کامیابی کے بعد سارے ملک کی تجارت اور پیداوار کا انھیں اجارہ دے کر اپنے ملک پر مُسلّط کر لیا۔ انگریز جو مدّت سے اس علاقہ میں تجارت کرتے تھے اب بھاگ نکلے اور سُماترا چلے گئے۔ سُماترا پہنچکر انھوں نے مِنگ کُبَاؤُ کے علاقہ میں اپنے مرکز کھول لئے ۱۶۸۵ء میں سلطان اَگنگ قید ہو گیا، جہاں ۱۶۹۵ء میں اس نے بحالتِ قید ہی انتقال کیا۔ اس سلطان کے ساتھ ساتھ بانتن کی قومی حکومت کا بھی قریب قریب خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ پھر بعد میں آنے والے حکمراں برائے نام حکمراں رہ گئے تھے، اور وہ ولندیزیوں کے اشاروں پر چلتے تھے۔

جو اِن کی فوج میں سپاہی تھا اور "اُن تنگ سراپاتی" کے نام سے مشہور تھا بھیجا۔ اس کے ساتھ انھوں نے ایک ولندیزی کو بھی بھیجا مگر اس ولندیزی افسر کا برتاؤ کچھ اس قسم کا تھا کہ سراپاتی اس سے بگڑ گیا اور ولندیزیوں کا دشمن ہوگیا اور اتفاق سے اس اثنار میں "پینگران پوربایا" کو بھی شکست ہوگئی اور وہ قید کر لیا گیا اِدھر عدم ادائیگی زرِگت کی وجہ سے نقضِ عہد کے باعث ولندزی ہمنگ کورت دوم سے بھی ناراض ہوگئے تھے لہٰذا انھوں نے ہمنگ کورت کے خلاف کارروائی کی دھمکی دی مگر ہمنگ کورت نے سراپاتی کو اپنی طرف ملا لیا اور ولندیزیوں کے خلاف جنگ شروع کردی۔ جب لڑائی نے زور پکڑا تو ولندیزیوں نے اپنے ایک مشہور جرنیل "کپتان تیک" کو ایک لشکرِ جرّار لیکر ہمنگ کورت کی سرزنش کے لئے ۱۶۸۵ء میں ماترم کی طرف روانہ کیا۔ ابھی یہ سپاہ راستہ ہی میں تھی کہ سراپاتی نے شب خون مار کر ختم کردی۔ اور وہ بڑھتا ہوا پسورُان میں آپہنچا۔

## آدی پاتی انم اور پاکو بووانو

۱۷۰۳ء میں ہمنگ کورت دوم کا انتقال ہوگیا اور اسکی جگہ اس کا لڑکا "آدی پاتی انم" ہمنگ کورت سوم کے لقب سے جانشین مقرر ہوا اور بمشکل ایک ہی سال حکومت کرسکا۔ تخت نشین ہوجانے کے بعد اس حکمراں نے اپنے لئے ایک نیا لقب اختیار کیا اور "سوتان ماس" کہلانے لگا۔ ابھی اس کو سریر آرائے سلطنت ہوئے کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ وہ اپنے ایک چچا "پینگران پوگر" کے ساتھ خانہ جنگی میں مبتلا ہوگیا اور چونکہ اس چچا کا زیادہ اثر تھا لہٰذا اس نے اپنے "سوتان" ہونے کا اعلان کردیا اور "پاکو بووانو" کا لقب اختیار کیا "پاکو بووانو" چونکہ ولندیزیوں کا خاص دوست تھا لہٰذا وہ ہر وقت

"سُونَان مَاسُ" کے خلاف اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ بلکہ 'پاکوبُووَانو' حکمراں ہی ولندیزیوں کی مدد سے بنا تھا اس لئے کہ ولندیزی افسروں نے درپردہ سازش کرکے 'سُونَان مَاسُ' کے سپاہیوں کو اپنی طرف ملالیا تھا۔ اور جب وقت آیا تو یہ تمام سُونَان مَاسُ کے حریف 'پاکوبُووَانُو' کے گرد جمع ہوگئے اور اس کو تقویت پہنچاکر حکمراں بنانے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ اس طرح 'پاکوبُووَانو' ولندیزیوں کی غیر براہِ راست امداد سے مَاتَرم کا حکمراں بنا اور زمامِ اختیار ہاتھ میں لیتے ہی اس نے اپنے کسی درپردہ وعدہ کے مطابق چند علاقے بھی ولندیزیوں کی نذر گذرانے جن میں خاص طور پر 'پریَانگَن'، 'چرِیبُون'، اور علاقہ 'مشرقی مَدُورَا' شامل ہیں۔ ان علاقوں کے علاوہ اس نئے حکمراں نے ولندیزی فوج کی مدد کے لئے ۲۵ سال تک کے لئے عمدہ چاولوں کی آٹھ سو بوریاں بھی ہر سال دیتے رہنے کا وعدہ کیا، چنانچہ ۱۷۰۶ء میں ولندیزیوں نے 'سُرَاپَاتی' کو زیر کرنے کے لئے 'پَسُورَوَان' پر چڑھائی کی جہاں وہ اس وقت اپنی طاقت اکٹھی کرنے میں مصروف تھا۔ ولندیزی فوج نہایت ہی چالاکی اور عیّاری سے ایسی خاموشی کے ساتھ پَسُورَوَان میں داخل ہوئی کہ سُراپاتی کو بھی آسانی کے ساتھ اس کا علم نہ ہوسکا بالآخر اس فوج نے پَسُورَوان میں داخل ہوکر موقع سے فائدہ اٹھایا اور دھوکہ دیکر اسے قتل کردیا، اور اس کے آقائے دولت 'سُونَان مَاسُ' کو قید کرلیا اور سیاسی مجرم بناکر جزیرۂ سِیلون (لنکا) میں لیجاکر نظر بند کردیا یہ جزیرہ اس وقت تک انہی (ولندیزیوں ہی) کے قبضہ میں تھا۔ اور ان کی تجارت کا بڑا مرکز تھا۔ اس طرح ولندیزیوں نے جاوا پر اپنا پورا پورا اقتدار حاصل کرلیا۔

**سلطنتِ مَاتَرَم کے ۳۴ ضلعے کی تقسیم** | مگر وہ اس اقتدار سے مطمئن نہ تھے

انھیں ہر وقت آیندہ کے اٹھتے رہنے والے ہنگاموں کے طوفانوں کا خوف لگا رہتا تھا۔ لہذا انھوں نے اپنے پنجۂ استبداد کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے اس سلطنت کو پارہ پارہ کر کے کمزور بنانے کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ اور اس کی صورت یہ رکھی کہ پوری سلطنتِ ماترم کو جس میں ماسوا کچھ علاقہ کے قریب قریب پورا جاوا شامل تھا۔ ۳۴ چھوٹے چھوٹے آزاد ضلعوں میں تقسیم کر دیا اور ہر ضلع پر ایک خود مختار ضلعدار مقرر کر دیا۔ جو ضلعدار کے بجائے حکمراں تصوّر کیا جاتا تھا اور سیاسی حیثیت سے "بوپاتی" کے معزز لقب کے ساتھ ملقّب تھا۔ اپنے اشاروں پر رقص کرنے والی کٹ پتلی یعنی نئے حکمراں "پاکو بوواانو" کو ان سب کا سربراہ یعنی برائے نام شہنشاہ بنا دیا جس کے ہاتھ میں اقتدار کچھ نہ تھا، نہ خارجہ پالیسی تھی اور نہ زرعی اور معاشی پالیسی تھی بلکہ صرف داخلی انتظامات تھے گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ کلائیو کے وقت کے ہندوستان کی سی دو عملی حکومت تھی، جسکا نصبُ العین حکمرانوں اور اہلِ ملک کو بیوقوف بنانے کے علاوہ کچھ نہ تھا یعنی" حق بھی راضی رہے شیطان بھی ناراض نہ ہو"، ملک کے چھوٹے بڑے زمیندار جنھیں سلاطینِ ماترم کے اقتدار کے باعث بھلا حکمرانی کا درجہ کہاں نصیب تھا، روٹی کا ایک ایک ٹکڑا ملجا نے اور حکمراں بنجانے کے باعث ان نو خداوندانِ غرب (ولندیزیوں) سے خوش تھے، ادہر پاکو بوواانو بھی سوچتا تھا کہ خواہ نام کے لئے کیوں نہ سہی ابھی اقتدار تو ہاتھ آتا ہے ورنہ بھلا کہاں وہ اور کہاں بادشاہت۔ قوم اور ملک کے وقار کو اگر صدمہ پہنچتا ہے تو پہنچا کرے ابھی اسے تو تو قیر مل گئی ہے

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھیرا

## پاکوبووانو اور اس کے جانشین

بہرحال ولندیزیوں نے پھر رفتہ رفتہ کلیدی مناصب بھی اپنی بہی خواہی کے سبز باغ دکھاکر اپنے قابو میں کر لئے اور اس طرح اہلِ اسلام کی وہ عظیم الشان سلطنت جس کے تخت پر کبھی اگنگ جیسا اولوالعزم اور باہیبت و جبروت حکمراں بیٹھتا تھا، اور جو جاوا کے اتحادِ ملّت کی آئینہ دار تھی پارہ پارہ ہوکر بے وقار ہوگئی بلکہ ولندیزیوں کے لئے آیندہ کا ایک خوانِ یغما بن گئی پھر چند سال کے بعد ۱۷۱۹ء میں 'پاکوبووانو' بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہکر ملکِ عدم کو سدھار گیا اور اپنی قوم اور ملک کے لئے ذلت و بربادی کے کانٹے بوگیا۔ جب وہ مرگیا تو ولندیزیوں نے خانہ پُری کے لئے اسی کے چھوٹے بھائی 'سونان پراُبو' کو تخت پر بٹھلادیا اور اس کے مرنے کے وقت یعنی ۱۷۲۷ء تک خوب اپنا اُلّو سیدھا کیا۔ پھر ۱۷۲۷ء میں اس کے اس جہان سے رخصت ہوجانے کے بعد اس کے سترہ سالہ لڑکے کو 'پاکوبووانو، دوم' کے لقب سے تختِ سلطنت پر بٹھلایا جو تاریخ میں 'ہمنگ کورت جہارام' کے نام سے مشہور ہے یہ حکمراں ۱۷۴۹ء تک برسرِ اقتدار رہا ہے۔

## ولندیزیوں کے خلاف جنگ

اسی اثنار میں ولندیزی گورنر جنرل نے مقامی باشندوں کے خلاف تقاسمۂ آبادی کی اسکیم پر عمل کرنے اور اس تقاسمہ کے ذریعہ اپنی پوزیشن کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کے لئے آس پاس کے چینی باشندوں کو بٹاویہ اور اس کے گردونواح میں ایک کثیر تعداد میں لاکر آباد کرنا شروع کردیا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی ہی اسکیم تھی جیسی کہ فلسطین میں یہودیوں کو بتدریج آباد کرنے کے سلسلہ میں انگریزوں نے شروع کی تھی۔ ان چینی آبادکاروں کو غیر معمولی طور پہ مراعات دینی شروع کیں جسکا

نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس کے تمام دیگر جزائر سے جوق در جوق آنکر چینی لوگ شہر بٹاویہ اور اس کی حوالی میں بس گئے۔ یہ لوگ یا تو زیادہ تر کاشت کار تھے یا پھر صنّاع اور سوداگر تھے، آنے کے ساتھ ہی ان چینیوں نے تمام کاروبار پر اپنا تسلّط جمانا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں چاۓ، چاولوں اور تمباکو کی کاشت اور شکر بنانے کی صنعت پر حاوی ہو گئے اس سے ولندیزیوں کی تجارت پر بُرا اثر پڑنے لگا۔ چونکہ بازاری کاروبار میں چینی لوگ اہلِ یوروپ کے مقابلہ میں کسی حال بھی کم نہ تھے لہذا ولندیزیوں اور چینیوں میں باہمی طور پر کاروباری مناقشہ شروع ہو گیا۔ اور اس طرح بجاۓ دوستی کے ان میں حریفانہ چشمک چل گئی، چونکہ ولندیزی خود بھی کاروباری تھے لہذا وہ ان چینیوں کے ساتھ دست و گریباں ہو گئے اور بالآخر ۱۷۴۰ء میں ایک باقاعدہ فوج کے ذریعہ ان کے خلاف لڑنے لگے۔ حتیٰ کہ ولندیزی گورنر جنرل فلکانیر نے اپنے خصوصی احکامات سے کام لے کر اس بے دردی کے ساتھ ان کا قتلِ عام کیا کہ مقامی آبادی بھی کانپ اٹھی۔ چینی لوگ ہزاروں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، جن لوگوں نے ان کی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا انھیں جہازوں میں بھر بھر کے غرقِ آب کر دیا گیا۔ اور بقیہ بے گناہوں کو جزیرۂ لنکا میں لیجا کر نذرِ ہاموں کر دیا گیا جہاں وہ مدتوں دشت نوردی میں اپنی موت کی تلاش کرتے پھرتے تھے۔

اس ہولناک واقعہ سے وہ مقامی شہزادے بھی جو مدّتوں سے ولندیزی طرزِ عمل کے خلاف تھے چینیوں کی حمایت میں متحد ہو کر میدان میں نکل آۓ اور انھوں نے ہمنگ کورٹ سے بھی ساتھ دینے کی درخواست کی جو اس وقت

ولندیزیوں کا خاص آلۂ کار تھا لیکن ہمنگ کورت نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یہ تمام شہزادے آتش پا ہوکر جون ۱۶۷۷ء میں اس کے محل کی طرف متوجہ ہوئے اور بجائے پہلے ولندیزیوں پر حملہ کرنے کے اسی پر چڑھائی کر دی اور اس کے محل کو بھی جلا ڈالا۔ ہمنگ کورت شروع میں تو لڑتا رہا مگر بعد میں تاب مقاومت نہ لاکر اپنے دار الحکومت سے بھاگ کر "تیورڈوگو" چلا گیا۔ اور تخت و تاج خالی ہوگیا۔ جنگ آزما شہزادوں نے "سونان ماس" کے پوتے "ماس گارنڈی"، کو اس کی جگہ حکمراں بنا دیا، اگرچہ "ماس گارنڈی" خانوادۂ شاہی کا فرد تھا مگر نہ تو اتنا ہوشیار ہی تھا اور نہ تجربہ کار، صحیح طور پر تقاضۂ وقت کے مطابق اپنی قوم کی رہنمائی بھی نہیں کر سکتا تھا لہذا مقابلہ آرا ولندیزی سپاہ کا مقابلہ نہ کر سکا اور بالآخر سرابایا کے مقام پر ان کے سامنے ہتھیار ڈالکر ان کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا، ولندیزیوں نے باقاعدہ اس کی مشکیں کس کر جزیرۂ لنکا میں نظر بند کر دیا اور اپنے پرانے دوست ہمنگ کورت کو بلا کر "سُراکرتا" کے مقام پر ۱۷۴۲ء میں پھر تخت پر بٹھلا دیا۔

## چکرا ننگرت کے ساتھ جنگ

اس زمانہ میں جزیرۂ مدورا میں چکرا ننگرت فرمانروا تھا جو مشرقی جاوا کا "سونان" بننے کا دعویدار تھا حالانکہ یہ علاقہ اس وقت تک ماترم کے تحت میں تھا۔ لہذا، چکرا ننگرت اور سونان کے مابین لڑائی شروع ہوگئی۔ ولندیزی جو چکرا ننگرت کے بھی خلاف تھے سونان (ہمنگ کورت) کی مدد کے لئے آپہنچے۔ اور اس طرح پھر ایک خونریز جنگ شروع ہوگئی۔ چکرا ننگرت ایک نہایت ہی طاقتور حکمران تھا،

لہذا اس نے کئی مقامات پر ہمنگ کورت اور اس کے ساتھیوں (ولندیزیوں) کو بری طرح ہرایا۔ گریسک اور بلورا کے مقامات ان سے چھین لئے اور ان کے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی ختم کر دیا۔ یہ گویا پہلا موقع تھا کہ اہلِ جاوا آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ایک کھلم کھلا خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے۔ تاریخ میں یہ لڑائی "جنگِ مدورا" کہلاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مدورا کا حکمراں تنہا رہ جانے کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک نہ لڑ سکا اور بالآخر ہار گیا اور تخت و تاج چھوڑ کر "بنجر ماسین" چلا گیا۔

**عہد نامۂ سُراکرتا**

اب گورنر جنرل "فلکا نیئر" کا قائم مقام "فان اِمہوف" مقرر ہو کر آیا ۱۷۴۶ء میں یہ نیا گورنر جنرل سُراکرتا پہنچا اور سُونان کے ساتھ اس نے ایک عہد نامہ کیا جو "عہد نامۂ سُراکرتا" کہلاتا ہے اس عہد نامہ کی رو سے یہ قرار پایا کہ "سُراکرتا" کے تمام علاقہ کی خاص پیداوار یعنی تمباکو آئندہ سے ولندیزی اجارہ داری میں تصور کی جائے گی، اس کی پیداوار بھی وہی اپنی نگرانی میں کرائیں گے اور اس کو درست کرنے اور قاعدہ میں لاکر تجارت کرنے کے لئے ضروری کارخانے اور دفاتر بھی کھول سکیں گے، سُونان اس امر پر راضی ہو گیا۔ اور عہد نامہ پر دستخط کر دئے۔

مگر شاہی خاندان کے اور دیگر افراد خصوصاً "پنگیران منگ کوبومی" نے جو سُونان کا چھوٹا بھائی تھا اور نہایت ہی عمدہ قسم کا سیاستدان اور مدبر تھا، اس عہد نامہ کو نہ مانا کیونکہ ایک طرح سے اس عہد نامہ کی بدولت ولندیزی پوری مملکتِ ماترم پر قابض ہو جاتے تھے، اس شہزادہ نے اپنی عواقب شناسی سے

سونان کی کافی فہمائش کی مگر اس کے سمجھ میں نہ آئی اور دونوں بھائیوں میں اختلاف پیدا ہوگیا، چنانچہ پنگِراَن دارالحکومت سے نکل کر اپنے ساتھیوں کی ایک بڑی سپاہ کو جمع کرنے کے خیال سے آس پاس کی مضافات میں چلا گیا اور بالآخر ایک[1] فوج اکٹھی کرکے ۱۷۴۶ء میں ولندیزیوں کے خلاف نبرد آزما ہوا اتفاق سے اسی زمانہ میں "سُونَان" سخت بیمار پڑ گیا اور جب ولندیزیوں نے یہ دیکھا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے فوراً ہی اپنے اس عہد نامہ پر جو تا حال زیرِ بحث تھا دستخط لے لیئے اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی پوری سلطنتِ مَاتَرم پر اپنا تسلّط جما لیا۔

## پاکُوبُوانُوسویم

اور اس کی جگہ اپنی گوں کے ایک نوجوان کو "پاکُوبُوانُوسویم" کے لقب سے تخت پر بٹھلا دیا جو ۱۷۴۹ء سے ۱۷۸۸ء تک حُکمراں رہا۔ اسی کے عہد میں وہ مشہور عہد نامہ کیا گیا جس کی رُو سے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ آئندہ سے مَاتَرم کے نام حُکمراں ولندیزیوں کی نگرانی میں حکومت کریں گے چنانچہ "پَنگِراَن مَنگ کُوبُومِی" کو جو اس وقت تک ولندیزیوں کے خلاف نبرد آزما تھا یہ عہد نامہ نہایت ہی ناخوشگوار گذرا اور اس نے اس کی سخت مخالفت کی اور اپنے آپ 'سونان' ہونے کا اعلان کر دیا اور پاکوبووانو سویم کا لقب اختیار کر لیا، ولندیزی بھلا کب اسے تسلیم کرنے والے تھے لہذا ا کدم جنگ چھڑ گئی، اس نئے پاکوبوانو کے ساتھ اس کے اپنے اہلِ ملک کی ایک بہت بڑی جمعیت ساتھ تھی لہذا ولندیزیوں کو شکست کھانی پڑی اور وہ مغربی جاوا کی طرف چلے گئے، اس طرح مشرقی جاوا ایک بار پھر ان کے اثر سے پاک ہوگیا ۱۷۵۲ء میں انھوں نے پھر ایک بار بٹاویہ میں اپنی ختم شدہ فوجی قوت کو اکٹھا

کرنا شروع کیا اور جب دیکھا کہ طاقت کافی بہم پہنچ گئی ہے تو پھر لڑائی کا آغاز کر دیا مگر وہ اس بار بھی کامیاب نہ ہو سکے، اور ہر محاذ پر انھیں پیچھے ہٹنا پڑا، آخران کا مشہور جرنیل "ہوفنڈرپ" استعفا دے کر واپس ہالینڈ چلا گیا اور اس کی جگہ "ہرتنگ" نامی ایک نیا جرنیل مقرر ہو کر آیا جو نہایت ہی چالاک اور معاملہ فہم شخص تھا۔ اس نے آنے کے بعد ہی منگ کابومی، کو دام فریب میں لانے کے لئے گیانتی کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی جو "گیانتی کانفرنس" کہلاتی ہے۔ یہ کانفرنس ۱۳ار فروری ۱۷۵۵ء میں منعقد کی گئی۔

## ماترم کی دو حصوں میں تقسیم

اس کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ آیندہ سے ماترم کے دو سیاسی حصے رہیں گے، ان میں سے ایک کا حکمراں "منگ کابومی" اور دوسرے کا "پاکو بوانو سویم" ہوگا۔ اور یہ دونوں حکمراں ولندیزیوں کی نگرانی میں بحیثیت حلیف کے حکومت کریں گے۔ اور ان دونوں کی مملکت بجائے سلطنت کے دیسی ریاستیں یا "وارستن لَندَن" کہلائے گی۔ چنانچہ اس عہد نامہ کے بعد سے منگ کابومی نے سلطان جوگ جکارتا اور پاکو بوانو نے سونان پاکو بوانو سویم کا لقب اختیار کیا۔ نیز دونوں کی حدود ریاست کے اعتبار سے یہ طے کیا گیا کہ منگ کابومی کا دارالحکومت "نان جوگ جکارتا آدی نگرت" (جو آجکل جوگ جکارتا کہلاتا ہے) اور سونان پاکو بوانو کا دارالحکومت "سُرکرتا آدی نِگرت" (جسے سولو بھی کہتے ہیں) رہے گا۔ اس طرح سلطنت ماترم جو صدہا سال کے ایک عظیم امتداد سے ایک آزاد اور باوقار مسلمان سلطنت چلی آرہی تھی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ولندیزیوں کی ماتحت ہوگئی اور ولندیزی بھی ایک مدت تک کے لئے اندونیشیا کے

سب سے بڑے سیاسی اور تمدنی مرکز جاوا پر مسلط ہو گئے۔

اب ماترم کی تقسیم کے بعد ولندیزیوں نے سیلون کو جلاوطن کئے ہوئے حکمراں کی طرف بھی اپنی توجہ کو مبذول کیا۔ یہ حکمراں مر چکا تھا اور اس کا لڑکا "ماس سعید" اس کے قایم مقام کے طور پر سیلون میں موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو بھی جاوا میں طلب کیا اور سونان اور سلطان دونوں سے تھوڑا تھوڑا علاقہ لے کر اس کے لئے بھی ایک چھوٹی سی ریاست قایم کردی اور اسے اس ریاست پر "پینگران منگ کونیگورو" کے لقب سے حکمراں بنادیا اور اس طرح اس تلافی مافات سے حتی المقدور ہر ایک کو خوش کر کے اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرتے رہنے کی عمل راہ نکال لی۔

پاکوبوانو ۱۷۸۸ء میں مرگیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا "سونان باگوس" تخت نشین ہوا، اسی طرح ۱۷۹۲ء میں سلطان ہمنگ کوبوانو اوّل کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور اس کی جگہ سلطان ہمنگ کوبوانو دوم تخت نشین ہوا۔ اس کے تین سال بعد ۱۷۹۵ء میں پینگران منگ کونیگورو بھی مرگیا۔

## بلیم بنگن کی لڑائی

اس طرح اس لڑائی کے بعد ماترم کے علاقہ اوسطی جاوا میں ولندیزیوں کے لئے قریب قریب فضا پر امن ہوگئی مگر بیلم بنگن میں ہندو شہزادے برابر ان کے خلاف بغاوتیں کرتے رہے لیکن وہ اتفاق سے اتنے کمزور تھے کہ ولندیزیوں کی کسی ٹکر کو بھی نہیں جھیل سکتے تھے لہذا وہ یکے بعد دیگرے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد لڑتے لڑتے ختم ہوگئے، کچھ ان میں سے بھاگ کر بالی چلے گئے جن کی جگہ ولندیزیوں نے بعد میں دو حکمراں یکے بعد دیگرے مقرر کئے، کہتے ہیں کہ ان حکمرانوں نے اہل جاوا کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اسلام

بھی قبول کر لیا تھا لیکن ۱۷۷۱ء میں بالی کے راجاؤں سے مدد حاصل کرنے کے باعث وہ پھر مرتد ہوگئے، اپنے ارتداد کے بعد انھوں نے ایک عرصہ تک اہلِ بالی کی مدد سے ولندیزیوں کے خلاف جنگ کی مگر ہار گئے اور بالآخر ختم ہو گئے، اس طرح جاوا سے برائے نام رہا سہا ہندو حکمراں خاندان بھی ختم ہوگیا، یہ گویا جاوا کا آخری ہندو حکمراں خاندان تھا جو ختم ہوا۔ اس طرح جاوا کی آیندہ کی پوری تاریخ دورِ غلامی کی وہ تاریخ ہے جسے ولندیزی عہد کی تاریخ کہنی چاہئے کیونکہ اب جاوا کی دیسی حکومتیں خود مختاری کھو کر برائے نام رہ گئی تھیں اور حیثیت میں انگریزی ہندوستان کی ماتحت دیسی ریاستوں سے کچھ زیادہ نہ تھیں، ان ریاستوں میں یکے بعد دیگرے آیندہ انہی خاندانوں کے حکمراں باری باری سے سریر آرائے حکومت ہوتے رہے مگر وہ سب ولندیزیوں کے ماتحت تھے آزاد اور خود مختار نہ تھے، ان کے دورِ حکومت میں آیندہ کوئی اہم قسم کے تاریخی واقعات بھی پیش نہ آئے ماسوا تیس سال بعد کی اس لڑائی کے جو جنگِ جاوا کہلاتی ہے اور رَینگیران دِیپونگورو کے ساتھ لڑی گئی تھی لہذا جاوا کی اس قومی تاریخ کو اب اسی مقام پر ختم کیا جاتا ہے اور ان کے ماتحت خاندانوں کے سلسلوں کو غیر اہم سمجھکر قلم انداز کیا جاتا ہے البتہ "جنگِ جاوا"، کو جو انڈونیشیا کی تاریخ میں پہلی آزادی کی جنگ سمجھی جاتی ہے تاریخ کے سلسلہ میں آگے چل کر بیان کیا جائے گا اب ذیل میں اسی دور کے ان اہم واقعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو جزیرۂ سماترا کی ولندیزی سیاست سے وابستہ ہیں اور تہذیب و تمدن کی تاریخ میں سیاسی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ اہم ہیں۔

## پاڈانگ پر قبضہ

اس ذیل میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر پاڈانگ کا علاقہ ہے جو جزیرہ سماٹرا میں مغربی ساحل پر پھیلا ہوا ہے، اس علاقہ میں تجارتی اہمیت کے پیش نظر انگریز سوداگر پہلے ہی سے آباد تھے جو بنکولن سے نکل کر ۱۶۴۱ء میں یہاں آباد ہو گئے تھے، اس وقت تک یہ علاقہ سلاطین آچیہ کی قلمرو کا ایک اہم ترین جزو تھا، جب سلاطین آچیہ کا زوال ہوا تو ولندیزیوں کو بھی یہاں اثر انداز ہونے کا موقع مل گیا، چنانچہ وہ سب سے پہلے "پائی نن" کے مقام پر وہاں کے مقامی سردار کے ساتھ مل کر ۱۶۶۵ء میں اس حصہ میں وارد ہوئے اور اسی سال انھوں نے سردارِ مذکور کے ساتھ ایک تجارتی عہد نامہ کیا جس کی رُو سے اس علاقہ کے قریب "چنگو" کے مقام پر انھیں اپنا تجارتی مستقر قایم کرنے کی اجازت مل گئی اور دو سال بعد ہی یعنی ۱۶۶۷ء میں انھوں نے پاڈانگ میں بھی اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

۱۶۸۱ء میں ان کی تجارتی کمپنی نے اپنے دفاتر کو اور زیادہ فروغ دینے کے لئے شمالی حصہ میں "تمپانولی" کے مقام پر اپنے مضبوط اڈے قائم کرلئے اور اس طرح وہ رفتہ رفتہ آس پاس کے جزائر پر بھی مسلّط ہوتے چلے گئے اُن کے اس بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار کو دیکھکر انگریز سوداگروں کو بھی تشویش ہونے لگی چونکہ ولندیزی نسبتاً زیادہ عیّار اور فریب کار تھے لہٰذا انھیں مقامی باشندوں سے بھی مدد مل گئی اور بالآخر انگریزوں کو مجبور ہوکر ان علاقوں سے نکلنا پڑا۔ حتیٰ کہ ایک سو سال کی ولندیزی چشمک نے ۱۷۱۹ء تک انھیں ان علاقوں سے بالکل بے دخل کردیا انگریز حالانکہ نسبتاً زیادہ سرمایہ دار اور زیادہ مستقل مزاج تھے مگر وہ مقامی

باشندوں کی نفسیات سے ولندیزیوں کی نسبت زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے اور اسی لئے انھیں اپنی تمام جائیدادیں اور مال ومتاع سب کچھ ولندیزیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر یہاں سے جانا پڑا۔ انگریزوں کے انخلا کے بعد اب یہاں کے مقامی سرداروں کے ساتھ سیاست کی شاطرانہ چالیں چلنے کے لئے ان کے واسطے اب راستہ صاف تھا۔

اسی طرح انھوں نے جنوبی سماٹرا کے علاقہ لمپونگ میں بھی جو مدّت سے سلطان بانٹن کے زیرِ نگیں تھا اپنی تجارتی اجارہ داریاں قایم کر کے کافی اثر بڑھا لیا اس کے بعد پھر سترہویں صدی میں پلیم بنگ کو بھی اپنی تجارت کے اثر میں لے لیا۔ جو سلطان دیماک کے اثر میں تھا۔

اس طرح رفتہ رفتہ ولندیزیوں نے قریب قریب پورے جزیرۂ سماٹرا میں اپنے تجارتی مرکز کھول لئے۔ اور ایک مدت تک پہلے سے آباد چلے آنے والے انگریزوں کے ساتھ جنگ[1] و مبارزت کرتے رہے یہاں تک کہ پھر ان کی لڑائیاں انگریزوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد مقامی سلاطین کے ساتھ چھڑ گئیں جن کا سلسلہ ۱۹۱۰ء تک

---

[1] **یورپ میں انگریزوں اور ولندیزیوں کی جنگ** ۱۶۹۳ء میں "نیوی گیشن ایکٹ" کے ذریعہ انگلستان کے حکمران کرامویل اور ہالینڈ کے شہنشاہ کے مابین جنگ کا آغاز ہوگیا، جس کے نتیجہ کے طور پر دیارِ مشرق میں ہر اس مقام پر بھی یہ دونوں قومیں آپس میں لڑنے لگیں جہاں ان کے تجارتی اثرات قایم تھے۔ یا ان میں باہمی طور پر آویزش جاری تھی۔ چنانچہ اس لڑائی کا اثر ان مقامات پر بھی پڑنے لگا۔ یعنی ولندیزی اور انگریز اس نواح میں بھی لڑنے لگے۔ سب سے پہلے مغربی سماٹرا کے علاقہ "نے ٹال" میں جہاں انگریز ۱۷۵۱ء سے مصروفِ تجارت تھے اور ۱۷۵۵ء سے "بارُوس"

تقریباً سوا سو سال تک جاری رہا۔ یہ لڑائیاں جنگِ بونجول، اور جنگ مننگ کباؤ اور جنگِ آچیہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں اور اہلِ سماترا کے درمیان "جہادِ مقدس" کہلاتی ہیں۔ ان لڑائیوں میں سماترا کے مسلمانوں نے سوا سو سال تک ایسی بہادری اور جوانمردی کا ثبوت دیا کہ اس طویل زمانہ کے کسی حصّہ میں بھی اُنھوں نے اپنے جزیرہ میں ولندیزیوں کو جاوا اور دیگر مقامات کی طرح کبھی بھی کامیابی کے ساتھ مسلّط ہونے کا موقع نہ دیا۔ یہ لڑائیاں اگرچہ خوں آشامیوں اور بربادیوں کے واقعات سے پُر ہیں اور اپنی حیثیت میں ولندیزی سامراج کے بہیمانہ مظالم کی درد بھری داستانیں ہیں لیکن قومی اور مذہبی نقطۂ نظر سے اہلِ سماترا کی تاریخ کا ایک ایسا زرّین باب ہے کہ جو انڈونیشیا کی آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ صبر و ثبات، استقامت، بہادری، جوشِ شجاعت اور اسلام شعاری کا سبق دیتا رہے گا اور خطرات کے ہر موڑ پر ان کی صحیح راہنمائی کرتا رہے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ان کی تاریخِ آزادی کا ایک ایسا پس منظر ہے جس کے ہر گوشہ میں تحفظ اسلام کی خاطر دھن من تن ہر چیز کی بازی لگانے والے مجاہدین کی زندہ تصویریں سرگرمِ عمل نظر آتی ہیں اور مر مٹ کر زندہ رہنا سکھاتی ہیں۔ ان مجاہدین میں

---

میں بھی کاروبار کرتے تھے اس جنگ کے اثر سے ولندیزیوں پر حاوی ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ انھوں نے ۱۶۵۵ء میں تمام پاڈانگ کو ولندیزیوں سے خالی کرا لیا۔ اور اُنھیں مار مار کر یہاں سے نکال دیا۔ اب ولندیزی یہاں سے جزیرہ جاوا میں چلے گئے مگر بعد میں پھر اپنی ریشہ دوانیوں سے اس طرف کو اثر قایم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کچھ زمانہ کے بعد وہ پھر انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اس کے بعد مقامی سلاطین خصوصاً آچیہ اور بونجول کے ساتھ ان کی مبارزت شروع ہوئی۔



مجاہد اسلام دیپونگورو



حضرت امام بونجول



فرزندِ اسلام تیکو عمر

میں سب سے زیادہ قابل ذکر مشہور عالم دین امام بونجولؒ ہیں۔

## پیدیری کی جنگ اور تحریک جہاد کا آغاز

جنھوں نے کم و بیش چالیس سال انڈونیشیا کے دشمنوں کے خلاف اپنے مذہبی جوش کی قوت سے منتشر قوم میں اتحاد و یگانگت پیدا کرکے عظیم الشان معرکے لڑے اور ایک معتد بہ زمانہ خاک و خون اور آتش و دود میں گذار دیا

## امام بونجولؒ

آپ "کوٹا"، واقع آجیہ مغربی سماترا میں ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے باپ سماتری انڈونیشی اور ماں مراقشی عرب تھیں نام و نسب کی ابتدائی کیفیت جو انڈونیشی عرب کے تذکروں میں بیان کی گئی ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بزرگ شیخ عثمان اٹھارہویں صدی کے اواسط میں شمالی افریقہ کے علاقہ مراقش سے ہجرت کرکے ہزاروں میل کی بحری مسافت طے کرنے کے بعد بمعہ اپنی ہمشیرہ "حمتون" سماترا میں وارد ہوئے، نہایت ہی بلند پایہ عالم اور متدین انسان تھے 'کوٹا' کے مقام پر قیام کیا اور اپنے تورع اور تدین کی بدولت دربار شاہی سے "شیخ نگندو" کا خطاب حاصل کیا اور بطور جاگیر کے ایک علاقہ بھی پایا۔ سماترا میں اس زمانہ میں مسجد کا خطیب بھی سرکاری عہدیدار ہوتا تھا چنانچہ بیان الدین جو "کوٹا" کی مسجد جامع کے سرکاری خطیب تھے ان کے ساتھ وابستہ ملاطفت ہوگئے۔ جب کچھ زمانہ گذر گیا تو شیخ نے اپنی بہن حمتون کو انہی کے ساتھ رشتہ زوجیت میں منسلک کر دیا۔ انہی حمتون کے بطن سے ۱۷۷۲ء میں امام بونجول پیدا ہوئے، جن کا بچپن کا نام محمد سَبَب اور لقب پتیا شریف تھا۔

چونکہ ان کے ماموں عربی زبان، ادب اور فقہ کے بڑے عالم تھے، اور پڑھاتے بھی تھے لہٰذا امام صاحب موصوف نے تعلیم انہی سے حاصل کی۔

جب امام صاحب سنِ شعور کو پہنچے تو اپنے باپ ہی کی جگہ خطیب مقرر کئے گئے اور 'راڈانگ' کے اس حلقہ میں برسر اقتدار حکمراں کے خاص درباری معلم بھی مقرر ہوئے، یہ حکمراں "ذاتوساجا چوہو" کے نام سے مشہور تھا۔ آپ کی تربیت کے اثر سے یہ بھی عالم ہو گیا اور بالآخر آپ نے اس کے اشارہ کے بموجب جہاد کی تحریک کا آغاز کیا اور لوگوں کو ولندیزی اثر و اقتدار کے خلاف

اور اپنے وطن کی تاریخ میں جنگِ آزادی کا سنگِ بنیاد رکھ دیا، ان کے یہ معرکے جزیرہ سماترا کی انڈونیشی تاریخ میں پیدیری کی جنگ کے نام سے مشہور ہیں جنھیں بعض مورخین نے پادریوں کی جنگ بھی لکھا ہے۔ اور اسلام کا مقدس جہاد بھی۔

اس جنگ کا آغاز باقاعدہ طور پر ۱۷ اپریل ۱۸۲۳ء کو ہوا اور امام صاحب کی وفات کے آخری سال یعنی ۱۸۶۴ء تک جاری رہا ولندیزیوں نے

---

منظم ہو جانے اور اسلامی شعائر کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین شروع کی چونکہ ایک گروہ ولندیزی اثر کے باعث داتوک کے خلاف تھا لہذا اسے زہر دے کر دھوکے سے ہلاک کر دیا اور ملک میں خانہ جنگی کا آغاز کر دیا۔ امام صاحب حالات کی ناساعدت کا اندازہ کر کے اپنے شاگردوں کے ایک گروہ کے ساتھ ترکِ وطن کر کے داتا جارٹی کی ایک پہاڑی وادی میں منتقل ہو گئے اور آہستہ آہستہ اس پاس کے چھوٹے چھوٹے تین رئیسوں کے اتحاد سے ایک مختصر سی طاقت بہم پہنچائی، یہ اتحاد "پادری" یعنی سفید پوشوں کا اتحاد کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں انڈونیشیا کے سماتری علماء سفید قسم کے لمبے لمبے چغے پہنتے تھے جو وضع میں عیسائی پادریوں سے بہت زیادہ مشابہ ہوتے تھے لہذا اس لباس کی بدولت یہ لوگ بھی مسلمانوں اور ولندیزی حلقوں میں پادری کہلاتے تھے، عقیدہ کے اعتبار سے نہایت ہی سخت تھے، اسلام کا کھویا ہوا وقار حاصل کرنا اور اس حصولِ وقار کے خاطر دشمنانِ اسلام کے ساتھ جہاد کرتے رہنا ان کا مطمح نظر تھا۔

بہرکیف امام موصوف کی اس تحریک (پادری) کی مناسبت سے اس پہاڑی مقام کا نام بھی پادری یا پیدیری پڑ گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ ویرانہ ان کی فوجی نقل و حرکت کے باعث ایک اچھا خاصہ شہر بن گیا، شروع شروع میں اس تحریک میں صرف تین رئیس شامل تھے اب پانچ اور شامل ہو گئے اور اس طرح یہ تحریک "بَرِسنا توان نان سیتاپان" (یعنی آٹھ سرداروں کی تحریک) کہلانے لگی۔ ان رؤسا کی وجہ سے امام صاحب کو ایک باقاعدہ بڑی فوج مہیا ہو گئی۔

چونکہ اس تحریک کا مقصد ولندیزیوں کے خلاف جنگ کرنا اور ان سے اپنے ملک کو آزاد کرانا تھا لہذا ولندیزیوں نے ان کے اثر کو ختم کرنے کے لئے مِنَنگ کباؤ کے اس علاقہ میں اپنے خفیہ فوجی اڈے قائم کرنے شروع کئے جہاں غیر مسلم حکمرانوں کی عملداریاں تھیں۔ چنانچہ امام صاحب

ان لڑائیوں میں اہلِ سماترا پر بڑے بڑے مظالم ڈہائے۔ ان کی بڑی بڑی بستیاں غارت کردیں، ہزارہا پُرامن انسانوں کو محض اپنا غلام بنانے کے خاطر تہس نہس کردیا۔ اگرچہ آخر میں امام صاحبؒ کو شکست ہوئی اور ان کو قید میں بھی جانا پڑا مگر اہلِ سماترا کے دل میں ولندیزی استعمار کے خلاف ایک آگ بھڑک اٹھی جو پھر کبھی نہ بجھی بلکہ ان کے مظالم کے طوفانوں میں اور بھی زیادہ بھڑکتی رہی۔

---

نے سب سے پہلے ان راجاؤں کی طرف توجہ مبذول کی اور رفتہ رفتہ ان میں سے بہتوں کو ختم کرکے ان کے علاقوں کو اپنے ممالکِ محروسہ میں شامل کرلیا اور پھر باقاعدہ سنہ ۱۸۲۳ء سے سنہ ۱۸۳۷ء تک ولندیزیوں سے مقابلہ کیا اور "بونجول" کے مقام کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، اس مقام کی مناسبت سے آپ "امام بونجول" کہلاتے ہیں۔ اب یہ قصبہ سُماترا کا ایک اچھا خاصہ شہر ہے اور مشہور تاریخی مقام ہے۔ اس مقام کا آپ کا پہلا معرکہ مشہور ولندیزی فوجی افسر کرنل رُوف کے ساتھ ۷ اپریل سنہ ۱۸۲۳ء کو ہوا۔ یہیں سے فوجیں لڑتی لڑتی "پیڈریؔ" کے محاذ پر نبرد آزما ہوئیں۔ یہ لڑائی تقریباً دس سال تک پوری خونریزی کے ساتھ جاری رہی بالآخر ولندیزیوں نے کسی طرح اپنا دامِ فریب پھیلاکر امام صاحب کے ایک ساتھی "داتو بندا ہارو" کو اپنی طرف ملالیا جس نے غلطی یہ کی کہ مشہور ولندیزی کرنل لاؤت کو بلالایا۔ چنانچہ امام کو جب اس کا پتہ چلا تو بہت افسوس کیا۔ بالآخر سنہ ۱۸۳۳ء میں انھیں شکست ہوگئی اور مجبور ہوکر انھیں ولندیزیوں کے ساتھ صلح کرنی پڑی۔ صلح کی رو سے ولندیزیوں نے انھیں یہ فریب دیا کہ وہ فی الحال انھیں بوکت تنگی کا ایجنٹ بنادیتے ہیں مگر امام نے اسے قبول نہ کیا بالآخر انھوں نے امام کو گرفتار کرلیا اور قید کرکے مسیحیت کے مشہور مقام "چونڈ پور" میں نظربند کردیا اس کے بعد وہ آپ کو امبون لے گئے۔ پھر کُمبا میں منتقل کردیا، اور جب وہاں بھی امام نے اپنی جہاد کی تحریک کو جاری رکھا تو نوٹا لے آئے جہاں ۲۳ سال قید و بند میں گذار کر بعمر ۹۲ سال سنہ ۱۸۶۴ء میں انتقال فرماگئے، آپ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور مجاہدِ اسلام گزرے ہیں، یوں مرنے کو تو بہرحال سب ہی کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے، مگر اس سے بہتر مسلمان کے لئے مرنا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے دین اسلام اور اہلِ اسلام کی خاطر لڑتے لڑتے ختم ہوجائے، اور بہادری اور جوانمردی کی تاریخ میں ایک

**آچیہ میں جہاد کی تحریک کا شیوع** بلکہ اسی دور میں آپ کے اثرات نے اور بھی دوسرے مقامات پر آزادیٔ وطن کی روح کو پھونک دیا۔ چنانچہ مشہور اسلامی سلطنت آچیہ جس کی تفصیلات 'عہد اسلام' کے باب میں گذر چکی ہیں، جب آخری آزاد اور بڑے حکمراں سلطان محمود شاہ (۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۴ء) کی وفات کے بعد کمزور ہوگئی تو ولندیزیوں کو یہاں بھی دست اندازی کا موقع ملا۔ اگرچہ وہ باوجود اپنی پُر فریب چالوں کے ۱۹۱۰ء تک کے ایک طویل امتداد میں کسی وقت بھی اس ملک میں کامیاب نہ ہو سکے مگر یہ ضرور ہے کہ ان ولندیزیوں کی بہیمت و بربریت کے باعث اس سرزمین کا امن و عافیت ایک زمانہ تک کے لئے ختم ہوگیا اور وہ غریب اور جوشیلے باشندے جو کوئی اچھا اور عظیم تمدنی کارنامہ انجام دینے کی طرف پُر امن ہونے کی صورت میں توجہ صرف کرتے اپنے وطن کے تحفظ اور دفاع میں مصروف رہنے کے باعث مدافعانہ لڑائیوں میں لگے رہے اور کوئی ایسا عظیم تمدنی کام انجام نہ دے سکے۔ جو انھوں نے کبھی پُر امن رہنے کی صورت میں اپنے قدیم سلاطین آچیہ کے عہد میں انجام دئے تھے۔ پہلے امن تھا، آشتی تھی، صلح کُل کا ماحول تھا، اب ولندیزی سامراجیوں کی فتنہ طرازیوں کے باعث نہ امن باقی رہا تھا اور نہ چین، ہر طرف لوٹ ہی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ دولت اہلِ ملک یہ ان (ولندیزیوں) کے سوداگر چھاتے جارہے تھے، اور سلطنت (آچیہ، کو ان کی پُر فریب سیاست نے بالکل مضمحل کر دیا تھا۔ اور مذہب اسلام بھی اب ان کے متعصب پادریوں کی سازشوں کے

---

زریں روایت اپنے پیچھے چھوڑ جائے، امام بونجول کی زندگی بھی اندونیشیا کی تاریخ آزادی کی ایک ایسی ہی زرّین یادگار ہے۔

سبب خطرہ سے محفوظ نہ تھا۔ اس طرح مسلمان ہر طرف سے پریشانیوں میں گھر چکے تھے۔

چنانچہ آچیہ کے مسلمان بھی جب مجبور ہو گئے تو بونجول اور دیگر علاقوں کے مجاہدین اسلام کی طرح متحد ہو گئے۔ اور ان سامراجیان ہالینڈ کے خلاف انھوں نے بھی بیک نعرہ پُرجوش ۱۸۶۹ء میں جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا جو آچیہ کی تاریخ میں جہادِ اسلام کے نام سے مشہور ہے۔ بہرکیف مسلمان باوجود اپنی ہر مجبوری کے پورے بیس سال تک ہر ہر محاذ اور ہر ہر علاقے میں لڑتے رہے چنانچہ اس عہد کے مورخین نے لکھا ہے مسلمان اس جہاد میں اپنے دل کھول کر لڑے کہ ولندیزیوں کو پیچھا چھڑانا بھی مشکل ہو گیا اور انھیں پتہ چل گیا کہ اسلام ایک زندہ قوت کا نام ہے۔ جب مسلمان ارادہ کر لیتا ہے تو نہ موت اسے روک سکتی ہے اور نہ دشمن کی طاقت اسے ڈرا سکتی ہے، وہ جان پر کھیل کر دشمن کو فنا کر دیتا ہے اور اس کی قوتوں کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے یا پھر خود شہید ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اب ولندیزی بھی کہ جو دنیا کے مانے ہوئے چالباز لوگ ہیں اسلام کے اس جذبۂ جہاد سے ششدر و حیران تھے اور ہر طرف شکست و ریخت کے باعث چالیں سوچتے تھے۔ بالآخر انھوں نے یہ کیا کہ عین اس وقت جبکہ مسلمان کامیابی کے سرے پر کھڑے ہوئے تھے کہ ان کے بعض ساتھیوں کو دامِ فریب میں لا کر ان کے رہنما محمد سامان المعروف بہ "تونکو تھی ڈیرو" (یعنی مقام تھی ڈیرو کا عالم) کو دھوکے سے مروا دیا۔ اور اس طرح آچیہ کا سارا کھیل ۱۸۹۱ء میں بگڑ گیا۔ اور کچھ عرصہ تک کے لئے جہاد کی تحریک بھی سرد پڑ گئی۔

بہرحال جیسا کہ آچیہ کے اس عہد کے بعض مسلم مورخین نے لکھا ہے اس کے بعد پھر ولندیزیوں نے اس علاقہ میں جو مظالم ڈھائے اور سختیاں کیں وہ ان کے جور و تعدی کی تاریخ کا ایک ایسا کالا ورق ہے کہ جس کے مطالعہ سے آجکل کی مہذب دنیا بھی کانپ اٹھتی ہے اور انسان لرز جاتا ہے۔ ہزارہا کی تعداد میں اس علاقہ کے مسلمانوں کو (کہ جن کی تعداد یہاں کی کل آبادی کا ۹۷ فیصد ہے) پکڑ پکڑ کر

دہکتی ہوئی بھٹیوں میں جھونک دیا، کہیں انھیں سمندر پر لیجا کر ڈبو دیا، کہیں ان کی بستیاں
تہس نہس کر دیں، کہیں انکے بڑے بڑے گاؤں جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیے۔ مگر بہادر
بھی ہوں تو ایسے ہوں۔ ظلم سہتے رہے، اور ہر آزمائشِ ایمانی سے گزرتے رہے
لیکن عزمِ جہاد کو نہ چھوڑا، جب کچھ زمانہ گزر گیا تو پھر ایکبار متحد ہو کر مشہور
فرزندِ اسلام تیکو عمر کی سرکردگی میں میدانِ جہاد میں نکل آئے
اور سنہ ۱۹۱۰ء تک اپنے دشمن ولندیزیوں سے اسی طرح لڑتے رہے
جس کی تفصیلات آگے کے اوراق میں دیئے ہوئے فٹ نوٹ
پر تیکو عمر کے حالات میں درج ہے۔ لہٰذا اب ان واقعات
کو اسی منزل پہ چھوڑ کر جاوا کے حالات پر پھر توجہ کو
مبذول کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۷۵۵ء تک کے حالات کا جائزہ بالاجمال
پچھلے اوراق میں لیا جا چکا ہے۔ اور اس سلسلہ میں سنہ ۱۸۲۵ء تک تقریباً
تیس سال کے امتداد کے واقعات کو نظر انداز کیا جاتا ہے، کیونکہ جاوا کی تاریخ
تمدن میں یہ امتداد کوئی خاص اہمیت رکھنے والے واقعات پر مشتمل نہیں ہے۔
مقامی سلطنتوں میں جن کی حیثیت سنہ ۱۷۵۵ء سے ماتحت دیسی ریاستوں سے زیادہ
نہ تھی، دستور کے مطابق باری باری سے متعدد حکمراں تاج و تخت پر آتے رہے
اور جاتے رہے مگر ان کی مدتِ حکومت میں تمدن پر اثر ڈالنے والے تاریخی
اہمیت کے واقعات کوئی خاص انداز میں نہیں گذرے، اسی لئے اس امتدادِ
تاریخی کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ البتہ سنہ ۱۸۲۵ء سے مقامی سلطنتِ
جاوا (ماترم) میں جس کے اشارات سماترا کے حالات کا جائزہ لینے سے قبل پچھلے
اوراق میں کئے جا چکے ہیں، ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جبکہ جاوا کی قومی تاریخ

میں تمدنی نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، معنوی حیثیت سے اس دور کو "دیپونگورو"[۱] کا دور خیال کیا جاتا ہے جو جنگ آزادی کا پہلا دیباچہ اور اہلِ جاوا کے جہادِ اسلامی کا انتہائی عملی تصور ہے۔ اصطلاحِ تاریخ میں اسے "جنگِ

---

۱ دیپونگورو: یہ سماترا کے مجاہدِ اعظم امام بونجول کی طرح جاوا کے مسلمان حکمران خاندان ماترم کا چشم و چراغ تھا، اسلامیانِ جاوا کا اولوالعزم رہنما، سلاطینِ ماترم کے خانوادہ شاہی کا نامور ترین ہیرو، ولندیزیوں کا سخت ترین دشمن، اسلامی علوم کا متبحر عالم، صاحبِ قلم اور صاحبِ سیف تھا، اگر اس کو جنوبی ہندوستان کے عظیم الشان رہنما سلطان ٹیپو سے مشابہ کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے واقعاتِ تاریخی اور حالاتِ شخصی بھی بہت حد تک سلطان ٹیپو سے ملتے ہیں، جس طرح سلطان ٹیپو، سلطان میسور حیدر علی کا بیٹا تھا، اس طرح دیپونگورو بھی سلطان ماترم کا ایک شہزادہ تھا اس کی لڑائی انگریزوں کے ساتھ تھی اور یہ ولندیزیوں کے خلاف جنگ آزما تھا، وہ میسور کو ایک آزاد سلطنت کے طور پر برقرار رکھنے کا خواہشمند اور یہ پورے جاوا کی آزادی کا علمبردار تھا، اسلامی تہذیب، اسلامی ثقافت اور اسلامی اتحاد و اقتدار دونوں کے نصب العین سیاسی کی روح تھے، دونوں اس بات کے دعویدار تھے کہ غیر ملک میں غیر قوم کو غیر قوم پر حکمراں بن جانے اور ان کے ہمہ گونہ وسائل پر چھا جانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آزادی اور خود مختاری ہر قوم کا پیدائشی حق ہے، جو ایک ملک، ایک قوم اور ایک تمدن کی وجودی برکات سے ایک قوم کو فطری طور سے حاصل ہے۔ جن کا انتہائی سرچشمہ مذہب ہے، بغیر مذہب نہ تمدن ارتفع حاصل کرسکتا ہے اور نہ دنیا میں انسانی شرافت پنپ سکتی ہے، مذہب ہی کی بدولت انسان اخوت و رافت کے سلسلہ میں منسلک رہتے ہیں، خدا کی غیر مرئی قوتوں کے خوف سے ڈرتے ہیں، یہی خوف امن کا گہوارہ اور عافیت کا سرچشمہ ہے، جس کی روانی سے قافلۂ حیات رواں ہے اور تمدن کی منزل باقی ہے، ورنہ دام و دد اور وحوش و طیور اور انسان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا جب کوئی غیر ملکی حکومت مسلط ہو جاتی ہے تو تمدن کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے اور محکوم قوم برباد ہو جاتی ہے، ترقی کی راہیں اور حوصلہ مندی کی شاہراہیں سب مسدود ہو کر

جاوا" کہتے ہیں۔

## جنگِ جاوا ۱۸۲۵ء تا ۱۸۳۰ء

یہ لڑائی ۱۸۲۵ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۳۰ء تک جاری رہی، یہ لڑائی محض تخت وتاج ہی

رہ جاتی ہیں۔

یہی نظریات تھے جنہوں نے جنوبی ہند میں "سلطان ٹیپو" کو اور جاوا میں "دیپونگورو" کو خاک وخون سے ہولی کھیلنے پر آمادہ کیا تھا اور خاکِ وطن اور تمدن اسلام کو بچانے کے لئے قربان ہوجانے کی دعوت دی تھی، یہ دونوں ہیرو اپنے اپنے ملک میں پاسبانِ تمدنِ اسلام کی حیثیت سے عظمتِ ابدی اور شہرتِ سرمدی رکھتے ہیں۔

اس مقام پر چونکہ دیپونگورو کے حالات کا جائزہ لینا ہے لہٰذا ٹیپو کے واقعات سے قطع نظر کیا جاتا ہے اور مختصر پیرایہ میں روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا جاتا ہے کہ اس کا مرتبہ ناموران انڈونیشیا کی تاریخ میں دیہیم و اورنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مختصر حالات یہ ہیں:—

وہ شہر ماترم میں ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوا، اس کا بچپن کا نام "ماس کورتو" تھا اس کی پرورش بھی اس کے دادا سلطان سایوہ کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی جو ۱۷۹۲ء سے ۱۸۰۲ء تک ماترم کا حکمراں رہا ہے۔ اور اخلاق وکردار کے اعتبار سے نہایت ہی خداترس، متورع اور متشرع شخص تھا، تخت پر بیٹھتا تھا مگر دل درویشانہ رکھتا تھا، دیپونگورو کو اس کی ہدایت تھی کہ "بڑے بن کر بڑوں کے سے کام کرنا، اور اپنی بڑائی سے بڑوں کا نام روشن کرنا، اسلام کے لئے جینا اور اہلِ اسلام ہی کے لئے مرنا۔"

چنانچہ ہونہار دیپونگورو نے بھی بڑے ہوکر بڑے دادا سلطان سایوہ کی نصیحت ہی کے مطابق اپنی زندگی کو وقف کردیا۔ حالانکہ جوان ہوجانے کے بعد تخت وتاج کا حقدار تھا، اور قانونی وارث تھا مگر اپنے اسلامی دل کے مجاہدانہ تقاضوں سے اس قدر مجبور تھا کہ اس نے بادشاہ بننا اور بادشاہ رہکر غیرملکی مقتدر ولندیزیوں کی ماتحتی میں رہنا کبھی گوارا نہ کیا، بلکہ جب سلطنت پر فائز ہونے کی باری آئی تو اپنا حق اپنے چھوٹے بھائی

کی بحالی کے لئے نہ تھی بلکہ پورے ملک کی غصب شدہ دولتِ آزادی کو بحال کرنے کی لڑائی تھی، عہدِ رفتہ کی شوکتِ گذشتہ کو دوبارہ زندہ کرکے اہلِ اندونیشیا کے سامنے حبُ الوطنی کے فرائض سے عُہدہ برا ہونے کی لڑائی تھی، جو عموماً نہایت ہی مخلص صاحب

---

سلطان جارُت کو سپرد کرکے خود ایک مبلغ اسلام بنگیا، لیکن کچھ زمانہ کے بعد جب کاروبارِ حکومت کی نزاکتوں نے اس کی عاقلانہ مشاورت کی ضرورت کو محسوس کیا تو وہ اپنے حکمران بھائی کا مشیر بن گیا اور اپنے خدمتِ وطن کے مشن کو بھی پورا کرتا رہا۔ کچھ لوگوں نے خفیہ طور پر سلطان جارُت کے خلاف ولندیزیوں سے سازباز کرکے اس کو ختم کرنے کی سازش کی، اتفاق سے کچھ زمانہ کے بعد سلطان کا انتقال ہوگیا اس وقت پنگیران دیپونگورُو اپنے تبلیغی مشن کے کاموں میں مصروف تھا کہ اچانک ولندیزیوں نے سلطان مرحوم کے سہ سالہ لڑکے "ریڈن ماس مینون" کو اسکا قایم مقام بناکر تخت و تاج کا وارث قرار دیدیا اور اپنی ریشہ دوانیوں سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی تدابیر بروئے کار لائے یعنی من مانی کرنے کے اسباب پیدا کرتے رہے، لہذا یہ بات حریت پسند دیپونگورُو کو کس طرح بھا سکتی تھی وہ ایک دم ولندیزیوں کے خلاف علی الاعلان میدان میں نکل آیا، اور محلاتِ شاہی چھوڑ کر "تیگل رے یو" کے مقام پر جا پہنچا جہاں ماترم کے قدیم نمکخواروں کے علاوہ اس کے اسلامی عقیدتمندوں کی بھی بڑی اکثریت تھی نیز علمائے اسلام کا بھی اس مقام پر کافی اثر و اقتدار تھا لہذا اس نے اپنی سعی سے علمائے اسلام کی معیت میں ایک عظیم الشان مذہبی جلسہ منعقد کیا اور اس جلسہ میں بقول بعض مؤرخین ایک پرجوش تقریر کی جس کا ماحصل اہلِ اندونیشیا کی اہلِ ہالینڈ کے ہاتھوں بربادی، جاوا میں مذہبِ اسلام کے لئے آیندہ کے خطرات اور تمدنِ شرقیہ ہندیا (اندونیشیا) کو ختم کرنے کی ولندیزی پالیسی کی عقدہ کشائی تھی۔ اس نے صاف صاف الفاظ میں اپنی قوم پر واضح کردیا کہ اگر وہ من حیث القوم کے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اس پُرفتن دور میں سوائے احکامِ اسلام پر عمل کرنے کے ان کے لئے اور کوئی دوسری صورت نہیں ہے اب ان کے لئے خطرناک وقت آچکا ہے جسکا مقابلہ سوائے جہاد فی سبیل اللہ کے کسی اور طرح ممکن نہیں، انھیں اتحاد، تنظیم، اور اخوتِ باہمی کی ہر وقت ضرورت ہے اور یہ چیزیں اسلام پر عمل کئے بغیر کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوسکتیں۔

کردار، اور صاحبِ عزم لوگوں کا شیوۂ شجاعت مانا گیا ہے اس لڑائی میں ایک فریق ولندیزی تھے اور دوسرا فریق جاوا کا عظیم ترین ہیرو اور فرزندِ اسلام ڈیپونگورو تھا، ایک طرف وسائل، قوت، اور پُرفریب سیاست کی فراوانی تھی اور دوسری طرف

---

چنانچہ اس کے انڈونیشی سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کی اس تقریر نے سوئی ہوئی قوم کو ایک دم چونکا دیا اور خطرات کا صحیح احساس دلاکر مجاہد بنا دیا، حتیٰ کہ لوگ سر بکفن ہو کر اس کی اطاعت میں جانبازوں کی طرح میدان میں نکل آئے اور اس کو اپنا اسلامی اور سیاسی ہر طرح سے رہنما بناکر دشمن سے مبارزت کرنے لگے۔

ولندیزی جو اسلام کے نظامِ تنظیمی کے علاوہ کبھی کسی چیز سے نہ ڈرتے تھے دیپونگورو اور اس کے ہزارہا ساتھیوں کا یہ جوش و خروش دیکھکر تہلکہ میں پڑ گئے اور اپنی سپاہ کو عام لام بندی کا حکم دے کر آمادۂ جنگ ہو گئے۔ اس طرح "تیگل ریتے لو" کے مقام پر ۱۸۲۵ء میں اہلِ جاوا کی پہلی جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔

ڈیپونگورو کے پاس نہ اتنے اعلیٰ قسم کا سامانِ حرب ہی تھا اور نہ سپاہی اتنے عمدہ تربیت یافتہ تھے لہذا پہلے ہی معرکہ میں ہزاروں کی تعداد میں شہید ہو گئے، اور خود دیپونگورو کو بھی "کالی سابا" کے مقام پر پیچھے ہٹنا پڑا۔ مگر اس کے بانکپن اور مجاہدانہ عزم میں مطلق فرق نہ آیا، وہ اسی طرح دردانہ اپنے مسلمان بھائیوں کو دعوتِ جہاد دیتا رہا۔ چنانچہ بلیرڈ کے مقام پر ۱۸۲۶ء میں پھر ایک بار اس کے ساتھ سر بکفن مجاہدینِ اسلام کا ایک عظیم لشکر اکھٹا ہو گیا۔ ولندیزیوں نے جب دیکھا کہ اب کے بار شکست ہونا یقینی ہے تو ہر وقت اپنے جاسوس کے ذریعہ روپیہ پیسہ اور منصب و اعزاز کا لالچ دلاکر ایک کثیر تعداد کو دیپونگورو سے منحرف کرا دیا، مگر اس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے ارادہ کو ملتوی نہ کیا، اگرچہ پھر ایک بار اس کو محاذِ جنگ چھوڑکر "سولو" کی طرف جانا پڑا لیکن اپنے مقدس مقصد کے نام پر بٹہ نہ لگنے دیا، ولندیزی اسکا تعقب کرتے ہوئے جب سولو میں بھی آپہنچے تو وہ "دی لنگو" کی طرف نکل گیا اور سنبھل کر پھر ایسا حملہ کیا کہ ولندیزی عش عش پکار اٹھے اور میدان چھوڑکر بھاگ نکلے، تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس بار ولندیزیوں کی یہ کیفیت تھی کہ وہ جس طرف بھی رُخ کرتے تھے، بُری

محض عزم، حوصلہ، سچائی اور حفاظت حقوق کے خاطر جہاد فی سبیل اللہ کا پر خلوص مظاہرہ تھا جس سے اسلام کی ایک غیر تمند قوم زندہ رہتی ہے اور اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے۔

---

طرح سے ہارتے تھے، یہاں تک کہ بہت سے اہم مقامات ان کے ہاتھ سے نکل گئے، اور قریب تھا کہ انھیں شکست ہو جاتی کہ اک دم انھوں نے دیپونگورو اور اس کے جرنلوں کے پاس اپنی ایک سفارت بھیجی اور درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ صلح کرنا چاہتے ہیں اور اس صلح میں وہ اس کے ہر مطالبہ کو مان لیں گے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے کہ اکثر بہادر شخص جتنا دلیر ہوتا ہے اتنا ہی سادہ لوح، سچا، اور بے فریب بھی ہوتا ہے، دیپونگورو بھی اگرچہ بے پناہ بہادر تھا مگر اسی قدر سادہ لوح اور سلیس طبیعت بھی تھا، اپنے جرنلوں کے کہنے میں آ کر صلح کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے راضی ہو گیا۔ کانفرنس ہوئی مگر کامیاب نہ ہو سکی اور ولندیزی اس کی ذات کو نقصان پہنچانے کا جو منصوبے کر آئے تھے ان میں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

چنانچہ کچھ دن گذر جانے کے بعد ولندیزیوں نے سازش کر کے ماتزم کے چند با اثر جرنیل مثلاً کیائی مُوجُو اور رُمنگ کو بُومی میں اختلاف پیدا کرا دیا اور رمنگ کو بومی کو لالچ دے کر اپنی طرف ملا لیا اور ان میں باہمی طور پر خانہ جنگی چھڑا دی۔ اور مذہبی سوال پیدا کر کے بالی، تدورے ترنباتے، مکاسر، امفور، مدورا اور مِنِنگ کیاؤ وغیرہ مقامات کے غیر مسلموں کو اکھٹا کر کے مُنگ کو بُومی کی سرپرستی میں دِیپُونگورُو کے خلاف لڑا یا، کہتے ہیں کہ یہ لڑائی ۱۸۲۸ء میں دلُوخرِہِیدُو، کے مقام پر لڑی گئی تھی مگر اسقدر خوفناک تھی کہ جاوا کے باشندوں نے اس سے پہلے کبھی بھی اسکا تجربہ نہیں کیا تھا۔ مگر باوجود اسقدر اشتداد کے دِیپُونگورُو کی ہمت میں بل نہ آیا، وہ اسی جوش و خروش کے ساتھ لڑتا رہا کہ ایک دم ولندیزیوں نے اس کی فوج کے سب سے بڑے جرنیل ریڈن علی باسُیو کو دھوکہ سے قید کر لیا اس افسر کا قید ہونا تھا کہ دیپونگورو کی فوج میں ہلچل مچ گئی اور ایک عام ابتری پھیل گئی۔ اگرچہ دِکیجاوُان، کے مقام پر اس نے کافی حوصلہ کے ساتھ بڑے دشمن کا مقابلہ کیا مگر اب اس کے پاس نہ راشن رہا تھا اور نہ سامانِ حرب،

بہر حال دیپونگورو نے پہلی بار ۱۸۲۵ء میں حملہ آور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے 'تیگل رے یو' کے مقام پر اپنے کمزور اور غیر تربیت یافتہ ساتھیوں کی ایک عظیم فوج کو اپنے وطن، اور اپنے اہلِ اسلام کے تمدن کو آزاد کرانے کے لئے بہادری کے ساتھ لڑا دیا اور پھر اس کے بعد بھی جگہ جگہ خونریز معرکے لڑے اور اگرچہ اکثر مقامات پر پسپائی سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر ہمت نہ ہاری اور عزم واستقلال میں بھی فرق نہ آنے دیا نہ قلت اسباب کو خاطر میں لایا اور نہ دشمن کے جدید اصولِ جنگ سے کبھی طبیعت میں ہیراس آنے دیا، بلکہ بہادر محبانِ وطن کی طرح لڑتا رہا اگر ساتھیوں نے دغابازی نہ کی ہوتی تو یقیناً اسے کبھی شکست کا منہ دیکھنا نہ پڑتا، اور نہ کبھی انڈونیشیا کو غلام بنانے والے ولندیزیوں کی قید وبند میں مجبوری اور مایوسی اسے پیش آتی۔ ۱۸۳۰ء

---

نتیجہ یہ ہوا کہ فوج میں ایک عام کمزوری سی پیدا ہوگئی۔

چنانچہ اسی اثناء میں جب ولندیزیوں نے ایک صلح کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی تو اس کے اکثر فوجی افسر راضی ہوگئے، یہ دیکھکر دیپونگورو کو بھی راضی ہونا پڑا، بالآخر مارچ ۱۸۳۰ء میں 'لانگ' کے مقام پر یہ کانفرنس منعقد ہوئی اور تین ہفتہ تک اس کی متعدد نشستیں ہوتی رہیں آخر ایک نشست میں دھوکہ دے کر اس بہادر اور جانباز انڈونیشی رہنما کو انھوں نے قید کر لیا اور نظر بند کر کے پہلے ماتن کے مقام پر، اور پھر مکاسر کے اس علاقہ میں بھجوادیا۔ جہاں ان کے خود کے ہم مذہب لوگ بستے تھے، آخر کار وہ اسی قید وبند میں ۸ رفروری ۱۸۳۵ء کو بعمر ۵۰ سال راہیٔ ملکِ بقا ہوا، اس کی قوم آج تک اس کو روتی ہے، اور اس کے مجاہدانہ عزائم، دلیرانہ حوصلوں اور حریت نواز کارناموں کو یاد کرتی ہے، اگرچہ دیپونگورو سچے محبِ وطن اور ایک مخلص اسلامی سپاہی کے طور پر مردانہ وار گذر گیا مگر اپنی قوم کو جنگِ آزادی کا وہ سبق پڑھا گیا جس کی وجہ سے انڈونیشیا کی بہادر اور ہونہار قوم نے بالآخر خود مختاری کا معرکہ جیت لیا اور تمدن کو آزاد کرالیا۔ سچ ہے اسلام کا چمن شہیدوں کے خون سے پربہار ہے۔

میں اس کو بوجوہ چند در چند شکست ہوئی اور ولندیزی اسے قید کر کے لے گئے اس طرح جاوا کی عظیم جنگِ آزادی ختم ہوگئی اور ولندیزی پورے طور پر جاوا پر چھا گئے، بلکہ پھر انھوں نے انتقام کے طور پر وہ حرکتیں کیں کہ جو ایک تہذیب کا دعویٰ کرنیوالی قوم کے لئے کسی طرح بھی زیب نہیں دیتیں۔

بہر حال دیپونگورو کے خاتمہ سے جاوا کی قومی تاریخ بھی کم از کم ایک سو سال کے لئے ختم ہوگئی کیونکہ اس دور کے بعد ماترم کی ٹوٹی پھوٹی ریاستوں میں پھر کبھی ایسا انقلاب نہ آیا جو انھیں ولندیزی شکنجۂ غلامی سے چھڑا لیتا اور ان کی کھوئی ہوئی عظمتِ آزادی انھیں دلا دیتا، اب ولندیزی جاوا پر مکمل طور پر غالب آ گئے، اس غلبہ کے بعد انھوں نے پھر اپنی ساری توجہ جزیرہ سماترا کے مختلف علاقوں کو زیر کرنے کی طرف منعطف کر دی اور اس انعطاف توجہ کے سلسلہ میں منِنگ کباؤ اور آچیہ کے مقامات پر سالہائے دراز تک بہادر اندونیشیوں کے ساتھ خونریز لڑائیوں کا ایک ایسا تانتا بندھا کہ وہ سنہ ۱۹۱۰ء تک کسی نہ کسی حیثیت سے برابر جاری رہا۔ ذیل میں اب اختصار کے ساتھ انہی حالات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

چونکہ آچیہ کا زوال ولندیزیوں کی فتح کی آخری کڑی تھی لہذا اب اس تسلسل میں پہلے منِنگ کباؤ کے واقعات ہی کو حیزِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔

**منِنگ کباؤ کی جنگِ آزادی**

"منِنگ کباؤ" سماترا کا مشہور پہاڑی علاقہ ہے، یہاں کے باشندے "باتاک" کہلاتے ہیں اور تمدن کے اعتبار سے بھی اندونیشیا میں بہت ہی قدیم روایات کے حامل ہیں، کسی زمانہ میں اس علاقہ میں مظاہر پرستی کا بھی بڑا غلبہ رہا ہے پھر رفتہ رفتہ کچھ علاقہ بدھ مذہب

کے اثرات میں آنکر بدہ بھی ہو گیا تھا، بعد میں اسلام اور عیسائیت نے بھی اس علاقہ میں کافی اثر حاصل کیا، اندرونی حصّہ کے لوگ اب بھی مظاہر پرست ہیں، جن کے اوضاع واطوار جیسا کہ مُبصّرین کا بیان ہے تاہنوز پرانے اور قدیم ہیں، لڑنے بھڑنے میں بھی پاکستان کے سرحدیوں کی طرح بڑے مضبوط اور بہادر ہیں۔ اُنیسویں صدی کے اوا خر تک جبکہ ولندیزیوں نے یہاں غلبہ حاصل کیا ایک خاص خاندان کے حکمراں "سی سِنگا مَنگا راجہ"[1] کے لقب سے ترتیب وار مشہور تھے۔ چنانچہ آخری حکمراں بھی اسی ترتیب سے "سی سنگا منگا راجہ یازدہم" کہلاتا تھا، جو انڈونیشیا کی قومی تاریخ میں "مِننگ کباؤ کا سب سے بڑا اور بہادر ترین حکمراں[1] گذرا ہے، اس نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا، چنانچہ اسلام قبول کرنے کے بعد

---

**سی[1] سنگا منگا راجہ ۱۸۸۳ء تا ۱۹۰۷ء**

یہ اپنے خاندان کا بارہواں اور آخری حکمراں گذرا ہے۔ ولندیزی اس کے عہد سے پہلے ہی ۱۸۵۳ء میں ایک خاص چال چلکر "باتاک" کے علاقہ پر چھا گئے تھے۔ اور راجہ کو برائے نام سا حکمراں بنا دیا تھا۔ بالآخر جب اس بارہویں حکمراں کا دور شروع ہوا تو اس نے ۲۹ رجون ۱۸۸۳ء میں یعنی اپنی تخت نشینی سے کچھ ہی عرصہ بعد ایک بڑی سی فوج لے کر علاقہ "پاڈانگ ہِس لومیاں" کے مقام پر جہاں ولندیزی اثر شدّت کے ساتھ قایم تھا ایک وحشیانہ حملہ کر دیا اور انھیں (یعنی ولندیزیوں کو) مار مار کر پیچھے کی جانب ڈھکیل دیا۔ اور ۲۴ سال تک کم وبیش وہ ولندیزیوں کے ساتھ خونریز لڑائیاں لڑتا رہا۔ اس نے اسی زمانۂ جنگ میں طوبی کا علاقہ بھی فتح کیا جہاں عیسائی آباد تھے اور ولندیزیوں کے خاص آلۂ کار تھے، اس کے بعد وہ "پےئی سَر" کی طرف بھی بڑھا، اور ہزاروں عیسائیوں کو قید کرتا ہوا آگے کی طرف نکل گیا، حتیٰ کہ اس نے مشہور مقام "بک کارا" کی طرف بھی پیش قدمی کی، اور علاقہ "آچیہ" کے چھوٹے چھوٹے روساکو بھی اپنی طرف ملا لیا، ولندیزی اس کی سیاست اور غیر معمولی حوصلہ سے بڑے پریشان تھے، سالہائے

اس نے بھی ۴۲ سال تک اپنے ملک کو ولندیزی اثر سے بچانے کے لئے جاوا کے مشہور ہیرو دیپونگورو کی طرح بڑی بڑی خونریز لڑائیاں لڑیں، اور پورے علاقہ منگ کباؤ کے باشندوں میں حب الوطنی، ایثار، قربانی، اور قومی تمدن کو بچانیکا

---

دراز کی لگاتار شکستوں نے انھیں سماترا پر غلبہ برقرار رکھنے کے سلسلہ میں بالکل مایوس کر دیا تھا۔ آخر کار ناکامی کی انتہا پر پہنچکر ۱۹۰۷ء میں جبکہ انھیں یہ ناکام لڑائیاں لڑتے ہوئے پورے ۴۲ سال گذر چکے تو سنگا راجہ کے ساتھیوں میں پھوٹ ڈالکر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی وہی پرانی سیاست بروئے کار لائے جو وہ اکثر جاوا میں دیسی حکمرانوں کے خلاف استعمال کر چکے تھے، یعنی یہ کہ آچیہ کے ایک چھوٹے سے علاقہ "امپو" کے رئیس کو جو سنگا راجہ کا بھی حلیف تھا اپنی طرف ملالیا اور بالآخر اس کی سازشوں سے ایک لڑائی میں ۱۹۰۷ء میں دھوکہ سے اس بہادر ہیرو کو ختم کر دیا، اور اس کے تمام مفتوحہ علاقہ کو تکہ بوٹی کر کے اپنے غدار ساتھیوں میں بانٹ کر پورے باتاک کے علاقہ کو اپنے شکنجہ میں لے لیا۔

اس طرح سماترا کے علاقہ باتاک کا وہ ہیرو جس نے جنگ آزادی میں اپنے دشمن کو ہمیشہ خائب وخاسر رکھا ختم ہوگیا اور اس کے خاتمہ سے اہل منگ کباؤ کی بھی آزادی ختم ہوگئی۔

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ آخری سنگا راجہ صحیح معنی میں عوامی رہنما تھا، اگرچہ وہ خانوادۂ شاہی کا فرد تھا لیکن باتاک کی ساری رعایا اس کے ساتھ تھی اور اس کے اشاروں پر ہر قسم کی قربانی دینا اپنے لئے فوز عظیم تصور کرتی تھی، وہ شخصی کردار کے اعتبار سے بھی نہایت بلند تھا، اعلیٰ درجہ کا سپاہی، پکا مسلمان، جہاد کا دلدادہ، اسلام کا جاں نثار اور غیر ملکی اقتدار کا سخت ترین دشمن تھا اپنے خاندان کا وہی سب سے پہلا مسلمان حکمران گذرا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے اہل وطن آزادی کی زندگی گذاریں، اور غیر ملکی تمدن سے اپنے وطن عزیز کو بچائیں۔ پھلیں پھولیں اور شادمانی کے ساتھ باعزت طور پر بسر کریں، اگرچہ وہ لڑتا ہوا بہادری کے ساتھ ختم ہوگیا مگر اپنے علاقہ کے لوگوں میں آزادی کی روح پھونک گیا، سنگا اندونیشی زبان میں شیر کو کہتے ہیں، وہ دراصل شیر ہی تھا۔ اسی کی شیری نے آگے چل کر آزادی تمدن کے لئے دلیری کی آزاد روایت قایم کی، چنانچہ وہ بھی اندونیشیا کے تمدن کی تاریخ میں دیپونگورو کی طرح زندہ رہیگا۔

---

عام احساس پیدا کر دیا، وہ اپنے وقت کا ایک زبردست ہیرو ایک عظیم الشان سپاہی اور بے لوث رہنما تھا، اس کے کارنامے بھی تمدنی نقطۂ نظر سے تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، وہ جب تک زندہ رہا ولندیزیوں کو کسی وقت بھی باتاک لوگوں پر غلبہ حاصل نہ ہو سکا، جب ۱۹۰۷ء میں وہ لڑتا ہوا مارا گیا، تو ولندیزی بھی منگ کباؤ پر چھا گئے بلکہ جم گئے اور انھوں نے پھر اپنی پوری پوری توجہ آچیہ کو زیروزبر کرنے کی طرف منعطف کر دی۔

**جنگ آچیہ دوئم** علاقہ آچیہ اس زمانہ میں مشہور ترین اندونیشی رہنما "تیکو عمر"[۵] کی سرکردگی میں مدت سے ان کے خلاف نبرد آزما تھا اگرچہ تیکو کی فوج محض ایک قومی مجاہد

---

**تیکو عمر**[۵] آچیہ کے فرزندانِ اسلام میں نشانِ کامرانی کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے کارنامے بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسقدر اہم ہیں کہ اگر ان کو بیان نہ کیا جائے تو دراصل اندونیشیا کی قومی تاریخ کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی، وہ بھی اپنے زمانہ کا ایک ایسا ہیرو گذرا ہے کہ جو اپنی قوم اور وطن پر ذلت و ادبار کی گھڑی آجانے پر ہمہ گونا قربانیوں کے ساتھ میدانِ عمل میں آجاتے ہیں، اور تمدن کی زرّین روایات کو زندہ رکھنے اور زندہ کرنے کے خاطر جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور اپنی صولت و بسالت کے زرّین کارناموں سے قوم کے نام کو روشن و تاباں کر دیتے ہیں، خود مٹ جاتے ہیں مگر اپنی قوم کو زندہ رہنے کا سبق دے جاتے ہیں۔ پھر حریت، حمیّت، بیداری اور وفاداری ان کے مبارک نام کے ساتھ ساتھ قومی تمدن سے وابستہ ہو جاتی ہیں، تاریخ بھی ان کے نام پر محبت کے پھول چڑھاتی ہے، "تیکو عمر" بھی آچیہ کا ایک ایسا ہی جلیل القدر اندونیشی ہیرو گذرا ہے اس کے اہل قوم بھی اسکو "جوہان پہلوان" یعنی مجاہد اعظم کہتے ہیں، وہ دراصل مجاہد اعظم تھا کیونکہ اس نے بھی بیس سال تک باوجود انتہائی بے سروسامانی اور قلت اسباب کے ولندیزیوں کے ساتھ جہاد کے عنوان پر وہ عظیم الشان اور بے مثل معرکے لڑے ہیں کہ تاریخ بھی ان کی بدولت روشن ہے اور مجاہدینِ آچیہ کا نام سربلند ہے۔ اس کی یہ لڑائیاں اور ان لڑائیوں کے حالات بھی اپنی نوعیت میں کچھ کم دلچسپ نہیں ہیں۔

کی غیر تربیت یافتہ سپاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی مگر پھر بھی اپنی قوم اور وطن کو بچانے کے سلسلہ میں جو کارنامے اس ہنگامی فوج نے انجام دیئے وہ آچیہ کی تاریخ میں زرّین حرفوں سے لکھنے کے قابل ہیں، ایک طرف ولندیزیوں کا

---

مگر طوالت کے خوف سے اس مقام پر محض ان کا عکس بیان کیا جاتا ہے کیونکہ تمدن کی تاریخ میں عکس کی حد سے متجاوز ہوکر تفصیلات میں جانا موضوع سے گریز کرنے کے مترادف ہوگا لہٰذا ذیل میں واقعات کے اجمال ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور اس اجمال سے قبل اس مجاہد کے نام ونسب اور اس کے ابتدائی حالات پر بھی مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

وہ اپنے حالات کے اعتبار سے آچیہ کے شاہی خاندان کا فرد تھا سونگ سونگ بُونیہ (مقام کا نام ہے) کے داتو یعنی رئیس کا سب سے بڑا لڑکا تھا، اور ماں سلطان آچیہ کی خاص لڑکی تھی، اس طرح اس کی پرورش بھی نہایت ہی اہتمام کے ساتھ کی گئی تھی، اسلامی علوم، فلسفہ، اور تاریخ کا خاص طور پر اس کو درس دیا گیا تھا۔ اور بچپن ہی سے فنِ سپاہ گری اور جہاں بانی کے اصول سکھائے گئے تھے، جب وہ سنِ رشد کو پہنچا تو آچیہ کے علاقہ کی تاریخ میں ایسا دور تھا کہ ہر طرف ولندیزیوں کی خونریزیوں کے باعث مسلمانانِ آچیہ کے درمیان نعرۂ جہاد سنائی دیتا تھا، شہری اور دیہاتی سب اپنے ملک کی آبرو کو بچانے کے لئے ایک قومی محاذ پر جمع تھے، اور غلامی کی زندگی پر بہادری کی موت کو ترجیح دیتے تھے۔

جیسا کہ 'اسلامی عہد' کے باب میں اشارتاً گذر چکا ہے کہ آچیہ کے آخری باوقار حکمراں سلطان محمود شاہ کے وقت میں ۸ / اپریل ۱۸۷۳ء کو ولندیزیوں نے سلطنت آچیہ کو برباد کرنے کے لئے ایک زبردست فوج لے کر چڑھائی کی، آچیہ کی فوج بھی مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آئی، لڑائی بھی نہایت ہی خونریز طریقہ پر لڑی گئی مگر ولندیزی کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ وہ کئی مقامات پر اور دوسرے محاذوں پر بھی اُلجھے ہوئے تھے لہٰذا وہ ہار کر بے نیل ومرام واپس چلے گئے اور ادھر سلطان محمود شاہ بھی ۱۸۷۴ء میں رحلت کر گیا۔

سلطان کی وفات کے بعد ۱۸۷۴ء میں جب اس کا لڑکا سریر آرائے سلطنت ہوا تو ولندیزیوں نے پھر حملہ کیا، اور اب کی بار وہ بڑے سازوسامان کے ساتھ میدان میں آئے

تربیت یافتہ اور مربوط لشکر تھا اور دوسری طرف تیکو کی اِدھر اُدھر سے اکھٹی کی ہوئی معمولی فوج تھی۔ بالآخر تقریباً بارہ سال تک غیر معمولی طور پر لڑنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں تیکو ہار گیا، اور ولندیزی آچیہ کے علاقہ پر چھا گئے اور غلبہ پانے کے بعد انھوں نے تیکو کو ایک کڑی قسم کے شرائط نامہ پر دستخط کرنے پر مجبور کیا اور صلح ہو گئی، مگر چونکہ آچیہ کے جوشیلے مسلمانوں نے اس صلح کو نہ مانا اور اس طرح

لڑائی ہوئی مگر آچیہ والے ہار گئے، سلطان کا لڑکا جو اس بہادر تیکو عمر کا ماموں تھا، اپنے بھانجے کو ساتھ لے کر جنگل میں نکل گیا، اور مفرور فوج کو اکھٹا کرنے میں لگ گیا، جب سپاہ کچھ اکھٹی ہو گئی تو عمر ہی کو اس کا جرنیل بنا کر ولندیزیوں کے مقابلہ پر بھیجدیا، عمر بہادری کے ساتھ لڑتا رہا یہانتک کہ اس نے تمام مغربی ساحل فتح کر لیا، کہیں اتفاق سے اسی زمانہ میں انگریزوں سے بھی اہلِ آچیہ کی ان کا ایک جہاز غارت کرنے کے سلسلہ میں چھڑ گئی، بے سروسامان فوج کا دو دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنا آسان نہ تھا لہذا تیکو عمر کی فتوحات جلد ہی مبدّل بہ شکست ہو گئیں۔ اور وہ خود پہاڑوں کی طرف نکل گیا اور ایک مدت تک فوجیں جمع کرتا رہا بالآخر ۱۸۹۲ء میں اس نے پھر سنبھل کر ایک خوفناک حملہ کیا، اس کے ہزاروں ہموطن اپنی قربانیوں سے حُبّ الوطنی کا واجبی فرض ادا کرتے ہوئے پروانہ وار شمعِ اسلام پر نثار ہو گئے۔ اور انھوں نے دلیری اور جوشِ کردار کی ایک عظیم مثال قایم کر دی۔

آخر کار ولندیزیوں نے جب یہ دیکھا کہ بنا بنایا کھیل اب بگڑتا ہے، اور فتح شکست میں مبدّل ہوا چاہتی ہے تو فوراً ہی انھوں نے "تیکو عمر" کی خدمت میں ایک عارضی صلح نامہ کی پیشکش کی۔ تیکو عمر بھی ہنگامی طور پر جمع کی ہوئی غیر تربیت یافتہ فوج سے زیادہ مطمئن نہ تھا، اور نہ اس کے بعض ساتھی ہی اب زیادہ عرصہ تک لڑتے رہنا چاہتے تھے چنانچہ ان مجبوریوں کے باعث اس نے ۱۸۹۳ء میں ولندیزیوں کے ساتھ صلح کر لی اور ان کی فوج کا ایک افسر "بنکر" کو "تارا جا"، (آچیہ کے انتہائی مغرب میں ایک شہر ہے) بھجوا دیا گیا۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ ولندیزی سپاہ پر کسی نہ کسی طرح دسترس حاصل کرنے کے لئے تیکو عمر خود بھی مدت سے چالیس سوچ رہا تھا مگر کوئی تدبیر بر نہ آتی تھی اتفاق سے صلح نامہ

تیکو کو اپنا علاقہ چھوڑ کر کوٹا راجا کے قصبہ کی طرف جانا پڑا۔ اس کو بھی اپنی متعدد شکستوں کا بڑا احساس تھا لہٰذا صلح ہو جانے کے بعد وہ ولندیزیوں کی فوج میں ایک بہت بڑا افسر بن گیا اور اس طرح ان کی ایک شاندار فوج اپنے قابو میں کر کے انہی کے خلاف پھر میدان میں اتر آیا، شکست ہوئی اور مغربی آچیہ کی طرف چلا گیا جہاں ۱۸۹۹ء میں موت واقع ہو گئی، تیکو عمر کی وفات کے بعد

---

کے بعد اب یہ موقع اچھا مل گیا، ولندیزی سپاہ کا افسر بن جانے کے بعد ایک بہت اعلیٰ اور تربیت یافتہ گروہ کی کمان اس کے ہاتھ میں آگئی چنانچہ ۱۸۹۶ء میں اس نے اس کمان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ولندیزیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور چند مضبوط قسم کے قلعے بھی چھین لئے، اسی اثنا میں تیکو چیت محمد جو آچیہ کے مشہور ترین قومی بہادروں میں شمار کیا جاتا تھا مع اپنی جنگجو بہن کے اس کی فوج میں آملا اس طرح ان دونوں نے اپنی متحدہ قوت سے ولندیزیوں کو کئی محاذوں پر بری طرح ہرایا۔ مگر ولندیزیوں کے وسائل بہت زیادہ وسیع تھے لہٰذا کمک کا سلسلہ برابر جاری رہا، بالآخر تیکو عمر کو شکست ہوئی اور وہ پیدیری تک پیچھے ہٹ گیا اور ۱۸۹۹ء میں دوبارہ اپنی فوجی قوت کو سنوارنے اور تربیت دینے کے لئے مغربی آچیہ کی طرف نکل گیا۔ زخموں سے اسقدر چور تھا کہ بالآخر جانبر نہ ہو سکا اور رحلت کر گیا۔

ولندیزیوں نے اس کی بچی کھچی منتشر سی فوج پر بھی یورش کی، جو اس وقت تیکو محمد داؤد کی سرکردگی میں آخری بار لڑنے کے لئے تیاریاں کر رہی تھی، مگر نہ تو جمعیت ہی زیادہ تھی اور نہ سامان حرب ہی کافی تھا لہٰذا یہ فوج ہار گئی اور ان کا افسر اعلیٰ تیکو محمد داؤد ۱۹۰۷ء میں قید کر کے جاوا میں نظربند کر دیا گیا، اس سے دو سال قبل یعنی ۱۹۰۵ء میں ان ولندیزیوں نے تیکو عمر کی بہادر بیوہ کو قید کیا تھا جو اپنے شوہر کے مر جانے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق ۱۹۰۱ء میں ولندیزیوں کے خلاف نبرد آزما تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ اسقدر بہادر خاتون تھی کہ اس نے مارتے مارتے ولندیزیوں کے کشتوں کے پشتے لگا دئے تھے۔ اور خود ہی فوجوں کی کمان کرتی تھی۔ اس کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں۔

غرض ان بہادران انڈونیشیا کے خاتمہ کے بعد آچیہ بھی ۱۹۰۷ء میں سیاسی حیثیت سے

بھی آچیہ کی جنگِ آزادی برابر جاری رہی، چونکہ یہ لڑائیاں جہاد کے نام سے لڑی جاتی تھیں لہذا ہزارہا مسلمان خود بخود ان میں شامل ہوجاتے تھے اور دل کھول کر لڑتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں آچیہ کی آخری لڑائی وہ تھی جو تیکو محمد داؤد نے تیکو عمر ہی کی افواج کو اکٹھا کر کے ولندیزیوں کے خلاف لڑی تھی۔

بہر حال سنہ ۱۹۰۷ء میں آچیہ بھی سالہائے دراز تک لڑنے کے بعد سیاسی طور پر ولندیزیوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس قبضہ کے بعد ولندیزی پورے انڈونیشیا پر چھا گئے، مکاسر، تدورے، ترناتے اور ان کے آس پاس کے جزائر اور دیگر جزائر بندا وغیرہ وہ جاوا پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی اپنے تسلط میں لے چکے تھے، اور ان مقامات پر اپنے مسیحی مشن[۵۱] قایم کر کے اپنے مذہب کو وسعت دینے کے اسباب بھی مضبوطی کے ساتھ بہم پہنچا چکے تھے، اب مدتوں کی سازشوں اور سیاسی چال بازیوں کے بعد جاوا اور پھر آچیہ اور پھر بالی پر بھی قابض ہوگئے اس طرح سنہ ۱۹۰۷ء

---

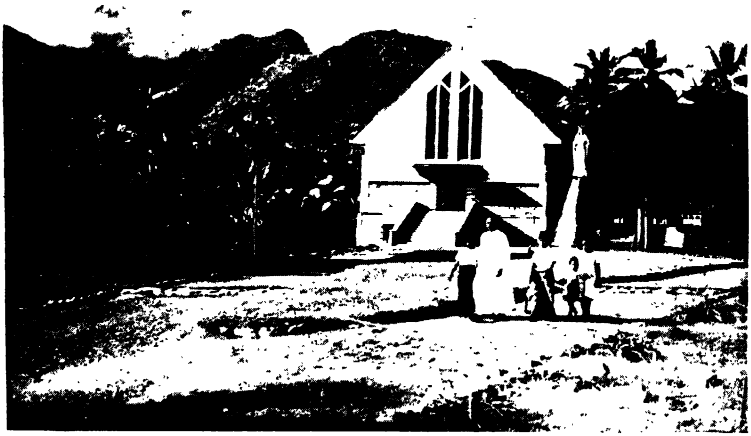
ختم ہوگیا۔ منِنگ کباؤ کا علاقہ پہلے ہی سے ولندیزی زیر کر چکے تھے اب آچیہ کی فتح کے بعد سے قریب قریب پورا سماترا بھی ان کے قبضہ میں آگیا، مگر ابھی انھیں مکمل طور پر چھائے ہوئے مشکل سے ایک ہی سال گذرا ہوگا کہ جزیرۂ جاوا میں سیاسی بیداری کا صور پھنکنے لگا اور نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوگیا، جس کی تفصیلات پانچویں باب میں بیان کی گئی ہیں۔

**انڈونیشیا میں عیسائی مشن کی تبلیغ**[۵۱]

یوں تو سب سے پہلے عیسائی مذہب اس نواح میں پرتگالیوں کے عہد میں پہنچا، جو مذہبی حیثیت سے نہایت ہی سخت، اور متعصب تھے، اور جبراً لوگوں کو عیسائی بناتے تھے، وہ ظالم بھی تھے، اور ناعاقبت اندیش بھی، ان کا نظم و نسق بھی زیادہ شاندار نہ تھا، اغراض بھی ان کی صرف دو تھیں یعنی گرم مصالحہ حاصل کرنے کے لئے اپنے مقبوضات بڑھانا اور ان مقبوضات میں اپنے اثر کو تقویت پہنچانے کے لئے مظاہر پرستوں کے گروہ میں اپنے عقاید کے مطابق مذہبی



انڈونیشیا میں عیسائیوں کا سب سے پہلا
گرجا گھر



انڈونیشیا میں عیسائیوں کا ایک دوسرا قدیم گرجا

میں پورا اندونیشیا ان کے تحت میں آگیا۔ جس کا نام انھوں نے نیدرلینڈ شیچے ڈچ ایسٹ انڈیز رکھا

**ولندیزی سربراہ**

اور اسطرح انکا مستحکم اور مضبوط راج قایم ہوگیا، جس کا سربراہ ہالینڈ کے تاج شاہی کا نمایندہ یعنی گورنر جنرل ہوتا تھا۔ وہی اس پوری قلمرو کا مختار سیاست و سیادت مانا جاتا تھا اور اسی کے حکم سے تمام ہالینڈ کے تاج شاہی کے فرامین اس وسیع ترین ملک پر منطبق کئے جاتے تھے، بعد میں مزید ولندیزی احکامات کی رو سے اس کے اختیارات کو اور بھی زیادہ وسعت دیدی گئی تھی۔

کل ولندیزی گورنر جنرل جو پیٹر بوتھ کے عہد (۱۶۱۰ء) سے آخری گورنر جنرل فان موک کے عہد (۱۹۴۸ء) تک اس ملک میں وقتاً فوقتاً مقرر ہو کر آتے رہے تعداد میں ۶۸ گذرے ہیں، ۱۹۰۷ء میں "فان ہرز" ان کا گورنر جنرل تھا، جو ۱۹۰۹ء تک اپنے منصب پر قایم رہا۔ اس منصب کی مدت کے لئے پانچ سال مقرر

---

تبدیلی پیدا کر کے اپنے ہمخیال پیدا کرنا۔ اور چونکہ وہ زیادہ تر ترناتے اور تیدورے وغیرہ جزائر میں آنکر قابض ہوئے تھے لہٰذا ان کے اثر سے کیتھولک عیسائیت بھی سب سے پہلے انہی علاقوں میں پھیلی، پھر وہ امبون کی طرف بھی متوجہ ہوئے لہٰذا ان کا اثر امبون کی طرف بھی پھیلا ان کے بعد آنے والے اسپینی تھے جو پرتگالیوں کی طرح کیتھولک مذہب کو مانتے تھے۔ ان کا اثر جزائر سلاویسی اور کالیمنتان کی طرف زیادہ تھا لہٰذا ان علاقوں میں بھی عیسائی مذہب پھیلا۔ پھر ولندیزی آگئے جو مذہباً پروٹسٹینٹ تھے لہٰذا مکاسر میں ۱۶۷۰ء کے قریب ان کا عقیدہ پھیلا، اور رفتہ رفتہ یہ شہر ان کے عقیدہ کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ ۱۸۵۹ء میں ولندیزیوں نے فلورس پر قبضہ کیا اور ادھر تیمور کی طرف ہارے ہوئے پرتگالی سولھویں صدی میں جا پہنچے تھے لہٰذا ان جزائر میں بھی عیسائیت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ ۱۸۹۴ء سے لمبوک جزیرہ میں بھی عیسائیت پھیلائی گئی اسی طرح جزیرہ سماترا میں جھیل طوبا کے قریب ولندیزی تاجروں کی خاص آبادیاں بنائی گئی تھیں لہٰذا اس طرف بھی

ہونے کے بعد یہ چوتھا گورنر جنرل تھا ورنہ عموماً یہ تمام گورنر جنرل ایک ایک سال یا ڈیڑھ ڈیڑھ یا تین تین اور چھ چھ سال کے لئے آتے تھے، سرکاری طور پر ان کے منصب کی کوئی خاص مدت مقرر نہ تھی، ان کا دور زیادہ تر یا تو تجارتی مال کے حاصل کرنے پر گذرتا تھا یا پھر اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے مقامی حکمرانوں اور رہنماؤں کے ساتھ لڑنے میں صرف ہوتا تھا جن کی تفصیلات کا عکس اسی باب میں پچھلے اوراق میں بیان کیا گیا ہے اور اتنا ہی حصہ دراصل اندونیشیا کے تمدن کی تاریخ سے وابستہ تھا لہذا ان گورنر جنرلوں کی سوانح عمریوں کو غیر ضروری جان کر حذف کر دیا گیا ہے اور آخری باب کے آخری صفحات میں ان کی فہرست درج کر دی گئی ہے جو تاریخی تسلسل کو جاننے کے لئے کافی ہے۔ البتہ ۱۹۰۷ء سے انھوں نے پورے ملک پر چھا کر اپنی سیاسی کارروائیوں سے حاکمانہ گرفت کو مضبوط تر کرنے کے لئے نئے نظم ونسق کا آغاز کیا جو تمدن پر اثر ڈالنے میں کافی نتیجہ خیز ہے لہذا اس کو

---

عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا، باتاک کے علاقوں میں بھی مظاہر پرستوں کو عیسائیت میں داخل کیا گیا۔ البتہ مسلمان بہت کمی کے ساتھ عیسائی مشنریوں کے قابو میں آسکے، زیادہ تر مظاہر پرستوں ہی میں اس مذہب کو تقویت حاصل ہوئی۔ اب تقریباً دس لاکھ سے قریب اندونیشی باشندے عیسائی ہیں جن میں کچھ چینی اور دیگر یورپی لوگ بھی شامل ہیں، سیرام، نیوگنی اور آس پاس کے جزائر میں بھی عیسائی مذہب کی تبلیغ بہت زور کے ساتھ چلائی گئی تھی۔

یہ عیسائی پروٹیسٹنٹ اور کیتھولک دونوں فرقوں پر مشتمل ہیں، ان کے مذہبی تمدن پر دوسری جلد میں روشنی ڈالی جائیگی۔ جہاں باشندوں کا طرز معاشرت بیان کیا جائے گا۔ اس لئے اس بیان کو اب اسی منزل پر چھوڑا جاتا ہے۔

اگلے باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، قومی حکومتیں آخری طور پر اس سن میں ختم ہو گئی تھیں، اس لئے ان کا ذکر بھی اسی حد تک درکار تھا۔

سنہ ۱۹۰۸ء سے اندونیشیا کی قومی بیداری کا آغاز ہو کر ایک دوسری نشاۃ کا سلسلہ شروع ہوا جو تمدن کا عظیم الشان باب ہے لہذا اس کو اس کے بعد ہی باب پنجم میں بیان کیا گیا ہے چونکہ نشاۃِ ثانیہ نظامِ حکومت سے بہت متاثر تھی لہذا پہلے نظامِ حکومت ہی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

# باب چہارم

## ولندیزی عہد کا نظامِ حکومت
## اور
## اندونیشی تمدن پر اس کا عام اثر

ولندیزیوں کا نظام حکومت اور ان کی پالیسی جہاں تک خود ان کی نوشتہ تواریخ اور تحریرات بتاتی ہیں ہمیشہ ایک نہج پر رہی اگرچہ ان کے دورِ حکومت کا تین سو چون سالہ زمانہ جو اس ملک میں گذرا ہے معنوی حیثیت سے دو خاص ادوار میں تقسیم ہے یعنی (۱) ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور (۲) حکومتِ ڈچ ایسٹ انڈی، ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات پر مختصراً پچھلے اوراق میں روشنی ڈالی جا چکی ہے لہٰذا اس مقام پر محض حکومتِ ڈچ ایسٹ انڈی کے نظام کو بیان کیا جائے گا۔

### حکومتِ ڈچ ایسٹ انڈی کا آغاز

قانونی طور پر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اجارہ ۱۷۹۵ء میں ختم ہوا اور اندونیشیا

### ۱۔ بٹاوین ری پبلک

۱۷۹۵ء میں ہالینڈ میں ایک عارضی انقلاب واقع ہو کر "ری پبلک" (جمہوری حکومت) قایم ہوگئی جو بٹاوین ری پبلک" کہلاتی ہے۔ اس حکومت کے قیام سے ہالینڈ کا شاہی خاندان بھاگ کر انگلستان

کا یہ ملک جو اس پورے دور میں "ڈچ ایسٹ انڈیز" کے نام سے معنون ہوتا رہا۔ ۱۷۹۸ء میں کمپنی کی حکومت سے منتقل ہو کر پہلی بار ہالینڈ کی مرکزی حکومت کا جزو قرار دیا گیا جو آخری مدت یعنی حملۂ جاپان کے ہنگامہ ۱۹۴۲ء تک اسی نہج پر رہا ہے اس طویل دور میں صرف چند سال کا ایک ایسا زمانہ گذرا ہے جبکہ کچھ عرصہ کیلئے انگریز[1] بھی اس ملک پر قابض ہو گئے تھے ان کا یہ دور ۱۸۱۹ء سے ۱۸۲۴ء تک رہا ہے

چلا گیا اور ۱۸۰۰ء تک اسی فراری کے عالم میں گذارتا رہا۔ چنانچہ اس نئے انقلاب کے بعد برسر اقتدار آنے والی حکومت نے کمپنی کے ولندیزی مقبوضات پر جو خود اس کمپنی کے حاصل کردہ اور قائم کردہ تھے حکومت کرنے کے اختیارات کو بھی چھین لیا اور اس کی تمام املاک کو بھی قومی قرار دیدیا۔ اس طرح ہالینڈ کی تجارتی کمپنی کے جتنے بھی مقبوضات بعبور بحر واقع تھے سب مرکزی حکومت کے حصے بن گئے حالانکہ مرکزی حکومت کے نظام میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ رد و بدل ہوتا رہا مگر یہ عبور بحر کے تمام حصے اس طرح ہالینڈ کی مرکزیت کا جزو چلتے رہے۔ مثلاً یہ کہ ۱۸۰۵ء میں ہالینڈ میں فرانس کے شہنشاہ نیپولین کی وجہ سے پھر شہنشاہیت کا انقلاب آیا اور جمہوریت ختم ہو گئی، نیپولین کا بھائی ہالینڈ کا حکمراں بن گیا مگر جب نیپولین بھی زوال میں آگیا تو اس کے بھائی کی حکومت بھی ختم ہو گئی۔ اہل ہالینڈ نے اپنے ملک کے جلاوطن شاہی خاندان کو انگلستان سے بلا کر پھر بحال کر دیا اور اس طرح ہالینڈ کی قدیم شہنشاہیت پھر قائم ہو گئی۔ چنانچہ اندونیشیا بھی اسی شہنشاہیت کے تحت میں ۱۹۴۵ء تک محکومیت کا دور گذارتا رہا۔

**[1] انگریزوں کا قبضہ** انگریز یوں تو مشرق میں ولندیزیوں ہی کی دیکھا دیکھ آئے تھے اور اپنے وطن انگلستان میں انھوں نے پہلی بار ۱۶۰۰ء میں بعہد ملکہ ایلزبتھ "ایسٹ انڈیا کمپنی" قائم کر کے مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کا آغاز کیا تھا مگر ولندیزیوں کے ساتھ ان کے محاربات کی تفصیلات تاریخ مشرق میں ۱۶۱۳ء سے ملتی ہیں جبکہ ولندیزیوں نے ان جزائر میں اپنی اجارہ داریاں قائم کر لی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ جزیرۂ سیلون پر قابض ہو گئے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کی مختلف

اور نظام حکومت کے اعتبار سے بھی ولندیزیوں سے نسبتاً ممتاز سمجھا گیا ہے۔ ضلعوں کی ابتدائی درستی، زمین کی نوعیات کی جانچ، لگان کی تشخیص، آثار قدیمہ کے محکمہ کا قیام انگریزی زبان کا رواج وغیرہ سب کچھ اس مختصر سے دور میں انجام دیا گیا۔

اس مختصر سے انگریزی عہد کا افسر اعلیٰ "سر اسٹیمفورڈ ریفلس"[1] گذرا ہے جو اس ملک کے عہد اقوام غرب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ ولندیزیوں نے

---

لڑائیوں کا اجمال پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے لہذا اس مقام پر مختصراً صرف آگے کے حالات بیان کئے جاتے ہیں:-

میسور کی لڑائی کی اصل وجہ ۱۷۹۶ء کا دور ہے جب ہندوستان میں لارڈ ولیزلی انگریزوں کا گورنر جنرل تھا اور میسور کے سلطان ٹیپو کے خلاف 'عہد نامۂ امدادی' کے سلسلہ میں نبرد آزما تھا، اور ٹیپو کا دوستانہ تعلق براہ راست فرانس کے حکمراں نیپولین کے ساتھ قایم تھا جس نے اسی زمانہ میں ہالینڈ کو بھی اپنے اثر میں لے رکھا تھا چونکہ انگریز نیپولین کے حملہ کے خطرات کو بھی ہندوستان میں محسوس کر رہے تھے۔ لہذا انھیں گمان گذرا کہ جزیرۂ سیلون جو ہالینڈ کے مقبوضہ ہونے کے باعث فرانس کے اثر میں ہے کسی وقت بھی نیپولین کی بحری افواج کا مستقر بن کر ان کے ساتھ چھڑ جانے والی لڑائی کا سبب بن سکتا ہے لہذا اسے فتح کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے 'سیلون' پر قبضہ کر لیا اور اس طرح ہالینڈ کے ساتھ اس نواح میں جنگ کا آغاز کیا۔ چونکہ مقامی انقلابات کی وجہ سے ہالینڈ کی حالت دگرگوں تھی لہذا وہ خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے مگر ان کی مخاصمت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بالآخر ۱۸۱۱ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل "منٹو" نے ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کرا کر ان کے خلاف ان جزائر میں لڑنے کے لئے بھجوا دیا۔ یہ بیڑہ ملایا اور دیگر جزائری علاقہ فتح کرتا ہوا مشرقی جاوا پر بھی آپہنچا اور آخر کار سماترا، جاوا، ملایا وغیرہ سے انھیں بے دخل کر کے انگریزی حکومت قایم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کا دور ۱۸۲۴ء تک قایم رہا۔

[1] **سر اسٹیمفورڈ ریفلس** اور "سر اسٹیمفورڈ ریفلس"، ہندوستان کے انگریزی گورنر جنرل کے تحت میں 'لفٹننٹ گورنر جنرل' کی حیثیت سے ان تمام علاقوں کا انگریزی حاکم اعلیٰ مقرر کر کے بھیجا گیا یہ بہت بڑا عالم، مصنف، منتظم اور سیاستداں تھا، "ہسٹری آف جاوا"

بھی اپنے آیندہ کے نظم ونسق میں اس کے قایم کردہ اصول سے اسی طرح استفادہ کیا جس طرح ہندوستان کے مغل بادشاہ اکبر نے شیر شاہ سوری کے نظام سے کیا تھا۔

انگریزوں کے اِنخلا کے لبعد ولندیزیوں نے اپنی پوری پوری توجہ اس ملک میں اپنے انتظامی[۵] استحکام میں صرف کردی اور زیادہ سے زیادہ مالی فائیدہ اُٹھانے میں

---

بھی اسی کی تصنیف ہے۔

غرض جب اس مقاطعۂ سیاسی و اقتصادی کے باعث یوروپ میں بھی ولندیزیوں کی حالت نہایت ہی خستہ وخراب ہونے لگی تو انھوں نے بجائے جنگ کے انگریزوں کے ساتھ صلح کرناطے کرلیا اور بالآخر ۱۸۲۴ء میں وہ برطانیہ کے ساتھ ایک دوستانہ عہدنامہ کرکے مالوکو اور سلیبس وغیرہ جزائر سے جو ان کے قبضہ میں رہ گئے تھے نکل کر دوبارہ جاوا اور سماترا پر بحال ہوگئے انگریز اس شرط کے ساتھ کہ جزیرۂ سیلون، اور جزیرۂ نما ملایا، اور شمالی بورنیو انھیں دیدیا جائے گا جاوا اور سماترا خالی کرکے واپس ہندوستان لوٹ آئے اور بھاگے ہوئے ولندیزی پھر دوبارہ بحال ہوگئے البتہ ان کے ہاتھ سے اب سیلون، ملایا، اور شمالی بورنیو کے علاقے نکل گئے اور انگریزوں کو منتقل ہوگئے جہاں اب تک بھی انگریز ہی حاکم اعلیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ سیلون ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۷ء سے خود مختار ہے۔

[۵] کیونکہ ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کے بنجانے کے باعث اہل غرب کے لئے مشرق میں آنے کا آسان ترین راستہ کھل گیا تھا اور اب مغرب کی ہر قوم مشرق میں بازاروں کی متلاشی تھی۔ خاص طور پر جرمنی کی ترقی بہت زور پکڑ رہی تھی اور اِدھر مشرق میں جاپان بھی عروج حاصل کرتا جارہا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں امریکہ نے بھی فلپائن پر اہل اسپین کے اِخراج سے اپنا قبضہ جما لیا تھا چنانچہ ولندیزی لوگ جو لڑنے میں زیادہ مضبوط قوم نہ تھے مزید مقبوضات کے اضافہ کا خیال چھوڑ کر اپنے استحکام میں لگ گئے اور اس ملک کے وسائل سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی اسکیمیں بروئے کار لانے لگے۔

منہمک ہو گئے۔ کیونکہ اب "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی بہ نسبت علاقہ بھی زیادہ وسیع و عریض تھا اور حیثیت میں بھی براہِ راست مرکز ہالینڈ کے تحت میں آ چکا تھا۔

چنانچہ اب ولندیزیوں نے باقاعدہ اپنی تہذیب و تمدن کو رائج کر کے اس ملک کی تہذیب و تمدن پر بھی بڑا گہرا اثر ڈالا چونکہ کسی نظامِ حکومت سے تہذیب و تمدن کا نظام بھی بہت زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے لہذا پہلے ولندیزی نظامِ حکومت ہی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس کے اثرات

## ۱۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نظامِ حکومت

ابتدا میں اس کمپنی کے مقبوضہ علاقوں کا حاکمِ اعلیٰ "گشتی گورنر" کی حیثیت رکھتا تھا جس کا صدر مقام بھی کوئی خاص نہ تھا۔ اسی طرح اس کی سیاسی حیثیت بھی صرف تاجرانِ ہالینڈ کے "نگراں" سے زیادہ نہ تھی، اور مقصد کے اعتبار سے بھی نظریہ صرف یورپین حریف قوموں کو بیدخل کرتے رہنا اور اپنا تجارتی رسوخ بڑھانا تھا مگر ۱۶۰۹ء میں جب پہلا گورنر جنرل مقرر کر کے بھیجا گیا تو اسے ڈائرکٹران نے ہدایت بھیجی کہ وہ کسی مقام کو مستقر قرار دے اور اپنا مرکز بنا لے۔ چنانچہ شروع میں انھوں نے اپنا مرکز بانتن کو بنا لیا پھر شہر بٹاویہ کو آباد کر کے مستقل ہو گئے مگر کمپنی کی باقاعدہ حکومت بہت تھوڑے علاقہ ہی تک محدود تھی۔ جاوا اور بیرونِ جاوا میں ایک زمانہ تک ان کا اقتدار محض برائے نام رہا جاوا کے بیشتر حصہ میں مقامی ریاستیں ان کے تجارتی اثر میں پھیلی ہوئی تھیں، مدورا بھی مدتوں ان کے قبضہ میں نہ آیا تھا۔ سماترا میں پاڈانگ بلیم بنگ، بورنیو، پونتیا ناک، سمباس، اور بنجرماسین اور شمالی سلیبس میں مکاسر وغیرہ تھے اس طرح ۱۸۱۹ء تک یعنی کمپنی کے خاتمہ کے بھی بیس سال بعد تک ولندیزی حکومت کا ان جزائر میں رقبہ بہت محدود تھا، اس ملک سے جاتے وقت جو وسعتِ قلمرو ان کے تحت میں تھی وہ بہت بعد کی بات ہے۔

اس طرح اس محدود سے علاقہ میں انتظام بھی بہت محدود تھا البتہ نظم و نسق کا حاکمِ اعلیٰ گورنر جنرل کہلاتا تھا، جس کے مشورہ کے لئے ان کی اپنی ایک کونسل تھی جس کے ارکان کونسلر کہلاتے تھے، ان کونسلروں کے تحت میں مختلف محکمے قایم تھے، جن میں سے ہر ایک کا افسرِ اعلیٰ ڈائرکٹر کہلاتا تھا۔

کو بطورِ نتیجہ آخر میں بیان کیا جائے گا۔

نظامِ حکومت کے سلسلہ میں قابلِ غور چیز یہ ہے کہ حکومت کی تشکیل ایک باقاعدہ دستور کے مطابق کی گئی تھی، جو "ایسٹ انڈین گورنمنٹ ایکٹ[۵] کہلاتا تھا۔ اس ایکٹ کی رو سے حکومتِ ولندیزی شرق الہند کا آخری ذمہ دار یا سربراہ "گورنر جنرل"، تھا جس کی حیثیت برطانوی ہند کے انگریز وائسرائے سے مشابہ تھی۔

---

پورا مقبوضہ علاقہ چند خاص رزیڈنسیوں (علاقوں میں تقسیم تھا) ہر رزیڈنسی میں چند ریجنیاں قایم تھیں، یہ ریجنیاں ذیلی ضلعوں پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے ہر ایک میں تھوڑے تھوڑے گاؤں ہوتے تھے۔

کمپنی کی حکومت کی پالیسی مقامی حکمرانوں اور سلاطین سے دوستی کرنا، ان کی دوستی کے ذریعہ تجارتی عہد نامے طے کرانا، اور اپنے دوستوں کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑاتے رہنا اور اس لڑائی سے فائدہ اٹھانا، ساری تجارت اپنے اختیار میں رکھنا، اہلِ ملک سے سستی سستی مزدوریاں لینا۔ اور عیسائیت پھیلانا وغیرہ تھی۔

[۵] ایسٹ انڈین گورنمنٹ ایکٹ

۱۸۴۸ء میں جاوا میں سخت قحط پڑا جس کے نتیجہ کے طور پر ہزاروں انسان اور لاکھوں جانور مر گئے حکومت کی آمدنی بھی گھٹ گئی، بالآخر بادشاہِ ہالینڈ اور اس کے امراء نے جو انقلابِ فرانس کے بعد بحال ہونے والی شہنشاہیت کے وقت سے اپنے ملک کے عوامی رہنماؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے یہ طے کیا کہ آیندہ نوآبادیاتی مسائل بھی "اسٹیٹ جنرل" (یعنی ہالینڈ کی پارلیمنٹ) ہی طے کیا کریگی (کیونکہ اس وقت تک یہ مسائل براہِ راست شاہ کے ہاتھ میں تھے) اور ان نوآبادیات سے متعلق قوانین ہالینڈ کی مقننہ ہی بنایا کرے۔

اس طرح اختیارات ملجانے کے بعد ۱۸۵۴ء میں ہالینڈ کی اسٹیٹ جنرل یعنی پارلیمنٹ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ برٹش انڈیا کی طرح ایک باقاعدہ قانونِ دستور بنایا اور اس کو اس ملک میں رائج کیا یہ دستور "ایسٹ انڈیا ایکٹ" کہلاتا ہے جس کی رُو سے یہ تجویز کیا گیا۔

۱۹۲۲ء کے گورنمنٹ ایکٹ کی رو سے وہ ہندوستان کے انگریز وائسرائے سے بھی زیادہ صاحب اختیار تھا۔

**گورنر جنرل** اسکا تقرر کرتے وقت عموماً اس چیز پر زیادہ غور کیا جاتا تھا کہ وہ کسی فوجی حلقہ کا اعلیٰ ترین عیسائی افسر رہا ہو اندونیشیا میں بھی کم از کم پندرہ سال رہ چکا ہو، امورِ انتظامی میں کافی مہارت رکھتا ہو، تحریر و تقریر

---

رسم غلامی کا سدِّباب کیا جائے گا، (۲) پریس کو آزادی دی جائے گی۔ (۳) جبریہ بیگار سے گریز کیا جائے گا، (۴) انفرادی مِلک کی زمینوں کا لحاظ رکھا جائے گا اور زمینوں کی خرید و فروخت بند رہے گی وغیرہ۔ اس طرح بظاہر تو یہ ایکٹ اچھا تھا اگر اس پر سچائی کے ساتھ عمل کیا جاتا تو یقیناً یہاں کے تمدن پر اس کے اثرات نہایت ہی خوشگوار ہوتے اور جیسا کہ انھوں نے خود اسے "اخلاقی پالیسی" کا نام دیا تھا، اخلاقی پالیسی ہی ثابت ہوتا مگر اس پر کبھی عمل درآمد نہیں کیا گیا بلکہ یہ اور کیا گیا کہ اس وقت کے گورنر جنرل "دوئی مایر فان ٹواسٹ" نے اس ملک میں آ بسنے والے اہل ہالینڈ کو میعاد پر زمینیں دینی شروع کردیں اس سے اہلِ ملک کی معاشی حالت اور بگڑ گئی۔

۱۹۰۱ء میں جب "خود انتظامی" حکومت قایم کرنے کی تجویز زیرِ غور آئی تو نیدرلینڈ کے تاج شاہی نے (بقول امرئے فینڈن ٹوش کی کتاب "ڈچ ایسٹ انڈیز صفحہ ۴۶) اعلان کیا کہ "بحیثیت ایک مسیحی قوت کے 'نیدرلینڈس' مجبور ہے کہ وہ 'ڈچ ایسٹ انڈیز' میں عیسائیوں کی حالت سنوارنے کے لئے آئینی حالات درست کرے اور عیسائی مشن کو مضبوط طور پر چلانے میں بھی خاص اقدام کرے" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماترا کے ساحلی علاقہ میں بسنے والے اہلِ ہالینڈ اور دیگر عیسائیوں کی حالت سنور گئی مگر ملک کی بڑی آبادی خراب و خستہ ہوگئی۔

**۱۹۲۲ء کا ایکٹ** ۱۹۲۲ء میں نیدرلینڈس کے دستور میں کچھ ترمیم کی گئی، خصوصیت کے ساتھ "نوآبادیات" سے متعلق فقرہ بدل دیا گیا۔ جس کی رو سے گورنمنٹ ایکٹ بھی بدلا گیا، اور دستور سے مقبوضہ علاقوں کے لئے "نوآبادی" کا لفظ

میں بھی مہارت رکھتا ہو اسکے عہدہ کی قانونی طور پر کوئی میعاد نہ تھی مگر عموماً پانچ سال تک تو ضرور اسے
اپنے اسی عہدہ پر رہنا پڑتا تھا منصب پر فائز ہوتے وقت اسے نیدرلینڈس میں بادشاہ
کے سامنے دستور کے مطابق حلفِ وفاداری اٹھانا پڑتا تھا، اس کی تنخواہ سالانہ تھی (بقول
ڈچ ایسٹ انڈیز صفحہ ۹۸) اور ......۰۰۰ فلورنس یا... ۲۳۲ ڈالر مقرر تھی۔ اس کے
علاوہ تاجِ شاہی کی نمایندگی کرنے کا بھتہ بھی ملتا تھا جو ......۱ فلورنس یا...۴۰ ڈالر

---

بھی حذف کر دیا گیا۔ قانون سازی اور امورِ انتظامی میں بھی ایک خاص امتیاز پیدا کیا گیا۔ اور
اس امتیاز کے پیشِ نظر گورنر جنرل کو خود مختاری کے بہت سے اختیارات بھی دیدیے گئے حالانکہ
خاص خاص قسم کے اختیارات تاج شاہی کے تحت میں رہے "ویٹو" کے اختیارات، اسٹیٹ جنرل کے
تحت میں رکھے گئے جسے نو آبادیات کے لئے قانون سازی کا حق بھی حاصل تھا۔ انڈونیشیا میں اس
ایکٹ پر ۱۹۲۵ء سے عمل درآمد شروع کیا گیا۔ اور اسی وقت سے یہ بھی قرار پایا کہ "فلکسراد"
(جس کا ذکر آگے آئے گا) اور گورنر جنرل کے باہمی اختلافات کی صورت میں قانون سازی کا
حق تاج شاہی کو حاصل ہوگا مگر بجٹ کے اختیارات گورنر جنرل کو دیدیے گئے۔ اور شرط یہ رکھی گئی
کہ فلکسراد اور گورنر اگر بجٹ کے معاملہ میں مختلف الرائے ہوں تو فیصلہ اسٹیٹ جنرل کرے گی
جس کی اعانت کے لئے ایک جداگانہ محکمہ بھی وزارتِ نوآبادیات" کے نام سے اسی زمانہ میں
ہالینڈ میں قایم کیا گیا اور شرق الہند کی پالیسی تجویز کرنے کا اختیار بھی اسی وزارت کو
دیا گیا۔ اس سے قبل، گورنر جنرل، شرق الہند کونسل کے نائب صدر اور اراکین فلکسراد"
کے چیئرمین، بحریہ کے کماندارِ اعلیٰ، عدالتِ عالیہ کے صدر اور آڈٹ چیمبر کے چیئرمین وغیرہ کے
عزل ونصب کے سارے اختیارات ہالینڈ کے تاج شاہی کے ہاتھ میں تھے اب پورے طور
سے وزیرِ نو آبادیات کے تحت میں آگئے۔ اس وزیر کی اعانت کے لئے ہالینڈ میں ایک سکریٹریٹ
بھی قایم کیا گیا جس کے متعلق فنڈن بوش لکھتا ہے (صفحہ ۹۲) تقریباً دو سو کے قریب افراد
کا ایک بڑا عملہ ہے، جن میں کلرک اور دیگر منشی سب ہیں اور یہ سب مقابلہ کے امتحانات پاس
کر کے ملازمت میں آتے ہیں، ان کے افسرِ اعلیٰ کا تقرر تاج شاہی کے احکامات سے ہوتا ہے۔

ہوتا تھا۔ اس کی رہائش کے لئے انڈونیشیا میں دو محل تھے، ایک شہر بٹاویہ میں اور دوسرا "بُوتَنْ زَارُخ" یعنی بوگور میں تھا۔ گورنمنٹ ایکٹ کی رو سے اس پر کچھ پابندیاں بھی تھیں مثلاً یہ کہ وہ بغیر تاجِ شاہی کی منظوری کے جزائر کو چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتا تھا، اور نہ براہ راست کسی ملک کی تجارتی کمپنی کا حصہ دار ہو سکتا تھا اور نہ کسی کمپنی کا ضامن بن سکتا تھا، عہدہ پر فائز ہوتے وقت اس کی عمر کا بھی کم از کم تیس سال ہونا ضروری تھا۔

اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں تمام امور "تاجِ ہالینڈ" کے نام میں انجام دیتا تھا۔ اس کے اختیارات ۱۸۵۴ء کے گورنمنٹ ایکٹ کے فقرہ نمبر ۶۰ کی رو سے مقرر تھے، وہ اپنے اعمال میں صرف تاج ہالینڈ کے سامنے جواب دہ تھا۔ اس کے کاروبار کو چلانے کے لئے ایک بڑا دیوان یا سکریٹریٹ تھا جو سکریٹری جنرل کی نگرانی میں عمل کرتا تھا، سکریٹری جنرل، گورنر جنرل کے بعد ڈچ ایسٹ انڈیز کا اہم ترین صاحبِ منصب اور صاحبِ مجاز شخصیت تصور کیا جاتا تھا۔ اسی کی وساطت سے گورنر جنرل کے ساتھ دیگر تمام محکمہ جاتِ حکومت مربوط تھے۔

دیگر محکمہ جات کی سربراہی کے لئے گورنر جنرل کے ماتحت ایک کونسل تھی جو "رادفان انڈی" (شرق الہند کونسل) (Raad van Indie) کہلاتی تھی۔

رَادفان اِنڈِی[1] | یہ اپنی حیثیت میں وائسرائے ہند کی "ایگزیکیٹو کونسل" سے

---

جو عموماً فوجی ہوتا ہے۔ یہ پورا محکمہ سات شعبوں پر مشتمل ہے مثلاً امور داخلی، آڈٹ، مالیات، تعلیمات بین الاقوامی مسائل، اور تجارت و حرفت وغیرہ مگران سب کے نو آبادیات کی خط و کتابت گورنر جنرل کے نام میں ہوتی ہے۔[51] مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مشاورتی معاملات میں اس کونسل کا کوئی درجہ نہ تھا۔

بالکل مشابہ بھی مگر ہندوستان میں اسکا رکن ممبر کہلاتا تھا اور یہاں اسے ڈائرکٹر کہتے تھے شروع میں ان کی تعداد صرف چار تھی مگر ۱۹۳۰ء سے ۵ کا اضافہ کر کے دس کر دی گئی۔ یعنی دو اندونیشی ۵ ولندیزی ورتین اور مگر یہ اندونیشی بھی عموماً گورنمنٹ ہی کے خاص نمک خوار ہوتے تھے۔ ان کا تقرر تاج شاہی کی منظوری سے ہوتا تھا، ان میں سے ہر ایک کے تحت میں ایک ایک شعبہ تھا، کُل شعبے سات تھے۔ مثلاً تعلیمات، مالیات، عدلیات مذہبیات و حرفیات، امور معاشیات، نظارتِ نافعہ (پبلک ورکس) رسل و رسائل امورِ جنگ، اور ریونیو۔ بعد میں دو کا اضافہ اور ہوا۔

پھر ہر شعبہ کے تحت میں ذیلی دفاتر اور سررشتہ جات تھے۔ ان دفاتر اور شعبہ جات کے مابین ربط قائم کرنے کے لئے شعبہ کا ایک جداگانہ سکریٹریٹ تھا جو شعبہ کے خصوصی سکریٹری کے تحت میں عمل کرتا تھا۔ حسابات کی عام دیکھ بھال اور جانچ پڑتال

---

نہ کبھی اس کے اجلاس منعقد ہوتے تھے بلکہ بحث طلب امور صرف تحریری اور گشتی ایجنڈے کے ذریعہ طے پاتے تھے۔ ۱۸۳۶ء سے قبل حکومت شرق الہند کی سربراہی کے لئے گورنر جنرل ان کونسل، ہوتا تھا اور کونسل کے اراکین ہی حکومت کے اراکین ہوتے تھے اس وقت اسے قانون سازی کے اختیارات بھی حاصل تھے جو ۱۸۵۴ء کے ایکٹ میں بھی برقرار رکھے گئے تھے۔ اس وقت یہ کونسل گورنر جنرل کو مشورہ دینے کی بھی مجاز تھی اگرچہ گورنر جنرل ان مشوروں کا پابند نہ تھا مگر ۱۹۲۵ء کی نظر ثانی کے بعد سے اس کونسل کی متحدہ حکمرانہ حیثیت ختم ہوگئی اور گورنر جنرل کے اختیارات کے سلسلہ میں یہ مسلّم ہوگیا کہ وہ کونسل کے مشوروں سے مستغنی رہے گا البتہ مقامی سلاطین کے امورِ جنگ کے حالات، خاص قسم کے اعلانات، ٹلکسرا د کے مجوزات اور اعلیٰ حکام کے عزل و نصب اور گورنمنٹ بل وغیرہ امور میں کونسل کی منظوری کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا تھا اسی طرح جلاوطنی کی سزا سے متعلق امور بھی اس کونسل ہی کی رائے سے طے پاتے تھے۔

مزید یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس کونسل کے تمام ارکان پچھلے سول سروس کے ریٹائرڈ افسر ہوتے تھے۔

کے لئے 'صدر محاسب' کا دفتر یعنی جنرل چیمبر آف اکاؤنٹس" قایم تھا مگر یہ براہِ راست ہالینڈ کے تاجِ شاہی (یعنی وزارتِ نوآبادیات) سے وابستہ تھا اور فیصلوں کے لئے عدالتِ عالیہ بمعہ ماتحت عدالتوں کے قایم تھی۔

غرض کونسل تمام قسم کی تجویزات کی تحریک اٹھاتی تھی اور گورنر جنرل اجلاس کے وقت (جو ترمیمی ایکٹ کے بعد سے ملتوی کر دئے گئے تھے) صدارت کے فرائض انجام دیتا تھا، اس کی عدم موجودگی میں نائب صدر، صدر رہتا تھا۔ گورنر جنرل کا ایوانِ رہایش جیسا کہ تحریرات سے واضح ہے، 'بوگور' میں تھا مگر سکریٹریٹ کے تمام شعبہ جات کے مرکزی دفاتر بٹاویہ میں تھے جن میں رکھے جانے والے ملازمین سِوِل سَروِس[1] کے امتحانات پاس ہوتے تھے۔ اور اسی امتحانی کامیابی کے معیار کے مطابق مختلف محکموں اور عہدوں پر فائز کئے جاتے تھے۔ ان محکموں کے سلسلہ میں ملک کی مالیات، تعلیمات اور عدلیات وغیرہ پر آگے روشنی ڈالی جائے گی اب ذیل میں مقننہ پر بھی اختصار کے ساتھ کچھ بیان کر دیا جائے۔

---

[1] **سِوِل سَروِس کے امتحانات** یہ امتحانات جیسا کہ معلوم ہوا ہے نہایت سخت ہوتے تھے پھر قانونی پابندیاں بھی کچھ اس قسم کی رکھی گئی تھیں کہ سوائے ولندیزی کے کوئی انڈونیشی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ اہلِ انڈونیشیا میں سے ذہین طالبعلم کا بھی اس میں کامیاب ہو کر سرکاری ملازمت میں آنا دشوار تھا۔

بہرحال جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ امتحانات پہلی بار ۱۸۴۲ء میں قایم کئے گئے، اور ان کی تربیت کے لئے سب سے پہلا ادارہ بھی 'سُراکرتا' کے مقام پر کھولا گیا مگر ۱۸۴۳ء میں پھر بند کر دیا گیا، اس کے بجائے خود ہالینڈ ہی میں 'رائل اکیڈیمی' کے نام سے

**فلکسراد (Volkasraad)**

چنانچہ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ برطانوی عہد کے متحدہ ہندوستان کی مقننہ (یعنی لیجسلیٹو اسمبلی کی طرح رسمی طور پر اس ملک میں بھی اس عہد میں ایک اسمبلی قایم کی گئی تھی جسے "فلکسراد" (عوامی اسمبلی) کہتے تھے جہاں تک مطالعۂ سیاست سے معلوم ہو سکا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی کے مقابلہ میں نہ یہ مجلس مقننہ تھی اور نہ اسقدر عوامی تھی۔ اس کے قیام اور عمل کے بارے میں جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کی اسمبلی کے قیام کے لئے سب سے پہلے ۱۸۵۴ء میں کوشش کی گئی اس کے بعد دوسری بار ۱۸۹۲ء میں اسکا مطالبہ کیا گیا بالآخر عہد نشاۃ ثانیہ میں اندونیشیا کے عوامی رہنماؤں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کے پیش نظر ہالینڈ کے وزیر نوآبادیات مسٹر پلیٹی (Playte) نے اسٹیٹ جنرل (پارلیمنٹ) کے سامنے ۱۹۱۵ء میں اس قسم کی مقننہ کے قیام کے لئے تجویز پیش کی جو ۱۶ دسمبر ۱۹۱۶ء میں قانون بنکر "گورنمنٹ ایکٹ" کا جزو قرار دی گئی اور اس کے بعد یہ نمایندہ جماعت

---

ایک دوسرا ادارہ قایم کیا گیا، اس کے تین درجے تھے یعنی پہلا درجہ ان لوگوں کے لئے جو قانون میں ڈاکٹر کی سند رکھتے تھے، اور کونسل کی رکنیت یا رزیڈنسی کی افسری کے لئے امیدوار ہوتے تھے، دوسرا ان لوگوں کے لئے تھا جو ڈاکٹر تو نہیں مگر گریجویٹ ہوتے تھے اور تیسرا درجہ صرف ثانوی تعلیم کے تکمیل یافتہ لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ شروع شروع میں یہ اکیڈیمی امسٹرڈم میں کھولی گئی مگر پھر ۱۸۶۴ء میں اس کا مرکز "لیڈن" قرار دیدیا گیا۔ تربیت کی مدت بھی پانچ سال تھی۔ ۱۸۷۶ء میں یہ ادارہ پھر توڑ دیا گیا اور اس کے بجائے ایک دوسرا ادارہ "اندولوجیکل اسٹیڈیز" کے عنوان سے کھولدیا گیا اور مدت تعلیم بھی ۱۸۹۱ء میں تین سال کر دی گئی یہ ادارہ ۱۹۱۳ء تک بھی قایم تھا۔

کے سامنے ۱۹۱۵ء میں اس قسم کی مقننہ کے قیام کے لئے تجویز پیش کی جو ۱۶ دسمبر ۱۹۱۶ء میں قانون بنکر دگورنمنٹ ایکٹ، کا جزو قرار دی گئی اور اس کے بعد یہ نمایندہ جماعت وجود میں آگئی۔ شروع شروع میں اس کی رکنیت کل ۳۹ نمایندوں پر مشتمل تھی مگر اسکی حیثیت مشاورتی بورڈ سے زیادہ نہ تھی، گورنر جنرل کو آزادی تھی کہ وہ جس موضوع پر چاہتا اس مجلس سے مشورہ کرتا اور بس۔ رسمی طور پر اندونیشیا میں اس کا افتتاح ۱۸ مئی ۱۹۱۸ء کو اس وقت کے گورنر جنرل کی تقریر سے کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء اور پھر ۱۹۲۵ء کے ترمیم شدہ گورنمنٹ ایکٹ کے ذریعہ اس مجلس کے اختیارات اور حیثیت میں بھی فرق آگیا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو اس کے ارکان کی مجموعی تعداد بھی ۴۰ کے بجائے ۴۹ کر دی گئی جن میں ۴۸ کی تقسیم کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا مثلاً

اندونیشی ۲۰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ان میں سے ۱۲ منتخبہ اور ۸ نامزد شدہ)

یورپین ۲۸ ″ ″ ۱۲ ″ اور ۱۶ ″

۱۹۲۷ء تک یہ ترکیب اسی نہج پر رہی مگر اس کے بعد تشکیل میں پھر ترمیم کر دی گئی اور اضافہ ہو کر کل ارکان کی تعداد بھی ۶۱ ہو گئی جس میں سے ۳۰ اندونیشی، ۲۵ نیدرلینڈی، ۵ غیر اندونیشی ایشیائی اور ایک ودیو۔

اب جہاں تک ارکان کے انتخاب کے طریق کار کے متعلق ہم پہنچی ہوئی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے طریقہ انتخاب غیر براہ راست تھا، اور مدت کے اعتبار سے بھی وقفہ برائے منصب ۳ سال تھا پھر ایک سال اور اضافہ کر کے چار سال کر دیا گیا تھا مگر مجلس کی برخاستگی کے لئے کوئی ضابطہ نہ تھا، انتخاب کے خاص خاص حلقے مغربی جاوا، وسطی جاوا، مشرقی جاوا، جاوا کی دیسی ریاستیں، جنوبی سماترا،

علاقہ، مینَنگ کَباؤ، شمالی سُماترا، مشرقی سُماترا، بورنیو، سلیبس اور جزائر سُنڈا خورد تھے مگر انتخاب برائے نام تھا، اور مجلس کا عمل بھی مہمل تھا جس پر روشنی ڈالتے ہوئے "سی بارانی" نے لکھا[1] ہے کہ "یہ لوگوں کی کونسل ایک ایسی کونسل تھی کہ جس کو بجائے عوام کی نمایندہ کہنے کے حکومت کی نمایندہ کہنا چاہئے جس میں ۲۵۰۰۰۰ یورپینوں میں ۲۵ نمایندے تھے، ۲۰۰۰۰۰۰ ایشیائی (عرب، چینی اور دیگر) میں سے صرف ۵ اور ۲۰۰۰۰۰۰۰ اندونیشیوں میں کل ۳۰ نمایندے تھے جن میں سے ۲۰ غیر براہ راست طریقہ سے منتخب کئے جاتے تھے، پھر طریقہ انتخاب پیچیدہ بھی اسقدر تھا کہ انتخاب کرنے والے آخر میں بہت کم رہ جاتے تھے، اس پر مزید یہ کہ تصفیہ شدہ امور پر نظر ثانی کے لئے گورنر جنرل کو ویٹو کے اختیارات حاصل تھے، اس طرح یہ مجلس صرف ہاں میں ہاں ملانے والوں کی ایک جماعت بنکر رہ گئی تھی"۔

غرض ولندیزیوں کی حکومت کی آخری مدت یعنی مارچ ۱۹۴۲ء تک اس مجلس کی نوعیت اور اسکا طریق کار اسی طرح قایم رہا پھر جب جاپانی آئے تو انھوں نے اپنا نظام اپنے طریقہ پر قایم کیا۔

## صوبائی نظام

اب ذیل میں ذرا صوبائی نظام کی بھی کچھ اجمالی کیفیت ملاحظہ ہو۔ جہاں تک کہ اس عہد کی ولندیزی تواریخ سے معلومات بہم پہنچی ہیں ملک کی سیاسی تقسیم اور صوبائی نظم و نسق کے اعتبار سے طریقہ کار ہر زمانہ میں ایک خاص مدت تک کے لئے ایک خاص طریقہ پر مشتمل رہا ہے۔ کمپنی کے عہد حکومت میں حدود مملکت محدود تھیں لہذا یہ تقسیم بھی محدود رہی لیکن ۱۹۱۰ء میں

[1] سی بارانی کی کتاب "(Why Indonesians Revolted)" صفحہ ۸ مطبوعہ جکارتا ۱۹۴۵ء۔

"فتح آچیہ" کے بعد چونکہ رقبہ بہت وسیع ہو گیا تھا لہٰذا صوبوں کی حد بندی اور ضلعوں کی مقامیت میں بھی کافی فرق آ گیا۔ اور ملکی تقسیم کا یہ سلسلہ پھر اس مدت یعنی ۱۹۱۰ء کے بعد سے لے کر ۱۹۲۲ء تک اور پھر ۱۹۲۲ء سے بزمانۂ زوال تک بدلتا رہا۔

۱۹۲۲ء سے پہلے تک یہ پورا جزائری ملک ولندیزیوں نے ۳۶ حصوں میں تقسیم کیا تھا جن میں سے پندرہ جزیرۂ جاوا اور مدورا میں تھے اور بقیہ ۲۱ بیرونِ جاوا میں تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو "رزیڈنسی" کہتے تھے، اور اس کا افسر اعلیٰ، "رزیڈنٹ" کہلاتا تھا مگر اس اصطلاح کا انطباق صرف جاوا اور مدورا ہی تک رہا جو اندرونی علاقے کہلاتے تھے، بیرونی علاقوں۔ مثلاً آچیہ، مشرقی سماترا اور سلیبس کے حاکمِ اعلیٰ گورنر کہلاتے تھے، جن کے تحت میں چند رزیڈنسیاں تھیں اور داخلی امور میں بہت زیادہ مختار تھیں ان کی کونسلیں بھی اپنے اپنے طور پر جدا جدا تھیں اور علاقہ کے حاکمِ اعلیٰ یعنی گورنر کے ماتحت تھیں جو گورنر جنرل کا مقرر کردہ ہوتا تھا۔ اس کی اعانت کے لئے ایک رزیڈنٹ اور ایک معاون رزیڈنٹ ہوتا تھا۔ جو اپنی اپنی رزیڈنسیوں میں صاحبِ اختیار افسر سمجھا جاتا تھا۔ رزیڈنٹ کی اعانت کے لئے ایک افسر اور ہوتا تھا جسے "کنٹرولر" کہتے تھے، یہ کنٹرولر دیسی یا دیہاتی بندوبست کا بڑا افسر مانا جاتا تھا مگر جاوا اور مدورا میں اسے "ریجینٹ" کہتے تھے، اور اس کی حیثیت نصف سرکاری اور نصف غیر سرکاری تھی۔ عموماً دیسی حکمراں اس عہدہ پر فائز کئے جاتے تھے اور ان کے دائرۂ عمل کو "ریجینسی" کہتے تھے ریجینسی کا کم سے کم رقبہ ۶۵۰ میل مقرر کیا گیا تھا۔ "ریجینٹ" کا قائم مقام "پاتِح" کہلاتا تھا۔ ہر ریجینسی چند خاص حصوں میں منقسم تھی جن میں سے ہر ایک کی حیثیت فی المثل ضلع کے تھی

اور ایک "وَیڈانا" کے ماتحت عمل کرتی تھی۔ وَیڈانا کے ماتحت گاؤں کا پورا نظام ہوتا تھا اور اس کا ایک نائب بھی تھا۔

**ملک کی صوبائی تقسیم**

اس نظم ونسق کے بعد اب صوبائی تقسیم پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ولندیزیوں کے زوال (سنہ ۱۹۴۲ء) کے وقت تک پورا ملک ۸ صوبوں میں تقسیم تھا مثلاً مغربی جاوا، وسطی جاوا، مشرقی جاوا جس میں مدورا بھی شامل تھا۔

---

لہ پورے ملک میں گاؤں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی (سرکاری رپورٹ سنہ ۱۹۳۰ء ملاحظہ ہو)۔
سنہ ۱۸۹۷ء میں کل گاؤں کی تعداد ۳۰،۵۰۰ تھی جن میں شمارہ آبادی فی گاؤں ۸۰۰ اشخاص تھا۔

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| سنہ ۱۹۰۷ء | ۲۶،۶۰۰ | " | " | " | ۱،۰۵۰ |
| سنہ ۱۹۱۷ء | ۲۴،۰۰۰ | " | " | " | ۱،۲۵۰ |
| سنہ ۱۹۲۷ء | ۱۸،۵۸۴ | " | " | " | ۱،۸۰۶ |

**گوٹنگ رودینگ**

نیز تحقیقات سے اس امر کا بھی پتہ چلا ہے کہ اس دور میں ان تمام گاؤں کے باشندوں نے اپنی قدیم دیہاتی تحریک "گوٹنگ رودینگ" (اتحاد باہمی اور مواخات) کی بھی تجدید کی تھی جو سینکڑوں سال سے ان میں چلی آتی تھی۔ یعنی یہ کہ ہر دیہاتی ایک دوسرے کا بھائی ہے، غم میں، خوشی میں، کاروبار اور لین دین میں برابر کا شریک ہے فصل کے موقع پر اور بیج بونے کے ہنگام پر اور ایسے ہنگاموں پر جو وارداتی قسم کے ہوتے تھے تمام گاؤں کے لوگ ایک یعنی ضرورتمند کے ہاں اکھٹے ہوجاتے تھے اور بلا کسی معاوضہ کے کام کرتے تھے، اس طرح تمام گاؤں اور دیہاتوں میں اتفاق قایم تھا، میل جول کی اسپرٹ کارفرما تھی، نہ ان میں چوری ہوتی اور نہ عصمت دری کی وارداتیں ظہور میں آتی تھیں اگر کبھی کوئی جرم کا مرتکب ہوجاتا تو گاؤں والے اسے اپنے گاؤں سے نکال دیتے تھے، اس طرح ان کا کردار اخلاق بھی بہت بلند تھا، "تو میرے کام آ، میں تیرے کام آؤں" اس تحریک کا اصل الاصول تھا، ایک اندونیشی دوست نے مجھے بتلایا کہ یہ اصول اب بھی اندونیشیا کی دیہاتوں میں اسی طرح کارفرما ہے۔ (قادری)

سماترا، سماتری جزائر، بورنیو، سلیبیس، بیہ سمندر۔ اور پھر ہر صوبہ چند خاص ضلعوں میں تقسیم تھا جن میں سے ہر ایک کو رزیڈنسی[۱] کہتے تھے اور ان صوبوں کو حکومت کہتے تھے، مگر یہ صوبے بتدریج قایم کئے گئے تھے ان کا قیام ایک ساتھ

---

۱ کل رزیڈنسیوں کی تقسیم — صوبہ جاتی رزیڈنسیوں کی مندرجہ ذیل تفصیلات ۱۹۳۲ء کی سرکاری رپورٹ (Statistisch Faaroverzicht) سے ماخوذ ہیں۔

جزائر جاوا اور مدورا

رزیڈنسیاں ۔۔۔۔ رقبہ (یہ رقبہ ۔۔۔ مربع کلومیٹر کے لحاظ سے حذف کردیا گیا ہے)

| صوبہ | رزیڈنسیاں | رقبہ | صوبہ | رزیڈنسیاں | رقبہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۔صوبہ مغربی جاوا | ۱۔بانتن | ۵ر۷ | | ۷۔بیسوکی | ۱۰ر۵۱ |
| | ۲۔بٹاویہ | ۱ر۸ | | ۸۔مدورا | ۵ر۶ |
| | ۳۔بوئتن زارخ | ۶ر۲ | ۴۔صوبہ سماترا | ۱۔لمپونگ | ۲۸ر۲ |
| | ۴۔پریانگان | ۶ر۲۱ | | ۲۔پلیم بنگ | ۸۰ر۹ |
| | ۵۔چریبون | ۶ر۵ | | ۳۔جامبی | ۴۶ر۶ |
| ۲۔صوبہ وسطی جاوا | ۱۔پکالونگان | ۶ر۵ | | ۴۔بنکولن | ۲۵ر۸ |
| | ۲۔سمارنگ | ۷ر۵ | | ۵۔مغربی ساحل | ۴۹ر۵ |
| | ۳۔بانیومس | ۵ر۴ | | ۶۔تپانولی | ۳۹ر۶ |
| | ۴۔کیدو | ۶ر۴ | | | |
| ۳۔صوبہ مشرقی جاوا | ۱۔سورابایا | ۳ر۵ | ۵۔صوبہ سماتری جزائر | ۱۔ریو | ۳۲ر۳ |
| | ۲۔بودی نیگورو | ۶ر۸ | | ۲۔بنکا | ۱۱ر۷ |
| | ۳۔میڈیون | ۶ر۵ | | ۳۔بلیتون | ۴ر۸ |
| | ۴۔کیدیری | ۵ر۷ | ۶۔صوبہ بورنیو | ۱۔مغربی بورنیو | ۴۷ر۲ |
| | ۵۔مالانگ | ۵ر۳ | | ۲۔جنوبی اور مشرقی بورنیو | ۳۸۶ر۶ |
| | ۶۔پروبولنگو | ۳ر۵ | | | |

عمل میں نہ آیا تھا ان صوبوں میں باقاعدہ کونسلیں تھیں جو پہلے رزیڈنسی کی کونسل کہلاتی تھی۔ ان کا سلسلہ پہلی بار ۱۹۰۵ء میں شروع ہوا تھا اس سے قبل رزیڈنسیوں میں کوئی باقاعدہ کونسل نہ تھی یہ کونسلیں ۱۹۲۶ء میں توڑ دی گیئں اور پھر ان کے بجائے نئی کونسلیں مرتب کی گیئں جو صوبائی کونسل کہلاتی تھیں اور گورنرِ صوبہ ہی کی صدارت میں عمل کرتی تھیں مگر ان کا کام بھی فلکسراد کی طرح محض بحث پر بحث کرنا تھا قانون بنانا نہ تھا۔

**گورنرِ صوبہ**

ہر صوبہ کا حاکمِ اعلیٰ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، گورنر ہوتا تھا جو عموماً حکومت کی نگاہوں میں اچھی طرح شہرت رکھنے والے رزیڈنٹوں میں سے منتخب کر لیا جاتا تھا، رزیڈنٹ کی طرح اس کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ پیدائشی ڈچ ہو، اور مذہباً عیسائی ہو، ان کا تقرر گورنر جنرل کے ایما سے ہوتا تھا۔ مگر یہ ضروری تھا کہ نوآبادیات کی وزارت سے رسمی منظوری حاصل کی جائے۔

---

| رقبہ | رزیڈنسیاں | | رقبہ | رزیڈنسیاں | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۵ر۰۹ | تمور | ۸۔ سیر سینڈو | ۵ر۰۹ | مینڈو | ۷۔ صوبہ سلیبس |

ریاستی رزیڈنسیوں کے رقبے ان کے علاوہ ہیں جو بخوفِ طوالت حذف کر دئے گئے ہیں۔

لہ متداول دستور کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اسمیں ایک شق یہ رکھی گئی تھی کہ گورنر جنرل جس علاقہ کو بھی مناسب سمجھے گا اور جب مناسب سمجھے گا، صوبہ قرار دیدے گا۔ چنانچہ گورنر جنرل جب مناسب سمجھتا تھا چند رزیڈنسیوں کے مجموعہ کو صوبہ قرار دیدیتا تھا۔ ورنہ رزیڈنسیاں بغیر صوبہ کے بھی قائم تھیں۔ مثلاً جاوا میں ایک مدت تک کوئی صوبہ نہ تھا، ۱۹۲۶ء میں مغربی صوبہ، ۱۹۲۹ء میں مشرقی اور ۱۹۳۰ء میں وسطی جاوا کا صوبہ بنایا گیا۔ سماٹرا کو ۱۹۲۲ء میں اور پھر اسکے کچھ دنوں بعد بورنیو اور سلیبس کو صوبے بنائے گئے۔ مگر "مالوکو" کو باوجود اسکے کہ وہاں کا حاکم گورنر کہلاتا تھا اس وقت تک صوبہ قرار نہیں دیا گیا تھا، بلکہ اسکی حیثیت ہمارے ہاں کی چیف کمشنری کے مانند تھی، جس کا مرکز "امبون" تھا۔ تدورے، ترناتے، ہلماہیرا، نیوگنی اور اسی سلسلہ (مالوکو) کے تمام چھوٹے جزائر جو پہلے "ترناتے رزیڈنسی" میں شامل تھے اسکے تحت میں آگئے (اب انڈونیشیا کے نظام جمہوریہ میں یہ سب ملکر ایک صوبہ مالوکو کہلاتے ہیں) جزیرۂ جاوا کی دو دیسی ریاستیں "سولو" اور "جوگ جکارتا" الگ الگ رزیڈنسیاں تھیں، نگران کا حاکمِ اعلیٰ بھی ایک ہوتا تھا اور وہ بھی گورنر کہلاتا تھا۔

گورنر کی حیثیت امورِ داخلی میں بالکل آزادانہ تھی اگرچہ وہ منصب کی حیثیت سے گورنر جنرل کے سامنے جواب دہ تھا مگر یہ دستور تھا کہ گورنر جنرل اس کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتا تھا۔ ہندوستان یا پاکستان کے صوبائی گورنر سے اس کی حیثیت بالکل مختلف تھی۔ یعنی یہ کہ نہ اس کے تحت میں صوبائی وزارت وکابینہ تھی اور نہ کوئی صوبائی اسمبلی تھی یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ جب ہندو پاکستان کے کسی صوبہ میں وزارت توڑ کر گورنری راج قایم کیا جاتا ہے وہ حیثیت یہاں کے گورنرِ صوبہ کو حاصل تھی، مرکزی کونسل کی طرح ایک صوبائی کونسل ضرور تھی جو "رَادْ فَانْ بَرُوْدِنْسِیْ" کہلاتی تھی، جس کے ارکان کے تحت میں ایک سکریٹریٹ تھا۔ جو تمام صوبہ پر حکومت کے کاروبار کو چلاتا تھا۔ اور سکریٹری جنرل کی نگرانی میں عمل کرتا تھا، صوبہ یا علاقہ میں واقع ہونے والی دیسی ریاستیں بھی گورنرِ علاقہ ہی سے مشاورت کرتی تھیں۔ اور رزیڈنسیوں کا نظم و نسق بھی اسی گورنر کے تحت میں تھا جس طرح ہمارے پاکستان میں ضلعوں کا انتظام قایم ہے۔

## حکومتِ خود اختیاری

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس ملک کے اس عہدِ نظام میں کبھی متحدہ ہندوستان، کی طرح صوبوں کے ضلعوں میں حکومتِ خود اختیاری قایم نہیں کی گئی البتہ میونسپل کمیٹیاں، ضرور قایم کی گئی تھیں تاریخی حیثیت سے ان کا قیام پہلی بار ۱۹۰۵ء میں عمل میں آیا تھا اس ذیل میں بعض "ڈچ مُصنّفین" کی تحریرات سے مُستفاد ہے کہ شروع شروع میں تحتانی معیار کے ولندیزی مدارس اور امورِ شہریت سے متعلق چیزیں سب ان میونسپلٹیوں ہی کے تحت میں رکھی گئیں، ۱۹۱۸ء تک ان میونسپلٹیوں کی حیثیت

غیر منتخبہ تھی یعنی ان کی دیکھ بھال کرنے والے افسر تمام حکومت کے نامزد کردہ ہوتے تھے اور عموماً ولندیزی ہوتے تھے اندونیشی ارکان بہت زمانہ کے بعد اس میں ایک مقرر تعداد میں لئے جانے لگے، جہاں تک معلوم ہوا ہے اندازہ یہ ہے کہ ان میونسپلٹیوں کا نظام بھی ہندو پاکستان کی میونسپلٹی نظام سے بالکل الگ تھا اس کی تفصیلات میں جانا اس مقام پر باعثِ طوالت ہوگا لہٰذا اب دیسی ریاستوں کے عام پوزیشن پر بھی اختصار کے ساتھ تاریخی تذکرہ پیش کر دیا جاتا ہے۔ مالیات، زراعت، اور تعلیمات کو اس کے بعد بیان کیا جائے گا۔

## دیسی ریاستیں اور ان کا عام پوزیشن

ولندیزی عہد کے نظامِ حکومت کے مطالعۂ سیسی سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء سے پورے اندونیشیا میں ریاستوں کی جملہ تعداد ۲۸۲ تھی جن میں سے چار جاوا میں اور بقیہ ۲۷۸ بیرونِ جاوا میں تھیں۔ جاوا کی ریاستوں میں سُرکرتا (سُولو) اور جوگ جکارتا کی ریاستیں نسبتاً بڑی تھیں۔ ان ریاستوں کے حکمران مختلف مقامات پر مختلف شاہی نام سے مشہور تھے مثلاً جوگ جکارتا کا حکمران سلطان، سولو کا سوسو ھونان اور بالی کا راجہ اور اسی طرح آچیہ کا سلطان کہلاتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء تک اکثر ریاستیں آزاد تھیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بقول "امرئے فنڈن بوش" صرف پندرہ گھروں پر مشتمل تھیں بعض ریاست کا رقبہ ایک چھوٹے سے ٹاپو ہی تک محدود تھا۔

ان دیسی ریاستوں کا رقبہ بقول " فنڈن بوش" (صفحہ ۶۶) بیرونِ جاوا کے تمام ملک کا آدھے سے زیادہ اور جاوا کا سات فیصدی تھا جو بحیثیت مجموعی بقول

فرِنول کُل اندونیشیا کی ۵/ ۱ آبادی پر محتوی تھا۔ بڑی ریاستیں ولندیزی "اصطلاحِ سیاست میں "پرِنسپلیٹی" کہلاتی تھیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نام مختلف مقامات پر مختلف تھے۔

ان ریاستوں کے ساتھ ولندیزی استعمار کا جو طرزِ عمل رہا اس کا اندازہ غالباً باب سویم وغیرہ کی تفصیلات سے کر لیا گیا ہوگا۔ کمپنی کے عہد تک یہ ریاستیں صرف تجارتی تعلقات میں ولندیزیوں کے تحت میں تھیں ورنہ دیسے آزاد تھیں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب زمامِ حکومت کمپنی سے منتقل ہو کر تاجِ ہالینڈ کے ہاتھ میں آئی تو دیسی ریاستوں کے ساتھ ولندیزی تعلقات کی کیفیت بھی بدل گئی۔

۱۹۰۷ء میں ہالینڈ کے تاجِ شاہی سے ایک اعلان کیا گیا جو چند مخصوص شرائط پر مشتمل تھا اور حیثیت کے اعتبار سے بھی بڑا اہم تھا، طے یہ کیا گیا تھا کہ اس شرائط نامہ کو منظور نہ کرنے والا دیسی حکمراں ولندیزی استعمار کا دشمن سمجھا جائے گا اور اس کی نامنظوری کو براہِ راست اعلانِ جنگ کے مترادف قرار دیا جائے گا۔ دیسی حکمراں نہایت کمزور اور مالی حالت کے اعتبار سے بھی خستہ حال تھے لہذا انھوں نے اس کو تسلیم کر لیا اور اس طرح سب ولندیزی سامراج کے ماتحت ہو گئے۔ عہد نامہ کی شرائط یہ تھیں مثلاً۔

(۱) ہر ریاست کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہالینڈ کے تاجِ شاہی کو اپنا مُقتدرِ اعلیٰ سمجھے۔ (۲) کسی بیرونی قوت کے ساتھ خواہ وہ یورپین ہی کیوں نہ ہو تعلقات قائم نہ کرے۔ (۳) ملکۂ ہالینڈ کے نمایندہ 'گورنر جنرل' کے ذریعہ جاری ہونے والے شاہی اعلانات اور احکامات کا احترام کرے۔

۱۹۲۵ء میں شرق الہند کی ولندیزی حکومت نے اپنے ترمیم شدہ مسودہ

قانون میں دیسی ریاستوں کے متعلق بھی کچھ جدید شقوق مرتب کیں جن کی رُو سے :-

(۱) ہر علاقۂ ریاست کی دوبارہ حد بندی کی گئی - (۲) اور اس حد بندی کے بعد یہ طے کیا گیا کہ نیدر لینڈ انڈیز کی مرکزی حکومت جب بھی کبھی ضرورت سمجھے گی ان ریاستوں کی زمینوں کو بلا کسی معاوضہ کے استعمال کر سکے گی - (۳) نیز گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ وہ ہر دیسی حکمراں کو اپنی کسی معقول وجہ پر معزول کر سکے گا اور اس کی جگہ نیا حکمراں متعیّن کر سکے گا - (۴) ہر دیسی حکمراں کو اپنے ضلع کے افسرِ مجاز سے مشورہ کرتے رہنا ہوگا۔

غرض اس طرح ریاستوں کی حیثیت کو ایک طریقے سے بالکل مفلوج بلکہ ختم کر دیا گیا اور دیسی حکمراں کے حقوق پر بھی چند پابندیاں لگا دی گئیں مثلاً یہ کہ وہ ولندیزی حکومت کے مقرر کردہ بجٹ سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا تھا، زمینوں کی پیداوار اور اشیائے درآمد برآمد پر بھی اسے ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، بالفاظِ دیگر اب حکمراں کی کوئی خاص پوزیشن نہ تھی - ان کے داخلی نظم و نسق پر روشنی ڈالتے ہوئے فنڈرن بوش،، (صفحہ ۶۸ پر) لکھتا ہے کہ :-

"ہر ریاست کو اپنے ہاں ایک یورپین منتظم رکھنا پڑتا تھا جس کے اختیارات بہت وسیع تھے - اس کے علاقہ میں بسنے والے یورپین لوگوں سے تعارض کرنا بھی دیسی حکمراں کے اختیارات میں نہ تھا - حتیٰ کہ کسی ریاست کے انڈونیشی باشندے مرکز کے کسی علاقہ میں جاکر مزدوری وغیرہ کرتے تو بھی دیسی حکمراں کوئی حکم نہیں چلا سکتا تھا۔"

غرض یہ تھی دیسی ریاستوں کی عام حیثیت اور ان کے حکمرانوں کا عام پوزیشن

اب ذیل میں ولندیزی نظامِ حکومت کی صیغہ جاتی کارفرمائیوں کا اجمال بھی ملاحظہ ہو۔ جو دراصل کسی مُلک کے نظامِ تمدّن پر ارادی اور غیر ارادی، خارجی اور داخلی ہر حیثیت سے اثر انداز ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ایک ملک کا "مالیہ" ہے جو قدرتی وسائل یعنی زراعت جنگلات، معدنیات، حیوانات اور تجارت پر مملو ہے۔ اور حکومت کے نظام اور عوام کی زندگی اور اس زندگی کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن پر خاص طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے اس شق کو بیان کیا جاتا ہے۔

# مالیات

**تاریخی پس منظر**

مالیات کے سلسلہ میں سب سے اہم چیز ملک کا "ریوینیو" یعنی صیغہ مال ہے جو آمدنی کی مُتفرع صورتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

لہٰذا اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کمپنی کے دورِ حکومت میں جیسا کہ پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے ولندیزی کمپنی کے مقبوضات کی وسعت اس ملک میں بہت محدود تھی اور اسی اعتبار سے آمدنی بھی جو لگانِ آراضی اور دیگر ذرائع سے حاصل ہوتی ہے وہ بھی کم تھی۔ کمپنی کی حکومت کا مطمح نظر زیادہ تر تجارتی اجارہ داریاں حاصل کرنا، اجارہ داریوں کے ذریعہ کم سے کم قیمت پر ملک کی پیداوار خریدنا اور ان پیداواروں کو زیادہ سے زیادہ منافع پر دیگر ممالک میں بیچنا تھا مگر ۱۷۹۸ء میں جب حکومتِ کمپنی ختم ہو کر تاجِ ہالینڈ کی براہِ راست حکومت شروع ہوئی تو ولندیزیوں کی جوع الارضی بھی شدید ہو گئی۔ حتیٰ کہ انقلابِ فرانس اور دیگر اثرات سیاسی کے خاتمہ کے بعد جب ہالینڈ انگریزوں کے ساتھ

ایک خاص معاہدہ کرکے ۱۸۱۵ء میں ان کھوئے ہوئے مقبوضات پر بحال ہوا تو حدودِ مملکت کو بھی بے تحاشہ طریقہ سے وسیع کرنے پر توجہ دی گئی جس کے نتیجہ کے طور پر ۱۸۲۵ء کی وہ لڑائی ظہور میں آئی جو اہلِ اندونیشیا میں پہلی جنگِ آزادی اور سیاستِ جاوا میں جہادِ دیپونگورو یا جنگِ جاوا کہلاتی ہے۔ اسی لڑائی کے بعد سے اہلِ ہالینڈ نے اپنی آئینی بندش اور قانونی شکنجہ کو اہلِ اندونیشیا پر مضبوط کیا تھا، اور نت نئی پالیسی کے ذریعہ مقامی باشندوں کے قبضہ سے زیادہ سے زیادہ انہیں اپنے اختیار میں لینے کی ترکیبیں نکالی تھیں چونکہ ایک بار ہالینڈ کے بادشاہ کا خاندان انقلابِ فرانس کے وقت جان بچاکر ہالینڈ سے انگلستان فرار ہوگیا تھا اور تقریباً بیس سال اس جلاوطنی میں بسر کئے تھے لہذا اپنی بحالی کے بعد پچھلے تجربہ کی بنا پر قلمرو کی پوری عنان اپنے ملک کے عوامی رہنماؤں اور زعمائے سیاست کے ہاتھ میں دے کر محض ایک آئینی حکمراں کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان جزائر میں وقتاً فوقتاً آتے رہنے والا گورنر جنرل اپنی من مانیوں اور قوم پرستیوں میں بہت زیادہ مختار تھا۔ اور اسی طرح اس کے زیرِ نگیں عمال بھی اپنے عمل میں بے زمام تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے بندش والے نئے نئے آئین اور جدید ترین قوانین کے باعث اندونیشیا کی جاگیرداریاں بھی خستہ حال ہوتی چلی گئیں بہت سے امرا تو مقروض ہوکر ولندیزیوں کے ماتحت ہوگئے اور بہت سے نامساعدتِ روزگار کے باعث ملکی نقشوں سے بھی محو ہوکر رہ گئے اور اس طرح اندونیشیا کا ایک وسیع وعریض رقبہ ان کے تحت میں آگیا۔

شاہ ولیم (بادشاہ ہالینڈ) کی بحالی کے بعد "فاندرکیپلین"، جو پہلا گورنر جنرل اور وائسرائے مقرر ہوکر (۱۸۲۶-۱۸۱۶) آیا تو اس نے زمینوں اور ان کے مالیہ کے متعلق

ایسے سخت قوانین مرتب کئے کہ تمام دیسی ریاستیں اور عام زمینداری نظام قریب پامال ہوگیا اور حکومتِ وقت کی آمدنی بھی غیر معتدبہ طور سے بڑھ گئی۔ جس کی مختصر کیفیت ذیل کی جدول میں ملاحظہ ہو[۱]:۔

(ریونیو اور مصارف اعداد میلن فلورنس میں شمار کئے گئے ہیں)

| سن | زمینوں کا ریونیو | دیگر وسائل آمدنی | میزان | مصارف کا شمارہ |
|---|---|---|---|---|
| سنہ ۱۸۱۴-۱۵ء | ۲ر۲۷ | ۵ر۰۵ | ۷ر۵۲ | ۹ر۰۹ |
| سنہ ۱۸۱۸-۱۹ء | ۳ر۲۵ | ۲۰ر۲۵ | ۲۳ر۴۵ | ۱۹ر۸۰ |
| سنہ ۱۸۲۰ء | ۴ر۰۱ | ۱۹ر۷۵ | ۲۳ر۷۶ | ۲۵ر۰۷ |
| سنہ ۱۸۲۳ء | ۵ر۴۱ | ۱۶ر۴۷ | ۲۱ر۸۸ | ۲۲ر۶۵ |

## زراعت اور زراعتی پالیسی

اور سنہ ۱۸۵۱ء میں "لبرل پالیسی" اختیار کرکے دیسی زمینداروں کی زمینیں یوروپی باشندوں کو اجارہ پر دینے کا آغاز کیا گیا اور اس کا اصطلاحی نام "اِملاک" یا (Estate) رکھا گیا اس طرح "اِملاکی نظام" یا (Estate system) ۔ شروع ہوگیا۔ اس نظام کے شروع ہونے سے سارے ملک کی زمینیں دو خاص اصطلاحی درجوں میں تقسیم ہوگئیں یعنی "مقامی نظام" (Native system) اور "اِملاکی نظام" یعنی (Estate system) اور اسی نظام کے ماتحت کاشت بھی ہونے لگی۔ حتیٰ کہ محکمۂ کاشت کا انتظامی پروگرام بھی اس نئے نظام کے ماتحت متشکل کیا گیا چنانچہ ایک مصنّف نے لکھا ہے کہ حکومت کی معاونت سے اجارہ پر اسقدر زمینیں حاصل

---

[۱] حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو جے۔ ایس فرنیول کی کتاب "نیدرلینڈس انڈیا"، صفحہ ۸۵۔

کی گئیں کہ اس املاکی نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں ولندیزی مالکانِ املاک کو بڑی آسانیاں بہم پہنچ گئیں ٹریکٹر اور دیگر جدید آلات کے استعمال سے فصلوں میں بھی افزونی ہوگئی اور چونکہ "مقامی نظام" کے ماتحت زمینوں کے قطعے بھی بہت چھوٹے چھوٹے رہ گئے تھے لہذا سوائے قدیم آلات اور طریقوں کے کاشت کے لئے کوئی اور صورت اہلِ انڈونیشیا کے لئے باقی نہ رہنے کے باعث پیداوار کی مقدار روز بروز کم ہوتی چلی گئی پھر پیداوار کی زراعت اجناس میں بھی بزورِ حکم تخصیص کر دی گئی تھی لہذا ویسے بھی مقامی باشندوں کے مزارعین اور زمینداروں میں بدحالی پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ چنانچہ زمانۂ جنگ کا ہالینڈی وزیر اعظم پروفیسر "خر برانڈی" اپنی کتاب "انڈونیشیا" (صفحہ ۲۷-۲۸) میں خود اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"جزائر کی تمام متنوع پیداواروں میں بشمول گرم مصالحے کے زیادہ تر ولندیزیوں کے ہاتھ میں تھی حکومت نے یورپی لوگوں کو زمینیں اجارہ (Lease) پر دلوادی تھیں۔ یہ زراعتی زمین ابتدا میں فارم تھیں پھر اسٹیٹ (Estate) میں منتقل ہوگئیں یہاں تک کہ یہ یورپین کاشت کار پھر ان میں مستقلاً آباد ہوگئے۔"

یہی مصنف پھر آگے لکھتا ہے کہ :-

"اگرچہ ملک زراعتی پیداوار کے اعتبار سے مالا مال تھا مگر ان پیداواروں میں کلوں کے ذریعہ کاشت کرنے والے ولندیزیوں کے مقابلہ میں اہل انڈونیشیا کا حصہ مشکل سے ۲ فیصدی[1] بھی نہ رہا تھا۔"

---

[1] اجناس کی سن وار پیداوار کی ذیلی جدولیں اسی مصنف کی کتاب سے ماخوذ ہیں یہ جدولیں انڈونیشی پیداوار عالمی پیداواروں میں فیصدی حصہ ظاہر کرتی ہیں۔

اس سے ولندیزی حکومت کی زراعتی پالیسی کے سلسلہ میں تقسیمِ آراضی کے نظام کی نسبت ان کے طرزِ عمل کا کافی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

**بندوبست**

اب یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بندوبستِ آراضی کے سلسلہ میں حکومتِ وقت نے سب سے پہلا خطرناک اقدام ۱۸۳۰ء میں کیا تھا جس کو وہ "کلچر سسٹم" کہتے تھے۔ اس سسٹم کو جاری کرنے والا اس وقت کا گورنر جنرل "فان دین بوش" تھا جس نے اپنے اس نئے نظام کے ماتحت یہ قانون بنایا تھا کہ اندونیشی کاشت کارلگان بجائے نقد کے جنس میں ادا کیا کریں تاکہ یہ اجناس اہلِ ہالینڈ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ہالینڈ بھیجی جا سکیں اور اگر ان کی ضرورتوں سے وافر ہوں تو پھر یورپ کے بازاروں میں بھیجی جا سکیں۔ کچھ زمانہ کے بعد پھر ایک دوسرا سسٹم جاری کیا گیا جو "کن سائینمنٹ سسٹم" کہلاتا ہے یہ سسٹم بقول بعض ماہرینِ معاشیات اسقدر مہلک ثابت ہوا کہ دیسی کاشت کار سب قرضدار

| نام اجناس | ۱۹۲۸ء | ۱۹۳۰ء | ۱۹۳۵ء | ۱۹۳۹ء |
|---|---|---|---|---|
| ربڑ | ۳۵ | ۲۹ | ۳۳ | ۳۷ |
| کھوپرہ | ۳۰ | ۳۷ | ۲۸ | ۳۷ |
| چائے | ۱۷ | ۱۸ | ۱۷ | ۱۹ |
| شکر | ۲۱ | ۱۹ | ۱۱ | ۱۱ |
| گرم مصالحہ | ۹۳ | ۹۳ | ۸۹ | ۹۱ |
| سنکونا | ۹۳ | ۹۴ | ۸۵ | ۸۹ |
| پٹرول | ۲٫۳ | ۲٫۸ | ۲٫۷ | ۲٫۸ |
| ٹین | ۲۱ | ۳۰ | ۱۷ | ۱۰ |

اور درمیانی آدمی کے دست نگر ہو گئے۔ چنانچہ اسی بندولبست پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ جے۔ ایس فرنیول لکھتا ہے[۵۱] کہ: ۔

"ان تمام بدعنوانیوں کے نتیجہ کے طور پر درمیانی قرضخواہ کا طبقہ بڑھتا گیا اور بازار تباہ ہو گئے دیسی باشندوں میں افلاس کا زور ہو گیا، جس کے نتیجہ کے طور پر اخلاق کو بھی ٹھیس لگی اور جرائم کی بھی ہمت افزائی ہوئی۔ ۱۸۲۶ء میں جب "دی ایرن" گورنر جنرل ہوکر آیا تو اس نے زمینوں کو پانچ سال کے واسطے ٹھیکہ پر دینے کا طریقہ نکالا اور اس طرح تمام یورپین ٹھیکہ داروں کو جاوا بھر میں مسلّط کر دیا اگرچہ جاوا ان کی ٹھیکہ داریوں کے باعث پیداوار کی ایک بہت بڑی منڈی ضرور بن گیا مگر مقامی باشندے بیکار ہو گئے۔ ان کی بیکاریوں سے فائدہ اٹھا کر ان سے بیگار بھی لی جانے لگی (بیگار کا طریقہ ۱۸۳۰ء میں "فانڈن بوش" نے جاری کیا تھا) جو آگے چل کر ایک اہم رسم بن گئی۔"

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اندونیشیا جو محض زراعتی ملک تھا اور جہاں دیسی باشندوں کا زیادہ تر گذران بجائے صنعت و حرفت کے زراعت ہی پر تھا اب زراعت کے معاملہ میں بھی دیسی باشندوں کے استفادہ کا مقام نہ رہا۔

دیسی باشندے بقول خود ولندیزی مصنفین صرف کھانے پینے کی ترکاریاں یا کسی قدر اور چیزیں مثلاً چاول پیدا کرتے تھے ورنہ تمام قسم کی قیمتی پیداواریں ولندیزی اجارہ داروں کے "املاکی نظام" کے تحت پیدا کی جاتی تھیں مثلاً مکئی، کساوا، قہوہ، چائے، گرم مصالحہ، چاول، گنا، ربڑ اور سنکونا اور ان کے لئے آبپاشی[۵۲] کے ذرائع بھی نہایت

---

[۵۱] ملاحظہ ہو "بنڈرلینڈس انڈیا"، صفحہ ۱۱۷ مطبوعہ ۱۹۴۵ء مصنفہ فرنیول۔

[۵۲] اس پیداوار کا تناسب بھی مختلف سالوں کے اعداد شمار کے مطابق مختلف اجناس میں مختلف تھا۔ ان کا کچھ شمارہ ذیل میں ملاحظہ ہو (یہ شمارہ مقدار ٹن میں لکھا گیا ہے)۔

اچھے اور شاندار تھے (بقول ہینڈ بک آف نیدرلینڈس ایسٹ انڈیز مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۰۷)

"ان یورپین فارموں کو سیراب کرنے کے لئے پہلی بار جاوا میں ایک بڑا محکمۂ آبپاشی سنہ ۱۹۰۱ء میں قایم کیا گیا، جس سے حکومت کی لگانی آمدنی میں غیر معتدبہ اضافہ ہوا پھر رفتہ رفتہ بڑے بڑے بند بھی باندھے گئے اور ان پر تقریباً ۰۰۰،۰۰۰،۰۵۰،۲ فلورنس خرچ کیا گیا۔ ان تمام بندوں کی جائے وقوع بھی ایسے حصّوں میں تھیں جو ولندیزی ٹھیکیداروں کی املاکی زمینوں سے قریب تر پڑتے تھے مگر مقامی کاشتکاروں کو ان سے خاطر خواہ فائدہ نہ تھا"

ایک اور مصنّف نے سنہ ۱۹۴۲ء میں آبپاشی کے وسائل کے ساتھ زیر کاشت زمینوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسی زمینیں محض جاوا میں ... ۰۰۰ ،۳ ایکڑ تھیں جن میں جدید آلات کے، تحت یورپین اجارہ دار کاشت کرتے تھے اور پیداوار کی بڑی افراط تھی۔

حکومت کی ریونیو، میں زراعتی آمدنی کے علاوہ قدرتی پیداواروں میں بڑے

| سال | چاول | مکئی | ماتے بین | کساوی |
|---|---|---|---|---|
| سنہ ۱۹۲۰ء | ۲۹۱۴۰۰۰ | ۱۵۱۴۰۰۰ | ۱۰۳۰۰۰ | ۵۸۲۲۷۰۰۰ |
| سنہ ۱۹۳۰ء | ۳۵۱۲۰۰۰ | ۱۹۵۶۰۰۰ | ۱۱۶۰۰۰ | ۵۲۱۶۰۰۰ |
| سنہ ۱۹۴۰ء | ۴۳۴۷۴۰۰۰ | ۱۸۳۱۰۰۰ | ۲۸۳۰۰۰ | ۸۲۹۰۰۰۰ |

چاول اور چاول کے بعد قہوہ اور شکر بھی اس ملک کی سب سے بڑی پیداواریں ہیں۔ جاوا کی زمین میں بقول ہینو مسانی ہر ایکڑ زمین پر چالیس ٹن شکر پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال کونین کا ہے جو 'سنکونے' سے بنائی جاتی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۲۹ء میں سنکونے کی معمولی پیداوار بقدر ۱۱۰۷ ٹن تھی جو کل عالمی پیداوار کے تناسب سے نوّے فیصدی ہوتا ہے۔

صیغے جنگلی پیداوار[۱]، اور بحری پیداوار کے بھی تھے۔ اس سلسلہ میں "حکومت ڈچ ایسٹ انڈیز" نے "فارسیٹ ڈیپارٹمنٹ"، اور فشریز وغیرہ بھی قایم کر رکھے تھے، جانوروں[۲] کے سلسلہ میں خود حکومت کی بڑی بڑی فارمیں تھیں جن کی دیکھ بھال کرنے والے ولندیزی افسروں کی تربیت اور بہم رسانی کے لئے ۱۹۲۵ء میں 'سکابومی' کے مقام پر ایک بڑا اسکول بھی قایم کیا گیا تھا جہاں زراعت، باغات، جنگلات، جانوروں کے

---

**۱ے جنگلی پیداوار** جنگلی پیداواروں میں بقول ایس۔ سینٹ مصنف کتاب "لائف اِن دی فارسیٹ آف دی فار ایسٹ"۔ گھسان جنگلات کی وجہ سے عمارتی لکڑیاں، چمڑہ رنگنے کا برادہ، شہد، موم، تارپین کا تیل، گندہ بروزہ، لوبان، ہاتھی دانت، چمڑہ، ہڈیاں اور چڑیا خانوں کے لئے نمائشی جانور وغیرہ کثرت سے دستیاب ہیں چنانچہ ولندیزیوں نے ان سب کی دیکھ بھال کے لئے بڑا محکمہ فارسیٹ قایم کیا تھا جس میں عملہ کے تمام ارکان ولندیزی تھے اور 'سکابومی' کے اس کلچرل اسکول کے تعلیم یافتہ ہوتے تھے جو ۱۹۲۳ء میں قایم کیا گیا تھا۔ اندونیشیوں کو اس مدرسہ میں داخلہ کا موقع کم ملتا تھا لہٰذا وہ حکومت کے اس شعبہ میں بھی شاذ و نادر ہی لئے جاتے تھے علاوہ اس کے ان تمام چیزوں کو اکٹھا کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھی اہلِ ہالینڈ ہی کی بڑی بڑی کمپنیاں قایم تھیں چنانچہ تجارتی حیثیت سے مستفید ہونے والے بھی غیر ملکی لوگ تھے، حکومت کو بھی "ٹیکس" میں اور ٹھیکوں میں کافی آمدنی ہوتی تھی۔

**۲ے جانور وغیرہ** اس کے ساتھ ساتھ بڑا ذریعۂ آمدنی 'فارموں' کا تھا جو بقول بعض مبصرین اہلِ ہالینڈ ہی کی اجارہ داریوں میں کارفرما تھیں مقامی گاؤں والے صرف یا تو چرواہے تھے یا پھر انہی یوروپین 'فارموں' میں چھوٹے درجے کے نوکر تھے، جانوروں کی تعداد کا اندازہ (اسٹیٹسمین ایئر بک ۱۹۴۵ء کے مندرجات کے مطابق) ذیل کے اعداد سے کیا جاسکتا ہے جو ۱۹۳۹ء کی بھائم شماری سے ماخوذ ہیں:۔

گھوڑوں کی تعداد ۶۹۳،۵۵۴

گائے بیل دیگر مویشی ۴،۴۶۳،۴۳۹

علاج اور معدنی اشیاء کی شناخت کی تربیت کے لئے طلبا رجاتے تھے اور تربیت پاتے تھے مگر جیساکہ فرینول اور دیگر خود ولندیزی مصنفین کی تحریرات سے پتہ چلا ہے دیسی باشندوں کو ان میں جو مواقع ملتے تھے وہ برائے نام تھے اس لئے محکمہ جاتی افسران بھی سب بعد میں ولندیزی ہی ہوتے تھے اور انھیں ٹھیکہ وغیرہ دینے میں خوب من مانی کا موقع ملتا تھا، حکومت کو تو فائدہ تھا ہی مگر ولندیزی اجارہ دار بھی خوب فایدہ اٹھاتے تھے۔

---

بھینسیں (کرباؤ) ۳۱۹۹۱،۹۴۴

سنہ ۱۹۳۰ء کی پنج سالہ بہائم شماری کے اعتبار سے یہ تعداد اس طرح تھی۔

بھیڑوں کی تعداد ۱۲۲۷،۱۱۲

بکرہ بکری ۱۰۰۲۱۳،۳۷۴

ان بکرہ بکریوں میں سوربھی شامل ہیں جو اندونیشی عیسائیوں یا چینیوں کے ہاں پلتے ہیں۔ ہاتھیوں کی تعداد ... ۱۵۰ تھی۔

**بحری پیداوار** بحری پیداوار کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں بھی حکومت نے محکمۂ فشریز، قایم کر رکھا تھا جزیرۂ بالی کے قریب ولندیزی کمپنیاں، موتی، نکالتی تھیں مچھلیوں کی پرورش گاہیں بھی سُرابایا، بنجرماسین اور دیگر مقامات پر سب ولندیزی ٹھیکیدار کے تحت میں چلتی تھیں مقامی لوگوں کے لئے صرف ماہی گیری یا ان مچھلیوں کے لئے نگراں کی حیثیت سے چھوٹے چھوٹے کام مقرر تھے۔

**معدنیات** بحری پیداوار کے بعد حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ معدنیات ہیں جن میں ٹین، گندھک، لوہا، کوئلہ، پیٹرول، سونا، ہیرا وغیرہ ہیں یہاں کے تیل کے متعلق "اقوام متحدہ" کی سالانہ رپورٹ سنہ ۱۹۴۵ء میں درج ہے کہ ہر سال ۶۰ میلین بیرل، نکلتا ہے جبکہ ایک بیرل میں ۴۵ گیلن کے حساب سے مجموعی گیلن کی تعداد دو ارب ستر کروڑ ہوتی ہے، جزیرۂ نیوگنی میں اس کے بڑے بڑے کارخانے کھولے گئے تھے، کمپنیاں سب ولندیزی تھیں، ٹین کے متعلق "ہینڈ بک آف ڈچ ایسٹ انڈیز" (مطبوعہ سنہ ۱۹۳۱ء) میں

**صنعت وحرفت**

ان امور کے بعد مالیاتی آمدنی کا دوسرا ذریعہ صنعت وحرفت تھی۔ صنعت وحرفت کے سلسلہ میں "کارخانوں" کا اجرا اہم چیز ہے جس نے حکومت کے مالیہ میں ٹیکس کی آمدنی سے غیر معمولی اضافہ کردیا، اور اہل ہالینڈ کو بھی اس ملک میں کارخانوں کے ذریعہ کاروبار پر چھا جانے اور ان کاروبار کے ذریعہ اپنی آمدنیوں میں اضافہ کرنے کا بڑا اور زرّین موقع مل گیا۔

---

درج ہے کہ صرف ۱۹۳۰ء میں ولندیزی سوداگروں نے بلیتون جزیرہ سے ۱۶۹۱،۷۰ اسٹرک ٹن حاصل کیا تھا۔ اسی طرح بورنیو میں سُمباس اور رلینڈوک کے مقام پر سونا اور ہیرہ نکالنے کے لئے بھی ولندیزی کمپنیاں کارفرما تھیں، ۱۹۳۲ء میں سلیبس میں لوہے کے کاروباری بھی سب ولندیزی تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک کے خاص باشندے ہر چیز سے منقطع تھے، انھیں تربیت دے کر ہر چیز سے محروم کردیا۔ لہٰذا وہ غریب صرف مزدور اور قلی ہو کر رہ گئے۔

**کارخانے اور حکومت کی صنعتی پالیسی**

ولندیزیوں کے اس عہد میں ملک کی صنعت وحرفت دو خاص شعبوں میں منقسم تھی یعنی (۱) مقامی صنعت اور (۲) غیر ملکی کارخانے کھولے جانے کا آغاز بیسویں صدی سے شروع ہوا ورنہ اس سے قبل اس ملک میں جہاں تک تاریخوں سے پتہ چلا ہے چینیوں کے شکر کے کارخانوں کے علاوہ تمام صنعتیں مقامی تھیں اور ہاتھوں سے انجام دی جاتی تھیں اور یہ صنعتیں گھریلو صنعتیں کہلاتی تھیں مثلاً کپڑا تیار کرنا، فرنیچر بنانا، برتن سازی، زیورات سازی اور دیگر چیزوں کے کاروبار وغیرہ ولندیزیوں کے کارخانے کھل جانے سے چیزوں کی قیمتیں گھٹ گئیں۔ دستی چیزیں قیمت میں گراں ہوتی تھیں لہٰذا مقامی کاروبار سب ٹھنڈے پڑتے چلے گئے اور معاشی گراوٹ ملک میں عام ہوگئی، کارخانے دار ولندیزی ہوتے تھے لہٰذا وہ عموماً مزدور بھی یا تو عیسائی ہو جانے والوں کو رکھتے یا پھر اپنے ساتھ لاتے تھے۔ مقامی باشندوں کو صرف چھوٹے چھوٹے کام دیے جاتے تھے وہ بھی پھر کبھی انھیں ملتے اور کبھی نہ ملتے اس طرح بے روزگاری

## تجارت

بہرحال جہاں تک ریسرچ سے پتہ چلا ہے ولندیزیوں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ جسقدر بھی کارخانے اس ملک میں کھولے تھے ان سے ان کی مراد اس ملک کو ترقی دینے یا یہاں کے باشندوں کو فائیدہ پہنچانا نہ تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ چونکہ یہاں سے کچا مال ہالینڈ لیجا کر تیار کرنے میں لاگت زیادہ بیٹھتی تھی اور کیسر بھی بہت مہنگی پڑتی تھی جس سے تجارت کو نقصان رہتا تھا لہذا انھوں نے کارخانے کھولے اور اپنی اجارہ داریوں کے سبب یہاں سے کچا مال خوب افراط کے ساتھ حاصل کیا پھر بنایا اور تیار کر کے ہالینڈ یا دوسرے ممالک کو روانہ کر دیا۔ اس طرح ان کی ذاتی تجارت کو بھی فائیدہ پہنچا اور حکومت کی آمدنی میں بھی کافی اضافہ ہوا۔

اس طرح صنعت و حرفت اور کارخانوں کے بعد حکومت کے مالیہ کا بڑا صیغہ یہی تجارت تھی جس کی دیکھ بھال کے لئے انھوں نے محکمۂ تجارت بھی قایم کر رکھا تھا غیر ملکی تجارت کا لائسینس جاری کرنا بھی اسی محکمہ کے ہاتھ میں تھا جو اپنی عام پالیسی کے

---

اور غربت و افلاس بڑھتا چلا گیا، ولندیزی مالکانِ کارخانہ دولتمند سے دولتمند تر ہوتے چلے گئے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں ولندیزی حکومت نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کارخانوں کی جو تعداد شائع کی تھی اسکا اختصار ملاحظہ ہو۔

| نام جنس | تعداد کارخانے | نام جنس | تعداد کارخانے |
|---|---|---|---|
| ربڑ کے ٹیوب ٹائر وغیرہ | ۱۰ | کپڑے کے میل | ۲۳۱ |
| گیس بجلی کے سامان | ۵۱۸ | شکر کے کارخانے | ۱۷ |
| لکڑی کا سامان تیار کرنے والے کارخانے | ۸۱ | کپڑے کے جوتوں کے کارخانے | ۲۴ |
| کونین کے کارخانے | ۶۱ | کاغذ کے | ۲۵۱ |
| آٹا پیسنے کی چکیاں | ۱۰۰۰ | تمباکو صاف کرنے کے | ۱۱۵ |
| سگریٹ کے کارخانے اس کے علاوہ ہیں۔ | | دہات وغیرہ صاف کرنے کے | ۳۴ |

ماتحت زیادہ تر بلکہ عمومیت کے ساتھ ولندیزی سوداگروں ہی کو جاری کرتا تھا پھر اس کے علاوہ چونکہ تجارت پر ٹیکس بھی نہایت ہی گراں قسم کے عائد کر دئے گئے تھے لہٰذا اہل ملک کا تجارت میں کوئی مقام نہ رہا چنانچہ اسی باب میں فرنیول لکھتا[۱] ہے کہ :۔

"ٹیکس[۲] اتنا بھاری تھا کہ مقامی سوداگر اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ان کی تجارت رفتہ رفتہ خود بخود زوال میں آ گئی اور تجارت کے زوال کے باعث ان کی دیسی صنعتوں کا بھی کوئی مقام باقی نہ رہا۔"

ہالینڈ کی حکومت مرکزی (زمانۂ جنگ ۱۹۴۳ء) کا ولندیزی وزیر اعظم "پروفیسر خر براندی" (Ger Brandy) بھی اس شدید پالیسی کے نتیجہ کا اعتراف کرتے ہوئے خود ایک مقام پر لکھتا[۳] ہے کہ :۔

"۱۹۴۰ء تک ان کی (یعنی مقامی اندونیشی باشندوں کی) تجارت کی عام حالت یہ تھی کہ پورے جاوا میں جس کی آبادی پانچ کروڑ ہے غیر معمولی حیثیت کا تاجر ایک جاوائی بھی نہ تھا۔"

---

[۱] ملاحظہ ہو "نیدرلینڈس انڈیا" مصنفہ جے۔ ایس۔ فرنیول صفحہ ۹۸-۹۹ مطبوعہ لندن ۱۹۴۵ء

[۲] ٹیکس کے بارے میں "ہینڈ بک آف دی ڈچ ایسٹ انڈیز" (صفحہ ۱۹) کے مندرجات کے مطابق ۱۹۳۶ء میں پورے ملک کی ۰۰۰۰۰۰۰۰ ۷۲ آبادی میں انکم ٹیکس دینے والے گروپ کی کیفیت یہ تھی مثلاً۔

یورپین ۹۹۴، ۲۰۶، ۱۰۶ ڈالر ادا کرتے تھے۔

چینی اور دیگر ایشیائی ۹۱۰، ۲۶۱، ۳۶ ڈالر ادا کرتے تھے۔

جبکہ ۷ کروڑ اندونیشیوں کی مجموعی آمدنی ۱۱۰، ۲۰۷، ۳۰ ڈالر سے زیادہ نہ تھی حالانکہ یورپینیوں کی آبادی کل کا صرف ۵ر۶ % تھی۔

[۳] ملاحظہ ہو "اندونیشیا" وزیر اعظم پروفیسر خر براندی صفحہ ۸ مطبوعہ لندن ۱۹۵۰ء۔

جبکہ محض جاوا کی برآمدی تجارت (بحوالہ اسٹیٹسمین ایئر بک ۱۹۴۵ء) مجموعی طور پر ۷۴۷،۰۰۰،۰۰۰ گلڈر کی قیمت کے مندرجہ ذیل اشیاء یا جنس کی صورت میں بھیجے ہوئے مال[۵] پر مشتمل تھی مثلاً

نباتی اشیاء یا ان سے تیار کی ہوئی چیزیں ۵۳۱،۰۰۰،۰۰۰ گلڈر قیمت کی تھیں
معدنی اشیاء ۵۳۱،۰۰۰،۰۰۰ گلڈر قیمت کی تھیں
حیوانات سے حاصل کی ہوئی چیزیں ۵۳۱،۰۰۰،۰۰۰ گلڈر قیمت کی تھیں
اور دیگر (متفرقات) وغیرہ ۸،۰۰۰،۰۰۰ گلڈر قیمت کی تھیں

---

۵ بحوالہ "ہینڈ بک آف دی ڈچ ایسٹ انڈیز" برآمدی تجارت کے سال بسال کا گوشوارہ (ہزار گلڈر میں شمار کیا ہوا) درجِ ذیل ہے۔

| نام اجناس | ۱۹۳۷ء | ۱۹۳۸ء | ۱۹۳۹ء | ۱۹۴۰ء |
|---|---|---|---|---|
| سارُونگ | ۱۵،۵۶۸ | ۱۰،۳۵۸ | ۱۱،۲۹۴ | ۱۴،۰۳۱ |
| سگریٹ | ۱۸،۳۶۳ | ۱۸،۵۵۴ | ۱۹،۲۷۲ | ۲۴،۷۴۵ |
| بانس کے ٹوپ | ۱۱۶ | ۱۰۴ | ۱۱۹ | ۱۲۳ |
| صابن | ۱،۹۱۲ | ۱،۸۲۵ | ۱،۹۵۸ | ۲،۱۵۸ |
| موٹر ٹیوب ٹائر | ۱،۶۷۳ | ۱،۹۰۷ | ۱،۸۲۶ | ۲،۱۷۴ |
| سائیکلوں کے ٹائر | ۷۵۱ | ۷۱۲ | ۸۰۸ | ۸۲۳ |
| بیئر شراب | ۱،۹۰۳ | ۲،۱۲۹ | ۲،۰۹۲ | ۲،۴۵۹ |

اسی طرح مجموعی قیمتِ برآمد کی تفصیلات یہ ہیں۔ مثلاً

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۹۳۵ء | ۳۴ | ملیون گلڈر | ۱۹۳۹ء | ۵۸،۶ | ملیون گلڈر |
| ۱۹۳۶ء | ۴۰،۱ | " " | ۱۹۴۰ء | ۴۳،۷ | " " |
| ۱۹۳۷ء | ۶۴،۱ | " " | ۱۹۴۱ء | ۹۶ | " " |
| ۱۹۳۸ء | ۵۴،۶ | " " | | | |

اور اسی سال دیگر ممالک سے درآمد کی ہوئی اشیا بھی مجموعی طور پر ۰۰۰۰۰۰۰ ۴ ۲ گلڈر قیمت کی تھیں جو مشینوں، شیشے کے سامان، کاغذ اور گاڑیوں وغیرہ پر مشتمل تھیں ۱۹۴۰ء میں اس تجارت کی مجموعی قیمت رقم ۷۳۰ ملین گلڈر یا ۰۰۰۰۰۰ ۳۱۰ و ۷ ڈالر تھی جس میں سے ۴۹۰ ملین گلڈر یا ۰۰۰۰۰۰ ۹ ۴ ڈالر کا مال ممالکِ غیر کو بھیجا گیا۔

**بنک** چونکہ تجارت کا زیادہ تر انحصار کامیابی بنک سسٹم پر ہے لہذا بنک بھی قایم کیا گیا اور حکومت وقت کے "سکوں"[۱] کی قیمت کا معیار بھی مقرر کیا گیا۔

بنک کے اصولِ تجارت پر روشنی ڈالتے ہوئے "فرنیول" نے لکھا ہے کہ نہایت ہی تناقص تھا کیونکہ "مانیٹری سسٹم" یعنی اصولِ زر غیر استوار تھا۔ اس لئے کہ تمام پیداوار حکومت لے لیتی تھی اور اس کے عوض میں محض محنت اور مزدوری کا صلہ دیتی تھی، جو محض تانبہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی جو مال ہالینڈ جاتا

---

**۱۔ سکے** یہ سکے عموماً سونے اور چاندی کے تھے اور کاغذ کے نوٹ بھی چلتے تھے، سونے کا سکہ "ان تیخ" کہلاتا تھا جس کی قیمت ۱۰ گلڈر تھی۔ بقیہ سکے سب چاندی کے تھے مثلاً

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ ریکس ڈالڈر | ۲/۵ گلڈر کے برابر | ۵۔ ڈبلچے | ۱۰ سینٹ کے برابر |
| ۲۔ گلڈر | ۱۰۰ سینٹ کے برابر | ۶۔ اسٹائی فر | ۵ " " |
| ۳۔ ہاف گلڈر | ۵۰ سینٹ کے برابر | ۷۔ سینٹ | ڈبل پیسہ (تانبہ کا سکہ) |
| ۴۔ کوارچی | ۲۵ " " | ۸۔ ہاف سینٹ | ایک پیسہ (تانبہ) |

ہر سکہ پر حکمران ہالینڈ کی تصویر تھی البتہ تانبہ کے سکہ پر چاول کی بالوں کی تصویر ہوتی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں ایک گلڈر کی تجارتی قیمت ایک ڈالر تھی جو ہمیشہ گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔

تھا اس کے تبادلہ میں وہاں سے کوئی چیز اسی قدر قیمت کی اندونیشیا میں کبھی نہ آئی اسی لئے ہمیشہ یہ تجارت یک طرفہ رہی اور اس ملک کی خوشحالی میں معتد بہ اضافہ نہ کر سکی۔

اس آخری وقت تک جاری رہنے والے ولندیزی سکوں کا باقاعدہ رواج ۱۸۳۳ء سے شروع ہوا ورنہ اس سے قبل کمپنی کے سکے چلتے تھے اور نام بھی جداگانہ تھے "جاوا بنک" سرکار کا سب سے بڑا بنک تھا جو انیسویں صدی میں قایم کیا گیا اس بنک کا صدر دفتر ہالینڈ میں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر بنک اور انشورنس کمپنیاں بھی قایم کی گئیں جن کا زیادہ تر کاروبار ولندیزی سوداگروں کے ساتھ ہوتا تھا۔

**عام قرضے**

عام قرضے "یا بنک ڈیبٹ" تعداد ۱۹۱۴ء میں ...۰۰۰,۰۰۱ فلورنس سے بھی کم تھی جو ۱۹۲۳ء میں اضافہ ہوکر ........۳۰۱ فلورنس ہوگئی اس کے بعد اس میں کمی واقع ہوئی چنانچہ ۱۹۲۸ء میں یہ ...۰۰۰,۰۰۰ ....۱ فلورنس ہوگئی اور ۱۹۳۳ء کے اواخر میں معمولی طور پر .......۵۲۲,۰۰۱ فلورنس تک جا پہنچی اور پھر ۱۹۳۹ء میں کم ہوکر ....۰۰۰,۲۷۳,۰۰۶ فلورنس رہ گئی، اس کے علاوہ لوکل گورنمنٹ فنڈ تقریباً ...۰۰۰,۰۰۰,۱ فلورنس سے بھی زائد تھا جو ۱۹۳۶ء کی "تخفیف" کی پالیسی پر مشتمل تھا۔

۱۰ مئی ۱۹۴۰ء تک 'اندونیشیا' کے مالیاتی حالات اور بنکوں کے کاروبار سب پورے طور پر نیدرلینڈ سے متعلق تھے ان کے علاوہ چینی، جاپانی، اور ہندوستانی بنک بھی قایم تھے نیشنل بنک آف اندونیشیا بھی قایم تھا۔ مگر زر[۵] مبادلہ کا بنک

**زر کا غیر ملکی مبادلہ**

غیر ملکی زر مبادلہ براہ راست نہ تھا بلکہ "جاوا بنک" کے ذریعہ

جاوا بنک تھا، جس کا صدر دفتر ہالینڈ ہی میں تھا، جہاں ہر ماہ فاضل رقم یعنی "بیلینس" منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اس طرح آمدنی کا بیشتر حصہ ہالینڈ میں پہنچ جاتا تھا۔

## رسل و رسایل

غرض یہ آمدنی کے خاص صیغے تھے ان کے بعد عام صیغوں میں "پوسٹ آفس" اور ریلوے کے محکمے تھے۔ جہازرانی بھی اسی میں شامل تھی اور عام سڑک کی ٹریفک بھی اسی کا ایک شعبہ تھا۔ یہ تمام شعبے حکومت کی آمدنی کے عام بڑے صیغے تھے۔ ریلوں[۵۱] پر حکومت کا اپنا تسلط تھا۔ اُن کے لئے ایک الگ محکمہ قایم تھا۔

---

ہالینڈ کے مرکزی بنک سے تبادلہ کیا جاتا تھا۔ جس سے اکثر اوقات غیر ملکی سوداگروں کو بڑی دقت پیش آتی تھی حالانکہ خود ولندیزی سوداگر اس اصول سے بڑے فائدہ میں تھے۔ اس طریقۂ کار کے اختیار کئے جانے کی ایک خاص وجہ تھی یعنی ہر ماہ "فاضل زر" جاوا بنک سے ہالینڈ پہنچ جاتا تھا، خود جاوا بنک میں نئے مہینہ کے شروع ہونے تک زائد رقم مطلق نہیں رہتی تھی۔ اس طرح زر کی قیمت کے تعین میں بھی جاوا بنک کا ہالینڈ کی صدر دفتر ہی مجاز تھا۔ اس طریقۂ کار سے ایک نقصان یہ بھی تھا کہ اہل ایشیا اہل ہالینڈ پر تجارت میں مُسابقت نہیں پا سکتے تھے بلکہ بعض دفعہ تو یہ ہوتا تھا کہ پریشان ہو کر غریب ہمت ہار بیٹھتے تھے اور اس طرح تجارت پر پورا قبضہ بھی ولندیزیوں کا اپنا رہتا تھا۔

### ۵۱ ریلوں کا عام اجرا

تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اس ملک میں سب سے پہلی ریل ۱۸۶۲ء بعہد گورنر جنرل "جیکب" جاری کی گئی، جس پر ۵۰۰۰۰۰ فلورنس صرف آیا تھا۔ یہ ریلیں جاوا میں جاری کی گئی تھیں پھر اس کے بعد مدورا میں اور پھر سماترا میں بورنیو اور سلیبس جزائر کے اکثر حصّوں میں بقول چارلس بردس مصنف کتاب "اسٹوری آف اندونیشیا" اب تک ریلیں نہیں ہیں۔

زمانۂ جنگ یعنی ۱۹۴۱ء سے قبل اس ملک میں کل انجنوں کی تعداد ۱۰۸۲ تھی اور ریلوے کی مجموعی لمبائی ۵٫۱۵۰ کلومیٹر تھی۔ انجنوں کی درستی اور مرمت کے لئے دو بڑے ورکشاپ

آمدنی کا اندازہ اسی نقصان سے کیا جا سکتا ہے جو بزمانۂ جنگ ان تمام امور کے معطل ہو جانے سے رونما ہوا (بقول برطانیہ ٹیک آف ایئر ۱۹۴۸ء صفحہ ۵۲۱)

ٹیلیفون کا نقصان ...... ۱۲۳ ڈالر ریلوں، موٹروں اور جہازوں کا نقصان ...... ۲۵۳ ڈالر تھا۔

## حکومت کے کُل آمد و خرچ کی کیفیت

اسی طرح حکومت کی مجموعی آمدنی[1] اور خرچ کی سالانہ کیفیت (بحوالہ "نیدرلینڈس انڈیا" صفحہ ۳۰۷ مصنفہ فرنیول) ملین فلورنس میں بقدر ذیل تھی:۔

---

تھے ایک جکارتا کے قریب منگاری کے مقام پر دوسرا اسی جاوا میں "میڈیون" کے مقام پر تھا۔

اعلیٰ قسم کی سڑکیں جن پر بسیں اور ٹرک چلتے ہیں ۱۹۴۰ء تک کل ۴۲،۸۰۹ میل لمبی تھیں۔ ان پر چلنے والی موٹروں کی تعداد ۰۴۷،۸ اور ٹرک کی تعداد ۱۳۲۸۱ تھی اور موٹر سائکلیں کل تعداد میں ۴۹۵،۳ تھیں۔

دخانی کشتیاں اور جھیلوں میں چلنے والے بوٹ ان کے علاوہ ہیں البتہ بحری جہازوں کی سب بڑی کمپنی "رایل پیکیٹ نیوی گیشن" تھی جو "بقول چارلس بروس" ۱۹۴۰ء تک ۲۲۵،۲۳۲ ٹن وزن کے کل ۱۳۵ جہازوں پر مشتمل تھی، ہوائی سروس کے لئے "ڈچ ایر لائن" مخصوص تھی جو ایک بہت بڑے ادارہ پر مشتمل تھی۔

| [1] آمدنی کے صیغے | ۱۹۲۵ء | ۱۹۲۶ء | ۱۹۲۷ء | ۱۹۲۸ء | ۱۹۲۹ء |
|---|---|---|---|---|---|
| ٹیکس وغیرہ | ۳۴،۵۵۵۹ | ۳۴۴،۰۷۷ | ۳۲۲،۱۰۹ | ۳۶۱،۲۱۵ | ۳۲۵۰۹۲۶ |
| اجارہ داری | ۵۵،۵۰۰ | ۵۳،۶۳۴ | ۵۱،۳۸۸ | ۵۱،۴۲۳ | ۴۹،۲۸۹ |
| پیداوار | ۶۹،۳۰۱ | ۷۳،۸۹۳ | ۸۰،۰۲۶ | ۶۲،۵۶۲ | ۵۵،۳۹۵ |
| صنعت و حرفت | ۳۹،۴۷۶ | ۳۹،۵۴۵ | ۴۲،۲۴۱ | ۵۰،۵۴۳ | ۴۶،۸۲۳ |
| متفرقات | ۱۷،۷۵۵ | ۲۱،۳۷۲ | ۱۶۶۶۴۴ | ۱۸،۶۲۷ | ۱۶،۷۲۴ |

نوٹ:۔ یہ اعداد شمار ملین فلورنس میں شمار کئے گئے ہیں۔

| سال | معمولی آمدنی | معمولی خرچ | خسارہ مصارفِ تنخواہِ ملازمان |
|---|---|---|---|
| ۱۹۳۲ء | ۳۰۰ر۳ | ۴۴۸ر۲ | ۱۴۷ر۹ |
| ۱۹۳۳ء | ۲۹۰ر۷ | ۴۰۰ر۸ | ۱۱۰ر۱ |
| ۱۹۳۴ء | ۲۹۴ر۸ | ۳۶۷ر۳ | ۷۲ر۵ |
| ۱۹۳۵ء | ۲۹۰ر۵ | ۳۱۸ر۳ | ۲۷ر۸ |
| ۱۹۳۶ء | ۴۰۲ر۸ | ۳۶۶ر۹ | ۰۰۰۰ |

اور ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں حکومت کی مجموعی آمدنی ۰۰۰ر۰۰۴ر۶۷۳ فلورنس اور ۰۰۰ر۰۰۵۴ر۳ فلورنس تھی۔

اس طرح یہ تو اس عہد کی مالیات میں آمدنی کا نقشہ تھا اب ذیل میں ان امور پر بحث کی جاتی ہے جو خرچ سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً سکرٹیریٹ، تعلیمات، رفاہِ عامہ عدلیات وغیرہ۔ سکرٹیریٹ کا حال پچھلے اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے لہٰذا اب ذیل میں صرف بقیہ امور پر تاریخی اور افادی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جاتی ہے:-

## "تعلیمات"

تعلیمات کے سلسلہ میں سب سے پہلی اور اہم چیز وہ زبان ہے جو ذریعۂ تعلیم قرار دی جاتی ہے اور جو عدالتی حیثیت سے بھی سرکاری زبان بنتی ہے اور دفتری کاروبار بھی اسی زبان میں انجام دئے جاتے ہیں۔ تہذیب و تمدّن پر اس کا خاص اثر پڑتا ہے۔

**وِلندیزی زبان** | یہ زبان ولندیزی زبان تھی جو سرکاری طور پر پہلی بار ۱۸۴۳ء میں اختیار کی گئی اسی تاریخ سے انڈونیشیوں میں ملکی تمدّن

اور ثقافت کا انحطاط شروع ہوتا ہے، عام احساسِ کمتری کی پیدایش کا بھی یہی زمانہ ہے۔

## مدارس کی ابتدا

جہانتک اس سلسلہ میں تاریخی حیثیت سے معلومات کا سلسلہ بہم پہنچاہے اس سے پتہ چلتاہے کہ سب سے پہلے اس عہد کی پوری تاریخ میں پرائمری تعلیم کے مدارس ۱۸۵۸ء میں قایم کئے گئے ورنہ اس سے قبل کمپنی کے زمانہ سے جو مدارس چلے آتے تھے وہ عموماً گرجا گھروں میں قایم تھے اور عیسائی مشنریوں کی نگرانی میں تعلیم دیتے تھے۔

یہ نئے قایم شدہ مدارس دو قسموں میں منقسم تھے یعنی مدارس برائے باشندگانِ انڈونیشیا، اور مدارس برائے باشندگانِ یوروپ۔ اور یہ دیسی مدارس بھی دو حصّوں میں منقسم تھے یعنی پہلی قسم کے اَپر پرائمری اور دوسرے مڈل تک کی تعلیم کے مدارس جنکا معیار ہائی اسکول تک کی تعلیم تھا۔ اَپر پرائمری مدارس "سیکولہ ڈیسا" (مدارسِ دیہات) کہلاتے تھے جن میں داخلہ کے وقت بچہ کی عمر ۶ سال ہونا ضروری تھا اس مدرسہ میں تعلیم کی مُدت ۷ سال رکھی گئی تھی۔ اس کی تکمیل کے بعد طالبعلموں کو درجہ دویم یا مڈل کی جماعت کے معیار والے اسکول میں داخل کیا جاتا تھا جس کی مُدّتِ تعلیم تین سال تھی اس قسم کا اسکول "سیکولہ کیلاس دُوا" کہلاتا تھا۔ یہ تمام مدارس دیسی باشندوں کے بچّوں کے لئے مخصوص تھے اور ان میں ذریعۂ تعلیم بھی ہر مقام اور صوبہ کی دیسی زبان تھی۔ اس کی تکمیل کے بعد دیسی باشندوں کے بچّوں کی تعلیم ختم ہو جاتی تھی۔

"مدارس برائے باشندگان یوروپ" میں بھی دو قسموں کے مدارس تھے جن میں پہلی قسم کے اپر پرائمری اور دوسری قسم ہائی اسکول کی تھی۔ اپر پرائمری قسم کے

اسکول" ایم - یو - ایچ - او" یعنی (Meer utigebreid hager ouderings)
کہلاتے تھے جن میں چھ سال کی عمر سے بچوں کو داخل کیا جاتا تھا اور ۷ سال تک پڑھایا
جاتا تھا پھر اس کے بعد "میلو" یعنی " اے - ایم - ایس" (Algemene
Middlebare school) میں داخل کیا جاتا تھا جس کی مدتِ تعلیم تین سال
تھی۔ اسی کی تکمیل کے بعد "یونیورسٹی" کی تعلیم کے لئے طلبا یورپ جاتے تھے ان مدارس
کا ذریعۂ تعلیم "ولندیزی" زبان تھی، ولندیزی کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن زبانیں بھی
سکھائی جاتی تھیں، واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان مدارس میں صرف ولندیزی افسروں
کے بچے پڑھتے تھے یا پھر اہلِ اندونیشیا میں سے ان لوگوں کے بچوں کو پڑھایا جاتا تھا۔
جو یا تو مذہباً عیسائی ہو گئے تھے اور یا پھر کسی اتفاقِ زمانہ سے کسی منصب پر جا پہنچے
تھے ورنہ عام لوگوں کی ان مدارس تک رسائی نہ تھی۔

**ثانوی تعلیم** اب جہاںتک ثانوی تعلیم کے مدارس کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہئے
کہ ولندیزی حکومت نے قومی تحریکات اور ملک کے انقلابی
رجحان سے متاثر ہوکر سب سے پہلی بار ۱۹۱۴ء میں آغاز کیا تھا ورنہ اس سے قبل
ثانوی[1] تعلیم کے مدارس عام نہ تھے جہاںتک واقعات اور ان کے حالات سے معلوم

---

[1] ثانوی تعلیم کا سب سے پہلا اسکول بقول فرنیول شہر بٹاویہ میں ۱۸۶۱ء میں قایم کیا گیا
تھا جس کی افادیت بھی صرف اہل یورپ تک ہی محدود تھی - اور اسکا مستقر بھی ایک گرجا
گھر میں تھا یہ مدرسہ "جمنازیم ولیم تھرڈ" اسکول کہلاتا تھا مگر (بقول فرنیول صفحہ ۲۱۱) ۱۸۷۴ء
تک کوئی اندونیشی اس میں داخل نہیں کیا گیا - البتہ چار سال بعد لوگ اپنے ذاتی اثرات کو
کام میں لاکر ۱۸۷۸ء میں اس قابل ہوئے تھے کہ انھوں نے اپنے بچوں کو بٹاویہ کے دیسی
میڈیکل اسکول میں داخل کیا اور وہ بھی اس شرط پر کہ جب کامیاب ہو جائیں گے تو انھیں

ہوسکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف بٹاویہ میں اس قسم کے اِکّے دُکّے مدارس تھے اور وہ بھی گرجا گھروں میں پادریوں کی نگرانی میں عمل کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد شہر بانڈونگ، سُرابایا، بوکت تنگی، پاڈانگ اور بنجرماسین اور بٹاویہ وغیرہ میں ثانوی مدارس قایم کئے گئے۔

حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ جداگانہ تعلیم کا مطالبہ سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں چینیوں نے شروع کیا تھا، جس پر مطلق غور نہ کیا گیا پھر اس کے بعد سنہ ۱۹۰۸ء میں ڈاکٹر واحیدین (جنھوں نے "سونوموا" کو مشورہ دیکر "بودی اُوتومو" کے نام سے قومی تعلیم کی انجمن قایم کرائی) نے بھی مطالبہ کیا تھا کہ اندونیشیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں مگر مطلق غور نہ کیا گیا اور ۶ سال تک، معاملہ اسی طرح التوا میں پڑا رہا مدت کے بعد پھر کہیں جاکر ان مطالبات پر نظر ثانی کی گئی اور مدارس کا آغاز ہوا۔ مگر تعلیمِ نسواں پھر بھی نظر انداز کر دی گئی۔ اندونیشیا کی قومی زندگی میں "تعلیم نسواں" کا مطالبہ کرنے والی سب سے پہلی خاتون "اَجنگ کارتینی[۱]" تھی۔ جو جپارا (علاقہ جادا)

---

دیہاتوں میں کام کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اندونیشیا کے سب سے پہلے رہنما ڈاکٹر واحیدین نے بھی اسی طرح تعلیم حاصل کی تھی۔

[۱] کارتینی: یہ اندونیشیا کی "فلورینس نائیٹینگل" گذری ہے، اور اندونیشی قوم کی تاریخ نشاۃ ثانیہ میں سب سے پہلی خاتون ہے جس نے باوجود ملک کی سماجی بندشوں کے جدید تعلیم ولندیزی اسکول میں حاصل کی اور پھر اس کے بعد چند خطوط اپنی قوم کی بیٹیوں کے نام لکھ کر چھوڑی جس میں خواتین کو بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دعوت دی گئی تھی۔ یہ سب سے پہلی اندونیشی خاتون ہے جس نے اپنی قوم کی خواتین میں بیداری کا صور پھونکا۔ اس کے مختصر حالاتِ زندگی یہ ہیں:۔



ریڈن اُجنگ کارتینی

کے ایک نہایت ہی معزز گھرانے کی چشم و چراغ تھی اگرچہ اس نے بقول بعض اندونیشی مصنفین رہنمایان اندونیشیا کی طرح کسی سیاسی انقلاب کی تحریک کی اساس تو قایم

خاندانی حیثیت سے وہ اندونیشیا کے ایک نہایت ہی معزز گھرانہ کی دختر ہے۔ اس کی ولادت جاپارا کی ایک مضافاتی دیہات "موئونگ" میں مشہور جاوائی افسر "ریڈان سستس ڈمنگرت" کے گھر میں ۲۱ راپریل ۱۸۷۹ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی مگر جب سن بلوغ کو پہنچی تو ایک ولندیزی جرنج اسکول میں مغربی طرز کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کی گئی جسکا معیار تحتانی یا پرائمری تعلیم سے زیادہ نہ تھا۔ اندونیشی خواتین میں وہ سب سے پہلی لڑکی تھی جو کسی ایسے مدرسہ میں تحصیل علم کے لئے بھیجی گئی کیونکہ اس وقت تک اہل اندونیشیا میں کچھ تو حکومت کی جاہل رکھنے کی پالیسی کی وجہ سے اور کچھ عیسائی پادریوں کی تعصب انگیز اور اندونیشی دشمنی کی حکمت عملی کے باعث مغربی طرز کی تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا مسلمان پھر نصرانی مشنریوں کی عیسائی بنانے کی جد وجہد کے سبب بھی اپنے بچوں کو اس طرز تعلیم کی طرف رجوع کرنے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس طرح جدید تعلیم میں بہت پیچھے تھے۔ اور خصوصاً لڑکیوں کی جدید تعلیم تو بالکل نہ تھی۔

غرض کارتینی نے ولندیزی اسکول میں اپنی پرائمری تعلیم کی تکمیل کی اور ولندیزی زبان کو نہایت ہی محنت کے ساتھ سیکھا کیونکہ بغیر اس کے اندونیشیا کے ان گھرانوں میں جنھوں نے مغربی بود و باش اختیار کرلی تھی یا جو کسی چھوٹی بڑی افسری پر مامور ہونے کے باعث ولندیزی عمال کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے تھے تہذیب میں بہت پیچھے سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ درخور ملازمت بھی نہیں مانے جاتے تھے۔ اس لئے ولندیزی زبان میں مہارت پیدا کرنا بڑا ضروری تھا۔ چونکہ مدارس بھی اس زمانہ میں پرائمری سے زیادہ عام نہ تھے لہذا وہ آگے چل کر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرسکی مگر اس نے اسی قدر تعلیم میں اتنی بیدار مغزی پیدا کرلی کہ وہ مغرب کی چڑھتی ہوئی موج ترقی کو پہچان سکے۔ اور اس پہچان سے اپنی قوم کے اہل ستینکو بھی خبردار کرسکے۔

فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد رمبانگ کے ایک اندونیشی افسر کے ساتھ متاہل کر دی گئی مگر اس نے بجائے خانہ نشین ہو جانے کے اپنی قوم کی خدمت پر کمر باندھی اور اپنے انقلابی تخیل سے ایک زندگی، ایک شعور اور ایک احساس پیدا کرنے کے لئے خواتین کو خواب غفلت سے جگانے کا عزم کیا

نہ کی مگر تعلیم نسوان کی بنیادی افادیت کے مطمحِ نظر کو اپنی قوم کی خواتین پر واضح کر کے ایک عظیم الشان بیداری کا سنگِ بنیاد رکھ دیا۔

---

جب اسکا رہوارِ عمر زندگی کی بیسویں منزل سے گذرنے کے قریب پہنچا تو اپنی طبیعت کے انقلاب کو بروئے کار لانے کے لئے ولندیزی زبان میں ایک چھوٹا سا کتابچہ تصنیف کیا جس کا عنوان تھا "دُور دُوا اُستر لِس تول لِخُت" اور اس میں شروع سے آخر تک دخترانِ اندونیشیا کو جدید تعلیم کی ترغیب و ترہیب دلائی اور ایک پیرایہ دلنشین میں انھیں سمجھایا کہ بغیر تعلیم کے نہ قومی معیار بلند ہو سکتا ہے، نہ انسانی قدریں اُجاگر ہو سکتی ہیں بلکہ کوئی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا جا سکتا قومیں بغیر علم کے زندگی ہی میں مرجاتی ہیں، غلام بن جاتی ہیں، بلکہ پست ترین ہو جاتی ہیں۔ علم ہی کی بدولت انسان زندہ ہے، چنانچہ اس کے مرنے کے کچھ عرصہ بعد اس کتاب کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، عربی اور اندونیشی زبانوں میں کیا گیا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا گیا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں کارتینی نے خواتین اندونیشیا کے لئے ایک جدید طرزِ تعلیم تجویز کیا اور اس کے لئے جداگانہ طور سے قومی مدارس کھولنے پر بھی زور دیا مگر اس وقت اندونیشیا میں غفلت اس قدر عام تھی کہ اس کی تجاویز کی طرف کسی نے بھی غور نہ کیا لیکن جب شعور و بیداری کا زمانہ عہد نشاۃ ثانیہ میں شروع ہوا تو اس طرف توجہ دی گئی اور اس کی تجاویز کی اقدار کو پہچانا گیا۔ حتیٰ کہ آج اس کے بتائے ہوئے نظام کے ماتحت اندونیشیا میں جیسا کہ بعض مبصّرین کا خیال ہے صدہا نسوانی مدارس قایم ہیں اور خواتینِ اندونیشیا کو نظری تعلیم کے علاوہ امورِ خانہ داری اور صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی ہے۔ اور یہ مدارس کارتینی ہی کے نام سے کارتینی اسکول کہلاتے ہیں۔

یہ تھی وہ خدمت جو اس اندونیشی خاتون نے انجام دی، حالانکہ سنہ ۱۹۰۴ء میں بمشکل ۲۵ سال زندہ رہ کر ایک بچہ کی ولادت کے موقع پر استدادِ درد سے بے تاب ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی مگر اپنی پرخلوص اور بے لوث خدمات کی یاد چھوڑ گئی جس کے باعث اسکا نام اندونیشیا میں آج تک زندہ ہے۔ اہل ملک اور اکابر حکومت سب ہر سال اس کی یاد مناتے ہیں۔ اور اس کے پرخلوص کارناموں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ سچ ہے جو اپنی قوم کے لئے کچھ کر جاتے ہیں، وہ کبھی بھی نہیں بھلائے جاتے بلکہ اسی طرح زندہ و پائندہ رہتے ہیں۔

## جدید تعلیم کے مدارس

بہر حال کچھ تو اہل انڈونیشیا کی عام بیداری کے بڑھتے ہوئے تقاضوں سے مجبور ہوکر اور کچھ آس پاس کے ممالک کی حریصانہ آویزش سے خائف ہوکر ولندیزیوں نے جدید تعلیم کو پھیلانے کی طرف توجہ دی۔ کیونکہ (بقول فرنیول اور دیگر یورپین مبصرین) بیسویں صدی کے آغاز تک پورے انڈونیشیا میں بجز ایک دو "میلو" (ہائی اسکول کے کوئی بڑا اسکول نہ تھا اور نہ برائے تحصیل یورپ جانے ہی کی اجازت تھی چنانچہ فرنیول لکھتا ہے (دیکھو اس کی کتاب "نیدرمینڈس انڈیز" صفحہ ۲۵۱) کہ:۔

"ہمیشہ ولندیزیوں کی یہ پالیسی رہی کہ وہ کسی طرح بھی مقامی باشندوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے یوروپ نہ بھیجیں"، اور نہ خود اس ملک ہی میں انھوں نے ۱۹۰۰ء کے آغاز تک کوئی باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا۔ ملک میں ہیجان جب پیدا ہونے لگا تو ان کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے ۱۹۰۹ء میں جاوا کے تین بڑے شہروں مثلاً بٹاویہ، سیمارانگ، اور سُرابایا میں ایک ایک "مینول ٹریننگ" اسکول کھولدیا۔ جسکا زمانۂ نصاب تین سال تھا۔ یہ تینوں مدرسے ایک قسم کے صنعتی مدارس تھے جن میں زرگری، آہنگری اور بڑھئی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں "بوئتن زارخ" کے مقام پر "اگریکلچر اسکول"، قایم کیا جس میں جنگلات، باغات اور کھیتی باڑی کی تعلیم دیجاتی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں شہر بٹاویہ ہی میں "لا کالج" (قانون کا کالج) اور بانڈونگ میں "ٹیکنیکل کالج"، کھولا۔ (اسی کالج میں 'سوکارنو' نے تعلیم حاصل کی تھی) مگر "آرٹس کالج"، بقول فرنیول ۱۹۲۹ء تک سارے ملک میں نہ تھا۔ البتہ ۱۹۲۷ء میں "میڈیکل کالج"، قایم کیا۔ مگر پھر بھی ملک کی ضرورتیں پوری نہ ہوسکیں۔

ظاہر ہے کہ ساڑھے سات کروڑ کی آبادی کے ایک وسیع ملک کے لئے ایک ایک کالج سے کیا بن سکتا تھا خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ یونیورسٹی کوئی نہ ہو کتنے تعجب کی بات ہے کہ اندونیشیا میں پورے ولندیزی عہد میں کوئی یونیورسٹی نہ تھی۔

بقول ایم۔ ایم جمیرس (ملاحظہ ہو کتاب "یونیورسٹیز آف دی ورلڈ" صفحہ ۵۴۴ مطبوعہ لندن ۱۹۵۰ء) ۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو (جبکہ ولندیزی جاپانیوں کی شکست اور اہل اندونیشیا کے اعلان آزادی کے بعد پھر دوبارہ اندونیشیا میں گھس آئے تھے) پہلی بار ساڑھے تین سو سال میں ایک یونیورسٹی (Universiteit te Nederlandsch Indie) کے نام سے بٹاویہ میں قایم کی جو چھ شعبوں پر مشتمل تھی اسکا تفصیلی حال دوسری جلد میں بیان کیا جائے گا۔

## اس عہد کا تعلیمی بجٹ

بہر حال جہانتک مصارف تعلیم کے بجٹ کا تعلق ہے "بقول سی بارانی" (ملاحظہ ہو اس کی کتاب "وہائی انڈونیشین ریوالیشن" صفحہ ۱۵) ولندیزی عہد کا آخری تعلیمی بجٹ ۱۹۴۱ء میں پاس کیا گیا تھا جس کی رو سے ایک ولندیزی طالب علم پر اتنا صرفہ آتا تھا جتنا کہ ۱۵,۷۲۲,۳۰۰ اندونیشی طلباء پر کل مصارف تعلیم کی مجموعی رقم جو دس سال قبل یعنی ۱۹۳۱ء میں تجویز کی گئی وہ ۲۲,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر تھی جسکا پچیسواں حصہ بھی اندونیشیوں پر صرف نہیں کیا گیا۔ بقول "ایم نصرون" یہ تمام رقم اہل یورپ یا اہل ہالینڈ کے اندونیشیا میں رہنے والے طلباء پر صرف ہوتی تھی، اور خود غریب

---

## سلے طلباء، اساتذہ اور مدارس کی تعداد

۱۹۲۸ء میں جیساکہ خود ان ولندیزیوں کی سرکاری رپورٹ

اندونیشی محروم تھے۔

غرض یہ تھا ولندیزی عہد کی تعلیم کا مختصر سا خاکہ اب رفاہ عامّہ کے چند خاص خاص امور کا حال بھی ملاحظہ ہو۔

## رفاہِ عامّہ کے امور

اس سلسلہ میں سب سے اہم چیز "شفاخانوں" کا قیام ہے مدارس کی وسعتِ تعداد کے ساتھ ساتھ ایک مہذّب اور مخیّر حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ شفاخانوں کے قیام کی طرف توجہ مبذول کرنا ہوتا ہے تاکہ عوام کی صحت اور تندرستی کا تحفظ کیا جاسکے کیونکہ اعلیٰ صحت ہی پر اعلیٰ ترقیاتِ ملکی وملّی کا انحصار رہتا ہے۔ ولندیزی عہد کی تاریخ پر اگر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کمپنی کا دورِ حکومت گذر جانے کے بعد مدّتوں اندونیشیا میں کوئی قابلِ ذکر ہسپتال نہ تھا، ۱۸۶۵ء میں پہلی بار چند چھوٹے چھوٹے ملیٹری ہسپتال، قایم کئے گئے مگر یہ محض ولندیزی افسرانِ حکومت یا سپاہیوں کے لئے مخصوص تھے عام نہ تھے۔

---

وغیرہ سے ثابت ہے اندونیشیا میں کل مدارس کی تعداد ۲۴،۷ر۳۴۱ تھی جو ۱۹۳۸ء میں اضافہ ہوکر ۲۶، ۲۴۱ ہوگئی جن میں:۔ مدارس برائے یورپین ۷۳۴ر ۵۴ تھے، برائے چینی ۹ ۴۲ و ۲۲ اور برائے اہلِ اندونیشیا ۵۰،۷ر۶۴ تھے۔ جن میں زیادہ پرائمری مدارج تک تعلیم دیتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں کل طلبار کی تعداد ۹،۶۰۶،۸۰ تھی (جن میں یورپین اور چینی زیادہ تھے) ان طلبار کے لئے کل مُدرّسین اور اساتذہ ۸۰،۷۰۳ تھے جن میں سے ۸ ۷ ۴ ۲ برائے مدارس پرائمری اور ۶۰۰ برائے مدارس ثانوی مقرر تھے۔ اسی لحاظ سے پوری اندونیشی قوم کا اوسط تعلیم ۱۹۴۷ء تک مشکل سے ۵ فیصدی بھی نہ تھا۔ جبکہ آس پاس کے ممالک مثلاً فلپائن میں یہی اوسط اسی سال ۴۰ فیصدی برما میں ۵۰ فیصدی تھائی لینڈ (سیام) میں ۱۵ فیصدی اور ملایا میں ۱۰ فیصدی تھا اس سے اہلِ اندونیشیا پر تعلیمی لحاظ سے ظلم کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عام لوگ اپنے دیسی طریقوں پر علاج معالجہ کراتے تھے، بیسویں صدی میں جاکر کہیں چند چھوٹے چھوٹے ہسپتال کھولے گئے، "جاوا سینٹرل ہاسپٹل" بہت بعد میں قایم کیا گیا، پھر ۱۹۲۷ء میں اسی سے ملحقہ "میڈیکل کالج" کھولا گیا۔ پھر تو رفتہ رفتہ یورپین طرز کے ہسپتالوں کا رواج ہوگیا۔ چنانچہ فرنیول (صفحہ ۳۸۰ پر) لکھتا ہے کہ:۔

"۱۹۳۱ء میں جاوا میں کل چھوٹے بڑے خاص و عام اور سرکاری و غیر سرکاری دواخانے ۳۰۷ تھے ان میں سے ۱۱۶ پرائیویٹ اور بقیہ ۵۰ چھوٹے چھوٹے ڈسپینسری تھے۔ بیرونِ جاوا (یعنی دیگر جزائر) میں کل چھوٹے چھوٹے ڈسپینسری ۳۰۲ تھے۔ جن میں سے ۲۷۰ پرائیویٹ اور کل ۳۲ سرکاری تھے۔ یعنی تین ہزار جزائر کے لئے حکومت نے کل ۳۲ ڈسپینسری قایم کر رکھے تھے جن میں سے زیادہ تر ڈاکٹر مشنری تھے اور تبلیغ نصرانیت کا نصب العین رکھتے تھے۔"

**کتب خانے**[۱] اعلیٰ انتظامِ امورِ صحت کے ساتھ ساتھ کسی ملک اور قوم کی ذہنی پرورش اور دماغی تربیت کے لئے قیامِ مدارس کے بعد کتب خانوں، کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جو حکومت اس اہمیت کو نظر انداز کر دیتی ہے وہ یقیناً اس ملک کے باشندوں پر بہت بڑے ظلم کا ثبوت دیتی ہے، اعلیٰ ترقیاں اعلیٰ قسم کے کتب خانوں ہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مگر ولندیزی عہد کی تاریخ پر اگر غور سے نظر

---

[۱] مسلمانوں کے عہدِ عروج میں بھی بغداد، قاہرہ، طرابلس، قسطنطنیہ، دمشق، قرطبہ، اور غرناطہ وغیرہ شہر کتب خانوں کے مرکز تھے بلکہ اس وقت کی دنیا میں سب سے بڑے کتب خانوں کے حامل تھے، آج اہلِ مغرب بھی اپنی قومی ترقیات میں اس اہمیت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں چنانچہ دیکھ لو برٹش میوزیم، کتب خانۂ نیویارک، کتب خانۂ پیرس اور کتب خانۂ ماسکو دنیا کے عظیم ترین کتب خانے ہیں جہاں اسی اسی لاکھ بلکہ ایک ایک کروڑ کتابیں مختلف موضوعات پر موجود ہیں اور ان کے شعبے بذاتِ خود ایک علیحدہ حکومت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قادری۔

ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۱۹ء تک جبکہ ولندیزیوں کو بٹادیہ (جکارتا) میں حکومت کرتے ہوئے کم و بیش، سوا دو سو برس گذر چکے تھے کوئی قابلِ ذکر کتب خانہ نہ تھا۔

## سب سے پہلا کتب خانہ[۱]

سرکاری طور پر سب سے پہلا کتب خانہ ۱۸۴۶ء میں رِنفلس کے کتب خانہ اور رمیہ کے کتاب گھر (Batavias Genootschop tot Nut van hot Algemeem) کے امتزاج سے قایم کیا گیا جو کہلاتا تھا۔ اس کی کتابوں کی پہلی فہرست "ڈاکٹر بلیکس" (Dr. Bleeks) نے مرتب کی تھی جو تقریباً بیس ہزار کتب پر مشتمل تھی مگر افادیت کا یہ عالم تھا بقول "نندن بوش" ۱۸۹۵ء تک بجز اہلِ یوروپ کے کوئی دیسی باشندہ اس کتب خانہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، نشاۃِ ثانیہ یا عہدِ تحریکاتِ سیاسی میں مدّتوں کے بعد کہیں ایسا اتفاق ہوا کہ انڈونیشیوں کو بھی کتب خانے میں

---

[۱] ۱۸۱۱ء میں جب انگریز ولندیزیوں کی جگہ برسرِ اقتدار آئے تو انگریز لفٹنٹ گورنر جنرل "سراسٹیمفورڈ رنفلس" نے صرف اپنے عملہ کے انگریزی افسران کی تفریح کے لئے ۱۸۱۹ء میں شہر بٹادیہ میں ایک کلب گھر قایم کیا۔ جس میں اور دیگر اسباب تفریح کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں بھی رکھی گئی تھیں نگرانی کے لئے ایک سیکرٹری بھی مقرر کیا گیا تھا، جس کا کام اراکین کے نام کتابیں جاری کرنا یا ان سے واپس لینا اور ادھر ادھر سے کتب کی فراہمی تھا۔ اس کتب خانہ میں زیادہ تر کتابیں انگریزی کی تھیں اور تاریخ، جغرافیہ، سفرنامے، فلسفہ، مذہب ایشیا کے مذاہب، ناول، ڈرامے، شعر و شاعری، نفسیات اور سیاسیات پر تھیں۔

انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ۱۸۳۲ء میں "پبلک پرنٹنگ آفس کے" ایک ریٹائرڈ افسر مسٹر "پی۔ دی۔ ڈی بیر" نے کتب فروشی کی دوکان کی صورت میں ایک چھوٹا سا کتاب گھر ترتیب دیا تھا، یہاں سے یورپین افسران بھی اپنے مطالعہ کے لئے کرایہ پر کتابیں لاتے تھے مگر ۱۸۳۶ء میں یہ کتاب گھر بھی اسی مالک کتب کی موت کے ساتھ ساتھ ختم ہو کر رہ گیا۔

جانے کی اجازت دی جانے لگی۔ اور رفتہ رفتہ پھر یورپ سے بھی کتابیں منگوا کر اضافہ کی گئیں حتیٰ کہ (بحوالۂ اندونیشین ریویو اشاعت ماہ اگست ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۵) ۱۹۴۱ء میں اس کتب خانہ میں کل تعدادِ کتب صرف چھ لاکھ تھی اور ولندیزی زبان پر مشتمل تھیں، ان میں کچھ کتابیں انگریزی، فرانسیسی، عربی، ملائی اور دیگر زبانوں کی بھی تھیں، (یہ کتب خانہ اب اندونیشیا کے عجائب خانہ سے ملحق ہے۔ اس عجائب خانہ اور دیگر عجائب خانوں کا ذکر پہلی فصل میں شہروں کے ساتھ ساتھ اور کچھ عہدِ قبل تاریخ کے باب میں کیا جا چکا ہے)۔

## پریس کا قیام

کتب خانوں کے قیام کے ساتھ ساتھ کاروبارِ حکومت[لہ] کو چلانے اور اپنی مطبوعات کو شائع کرنے کے لئے خود حکومت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم چیز پریس کا قیام ہے، اندونیشیا میں سب سے پہلا پریس بجائے حکومت کے ۱۸۵۵ء میں عیسائی مشن نے قایم کیا تھا (بقول فرنول صفحہ ۱۲۴) جہاں سے تبلیغِ عیسائیت کے لئے اخبار نکلتا تھا (مگر مصنفِ موصوف نے اس اخبار کا نام نہیں لکھا بلکہ مزید یہ لکھ دیا ہے کہ ۱۸۶۴ء میں ایک اور اخبار جاری کیا گیا)

[لہ] حکومت نے اپنے خلاف پیدا ہو جانے والی بیداری اور برہمی کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ۱۹۰۸ء میں ایک دارالاشاعت (پبلسٹی کا محکمہ) قایم کیا جہاں سے ملائی، جاوائی اور سنڈائی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع ہوتے تھے، اور شہروں اور دیہاتوں میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ اس کی مطبوعات کی کثیر التعدادی کا اندازہ (بحوالۂ سرکاری) اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۷ء میں کل ۲۶۸،۳۴۳،۱۸۰ کتابیں تقسیم کی گئیں۔ ان کی تقسیم کے لئے جا بجا چھوٹے چھوٹے دارالمطالعے بھی قایم کئے گئے جن کی مجموعی تعداد ۱۹۴۰ء تک ۲۲۳۴ پہنچ گئی تھی۔ ان سب دارالمطالعوں کا مقصد صرف حکومتِ وقت کا پراپیگنڈا تھا اور اہلِ اندونیشیا کی بیداری کو روکنا اور ان کے رہنماؤں کو سیاسی حیثیت سے ختم کرنا تھا۔

## اخباروں کا اجرا

اس سلسلہ میں ایک انڈونیشی مصنف "ڈاکٹر سمانانگ" نے باقاعدہ تحقیقات کر کے ایک مختصر سا مقالہ اپنی انڈونیشی زبان میں (Beberapa soal Tentang Pers dan Journalistik) یعنی "صحافت اور پریس سے متعلق چند مسائل" کے عنوان پر لکھا ہے، جو ۱۹۵۰ء میں ۱۲۷ صفحات کی ایک چھوٹی سی کتاب کی صورت میں جیکرتا سے شائع ہوا تھا، ذیل کی معلومات اسی مقالہ سے ماخوذ ہیں۔

"ڈاکٹر سمانانگ" کی معلومات کے مطابق انڈونیشیا میں اخبار نویسی کا آغاز ۱۷۴۴ء میں ہوا جبکہ ولندیزیوں کو اس ملک میں آئے ہوئے کوئی ڈیڑھ صدی گزر چکی تھی، سمانانگ کا خیال ہے کہ یہ کوئی باقاعدہ اخبار نہ تھا بلکہ ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی" کو ملک کے عام حالات سے باخبر رکھنے کا ایک مختصر سا جریدہ تھا جو کبھی شائع ہوتا اور کبھی نہ ہوتا، حتیٰ کہ یہ عوام تک بھی نہ پہنچ پاتا تھا۔ اس کے نام کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں ہوسکا، البتہ سمانانگ نے لکھا ہے کہ "فان اِم ہوف" (Van Imhoff) نامی ایک ولندیزی اس کا مدیر تھا۔ جو ولندیزیوں کی تاریخ صحافت میں اولیت کا شرف رکھتا ہے۔

اسکے کچھ عرصہ بعد کمپنی کے سکریٹریٹ کے ایک کلرک "جان ارڈمن یوردن" (Jan Erdman Jordens) نے تقریباً ۱۷۴۷ء میں "اوکترُوئی" (Octrooi) نام کا ایک مختصر سا جریدہ جاری کیا جو محض خبریں شائع کرتا تھا۔ اور ولندیزی سربراہ حکومت کو انڈونیشیا کے مقامی رؤسا اور حکمرانوں کے حالات سے متعلق معلومات بہم پہنچاتا تھا، کچھ عرصہ بعد جب یہ اخبار بند ہوگیا تو مدیر مذکور نے حکومت کمپنی کے ایک دوسرے اخبار (Batavias Nouvelles er Politique Raisomementen) کے اجرا کی اجازت حاصل کی اور بڑی کوشش و محنت کے ساتھ اسے جاری کیا، یہ اخبار بھی نقطۂ نظر کے لحاظ سے قدامت پسند تھا، اور اشاعت کی حیثیت سے بھی بہت محدود تھا۔

اس اخبار کے چھتیس ۳۶ سال بعد یعنی ۱۷۸۴ء میں "ہیت ونّ دُو نیُوز" (het vend unieuws) نامی ایک اور اخبار جاری ہوا، مگر محض نیلام کی اشیاء کے متعلق ہی خبریں شائع کرتا تھا۔

۱۸۱۲ء میں جب انگریز کچھ عرصہ کیلئے اندونیشیا پر مسلط ہوئے تو انھوں نے اپنی مادری زبان میں "جاوا گورنمنٹ گزٹ" (Java Govt Gazette) جاری کیا جو انکا ایک سرکاری جریدہ تھا جب ولندیزیوں کے ساتھ عہد نامہ ہو جانے کے بعد انگریز اندونیشیا سے چلے گئے اور ولندیزی اس ملک کے اقتدار پر دوبارہ بحال ہوئے تو انگریزی گزٹ کے نمونہ پر انھوں نے بھی ۱۸۱۷ء میں اپنا ایک سہ روزہ گزٹ جاری کیا جو "بٹاویہ اسچے کورانت" (Bataviasche Courant) کے نام سے معنون تھا، اور ولندیزیوں کا سب سے پہلا اور باقاعدہ سرکاری اخبار تھا، یہ غالباً ۱۸۲۸ء تک جاری رہا، اس اخبار میں حکومت کمپنی کے احکامات شائع ہوتے تھے، یا افسران کے عزل ونصب سے متعلق خبریں ہوتی تھیں۔ کچھ زمانہ بعد یہ اخبار بند کردیا گیا، اور اس کے بجائے "نیدرلینڈشے انڈیز ہینڈیلش بلیڈ" (Nederlandshe Indies Hendelsblad) جاری کیا گیا جو ۱۸۳۳ء تک جاری رہا۔

۱۸۳۷ء میں شہر سرابایا میں سب سے پہلی بار ایک روزنامہ "سرابایا کورانت" (Surabaja Courant) کے نام سے جاری ہوا۔ گویا یہ اندونیشیا کی تاریخ صحافت میں سب سے پہلا باقاعدہ روزنامہ تھا، اور ولندیزی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ بعد میں اسکا نام بدلکر "ڈی لوکوموتیف" (De Locomotief) کردیا گیا، یہ اخبار ۱۸۴۵ء تک جاری رہا۔

۱۸۵۱ء میں شہر بٹاویہ (جکارتا) سے "بٹاویہ اسچے ایڈ ورتینیٹی بلیڈ" کے نام سے ایک سہ روزہ اخبار جاری ہوا۔ جو ۱۸۵۲ء میں ایک سال تک اسی نہج پر چلتے رہنے کے بعد "جاوا بودی" (Java Bode) کے نام سے شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار ۱۸۵۸ء تک جاری رہا، اس کے بعد اندونیشیا کے اور دیگر شہروں سے بھی اخبارات شائع ہونے لگے، چنانچہ ۱۸۵۹ء میں پاڈانگ سے اور ۱۸۶۱ء میں مکاسر سے بھی اخبارات شائع ہونے لگے۔ اسی سال سرابایا سے ایک دوسرا مشہور اخبار "نیوز بودی" (Nieuws bode) شائع ہوا، مگر اس کو بعد میں حکومت نے بند کردیا اور ضبط کرلیا۔

۱۸۵۶ء میں سولو اور سرابایا میں اور ۱۸۵۸ء میں جکارتا میں "بزبان ملایو" بھی پریس قایم کرنیکی سعی کی گئی۔ چنانچہ "ملایو زبان" جو اب اندونیشی زبان کہلاتی ہے) کا سب سے پہلا اخبار جو اندونیشیا

میں شائع ہوا وہ "سلومپریت ملایو" (Slompret Melaju) تھا جو ۱۸۶۰ء میں شہر سیمارانگ سے جاری
کیا گیا، اسکے ایکسال بعد ہی یعنی ۱۸۶۱ء میں سراباپاسے "ملایو زبان" کا دوسرا اخبار "بنتانگ تمور" (ستارۂ مشرق)
(Bintang Timur) جاری ہوا، ۱۸۶۳ء میں شہر سولو سے جاوی رسم الخط میں "بروماتانی" (Bromar
tani) نام کا اخبار جاری ہوا۔ اور پھر ۱۸۶۷ء میں جکارتا سے "ملایو زبان" میں "بی یانگ لالا" (Biang
lala) جاری ہوا اور دو سال بعد یعنی ۱۸۶۹ء میں "بنتانگ برات" (ستارۂ مغرب) (Bintang
Barat) شائع کیا گیا پھر "ماتاہاری" (آفتاب) (Mata Hari) نام کا اخبار نکالا گیا، مگر یہ سب اخبارات
مدیرانِ ولندیزی کی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔

۱۸۶۹ء میں جزائر سلاویسی سے سب سے پہلا اخبار ماہنامہ کی صورت میں "چاہیا سیانگ" (Tjahja
Siang) (نمودِ شام) جاری ہوا، اور ماہنامہ سے "ہندیا نیدرلینڈ" (Hindia Nederland)
اور جکارتا سے "بنتانگ جوہر" (Bintang Djohar) نکلا۔

غرض ۱۸۸۵ء میں پورے اندونیشیا میں ۱۸ اخبار بزبان ولندیزی اور ۱۲ اندونیشیا کی مختلف مقامی
زبانوں میں شائع ہوتے تھے، انمیں سے کچھ روزنامے، کچھ ہفت روزہ اور کچھ ماہنامے تھے۔ اس مدت کے تقریباً ۲۵ سال بعد
پھر یہ تعداد ۲۰۰ تک جا پہنچی، یہانتک کہ جب اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں "بودی اوتومو" اور اسکے بعد شرکت اسلام کی قومی
تحریکوں کا آغاز ہوا تو اندونیشیا کے قومی پریس کی بھی بنیاد پڑ گئی، جس کا ذکر آگے چلکر "نشاۃ ثانیہ" کے باب میں کیا جائے گا
مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۱۸ء میں "فلکسراد" کے قیام کیبعد قریب قریب ہر جگہ سے اخبارات نکلنے لگے چنانچہ
جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اسوقت جکارتا سے نکلنے والے مشہور مشہور اخبار "پمن دنگن"
(Pemandangan) "چاہیا تمور" (Tjahja Timur) اور "بریتا عموم" (Berita Oemoem)
اندونیشی زبان کے اور "جاوا بودی" (Java Bode) "ہیت بٹاویاش" (Het Bataviaasch)
"فلکس کورانت" (Volkscourant) اور (Het Nieuws van den Dag van)
ولندیزی زبان کے بڑے بڑے اخبار تھے۔

زمانۂ جنگ میں جوگ جکارتا سے "جوگ جا بودی" (Djogdja Bode) ماتارام (Mataram)
"ڈی فورستن لنڈن" (De Vorstenlanden) اور ساجاتاما (Sadja Tama) وغیرہ اخبارات

نکلتے تھے، سوبونی نکلنے والا مشہور اخبار "پیوارتا" (Pewarta) تھا جس کا بعد میں نام بدل کر "درموکنڈو" (Darmo Kondo) کر دیا گیا تھا۔ اسی زمانۂ جنگ میں مشہور "مالانگ" سے نکلنے والے اخباروں میں سب سے زیادہ مشہور اخبارات "مالانگ بودی" (Malang Bode) اور "اوستھاک بودی" (Oosthoek Bode) تھے۔ انہیں دنوں سماترا سے "پیوارتا دیلی" (Pewarta Deli) "سینار دیلی" (Sinar Deli) "پرسامان" (Persamaan) "ریڈیو" اور "پرچا سلاتان" (Pertja Selatan) وغیرہ اخبارات شائع ہوتے تھے۔ جبکہ بورنیو سے "سوآرا کالیمنتان" (Suara Kalimantan) مشہور اخبار نکلتا تھا، یہ سب روزنامے تھے انکے علاوہ چینی اخباروں کو چھوڑ کر جو ہفت روزے نکلتے تھے ان میں "پانجی اسلام" (Pandji islam) "پیمبنگن" (Pembangun) "پیسیت" (Pesat) "پنیبر سمنگت" (Penjebar Simangat) اور "پیڈومن مشارکت" سب سے زیادہ مشہور تھے۔

ان امور کی اجمالی صراحت کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر پیرایہ میں عدلیہ کے نظم و نسق کو بھی بیان کر دیا جائے۔

## "عدلیہ"

چنانچہ اسی سلسلہ میں یاد رکھنا چاہئے کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت بٹاویہ میں قائم تھی اور "ہوخ خریخٹس ہاف" (Hoog Gerechts) کہلاتی تھی،

**ل ۵ عدالتی نظم و نسق کی عام کیفیت** یہ عدالتی نظم و نسق پورے ملک میں دو خاص حصوں میں تقسیم تھا۔ یعنی

(۱) وہ علاقے جن پر حکومت براہِ راست کار فرما تھی۔ (۲) وہ علاقے جن پر حکومت دیسی ریاستوں کے ذریعہ حکم چلاتی تھی مگر یہ دونوں صورتیں بھی پھر دو خاص حیثیتوں میں منقسم تھیں اور ہر دو حیثیتوں کے باعث پورے ملک کو نظامِ عدل کے بارے میں چار حصوں میں بانٹا گیا تھا۔

۱۔ (الف) انصافِ حکومت براہِ راست حکومت کئے جانے والے علاقوں میں۔

(ب) انصاف حکومت خود اختیاری علاقوں میں۔

۲۔ (الف) دیسی انصاف براہِ راست حکومت کئے جانے والے علاقوں میں اور

(ب) دیسی انصاف خود اختیاری علاقوں میں۔

اور یہ تفریقِ تنظیم نہ صرف عدلیہ کی تنظیم اور عدالتی کارروائی ہی کے اعتبار سے تھی۔ بلکہ

یعنی "عدالتِ عالیہ" اس کے تحت میں عمل کرنے والی عدالتوں کو "لانڈ خر یخت" (Landgerecht) کہتے تھے۔ جن کی تنظیم سنہ ۱۹۱۴ء کے قانون کے بموجب کی گئی تھی اور اس طرح انصاف کا انتظام اور ایکزیکیٹو کا انتظام الگ الگ کر دیا گیا

---

"قانونِ عادات" کی ان حدود اور رنجیر کے اعتبار سے بھی تھی جو دیسی باشندوں اور غیر ملکی مشرقی لوگوں کی قانونی زندگی پر کنٹرول کرتی تھی چنانچہ ذیل میں اب انہی چاروں کا اجمال پیش کیا جاتا ہے۔

"رپورٹ آف دی کمیٹی ٹو اسٹیڈی پبلک لا صفحہ ۵۹" میں درج ہے کہ ولندیزی مشرق الہند گورنمنٹ کے ایسے علاقوں میں عدل وانصاف کا انتظام ایک باقاعدہ حاکمانہ حیثیت رکھتا تھا جبکہ دیسی انصاف مستثنیات میں سے تھا۔ حکومت کا انصاف تین خاص عدالتوں پر مشتمل تھا مثلاً (۱) یورپینی عدالتیں۔ (۲) دیسی عدالتیں اور (۳) عدالتیں برائے ہمہ نوع آبادی۔

پہلی قسم (یعنی یورپین عدالتوں) سے مراد ایسی عدالتیں تھیں جن میں قانون یا تو یورپین تھا اور یا ان کا اپنا مقامی تھا۔ ان کے جج بھی یورپین ہوتے تھے۔ اور دیسی عدالتوں کے جج دیسی ہوتے تھے (دیسی ججوں میں وہ لوگ زیادہ قابلِ ترجیح تھے جو عیسائی ہوگئے تھے) مگر چینی باشندے یورپین عدالتوں ہی کی حدود میں شمار کئے جاتے تھے اس طرح وہ دیسی باشندے بھی ان عدالتوں کی حدود میں آتے تھے جنھوں نے مذہب بدل لیا تھا، طرزِ زندگی اور وضع یورپین بنالی تھی۔

یہ یورپینی عدالتیں بھی تین قسم کی تھیں یعنی پہلی وہ جسکا جج رزیڈنسی جج ہوتا تھا اور "رزیڈنسی خر یخت" کہلاتا تھا۔ اور دوسری بڑی عدالت قانون تھی جس کو "راد وان جسٹٹ" کہتے تھے اور تیسری عدالت سپریم کورٹ تھی جسے "ہوگ خر یختس ہاف" کہتے تھے یہی عدالت یہاں کی ہائی کورٹ تھی۔

اعلیٰ عدالتیں تمام جزائر میں کل چھ تھیں اور معمولی طور پر یورپین لوگوں کے سول اور جرائم کے مقدمے طے کرتی تھیں سنہ ۱۹۳۸ء میں "نزہار" کی مساعی سے عدالتِ عالیہ کا ایک تیسرا ایوان بھی دیسی اعلیٰ عدالتوں کی اپیل کی سماعت کے لئے بٹاویہ میں قایم کیا گیا۔ اور حدود کے اعتبار سے بٹاویہ، بیمارانگ اور سُرابایا کی عدالتِ عالیہ کی حدود میں رکھا گیا مگر مکاسر، میڈان اور پاڈانگ کی عدالتِ عالیہ کی حدود میں دیسی عدالتوں کے وہ تمام علاقے جو خود اختیاری تھے۔

حالانکہ پہلے یہ دونوں کام ایک افسر انجام دیتا تھا یہ عدالتیں پولس کی عدالتیں تھیں اور تین ماہ کی سزا یا ۵۰۰ فلورنس جرمانہ کرنے تک کے مقدمات کی سماعت کرتی تھی۔ ان کے فیصلوں کی کوئی اپیل نہ تھی۔

---

نہ رکھے گئے ورنہ ویسے یہ عدالت عالیہ سول اور کریمنل مقدمات کی اپیل کی آخری عدالتیں قرار دی گئیں جنھیں چھوٹی عدالتوں کے فیصلوں کو بھی منسوخ کرنے کا اختیار تھا، اور دیسی علاقوں کی عدالت میں دیسی ریجینٹ یا اس کا "پایتھ" ہی بحیثیت ریجنسی جج عمل کرتا تھا اور "ریجینٹ ہیپ خرنجت"، کہلاتا تھا اس جج کی مدد کے لئے ایک مسلمان مذہبی مشیر بھی تھا جسے "پنگھولو" کہتے تھے۔

بیرونی صوبجات کے براہِ راست حکومت کئے جانے والے علاقوں کی دیسی عدالتیں ان متذکرہ بالا عدالتوں سے مختلف تھیں اور "اِن لینڈشے رخٹ پراک" (یعنی دیسی نظم ونسق انصاف کی عدالتیں) کہلاتی تھیں مگر جزائر مالوکو، بنکا، بلیتون، اور منیڈو میں یہی عدالتیں "نیگوری کورٹس"، کے نام سے موسوم تھیں، اس طرح سماترا کے ساحلی علاقوں اور بورنیو میں بھی انکا نام یہی تھا۔ بعض رزیڈنسیوں میں انھیں "مجسٹریسی" بھی کہتے تھے۔

چونکہ آبادی کا بڑا حصہ انہی علاقوں میں تھا جو حکومت کے انصاف کے علاقے تصور کئے جاتے تھے اس لئے دیسی انصاف کے علاقے بہت کم تھے یہی وجہ ہے کہ حکومت کی دیسی عدالتوں میں صرف وہی مقدمے پیش ہوتے تھے جن میں دونوں فریق انڈونیشی ہوتے تھے اور ان کے مقدمات "قانونِ عادات" کے مطابق فیصل کئے جاتے تھے۔

ولندیزی شرق الہند کے دستور مُبیّنہ ۱۸۵۴ء و ۱۹۲۵ء کی رو سے یہ قرار دیا گیا کہ جہاں دیسی آبادی اپنے نظم پر کاربند نہ ہو تو وہاں فیصلے بادشاہ ہالینڈ کے نام میں کئے جائیں لیکن جب ۱۹۳۱ء میں ۱۹۳۲ء کے قانون پر نظر ثانی کی گئی تو اس کی بہت سی شقیں بدل دی گئیں اور ان کی رو سے یہ قرار پایا کہ آئندہ سے "دیہات کے نظامِ عدل کو بھی تسلیم کیا جائے گا (یاد رہے کہ یہ دیہات کا نظم ونسق اپنی نوعیت میں ہند و پاکستان کے "پنچایت سسٹم" سے کچھ ملتا جلتا ہے) جو چند چھوٹی بڑی عدالتوں میں منقسم تھا اور ان میں سے ہر عدالت "راپٹس" کہلاتی تھی، اور ان کی ترتیب اس طرح سے تھی مثلاً اعلیٰ راپٹس، بڑی راپٹس، اور ادنیٰ راپٹس۔

البتہ یہ سب عدالتیں بٹاویہ ہائی کورٹ "ہوُخ خرِیخْتس ہاُف" کے صدرہی[۱] کی ماتحت تھیں جو اپنی حیثیت میں ہالینڈ کے تاجِ شاہی کا نمایندہ سمجھا جاتا تھا مگر درجہ میں گورنر جنرل سے کم ہوتا تھا۔ اس کے تحت میں ایک نائب صدر اور دیگر حکامِ عدالت تھے جن کا تقرر گورنر جنرل خود کرتا تھا مگر بقول فرنیول (صفحہ ۱۹۶) " عدالتوں کے لئے از روئے دستور یہ ضروری نہ تھا کہ محض اہلِ ہالینڈ ہی میں سے کوئی شخص جج مقرر کیا جائے بلکہ اس

اس نظام کی صورت (بقول مُصنف کتاب (The Effect of Western Influence on Native Civilization in the Malay Archipelago) صفحہ ۵۶ سنہ ۱۹۲۹ء) یہ تھی کہ ہر گاؤں میں با اثر لوگوں کی ایک جماعت تھی جو اہلِ دیہات کے قضیے اور تنازع دور کرتی تھی۔ ابتدا میں یہ نظام نہایت سادہ تھا مگر بیسویں صدی میں باقاعدہ قانون کی صورت میں مُدوّن کر لیا گیا۔

اسی طرح مذہبی نظامِ عدالت بھی قایم تھا چنانچہ اس باب میں "بنیدبرخ"، (مُصنّف کتاب (Basic Studies in Wet en Adat) جلد دوم صفحہ ۱۶۸ مطبوعہ سنہ ۱۸۹۶ء) لکھتا ہے کہ:-

"مسلمانوں کا مذہبی نظامِ عدل شرق الہند کے نظامِ عدالت میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے ملک کے قوانینِ عادات میں مظاہر پرستوں، ہندوؤں اور عیسائیوں سب کے قانون شامل تھے مگر اسلامی قانون کی ہمہ گیری نے ان سب قوانینِ عادات کی جگہ لے لی اور ان کے مذہبی علماء ہی ان کے قضیوں کے فیصلے دیتے ہیں،، یہ مذہبی حاکمِ عدالت "پِنگھولو" کہلاتا تھا جو فقۂ شافعیہ کی رو سے فیصلے چکاتا تھا۔

[۱] اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شروع میں "صدرِ عدالت" کا اندونیشیا میں کوئی منصب نہ تھا بلکہ عام طور پر ڈائرکٹر یٹ انصاف کا ایک افسرِ اعلیٰ ہی یہ فرائض انجام دیتا تھا ہائی کورٹ کی عدالت پہلی بار سنہ ۱۸۱۹ء میں قایم کی گئی اور اس کے پہلے قایم کرنے والے بھی انگریز ہی تھے جو "رَیفلس" کے عہد میں ولندیزیوں کے بجائے اس ملک پر قابض ہو گئے تھے جب زمامِ حکومت ایک خاص عہد نامہ کے ذریعہ سے دوبارہ منتقل ہو کر ولندیزیوں کے ہاتھ میں پہنچی تو پھر انھوں نے اس نظامِ عدالت کو بھی اس ملک میں مستقلاً رہنے دیا۔

منصب کا حق اہلِ اندونیشیا کو بھی پہنچتا تھا مگر حکومت کو کبھی اس حق کو صحیح طور سے پورا کرنے کی نوبت نہ آئی۔

ججی کے عہدہ پر فائز ہونے کے لئے "بقول فَندَن بُوش" ایک امیدوار کے لئے ضروری تھا کہ وہ کم از کم قانون کا گریجویٹ ہو اور پانچ برس تک شرق الہند کی کسی سرکاری عدالت میں وکیل رہ چکا ہو البتہ رزیڈنسی کے عدالتی عہدہ کے لئے یہ شرط ضروری نہ تھی۔ اس کے لئے محض اتنا ہی کافی تھا کہ امیدوار امورِ داخلہ کے کسی شعبہ میں چند سال کام کر چکا ہو۔

قانون کی حیثیت سے ان تمام عدالتوں میں ولندیزی ضابطہ رائج تھا جو رُومَن ڈَچ لا کہلاتا تھا البتہ ایسی عدالتوں یا دیسی باشندوں کا فیصلہ دیسی قانون کے مطابق کیا جاتا تھا جسے اصطلاحی طور پر "قانونِ عادات[۵]" کہتے تھے۔

---

[۵] **قانونِ عادات** "عادات" عربی لفظ ہے جس سے رسم و رواج کے اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ جہاں تک اس اصطلاح کا اس ملک کے قانون پر انطباق ہوتا ہے مشہور ولندیزی مقنن "ڈاکٹر ترہار" کی رائے ہے کہ "قانونِ عادات" سے مراد یہاں کا وہ مقامی قانون ہے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ملک کی اپنی سماجی ضروریات کے مطابق ہزاروں سال سے تاریخ کے ردّ و بدل کے ساتھ خود بخود پیدا ہوتا رہا ہے یعنی یوں کہنا چاہئے کہ اس ملک کا وہ اپنا خالص قانون جو مذہب کے اصول پر رواج پاتا رہا۔ عیسائیوں میں عیسائیوں کا، ہندو میں ہندو کا اور مسلمانوں میں اسلام کا قانون، بعض انگریز مصنفین نے اسے "کسٹومری لا" لکھا ہے۔ مگر "ترہار" کی رائے میں یہ درست نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر اسے "نیٹیو لا" کہا جائے تو درست ہوگا۔ ورنہ اس کے لئے "پرِی میٹیو لا" کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔

اس قانون کے متعلق ایک ولندیزی محقق (C. Snouck Hurgronje) "سی اسنائک ہُرخرونی"، جو انیسویں صدی میں عربی کا بھی ایک بہت بڑا عالم تھا اپنی کتاب

اِس قانون عادات کے مطابق بقول "فان وُلن ہوفن" (Van Vollen hoven) (ملاحظہ ہو اس کی کتاب "عاداتِ رجنت" جلد اول صفحہ ۱۴۸) پورے اندونیشیا کو چند خاص خاص قانونی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان حلقوں میں دہیں کے مقامی قانون

---

## ۵ قانونِ عادات کے خاص خاص حلقے :-

۱۔ آچیہ ۔ یہ حلقہ سماٹرا کے مغربی ساحل پر سنگکل کے نصف باتاک والے دیس سے شروع ہوتا ہے اور شمال میں آچیہ تک پھیلا ہوا ہے اور مشرق میں ملایا کے قریب تک چلا گیا ہے اس حلقہ میں تقریباً ۸،۰۰،۰۰۰ آچیائی باشندے اس قانون کی حدود میں آتے ہیں۔ (یہ جتنے بھی اعداد شمار آبادی درج کئے گئے ہیں اب ۱۹۳۰ء کی "سینسس ان نیدرلینڈس انڈیا" جلد اول تا ہشتم مطبوعہ ۱۹۳۶ء سے ماخوذ ہیں)

۲۔ گیاؤ، اُلائس، اور باتاک کا حلقہ :- یہ حلقہ بھی آچیہ سے ملحق ہے اور سِننگ کباؤ کا ضلع بھی اسی میں شامل ہے۔ وہ لوگ جو اس علاقہ کے پہاڑوں میں قبائلی زندگی گذارتے ہیں۔ "گیاؤ" اور وادیوں میں رہنے والے 'اُلائس' کہلاتے ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی ۱۲،۵۰،۰۰۰ ہے جن میں ۱،۷۵،۰۰۰ باتاک ہیں۔

۳۔ مِننگ کباؤ :- اس حلقہ میں پاڈانگ کا پہاڑی علاقہ بھی شامل ہے اور سیاک اور کوتان دریاؤں کا بالائی حصہ بھی اس میں شمار ہے۔ اسی طرح قدیم آبادی کے مراکز 'لیما پُرلوکوتا' اور تانا دائر بھی اسی میں شامل ہے ان حلقوں کی مجموعی آبادی ۱،۸۵،۰۰۰ ہے۔ جن میں کچھ لوگ 'پولینیشین' تمدن کے بھی حامل ہیں۔

۴۔ جنوبی سماترا :- اس میں جامبی، پلیم بنگ، بنگ کولن، اور لیمپونگ کی رزیڈنسیاں شامل ہیں ان کی کل قانونی آبادی ۱۵،۰۰،۰۰۰ ہے۔

۵۔ ملائی حلقہ :- جس میں رُدکن، اور سیاک کی وادیوں کے علاوہ مشرقی سماترا اور بورنیو میں سمباس اور پونتیانا ناک کے شہری اور دیہاتی وسیع علاقے ہیں۔ برطانوی ملایا، وسطی تیمور اور جنوبی بیو کے علاقے بھی اسی قانون میں آتے ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی ۷،۱۵،۰۰۰ ہے۔

۶۔ بنکا اور بلیتون :- ان کی قانونی آبادی ۱،۴۰،۰۰۰ ہے جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں۔

کے بموجب فیصلے کئے جاتے تھے۔ ولندیزی مورخین کی تحریرات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۲۴ء تک اس ملک میں کہیں کہیں اس قانون کے بموجب عدالتیں فیصلہ کرتی تھیں مگر ۱۸۲۴ء کے بعد باقاعدہ یورپین اور دیسی قانون کا نظریہ قائم کیا گیا۔ اور ۱۸۴۸ء میں تین خاص

---

۷۔ بورنیو:۔ مغربی بورنیو کے پہاڑی علاقے کے علاوہ دایاک کا علاقہ ہے جس کی آبادی ۰۰۰،۵۰۱ ہے جن میں باہو کا لیمنتان، دایاک، منگایو اور پونتن قبائل شامل ہیں۔

۸۔ منہاسہ:۔ جس میں مینڈو، تون واتو، اور اموانگ قبائل کے لوگ ہیں اور شمالی سلیبس تک چلے گئے ہیں ان کی مجموعی آبادی ۰۰۰،۴۵۰ ہے۔

۹۔ گورن تالو:۔ یہ شمالی سلیبس کا علاقہ ہے اور منہاسہ اور توروجا کے حلقۂ قانون کے درمیان واقع ہے۔ اس کی آبادی ۰۰۰،۲۸۰ ہے۔

۱۰۔ توروجا:۔ یہ وسطی سلیبس کا قانونی علاقہ ہے۔ ان لوگوں کی کل آبادی ۰۰۰،۵۵۰ ہے۔

۱۱۔ جنوبی سلیبس:۔ اس حلقہ میں منداز، لووو، اور موری کی سرزمینیں تھیں اور سلیبس کے مغربی اور مشرقی حصہ کے مکاسری اور بوگینی لوگ بھی شامل تھے۔ دیسی آبادی کی کل تعداد ۰۰۰،۲۰۰،۳۰۷ تھی۔

۱۲۔ ترناتے:۔ اس گروپ میں ہلماہیرا، اور پانچ دیگر بڑے جزائر مثلاً موروتائی، ترناتے، تیدورے، بت جان، اور اوبی شامل تھے۔ ان کے علاوہ سولا، وائیگو اور میسول جزائر بھی انہی میں شامل تھے، دیسی آبادی کا کل تخمینہ ۰۰۰،۱۶۵ تھا۔

۱۳۔ امبون اور مالوکو:۔ اس قانونی گروپ میں بارو، سیرام، امبون۔ جزائر بیندا، سیرن لاؤت، بابر، واٹوبیلا، اور فاصلہ کے جزائر ئی، آرو، تانم بار، وغیرہ شامل ہیں جن کی آبادی ۰۰۰،۳۲۰ ہے۔

۱۴۔ نیوگنی:۔ اس میں اندونیشی ایریان بروت یا علاقہ نیوگنی، اور آس پاس کے جزائر مانسی شوتن اور راردان ہیں کل آبادی ۰۰۰،۳۲۵ تھی۔

۱۵۔ تیمور:۔ اس میں سنڈا خورد کے جزائر شامل کئے گئے تھے جو مشرقی سمباوا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ فلورس اور رودٹی بھی اس میں شامل تھے۔ کل آبادی ۰۰۰،۵۰۱ تھی۔ (۵۶۸ کے باقی صفحہ پر)

گروپ بنائے گئے مثلاً یورپین، دیسی اور غیر اندونیشی ایشیائی وغیرہ ۱۹۲۵ء میں باقاعدہ قانونِ عادات پر کتابیں لکھوائی گئیں اور اس طرح قانونِ عادات مرتّب ہوگیا۔

غرض یہ تھا مختصر سا جائزہ 'عدلیہ' کے نظم و نسق اور ترتیبِ قانون کا جس نے ولندیزی پالیسی کے ماتحت برسرِ عمل آنکر اندونیشی تمدّن پر غیر معمولی اثر ڈالا، اس کی تفصیلات ذیلی نوٹ میں آگے چل کر ولندیزی حکومت کی پالیسی کے عنوان کے زیر تحت بیان کیجائیں گی۔

اب اس مقام پر اختصار کے ساتھ حکومت کے فوجی نظام اور فوجی پالیسی پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو تمدّن پر اثر انداز ہونے والے عناصر میں ایک ضروری بلکہ اہم عنصر سمجھا جاتا ہے لہٰذا اس کی تمدنی اہمیت پر روشنی ڈالنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس

# فوجی نظام

کی تشکیل و ترتیب کو بیان کر دیا جائے۔

**فوج کی تشکیل** جہاں تک تحقیقات سے تفصیلات کا پتہ چلا ہے اندونیشیا میں اس عہد میں ولندیزیوں کا فوجی نظام جو اگرچہ مشرق کے دیگر مقبوضاتِ مغرب کے فوجی نظاموں کے مقابلہ میں زیادہ شاندار اور کامیاب نہ تھا مگر جو کچھ بھی تھا وہ عموماً برطانیہ کے ہندوستانی فوجی نظام سے بہت زیادہ مماثل تھا مثلاً سپاہیوں کی بھرتی، افسران کا تقرر، تربیت کے اصول، فوجی عہدوں کی تقسیم، مقامی اور یورپین سپاہیوں کا بین الدرجاتی امتیاز، فوجی مستقر کا استقرار، فوجی ضابطہ

کی پابندی، ایشیائی اور یورپین سپاہیوں کی تنخواہوں کا فرق وغیرہ وغیرہ۔

پورے ملک (انڈونیشیا) میں ایک باقاعدہ فوج تھی جو دو خاص شعبوں میں تقسیم تھی ایک ایستادہ اور دوسری محفوظ فوج اور دونوں ملکر ایک بڑی فوج کی تشکیل کرتی تھی جس کو "کوُ نِنکلِکُ نیدرلینڈس اِندِشچے لیخر" یعنی ولندیزی شرق الہند کی شاہی فوج (Koninklijke Nederlands Indische Leger) کہتے تھے۔ اس فوج میں جس میں دیسی اور ولندیزی دونوں قسم کے سپاہی ملازم تھے۔ اس کے علاوہ جاوا کی بڑی دیسی ریاستوں کی بھی ایک فوج تھی اور یہ "لِی جیوَن" کہلاتی تھی۔ اس کے افسران تمام ولندیزی تھے یا پھر دیسی شاہی خاندان کے افراد تھے اور سپاہی تمام دیسی باشندے تھے، کمانڈر اعلیٰ ریاست کا حکمراں تھا جو بیک وقت ملکۂ ہالینڈ کا "ایڈ جوٹینٹ" بھی سمجھا جاتا تھا۔ تحقیقات سے اس امر کا بھی پتہ چلا ہے کہ ویسے تو بظاہر یہ فوج کہنے کو دیسی فوج تھی اس کا خرچہ بھی خود دیسی ریاست ہی برداشت کرتی تھی مگر کارکردگی اور افادی حیثیت میں مِن کُلِّ حال ولندیزی تھی۔ کیونکہ ولندیزیوں کی خواہش کے مطابق ہی اس فوج کو عمل کرنا پڑتا تھا۔

**فوج کے شعبے** ابتدا میں یہ افواج صرف برّی اور بحری شعبوں پر مشتمل تھی مگر رفتہ رفتہ پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے ان میں فضائیہ کا شعبۂ اضافہ کر دیا گیا اور اس طرح فضائیہ کے لئے ہوائی مستقر بھی قایم ہو گئے۔

**رنگ رُوٹی کا طریقہ** عموماً فوج میں ان نوجوانوں کو بھرتی کیا جاتا تھا جن کی عمر کم از کم ۱۸ سال اور زیادہ سے زیادہ ۳۲ سال ہوتی تھی اور انھیں متعدد فوجی ٹریننگ کے لئے تقریباً ۱۲ سال تک تربیت حاصل

کرنی پڑتی تھی اور ملازمت کی آخری مدت ۲۰ سال تھی۔ فوج میں داخلہ کے وقت رنگروٹ کی تعلیم کے معیار کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ جاہلِ مطلق کو محض سپاہی کے طور پر بھرتی کرتے تھے اور پرائمری تعلیم کی اسناد کے آدمی کو سارجنٹ اور ثانوی تعلیم والے کو کارپورل لفٹنٹ مقرر کرتے تھے مگر وہ پورا لفٹنٹ نہیں ہوتا تھا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اندونیشی سپاہی کو اصطلاحی طور پر (hilander) "مقامی" اور ولندیزی سپاہی کو "یورپین" کہا جاتا تھا۔ فرائض دونوں کے ایک تھے اور ضابطہ کی پابندی بھی دونوں پر ایک ہی طور پر عاید تھی مگر تنخواہوں، حقوق اور ترجیحات میں دونوں ایک دوسرے سے متباین تھے۔ اس عہد کے ایک فوجی مبصر سے معلوم ہوا ہے کہ ایک ولندیزی سپاہی اتنی تنخواہ پاتا تھا کہ جتنی ایک اندونیشی لفٹنٹ کو ملتی تھی۔ "کورٹ مارشل" یعنی فوجی عدالت میں بھی اندونیشی سپاہی پر اشتداد نسبتاً زیادہ تھا اس کے لئے یہ ضابطہ بھی یورپین فوجی ملزم سے جدا تھا، فوجی ترقی کا بھی یہ حال تھا کہ شروع کے پندرہ سال تک اندونیشی رنگروٹ کو کوئی خاص ترقی نہیں ملتی تھی۔ جب یہ مدّت گذر جاتی تو اسے "کارپورل سارجنٹ" بنایا جاتا تھا جو حیثیت میں غیر منصبدار افسر سے زیادہ نہ تھا۔

### فوجی اکیڈمی اور تربیت کی مدّت

تربیت کے لئے اعلیٰ اور بڑا ادارہ ہالینڈ میں بریڈا کے مقام پر قایم تھا جو ۱۹۱۲ء میں پہلی بار قایم کیا گیا۔ ولندیزی افسران اسی ادارہ میں تربیت پاتے تھے۔ یہ ادارہ "رایل اکیڈیمی" کہلاتا تھا۔ اندونیشیا میں پہلی جنگ عظیم تک کوئی تربیتی ادارہ نہ تھا البتہ جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوگئی اور "فل کسراد" (اندونیشی اسمبلی) قایم

ہوئی اور اس میں بعض اندونیشی اراکین نے فوجی تربیت کے ادارہ کے قیام کے لئے تجویز پیش کی تب کہیں جا کر شہر بانڈونگ کے مقام پر ایک برائے نام اور معمولی قسم کی فوجی اکیڈمی قایم کی گئی جس میں دیسی سپاہیوں کو تربیت دی جاتی تھی مگر اس اکیڈمی کا تربیت یافتہ معمولی قسم کا سپاہی ہوتا تھا یا پھر زیادہ سے زیادہ درجہ دوم کا لفٹننٹ ہوتا تھا۔ فوج کی اعلیٰ افسری کے لئے فوجی ضابطہ کے مطابق ہالینڈ کی رائل اکیڈمی کی سند ضروری تھی جس کا حاصل کرنا ایک "ان لینڈر" (یعنی دیسی سپاہی) کے لئے بہت مشکل تھا کیونکہ نہ وہ اپنے معاشی حالات کے پیش نظر ہالینڈ جا سکتا تھا اور نہ تربیت پا سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ اندونیشی باشندے اعلیٰ افسر کبھی نہ بن سکے، سب سے بڑا افسر جو ایک اندونیشی کبھی بن سکا وہ اندونیشیا کی ساری قوم میں صرف ایک شخص تھا "دُے رُپ سُومُوہارجو" جو سب سے پہلا اور سب سے آخری "میجر" تھا۔ ورنہ سیکنڈ لفٹننٹ سے آگے کوئی اندونیشی سپاہی ترقی پر فائز نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس حیثیت کے سپاہیوں کی بہت کم تعداد تھی جسے اتنی بڑی آبادی کے پیش نظر نہ ہونے کے برابر سمجھنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور یاد رکھنی چاہیئے کہ جب کوئی اندونیشی رنگروٹ تین ماہ کی ابتدائی تربیت میں ہوتا تھا تو اسے تنخواہ ہفتہ وار ملتی تھی جس کی شرح ۲۵ سینٹ یومیہ (یا چار آنے روز) تھی۔

بانڈونگ کی ملٹری اکیڈمی کی مدتِ تربیت تین سال تھی جس کے ختم کرنے کے بعد ایک کارپورل سارجنٹ درجہ دوم کا لفٹننٹ مقرر ہوتا تھا۔ جنگ عظیم اول کے بعد فوجی ہوائی مستقر بھی بانڈونگ ہی کے مقام پر قایم کیا گیا تھا۔ اسی طرح

گورنر جنرل کی کونسل کے شعبۂ دفاعیہ کا ڈائرکٹریٹ بھی بانڈونگ ہی میں قایم تھا، اور بحریہ کی تربیت گاہ مشہور بندرگاہ سُرابایا میں قایم تھی مگر یہ بھی صرف دیسی بحری سپاہیوں کی تربیت کرتی تھی جبکہ اعلیٰ تربیت گاہ کا مرکز ہالینڈ میں تھا۔

## فوج کی تعداد اور خاص خاص فوجی مستقر

سنہ ۱۹۴۱ء میں کل تربیت یافتہ ایستادہ فوج کی تعداد آٹھ سے نو ہزار تک تھی اور محفوظ فوج ...۳۵ ہزار تھی۔ جن میں ایک ہزار افسران اور ...۵ ولندیزی سپاہی تھے۔ افسوس ہے کہ بحری بری اور فضائی عملہ کے جداگانہ اعداد و شمار دستیاب نہ ہوسکے۔ مگر جہاں تک فوجی مستقر کا تعلق ہے معلوم ہوا ہے کہ ان کے خاص خاص مراکز مگ لانگ، مالانگ، جکارتا، بوگور، پاڈانگ، مکاسر اور بانڈونگ میں تھے مگر بانڈونگ کا مستقر سب سے بڑا تھا۔ اعلیٰ فوجی افسران بھی اسی مقام پر رہتے تھے۔

## دیسی سپاہیوں کی مقامیت

اب جہاں تک دیسی سپاہیوں کی فوجی بھرتی کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابتدا میں عموماً مکاسر، ترناتے، ہِدُورُٹے اور امبون وغیرہ مقامات کے عیسائی ہوجانے والے انڈونیشیوں کو فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا پھر بعد میں جاوائی باشندوں کو بھی فوج میں لیا جانے لگا۔ جاوائی باشندوں میں عموماً "پُورُوورجو" (واقع وسطی جاوا) کے باشندے فوجی خدمات پر مامور ہوتے تھے سُماترا کے لوگ ولندیزیوں کی فوجی خدمات میں حصّہ لینے سے محترز تھے کیونکہ ان کے ساتھ سنہ ۱۹۱۰ء تک ولندیزیوں نے بڑی خونریزیاں کی تھیں۔

بہرکیف یہ بتلانا تو مشکل ہے کہ ولندیزی سپاہ میں دیسی باشندوں کی

شمولیت کا فی صدی اوسط کیا تھا کیونکہ اس کے متعلق کوئی معلومات بہم نہ پہنچ سکی،
البتہ یہ ضرور اندازاً معلوم ہوا ہے کہ ان کی تعداد اسقدر قلیل تھی کہ گویا ان کی کوئی
فیصدی قایم ہی نہیں کی جاسکتی۔

## فوجی مصارف کا اندازہ

بقول فندران بوش (صفحہ ۳۴۹) ولندیزی شرق الہند کی حکومت کے کل فوجی اخراجات
جن میں ریٹائرڈ افسران کی پینشن بھی شامل ہے تقریباً ۰۰۰,۰۰۰,۴۰ فلورنس
سالانہ تھی مگر ۱۹۲۹ء میں معاشی گراوٹ کے باعث بقدر ۰۰۰,۰۰۰,۷۶ فلورنس
کی تخفیف کی گئی لیکن ۱۹۳۶ء میں مصارف میں کچھ اضافہ کیا گیا حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء میں
بری بحری اور فضائی افواج کے خرچ کا کل تخمینہ ۰۰۰,۰۰۰,۱۲۶ فلورنس
تک جا پہنچا۔

یہی مصنف آگے لکھتا ہے کہ ان مصارف کی زیادتی کی وجہ دو تھیں اول تو
یہ کہ ولندیزی افسران کی تنخواہیں اور بھتہ بہت زیادہ تھا پھر ان کی تربیت پر بھی
بڑا سرمایہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اس خرچہ کی زیادتی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے
کہ صرف ۳۳۳ ولندیزی سپاہیوں پر ۰۰۰,۵۹۲ فلورنس خرچ آتا تھا جبکہ خالص
انڈونیشی سپاہیوں کے مصارف نہایت ہی قلیل تھے۔

## فوجی زندگی کا تمدن پر اثر

اگرچہ بادی النظر میں فوجی نظام کا خاص مقصد ہر حکومت کے نزدیک اس کے اپنے وقار کو سربلند
کرنا، ضبط و نظم قایم رکھنا اور اپنے ہر گونہ مقاصد کا جن میں دفاعِ ملک بھی شامل
ہے تحفظ کرنا ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو فوج اور اس کا نظام، تہذیب

انسانی کے ان اجزائے ترکیبی میں سے ہے جو کسی ملک کے تمدن پر گہرا اثر ڈالنے میں مؤثر سمجھے جاتے ہیں کیونکہ شجاعت، مردانگی، حوصلہ مندی بے باکی اور عزتِ نفس جو اخلاق کے بڑے سرچشمے ہونے کی جہت سے تمدن کا جزو ہیں فوجی زندگی ہی سے پروان چڑھتے ہیں بلکہ نشو و نما پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک طور سے سوداگری کی طرح فوجیں بھی ایک ملک کے تمدن کو اپنی نقل و حرکت کے ذریعہ دوسرے ملک میں پہنچانے کا بڑا ذریعہ ہیں، اسی لئے جہاں مذہب اور تعلیم روحِ تمدن کو تقویت پہنچاتی ہیں فوجی زندگی اس کے طبعی اجسام کو قوت بخشتی ہے، چنانچہ وہی حکومتیں، جو اپنی محکوم قوم کے افادہ کو ملحوظ رکھکر فوجی برکات کا بلالحاظِ ترجیح خیال رکھتی ہیں خواہ وہ قومی ہوں یا غیر قومی معتبر اور مفید سمجھی جاتی ہیں ورنہ ان کے نظام کا سارا طریقہ منافع خور اور مشیخت پسند گروہ کا ایک ایسا دفتر بنکر رہ جاتا ہے جو اپنی گوناگوں کارکردگیوں سے ایک امتداد کے بعد محکوم قوم کے ماریل یعنی حوصلہ کو بھی دبا دیتا ہے، اور رہیا کی کو بھی فنا کر دیتا ہے جس سے بالآخر کار اس قوم کا تمدن مجروح ہو کر رہ جاتا ہے، اور آزادی کی بوخوئے غلامی میں بدل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جب کبھی تاریخ کے کسی انقلابی ہنگامہ کے نتیجہ کے طور پر وہ حکومت زوال میں آتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ تمدن کی فوجی برکات سے دانستہ طور پر محروم رکھی جانے والی ناکردہ گناہ محکوم قوم بھی اس ادبار کا شکار ہو جاتی ہے۔

**ولندیزیوں کا پرچم** ہندوستان کی انگریزی فوج کی طرح ان کی سپاہ کے بھی متعدد پرچم تھے مگر جہاں تک ان کے سرکاری نوآبادیاتی جھنڈے کا تعلق ہے وہ "ترنگا" تھا یعنی سرخ، نیلا، اور سفید اور یہ جھنڈا "اورائیاں" (Oraijan) کہلاتا تھا۔

## ولندیزی حکومت کی فوجی پالیسی اور اس کا اندونیشی تمدن پر اثر

چنانچہ اگر انہی نکات کو ذہن میں رکھکر ولندیزی عہد کی فوجی پالیسی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کبھی اہل اندونیشیا کو اس تمدنی برکت سے فراخدلی کے ساتھ متمتع ہونے کا موقع نہ دیا۔ شروع میں ایک زمانہ تک سوائے ان عیسائیوں کے دوسرے اندونیشی فوج میں بھرتی بھی نہیں ہو سکتے تھے، جن کی تعداد بہت کم تھی اور محض امبون، ترناتے، تندورے اور مکاسر کے مقامات سے تعلق رکھتے تھے ایک زمانہ کے بعد عام اور دیگر اہل مذاہب اندونیشیوں کو فوج میں لیا جانے لگا مگر قوانین اور ضوابط ایسے سخت مقرر کئے کہ سوائے معمولی قسم کے سپاہیوں کے افسر نہیں بن سکتے تھے اور اگر افسری کے بھی لایق ہو جاتے تو پھر ہالینڈ جا کر تربیت حاصل کرنے کی محرومی کے سبب اعلیٰ قسم کے فوجی امتیازات سے محروم رہتے تھے، خود فندن بوش کا اعتراف ہے کہ:[۱]

"محض معدودے چند ہالینڈ کی تربیت گاہ سے مستفید ہونے کے مواقع پا سکے"۔

اس کے علاوہ جو عہد نامے ان اندونیشی سپاہیوں اور افسروں سے آغازِ ملازمت کے وقت کئے جاتے تھے اسقدر سخت ہوتے تھے کہ آدمی انکا متحمل نہ ہو کر بھاگ جاتا تھا یا پھر رفتہ رفتہ کی تربیت سے ان میں ایسا غلیظ سلامی احساس اور اپنے تئیں احساسِ کمتری پیدا کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے قومی افادہ کے نقطۂ نظر سے تو بالکل بیکار ہو جاتے تھے۔

---

جیسا کہ بعض مبصرین کے بیان سے معلوم ہوا ہے تمام ولندیزی سرکاری عمارات پر یہی جھنڈا لہرایا جاتا تھا۔

[۱] ڈچ ایسٹ انڈیز صفحہ ۳۴۹۔

قطع نظر ان امتیازی برتاؤوں کے اندونیشی آبادی کی کثرتِ تعداد کے تناسبِ عمومی کے پیش نظر بھی ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ کیونکہ ولندیزی حکومت ہندوستان، ملایا، شمالی بورنیو، اور آسٹریلیا میں اقتدار رکھنے والی برطانیہ پر اپنے تحفظ کا دار و مدار رکھنے کے نظریہ کی حامل ہونے کے سبب ولندیزی شرق الہند کی دفاع پر روپیہ صرف کرنا فضول سمجھتی تھی اور اسی لئے نہ اندونیشیوں کو زیادہ تعداد میں بھرتی کرتی تھی اور نہ عوام کو شہری دفاع کی تربیت دیتی تھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۲ء میں جاپان کے حملہ کے وقت جہاں خود ان کا زوال ہوا اندونیشی قوم بھی حملہ آوروں کی پیدا کردہ مصیبتوں کی شکار ہوگئی جیسا کہ خود جدید اندونیشیا کے ایک مشہور رہنما سُوتَن شَہریر[۵] نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"جب نیدرلینڈس انڈیز حکومت نے مارچ ۱۹۴۲ء میں بانڈونگ کے مقام پر جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تو غیر مسلّح اور غیر تربیت یافتہ آبادی بھی جاپانی عسکریت کے مظالم کا شکار بن گئی اور پھر تقریباً تین ساڑھے تین سال تک برابر ان مظالم کو بھگتتی رہی جنکا پہلے کبھی تجربہ نہ کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی تمامتر ذمہ داری اسی ولندیزی استعمار پر عاید ہوتی ہے جس نے ہماری قوم کو اسلحہ کے استعمال اور شہری تحفظ کی تربیت سے محروم رکھکر بڑھتی ہوئی جاپانی افواج کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔"

اندونیشی قوم پر اس کا کیا اثر پڑا ہوگا خود اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اب

---

۵ پرجُوانگَن کِیتا یعنی "ہماری جد و جہد" مصنفہ شہریر۔ (بزبان اندونیشی)

ذیل میں اس عہد کے ان عام اثرات کو بیان کیا جاتا ہے جنھوں نے اندونیشی تمدن پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔

## ولندیزی عہد کا اندونیشی تمدن پر اثر[لہ]

ولندیزی عہدِ حکومت کا اگر تمدنی تاثرات کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اندونیشیا کے تمدن پر بہت کافی اثر ڈالا ہے۔ عمرانی نفسیات کے مقتضیات میں یہ امرِ مسلّم ہے کہ جب دو مختلف الخیال، مختلف النسل، اور مختلف الوضع

۱۵۔ تیمور: ۔ اس میں سنڈا خورد کے جزائر شامل کئے گئے تھے جو مشرقی سمبادا تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ فلورس اور روٹی بھی اسی میں شامل تھے ۔ کل آبادی ۱،۵۰،۰۰۰ تھی ۔ (صفحہ ۵۴۱ سے مسلسل ہے)

۱۶۔ بالی اور لومبوک: ۔ ان میں ۱۰،۰۰،۰۰۰ بالی کے ہندو اور ۷،۵۰،۰۰۰ ساسک اور سمبادی لوگ شامل تھے ۔

۱۷۔ وسطی اور مشرقی جاوا: ۔ اس میں سراکرتا اور جوگ جکارتا شامل نہیں کئے گئے تھے ۔ کل آبادی ۲۶،۰۰،۰۰۰ تھی ۔

۱۸۔ جوگ جکارتا اور سُراکرتا: ۔ یہ دونوں ریاستی علاقے تھے اس حلقہ کی عاداتی آبادی کل ۴۰،۰۰،۰۰۰ تھی ۔

۱۹۔ مغربی جاوا: ۔ اس علاقہ میں سنڈانی لوگ آباد ہیں اور اسے "پَاسُنْدَان" کا علاقہ بھی کہتے ہیں ۔ اس میں کل آبادی ۹۲،۷۵،۰۰۰ ہے ۔

## ولندیزی حکومت کی پالیسی[لہ]

کسی ملک کے تہذیب و تمدن کی ترقی میں اس ملک کی برسر اقتدار حکومت کی پالیسی بھی بڑا دخل رکھتی ہے، یہی پالیسی تہذیب و تمدن کو عروج پر پہنچاتی ہے اور اسی پالیسی کے سبب اکثر تہذیب و تمدن برباد ہو جاتے ہیں خواہ حکومت ملکی ہو یا غیر ملکی جب جمہوری افادیت کے نظریہ کے ساتھ کار فرما نہیں ہوتی ۔ بلکہ اس کا نظریہ ملک اور اہلِ ملک کی عام منفعت کے

قومیں ایک دوسرے سے امتزاج پاتی ہیں تو دونوں اپنے تمدن میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ لیکن اگر دونوں اقوام میں سے ایک قوم حاکم اور دوسری محکوم ہو تو پھر اثر پذیری زیادہ تر محکوم قوم میں ہوگی حاکم قوم میں نہ ہوگی، کیونکہ حکومت

---

برعکس ایک محدود گروہ ایک محدود جماعت اور ایک محدود طبقہ یا سرزمین کو مستفید و مستفیض کرنا ہوتا ہے، تو اس ملک کے عوام نہ ترقی پاتے ہیں اور نہ بامِ عروج پر پہنچتے ہیں بلکہ پست اور بدقوارہ ہوکر رہ جاتے ہیں، نتیجہ کے طور پر ان کا تمدن بھی خستہ و خراب ہوجاتا ہے، اور ترقیاتِ مادی کی محرومی کے ساتھ ساتھ ان کا روحانی ترفع بھی ختم ہوجاتا ہے۔ غیر جمہوری نظام اور غیر عوامی نقطۂ نظر رکھنے والی حکومت خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ ہو اور اس کے اربابِ حل و عقد کتنے ہی دانشمند ہوں، تہذیبِ سیاسی کے نقطۂ نظر سے نہ وہ حکومت ترقی یافتہ کہے جانے کی مستحق ہے اور نہ اس کے اربابِ حل و عقد خطابِ دانشمندی کے سزاوار ہیں، بلکہ خودغرضوں کا ایک ایسا گروہ کہا جائے گا جو اپنے زورِ قدغن سے عوامی قیمت پر متمتع ہوتے رہنا چاہتا ہے، اور ہر آئینہ ملک اور اہلِ ملک کو برباد کرنا چاہتا ہے یہی بربادی بنتیجۂ کار تمدن کی بربادی ہے۔ جو اپنی پستی کے آخری مرحلہ پر پہنچکر ہولناک قسم کے انقلاب کو جگاتی ہے، افراتفری پیدا کردیتی ہے، اور خطرناک قسم کی تبدیلیوں کا موجب بنجاتی ہے، دبی ہوئی قوم کے برباد شدہ تمدن میں نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے اور انقلاب کی پرورش شروع ہوجاتی ہے، پھر تاریخ کا کوئی سا واقعہ بھی ذریعہ اشتعال بنکر پورے ملک کو بھڑکا دیتا ہے۔ انقلاب آتا ہے اور اس خود غرض اور غیر عوامی حکومت کو ختم کردیتا ہے۔ دبا ہوا تمدن ابھرتا ہے اور قومیت اور مذہبیت کے احساس کے ساتھ پورے ملک کو متحد کرکے آمادۂ جد وجہد کردیتا ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ولندیزی حکومت کی ساری ترقیاں اور اس کے اربابِ حل وعقد کی تمام دانشمندیاں اسی نوع پر مشتمل نظر آتی ہیں۔ جسکا آخری نتیجہ انڈونیشیا کا قومی انقلاب ہے اس میں شبہ نہیں کہ ولندیزی یورپ کی ایک ترقی یافتہ قوم تھے، ان کی حکومت ضبط و نظام کی حامل تھی، انھوں نے سوا تین سو سال کے بعد بیسویں صدی میں اس ملک میں بڑے بڑے ترقی کے اسباب بھی بہم پہنچائے جیسا کہ خود زمانۂ جنگ (۱۹۴۲ء) کا آخری ولندیزی گورنر جنرل "فان موک"

کی باگ ڈور ہاتھ میں رہنے کے باعث ملک کے تمام وسائل اور ذرائع، اس حاکم قوم ہی کے قبضہ یا تسلط میں رہیں گے اور یہ استیلا ہی دراصل تمدن اور تہذیب پر اثر انداز ہونے کا خاص ذریعہ ہے۔ ہر محکوم قوم شروع شروع میں نہ سہی لیکن آخر میں یا پھر تاریخ

---

حسرت و یاس کے ساتھ اپنی کتاب (The shakes of Democracy in South East Asia) (صفحہ ۶۵ مطبوعہ انگلستان ۱۹۴۵ء) میں تحریر کرتا ہے کہ: ”ہم نے بہت سے علاقوں میں سڑکیں بنائیں، ریلیں جاری کیں، پہاڑوں کو صاف کیا، جنگلات کو قابلِ زراعت بنایا ہزاروں کی تعداد میں اسٹیمر منگوائے، موٹروں اور بسوں کو بھی مہیا کیا، شہروں کو وسعت دی۔ پاور پلانٹ کو نصب کیا۔ اور جگہ جگہ روشنی پھیلا دی، جدید جدید عمارتوں کو تعمیر کیا، ریڈیو اور تار برقی بھی یہاں لائے، ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر کو بھی آسان تر کر دیا مگر پھر بھی ہمارا یہ انجام ہو“ یہ صحیح ہے اور میرے خیال سے اہل اندونیشیا بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے مگر کیا واقعی ان تمام اسباب اور چیزوں سے ان کا نظریہ کبھی یہ تھا کہ غریب اندونیشی لوگ بھی ان سے مستفید ہوں اور واقعی فائدہ اٹھائیں اور انکی تہذیب ترقی پر پہنچے، اگر ان کی حکومت کی سیاسی پالیسی پر غور کیا جائے تو غالباً نتیجہ نفی میں نکلے گا اور یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کا مقصد ہرگز عوامی یا مقامی مفاد نہ تھا بلکہ اپنی ذاتی منفعت تھی اور اپنے وطن (ہالینڈ) اور اہلِ وطن (اہل ہالینڈ) کو آسودہ کرنا تھا۔ وہ اس ملک سے ہمیشہ ہمیشہ مستفید ہوتے رہنا چاہتے تھے اور یہ سمجھ چکے تھے کہ انھیں یہاں سے جانا نہیں ہے، بلکہ یہیں رہنا ہے اور حکومت کرنا ہے اس لئے انھوں نے یہ سب کچھ چیزیں بجائے اہلِ اندونیشیا کے اپنے مفاد اور اپنی سہولتیوں کے لئے بنائی تھیں۔ سرِ راہ اگر کچھ فائدہ اہلِ اندونیشیا کو بھی پہنچا تو کیا ہوا۔ ان کی پالیسی یک طرفہ اور خود غرضانہ رہی یہی وجہ ہے کہ اندونیشی تمدن پر اسکا بہت بُرا اثر پڑا۔ اور بالآخر انھیں قومی انقلاب پر آمادہ ہونا پڑا۔ ذیل میں اب اسی پالیسی کا اجمال پیش کیا جاتا ہے۔

**زراعتی پالیسی** کسی حکومت اور عوام کی تہذیب کے باہمدگر تاثرات کی سب سے پہلی شق زراعتی پالیسی ہے۔ ملک زرخیز ہو، اور پیداوار بھی زرریز ہو لیکن اگر حکومت کی ناقص پالیسی کے باعث عوام زمینوں سے بے دخل کر دئے جائیں اور پیداواروں میں

کے کسی دور میں ضرور اس امر کی کوشش کرتی ہے کہ حاکم قوم کی خوشنودی حاصل کرے اور اس کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے تعاون برتے۔ ورنہ پھر اسکا کام چلنا محال ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حاکم قوم کا محکوم قوم پر اثر پڑنا ناگزیر ہے۔ اثر خواہ مذہبی ہو، یا تہذیبی

---

بھی اپنا واجبی حصہ رکھنے سے محروم ہوجائیں تو پھر اس ملک کے عوام کی اقتصادی حالت خراب ہوجاتی ہے، پیسہ کم اور گرانی زیادہ ہوجاتی ہے۔ اجارہ داریاں یا ٹھیکہ داریاں جو ایک طرح سے جاگیرداریوں سے کم نہیں ہیں، بھوکے کاشتکاروں کو اور بھی بھوکا بلکہ قلاش تر کر دیتی ہیں، اور خصوصاً ان ممالک میں جو صنعتی نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ زراعتی ہیں وہاں اور بھی افلاس بڑھ جاتا ہے اور ضروریاتِ حیات کا دائرہ تنگ ہوجاتا ہے ضروریاتِ کارکردگی، ضروریاتِ راحت اور ضروریاتِ نشاط جن کی اعلیٰ تکمیل سے تہذیب کو ترقیاں حاصل ہوتی ہیں ان کا پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا چنانچہ زراعت میں انڈونیشیوں کا جو حصہ رکھا گیا اس پر خود زمانۂ جنگ کے ہالینڈ کے وزیراعظم پروفیسر خُربرانڈی کے الفاظ ملاحظہ ہوں (یہ پروفیسر اپنی کتاب "انڈونیشیا" کے صفحہ ۲۷-۲۸ پر رقمطراز ہے)۔

"جزائر کی تمام متنوّع پیداواروں میں بشمول گرم مصالحہ کے زیادہ تر پیداواریں صرف ولندیزیوں کے ہاتھ میں تھیں، حکومت نے یورپین لوگوں کو مقامی باشندوں کی زمین اجارہ پر دلوادی تھیں۔ یہ زراعتی زمینیں فارم سے اسٹیٹ (Estate) میں بدل گئیں اور یہ تمام اسٹیٹس ولندیزی زمینداروں کی مِلک ہوگئیں"۔

لہٰذا اس کے بعد ولندیزیوں نے "کلچر سسٹم" جاری کیا اور پھر دوسرا بندوبست نکالا، جو "کن سائینمنٹ سسٹم" کہلاتا تھا جس کے ماتحت رہنے سہنے انڈونیشی کاشتکاروں کو زر کے بجائے لگان جنس میں دینا پڑتا تھا اور وصول شدہ جنس ہالینڈ بھیجدی جاتی تھی۔ جسکا نتیجہ اور بھی مہلک ثابت ہوا چنانچہ ایک انگریز ماہر معاشیات مسٹر جے۔ ایس فرنوِل کے الفاظ (اس کی کتاب "نیدرلینڈس انڈیا" کے حوالہ صفحہ ۱۱۷ مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ء سے) ملاحظہ ہوں:-

"ان تمام بے عنوانیوں کے طور پر درمیانی قرضخواہ کا طبقہ بڑھتا چلا گیا، مقامی بازار تباہ ہوگئے، باشندوں میں افلاس بڑھ گیا اور جرائم کو بھی ہمت افزائی ہونے لگی"۔

"تمدنی" انداز میں ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے پڑتا ہے اور اس کی رفتار اگرچہ بعض حالات میں تیز ہوتی ہے اور بعض حالات میں کم تیز ہوتی ہے۔ صدیوں کا اگر امتداد واقع ہو جائے تو پھر یہ اثرات بھی منطبق ہو کر راسخ ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے تسلسل میں اکثر جزو تمدن

## آبپاشی کی پالیسی

اعلیٰ وافر زراعت بغیر عمدہ وسایل آبپاشی کے ناممکن ہے' آبپاشی کے سلسلہ میں "اے ہینڈبک آف نیدرلینڈس ایسٹ انڈیز" (مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۰۷) کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"آبپاشی کے وسایل پر تقریباً ۲۵۰،۰۰۰،۰۰۰ فلورنس خرچ کیا گیا اور جگہ جگہ "بندھ" باندھ کر آبپاشی کے وسایل کا ایک جال سا بچھا دیا گیا مگر چونکہ اس جال سے زیادہ تر ولندیزی فارموں ہی کو مستفید کرنا مقصود تھا لہذا یہ سب بند ان حقوں میں باندھے گئے جہاں اہل یوروپ کی بڑی بڑی اسٹیٹس تھیں۔ اس طرح مقامی مزارع محروم ہو گئے"۔ ان کی پیداواروں کی مقدار بھی قلیل تر ہوتی چلی گئی۔

## صنعتی اور معاشی پالیسی

اسی طرح صنعت و حرفت کے معاملہ میں بھی ہالینڈ اور دیگر سوداگران مغرب کی جدید کلوں کے ذریعہ صنعتی ہمت افزائی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا جس سے مقامی دستی صنعت کار بے روزگار ہو گئے اور جدید کارخانوں میں بھی ان کا کوئی حصہ نہ رہنے کے باعث افلاس کو بڑھتے رہنے کا موقع مل گیا پھر ولندیزیوں نے یہاں پر کارخانے کیوں کھلوائے اس ذیل میں "فرنیوَل" کی عبارت (صفحہ ۲۹۸) ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتا ہے کہ "ولندیزیوں نے یہ تمام کارخانے اپنے ذاتی مفاد کے لئے کھولے تھے۔ کیونکہ یہاں سے کچا سامان یوروپ لے جا کر تیار کرانے میں لاگت بہت آتی تھی اور مزدور بھی وہاں سستے نہ تھے"۔ گویا جدید صنعتوں میں اگر اہل انڈونیشیا کا کچھ حصہ تھا تو وہ صرف مزدوری اور قلی گیری تک رکھا گیا تھا پھر یہ مزدوری بھی آمدنی کے اعتبار سے خود کفیل نہ تھی۔ اس ذیل میں "سی بارانی" کی کتاب "دی ہائی اِنڈونیشین ریوالیٹیڈ" (صفحہ ۱۲) کا اقتباس ملاحظہ ہو وہ لکھتا ہے:۔

"ولندیزی جو کل آبادی کا محض ۰.۵ فیصدی تھے کل ملک کی آمدنی کا ۶۵ فیصدی حاصل کرتے تھے اور دیگر ایشیائی جو کل آبادی کا ۲ فیصدی تھے ۲۲½ مگر انڈونیشی جن کی تعداد کل آبادی

بنکر قدیم تمدن میں مخلوط ہو جاتے ہیں۔

ان اثرات میں سب سے بڑا اثر رہائش پر پڑتا ہے۔ رہائش کے بعد لباس، پھر زبان، پھر علم و ادب، پھر نفسیات، اس کے بعد کردار و اخلاق، اور مذہب پر بھی

---

کا ۵ء۹۵ تھی ان کا حصہ صرف کل آمدنی کا ۱۲½ فیصدی تھا"

یہی مصنف پھر (صفحہ ۱۳ پر) آگے لکھتا ہے کہ:۔

"چودہ گھنٹے محنت لی جاتی تھی، اور معاوضہ بیس سینٹ (یاد رہے ایک سینٹ ہمارے پاکستان کے ڈبل پیسے کے برابر ہوتا ہے "قادری") دیا جاتا تھا۔ اگر کبھی ان مزدوروں کی حالت کو سنوارنے کا منصوبہ لے کر کوئی یونین کھڑی بھی ہوتی تو ولندیزی پولیس اسے کچل کر ختم کر دیتی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۹ء میں وقتاً فوقتاً جو مزدور ایسوسیشن مزدوری کے اضافہ کا مطالبہ لے کر کھڑے ہوئے کمیونسٹ قرار دے کر مستوجب سزا قرار دئے گئے۔

علاوہ سی بارانی کے اور دیگر ماہرین معاشی کے اعداد شمار سے پتہ چلتا ہے سالانہ آمدنی کے حساب سے ہر اندونیشی مزدور کی یومیہ آمدنی کا اوسط تین پیسے پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسقدر غربت زدہ لوگ اپنی تمدنی بہبود پر بیچارے کیا خرچ کر سکتے تھے۔ (یہ اوسط سنہ ۱۹۲۹ء میں فلکسراد کے اجلاس میں مسٹر پراؤتا نے پیش کیا تھا)۔

## تجارت کی پالیسی

یہ تو تھا مزدور پالیسی کا نقشہ اب تجارتی پالیسی کا نقشہ ملاحظہ ہو، پیداوار کی افراط اور وسائل کی فراوانی کے باعث اندونیشیا ہمیشہ بڑا تجارتی مرکز رہا ہے، خود ولندیزی عہد میں بھی اس کی تجارت کا مقام بہت اونچا تھا مگر یہ تجارت سب ولندیزیوں یا دیگر اہل یورپ کے ہاتھ میں تھی۔ بیرونی تجارت میں لائسنس نہ ملنے کے باعث اندونیشی سوداگروں کا کوئی خاص مقام نہ رہا تھا چنانچہ ہالینڈ کا سنہ ۱۹۴۲ء کا وزیر اعظم پروفیسر خربرانڈی اپنی کتاب "اندونیشیا" کے صفحہ ۳۸ پر لکھتا ہے کہ:۔

"سنہ ۱۹۳۰ء تک یہاں (اندونیشیا) کی تجارت کی یہ کیفیت تھی کہ پورے جاوا میں جس کی آبادی پانچ کروڑ ہے ایک جاوائی بھی غیر معمولی حیثیت کا تاجر نہ تھا"

آخر کیوں؟ صرف اس لئے کہ نہ تو غیر ملکی تجارت کرنے کے لئے انھیں لائسنس

اثر پڑجاتا ہے، آرٹس اور صنعتیں بھی متاثر ہوتی ہیں زبان کی وجہ سے علم وادب پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اور علم وادب کی وجہ سے مذہب کے نقطۂ نظر اور اخلاق کے انداز پر بھی اثر پڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔

---

دیئے جاتے تھے اور نہ ولندیزی اجارہ دار انھیں اپنے خود ہی کے ملک میں سامانِ بضاعت اکھٹا کرنے دیتے تھے پھر ستم ظریفی یہ تھی کہ ٹیکس کی شرح ناقابلِ برداشت تھی۔ جیسا کہ "سی بارانی" نے لکھا ہے کہ "درآمد اور برآمد پر جاپان کے مال کو روکنے کی غرض سے اسقدر کسٹم ڈیوٹی لگادی گئی کہ مقامی سوداگروں کے لئے تجارت کرنا قریب قریب ناممکن ہوگیا"

آگے فرنیول (اپنی کتاب "نیدرلینڈس انڈیا" کے صفحہ ۹۸ سر پر) لکھتا ہے کہ:۔

"یہ ٹیکس اتنا بھاری تھا کہ مقامی سوداگر اسے برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اس سے ان کی تجارت کو زوال ہوگیا اور تجارت کے زوال سے ان کی صنعت وحرفت کا بھی کوئی مستقبل باقی نہ رہا"۔

پھر سب سے بڑھ کر یہ خرابی تھی کہ ولندیزی جو مال اندونیشیا سے ہالینڈ بھیجتے تھے اس کے معاوضہ میں اتنی ہی قیمت کی کوئی چیز اندونیشیا کو واپس نہیں منگواتے تھے اس طرح تجارت یک طرفہ ہو کر ہمیشہ ایک ملک کی معاشیات کے لئے نہایت ہی ہلاکت انگیز ہوتی ہے۔ اس یک طرفہ تجارت کا تخمینہ پروفیسر فان گیلڈرن نے اپنی کتاب (Economic policy in the Netherlands East Indies) میں دیتے ہوئے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "۱۹۲۵ء میں جو مال بلا معاوضۂ واپسی کے ہالینڈ بھیجا گیا وہ بقدر ...... ۵۰۴۱ گیلڈر تھا"

سوداگر عموماً زیادہ ولندیزی تھے لہذا وہ اپنا زیادہ سرمایہ ہالینڈ ہی میں رکھ چھوڑتے تھے، جاوا میں جسقدر بھی بنک تھے بقول (Dr. C. F. Schiffer) (ان کا مقالہ (Banks and Banking in Indonesia) "اکانومک ریویو آف اندونیشیا" ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء مطبوعہ جکارتا میں شائع ہوا تھا) ان کے صدر دفاتر ہالینڈ میں تھے اور بجٹ کا تمام سرمایہ محفوظ رکھتے تھے۔

**رسل ورسایل کی پالیسی** | تجارت کے ساتھ ساتھ "سفر وحضر" میں رسل ورسایل

ولندیزی اندونیشیا میں کم و بیش تین سو چون سال حکمراں رہے، شروع شروع میں ان کی حیثیت تاجرانہ تھی، لہٰذا انکا اثر بھی ابتدا میں تجارت پر پڑا تجارت کی وجہ سے وہ زراعت میں قدم فرسا ہوئے لہٰذا اصولِ فلاحت بھی ان سے متاثر ہوئے پھر انھوں نے

---

کی پالیسی بھی معیارِ تمدن پر بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اندونیشیا میں ولندیزیوں نے ریلیں (جاوا میں) کافی جاری کر دی تھیں مگر ان میں خاص اندونیشیوں کے لئے سفر کی کوئی آسانی نہ تھی چنانچہ مسٹر نصرؔ وُن اپنے مقالہ (Freedom from Spiritualism) (جو اندونیشین ریویو ماہ اپریل ۱۹۵۱ء کے صفحہ ۱۹۱ پر شائع ہوا تھا) میں تحریر فرماتے ہیں کہ "رنگ و نسل کا جو امتیاز عام طور پر برتا جاتا تھا وہ ان ریلوں کے سفر کے سلسلہ میں خاص طور پر نمایاں تھا مثلاً یہ کہ کسی اندونیشی کو اجازت نہ تھی کہ وہ ریل میں تیسرے درجہ کی گاڑی کے علاوہ کسی اور اعلیٰ درجہ کی گاڑی میں سفر کر سکے۔ یہی حال موٹروں اور کاروں کے رکھنے کے سلسلہ میں تھا، یعنی کوئی اندونیشی کار نہیں خرید سکتا تھا۔ البتہ صرف ان لوگوں کو اجازت تھی جنھوں نے مصلحتِ زمانہ کے ماتحت کوئی سرکاری درجہ حاصل کر لیا تھا یا اپنی وضع کو بدل کر یورپین وضع اختیار کر لی تھی اور یا جو زیادہ ٹیکس دیتے تھے مگر ایسے لوگ بہت کم تھے۔"

**تعلیمی پالیسی** ان سب امور کے ساتھ ساتھ سب سے اہم چیز جو کسی ملک کے تمدن کی صحیح معیار ہے وہ وہاں کی حکومت کی اعلیٰ تعلیمی پالیسی ہوا کرتی ہے، یعنی وہی حکومت کسی ملک کے تمدن کی صحیح سرپرست ہے جو وہاں کے عوام کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائے اور ہر کس و ناکس کو دلدادہ علم و فن بنا دے، تعلیم کی نشر و اشاعت میں دقتیں پیدا کرنے والی حکومتیں دراصل اس ملک کے تمدن کے ساتھ ناانصافی برتنے والی حکومتیں ہوتی ہیں اس خصوص میں بھی ولندیزی عہد نے تمدن اندونیشا کے ساتھ انصاف نہ برتا۔ شروع کے تین سو سال تک انھوں نے تعلیم کو پھیلانے کی طرف مطلق توجہ نہ دی چنانچہ خود ان کے آخری گورنر جنرل فان موک (صفحہ ۴۶) کے الفاظ (اس کی کتاب (The shakes of Democracy in South East Asia) ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"مدتوں ان نو دریافت مقامات میں ولندیزیوں نے تعلیم کو عام نہ ہونے دیا بلکہ محض

اپنے مشنریوں کے ذریعہ مذہب عیسائیت کو پھیلانے کا کام انجام دیا لہذا مذہب پر بھی اثر پڑا، مدتوں کے بعد کمپنی کا دورِ حکومت گذر جانے پر جب تاجِ ہالینڈ کی عملداری کا آغاز ہوا تو یہ اثر بھی حکومت کی ہمہ گیر حکمتوں کے باعث گوناگوں ہوتا چلا گیا،

---

خاص خاص مقامی خاندانوں ہی کو بہرہ مند کیا"

۱۹۰۸ء سے قبل جسقدر بھی مدارس قایم کئے گئے وہاں حکومت کا طرزِ عمل کچھ اس قسم کا رہا کہ تعلیم حاصل کرنا عوام کے بس کی بات نہ تھی چنانچہ "سی بارانی" (ملاحظہ ہو اس کی کتاب وہائی انڈونیشینکس ریوالٹیڈ ص ۱۰۱) لکھتا ہے کہ: -

"بد قسمتی سے ان ابتدائی مدارس کو بھی ایسی کڑی آئینی بندشوں میں حکڑا گیا کہ ماسوا چند کھاتے پیتیوں کے عوام اپنی اولاد کو نہیں پڑھوا سکتے تھے، یعنی ان مدارس میں جزائر کی باشندگی کی بڑی بندش تھی۔ مثلاً یہ کہ جس مقام پر مدرسہ قایم ہے بس وہیں کے لوگ اپنے بچوں کو پڑھوا سکتے ہیں اور دوسرے حلقہ یا علاقہ کے لوگ نہیں پڑھوا سکتے پھر یہ مدارس بھی کہیں کہیں تھے، ہر جگہ نہ تھے"

پھر طرزِ تعلیم بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ مقامی باشندوں کے لئے جو اسکول کھولے گئے وہ آٹھویں جماعت کے بعد ختم ہو جاتے تھے، یونیورسٹی آخری زمانہ تک نہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ جانا پڑتا تھا جو ہر آدمی کے بس میں نہ تھا پھر بیسویں صدی کے شروع تک اس کی بھی اجازت نہ تھی۔

## سِول سَروِس کی پالیسی

ملازمتوں میں "سِول سَروِس" کے پاس شدہ لئے جاتے تھے۔ جن کے امتحانات بھی اکثر و بیشتر یورپ میں ہوتے تھے اور وہیں اس کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ انڈونیشیوں کا افلاس اور ان کی تعلیمی پس ماندگی اس کی انھیں کہاں مہلت دیتی تھی کہ وہ غریب اس امتحان کو پاس کر کے حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے اگر کوئی لاکھوں میں ایک صاحب استطاعت اس معرکہ کو جھیل جاتا تو کوئی عہدہ حاصل کر لیتا مگر جج پھر بھی نہیں بن سکتا تھا۔ حالانکہ بقول فرنیول دستور میں اس کی بندش نہ تھی لیکن ایک رسم بن گئی تھی۔

## عدلیہ کی پالیسی

جج نہ بنائے جانے کے ساتھ ساتھ عدالتوں میں بھی ان کے ساتھ کوئی

اندونیشیا کے باشندے مغربی تمدن اور مغربی ادب سے پہلے واقف نہ تھے، مغربی اخلاق و فلسفہ کا اثر بھی اسی عہد سے پڑا، یوروپ کی متعدد زبانوں کے سیکھنے کا بھی انھیں اسی دور میں موقع ملا لہٰذا وہ مغربی اندازِ علم وادب سے اسی دور میں واقف ہوئے، لباس اور مکانات

---

اچھا رویہ نہ تھا چنانچہ پاکستان کے سرکاری پرچہ "ماہِ نو" ارشائع کردہ کراچی جلد۲ شمارہ ماہ جون ۱۹۴۹ء صفحہ ۶۱) میں یکبار ایک ترجمہ کیا ہوا مقالہ شائع ہوا تھا جس میں خاص طور پر مقالہ نگار نے عدالتی پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ "کوئی ایشیائی کسی ولندیزی مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا ہو کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ایک سرکنڈے کی نشست پر بیٹھ کر نہایت ہی لجاجت کے ساتھ بات کرنے کا حکم تھا۔ اس کے علاوہ جبریہ بیگار کا عام رواج تھا۔"

## احساسِ کمتری پیدا کرنے کی پالیسی

خود غرض اور عوام سے بیجا فائدہ اٹھانے والی حکومتیں ہمیشہ ایک یہ طریقہ بھی اختیار کیا کرتی ہیں کہ وہ اپنے ماتحت عوام میں "احساسِ کمتری" پیدا کر دیتی ہیں تاکہ وہ اس احساس کے غیر معمولی بوجھ سے ہمیشہ دبے رہیں اور کبھی سر نہ اٹھائیں اور ان کے تعمیل حکم میں چون وچرا نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ولندیزی حکومت کا بھی خاص کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اہلِ اندونیشیا میں احساسِ کمتری بے انتہا پیدا کرنے کی کوشش کی مثلاً یہ کہ مدارس کے (بقول سی بارانی) بچوں ہی میں اس کی بنیاد رکھ دی جاتی تھی درسی کتابوں میں تصویریں جو ہر سبق کے ساتھ ہوتی تھیں دو قسم پر مشتمل ہوتی تھیں یعنی ایک اندونیشی تصویر اور دوسری ولندیزی تصویر، اندونیشی تصویر میں جو کردار دکھایا جاتا تھا وہ خالص اندونیشی ہوتا تھا، مگر اس کو اسقدر حقارت آمیز انداز میں دکھاتے کہ دیکھنے والے کے دل میں اہلِ اندونیشیا کی نسبت نفرت پیدا ہو اور اس کے برعکس ولندیزی تصاویر نہایت ہی اعلیٰ اور شاندار کردار کے ماتحت دکھائی جاتی تھیں اور ان باتوں کا بچوں کی نفسیات پر بڑا برا اثر پڑتا تھا۔"

اس طرح بقول بعض مبصرین دیہاتوں میں یہ حکم عام تھا کہ اگر کوئی ولندیزی جا رہا ہو تو دیہاتی اس کے سامنے سائیکل پر بیٹھکر نہیں جا سکتا تھا، بلکہ سائیکل سے اک دم اتر کر جھک کر اس ولندیزی کو سلام کرنا پڑتا تھا ورنہ اس غریب اندونیشی پر ہتک عزت کا دعویٰ ہو جاتا تھا جس کی سزا جرمانہ تھی یا پھر عدم ادائیگی کی صورت میں قید تھی۔

کی تعمیر میں بھی اندازِ مغربی انہی کے اثر سے پہنچا، آزاد خیالی جو موجودہ یوروپ کے سوشلزم کے فلسفہ کا بڑا جز وہے وہ بھی غالباً یہاں ولندیزی عہد ہی سے پہنچا ہے، بلکہ بعض آدابِ زندگی بھی مغربی ہو گئے مثلاً مغربی سلام کے لئے گڈ مارننگ کہتے ہیں یا گڈ بائی بھی کہتے ہیں، انڈونیشی تہذیب میں بھی اس کے مترادفات کا رواج پایا جاتا ہے اور ان کے ہاں بھی سلامتؔ پاگی اور سلامت مالم کہتے ہیں۔ اس طرح یوروپ کی تمام ایجادات اختراعات اور دیگر فنی چیزوں سے بھی اسی دور میں انڈونیشی تمدن کو روشناس ہونا پڑا ہے۔ بلکہ سیاسیات کا انداز بھی ولندیزیوں کی سیاست ہی کے ردِّعمل کے طور پر پیدا ہوا ہے۔ جسکا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔

---

## مذہبی پالیسی

اس عہدِ استعماریت و بربریت کا اہلِ انڈونیشیا پر سب سے بڑا ظلم اور انکے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی ولندیزی حکومت کی مذہبی پالیسی تھی۔ یعنی عیسائیت کو مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں پھیلانا۔ اگرچہ یہ کام پہلے پرتگالی بھی اس ملک میں کر چکے تھے اس لئے عیسائیت پھیلانا تو کوئی نئی بات نہ رہا تھا مگر اس نظریۂ سیاسی کے ساتھ اہلِ ملک کو بجبر عیسائی بنانا کہ مسلمان اقلیت میں ہو جائیں تاکہ پھر ان کی حکومت کے خلاف کوئی انقلاب پیدا نہ کریں۔ ولندیزی حکومت نے اکثریت کے خلاف مذہبی سوال اٹھا کر ناانصافی کا ثبوت دیا بلکہ اپنے مذہبی تعصب کا ثبوت دیا۔ درحقیقت ولندیزی حکومت اپنے وقت کی ایک ظالم ترین حکومت تھی سنہ ۱۹۰۱ء میں اور پھر سنہ ۱۹۰۸ء میں ہالینڈ کے تاجِ شاہی نے بجبر عیسائیت پھیلانے کا اعلان کر کے اہلِ انڈونیشیا پر بڑا ظلم کیا۔ مذہب کے بچاؤ کے انداز نے رفتہ رفتہ ان میں وہ انقلابی روح بیدار کر دی جس نے انھیں سمجھا دیا کہ اگر وہ نہ سنبھلے تو ان کا تمدن بالکل ختم ہو جائے گا لہٰذا تحریکات کے ذریعہ نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ جس نے ان کے قومی انقلاب کی پرورش کی اور آزادی کی راہ دکھائی۔ اسطرح مذہبِ اسلام ہی انڈونیشیوں کیلئے غیر ملکی غلامی سے نجات پانے کا ذریعہ بنا۔




عہدِ نشاۃِ ثانیہ کے اندونیشی رہنما

# باب پنجم

## نشاۃ ثانیہ[1]

ولندیزیوں کو اس ملک میں گذارتے ہوئے کچھ اوپر تین سو سال ہو چکے تھے مگر اس طویل دور حکومت میں جس سیاسی پالیسی پر وہ کاربند رہے ملک اور اہل ملک کے حق میں اسقدر مضر اور غیر نفع بخش تھی کہ پوری اندونیشی قوم متنوّع بربادیوں کا شکار ہو گئی یعنی یہ کہ نہ ان کے پاس دولت رہی، نہ تجارت بلکہ عام معاشی گراوٹ کے باعث علم و حکمت بھی ان سے معدوم ہوتے چلے گئے، اور اس طرح ایک ایسی قوم جس نے کبھی صدیوں کا امتداد اپنی خود مختار حکومت کے جاہ و جلال اور عز و ناز کی آغوش میں گذارا تھا اب مزدور اور قلی بنکر انتہائی فروتری اور ابتری میں بسر کرنے لگی۔ ولندیزی حکومت نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی کے ساتھ ساتھ معاشی پالیسی کا توازن بھی کچھ اس طرح کا رکھا کہ مقامی باشندوں کے لئے افلاس و فلاکت کے اسباب روز افزوں ہوتے چلے گئے اور اس طرح ایک بڑی آبادی نانِ جویں سے بھی محروم ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ادبار و حرمان کے دور میں کوئی قوم کیا تو اپنی تعلیم کو درست کر سکتی ہے اور کیا اپنا معیارِ زندگی بلند رکھ سکتی ہے جب روزمرہ زندگی کی ضروریات ہی میسر نہ ہوں تو ضروریاتِ کارکردگی اور ضروریاتِ راحت کس طرح

---

[1] نشاۃ ثانیہ کے اس باب کی تیاری میں کافی محنت کرنی پڑی ہے۔ پہلے قائدین اکابرین کی سوانح عمریوں کو باقاعدہ مقالوں کی صورت میں مرتب کیا گیا پھر انہی کے واقعات اور حالات کی اساس پر نیز دیگر مضامین کے مطالعہ سے ایک خاص تسلسل کے ساتھ متن پر تحریکات و حالات کو ترتیب دیا گیا جو آئندہ کی جنگ آزادی کی تاریخ کا ضروری پس منظر ہے۔ فٹ نوٹ میں سوانح عمریوں کے مضامین کو تیار کرنے میں پوسا کا اندونیشیا ڈاکٹر سوتومو، چکرو آمنوتو وغیرہ مختصر اندونیشی کتابوں سے بھی مدد لیگئی ہے۔ قادری

میسر آسکتی ہیں، معاشی نقطۂ نظر سے تعلیم و سیاست، اور معیار و لطافت، ضروریاتِ کارکردگی اور ضروریاتِ راحت کے بڑے شعبے ہیں، جب کسی قوم میں ان کا عام فقدان ہو جاتا ہے تو وہ قوم ادبار اور پستی میں آگرتی ہے، پھر اس کا سنبھلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے، یہی اس قوم کا زوال ہے۔

ولندیزیوں کی طویل سیاست اور معاشی پالیسی نے بھی قومِ اندونیشیا میں اسی طرح کا زوال پیدا کر دیا تھا، مگر ہر زوال کے بعد ایک عروج اور ہر عروج کے بعد ایک زوال آتا ہے، تاریخ خود اپنے آپ کو دہراتی ہے، اسباب تدریجی طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں اور حالات کو بدلتے رہتے ہیں جب جور و تعدی اپنی حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں، تو خود بخود اہلِ ظلمہ کے حق میں قہر و غضب بن جاتے ہیں، یہی قہر و غضب انقلاب کی پرورش کرتے ہیں، اور آزردہ دل اور افسردہ حال قوم کو اُکسا کر آمادۂ عمل کر دیتے ہیں، عمل شروع ہوتا ہے اور ایک نئی قومی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے یہی نئی زندگی فلسفۂ تمدن میں "نشاۃِ ثانیہ" کہلاتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ "نشاۃِ ثانیہ" کا آغاز ہمیشہ کسی ایک غیر معمولی واقعہ یا کسی اہم ترین حادثہ سے ہوتا ہے اور غیر معمولی واقعہ یا اہم ترین حادثہ مدتوں کی کار فرمائیوں کا نتیجہ ہوتا ہے، یا سیاستِ عصر کے نفسیاتی تاثرات سے ظہور میں آتا ہے جب وہ واقعہ پیش آجاتا ہے تو اس کے مابعد الاثر نتائج کی ہولناکیوں کے تصور سے ادبار و زوال کی آغوش میں غفلت کی نیند سونے والی قوم اک دم چونک پڑتی ہے، بیدار ہو جاتی ہے، اور تنظیم و عمل میں لگ جاتی ہے، تنظیم و عمل جاری رہتے ہیں، اور پورے عہدِ نشاۃِ ثانیہ میں تکمیل کی منزل سے گذرتے رہتے ہیں۔

مدتوں کے بعد جب انجام تکمیل ہو جاتا ہے تو انقلاب آتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر اہل ظلمہ ختم ہو جاتے ہیں اور مظلوم برسر اقتدار آجاتے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اندونیشیا کی نشاۃ ثانیہ بھی من کل حال اسی نوع کی نفسیات پر مشتمل ہے جس کا زمانۂ آغاز انیسویں صدی کا اختتام اور بیسویں صدی کی ابتدا ہے، یعنی وہ دور ہے کہ جب مغرب میں سیاسی اور اقتصادی کشمکش و رقابت نے اقوامِ یوروپ میں حرص و آز کی آگ کو مشتعل کر کے ان کی سیاسی توجہات کو ایک بالکل نئی سمت میں بدل دیا تھا جسے بالفاظِ سیاست "حلقۂ جاتی اثر" یا شہنشاہیت کی حمایت" کہنا چاہیے۔ چونکہ دولِ یوروپ کی مستعمرات میں مشرق کے ایسے دیار شامل تھے جن کی اکثر آبادی کا مذہب "اسلام" تھا اور مشرقِ وسطیٰ آخری دور پر خلافتِ ترکیہ کی قلمرو تھا جس پر مغرب کی سیاست استیحصالِ وسائل کی طلب میں تیشہ زن ہونے کے لئے واقعات کے پلٹا کھانے کی منتظر تھی اور جہاں سے "اتحادِ بین الاسلام" کے عنوان سے انقلابی تحریکوں کے شیوع کی صدا بھی بلند ہو رہی تھی۔ جس سے مستعمراتِ مشرق کے یوروپین مبصرین اپنے استیحصال کے خلاف ایک اشتعالی خطرہ محسوس کر رہے تھے۔

چنانچہ انھوں نے اپنی اپنی مستعمرات میں اپنی قدیم سیاسی گرفت کو مستحکم تر کرنے کے لئے اب نئی نئی تجاویز اور نئی نئی صورتیں سوچنی شروع کیں اور اس طرح بساطِ سیاست پر ایک نئی چال کا آغاز ہو گیا۔ اندونیشیا کا برباد شدہ ملک بھی جس پر ولندیزی استعمار غالب تھا، اس بیکانِ رفتار کا آماجگاہ بن گیا یعنی یہ کہ سیاستِ عصر کے نفسیاتی تاثرات سے متاثر ہو کر ولندیزی مبصرین بھی اب یہ محسوس کرنے لگے کہ

یہ ملک (اندونیشیا) جو اگرچہ تین سو سال کی سعیٔ پیہم سے حتی الامکان لاغر و شکستہ کیا جا چکا ہے اور سنبھلنے کے ظاہری امکانات سے بھی محروم ہو چکا ہے پھر بھی ایک مسلمان ملک ہے اور اسلامی آبادی کا دنیا میں دوسرا بڑا مرکز ہے۔ اگر فوری طور پر ارتداد کے ذریعہ اسلام سے منحرف کر کے دائرۂ مسیحت میں شامل نہ کیا گیا اور اسلامی اکثریت سے مسیحی اکثریت میں نہ بدلا گیا تو بہت جلد اقصائے مشرق سے اٹھتے ہوئے کسی اسلامی انقلاب سے مشتعل ہو کر ان کے حلقۂ اقتدار سے نکلنے کی سعی کرے گا اور اپنے روایتی جوشِ جہاد سے گرما کر آمادۂ پیکار ہو جائے گا، اس وقت ولندیزی استعمار کو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا اور اس کا دبانا بھی ان کے لئے آزمائش طلب بن جائے گا۔ لہذا یہی وقت ہے کہ اس کی ہمہ گونہ پستیوں اور ہمہ قسم کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی جڑوں کو مضبوط کیا جائے اور اپنے کثیر التعداد مشن کی مساعی کے ذریعہ عیسائیت کی اکثریت میں تبدیل کر لیا جائے اور اگر اس مقصد کے حصول میں روپیہ بھی بے دریغ خرچ کرنا پڑے تو اس میں بھی تامل نہ کیا جائے، ورنہ پھر وہ دن دور نہیں کہ جب ولندیزی وقار ایک کمزور سے لفافہ کی طرح چاک ہو کر رہ جائے گا اور ہالینڈ کے تاجِ شاہی کو اس قیمتی اور دولتمند نو آبادی سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔ یہ تھا مبصرینِ ہالینڈ کا نظریہ۔ کس قدر ہولناک، کس قدر خطرناک اور کس قدر گندہ۔

اتفاق سے اس زمانہ میں ہالینڈ میں کیتھولک پارٹی برسرِ اقتدار تھی، اور مرکزی حکومت کا سارا اقتدار بھی اسی پارٹی کے ہاتھ میں تھا، پھر یہ پارٹی اپنی حیثیت میں بھی ایک ایسی پارٹی تھی کہ جس کا بنیادی مطمحِ نظر مسیحیت کی اشاعت اور زیادہ سے زیادہ لوٹ کھسوٹ کرنا تھا لہذا وہ اپنے مبصرین کی اس ہدایت کاری کے مطابق اقدام کرنے کے لئے

آمادہ ہوگئی اور بالآخر اپنی آخری بحث وتمحیص کے بعد اس نے سنہ ۱۹۱۰ء میں "ہاگ" (دارالحکومت ہالینڈ) سے یہ اعلان کر دیا کہ ہالینڈ کا تاجِ شاہی اندونیشیا کو مسیحیت میں شامل کرنے کے لئے اپنے مقدور بھر مشن کی مساعی کے ساتھ تعاون کرے گا اور نئے بننے والے عیسائیوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے گا۔

غرض ادھر ہالینڈ سے یہ اعلان جاری ہوا اور ادھر خستہ حالی سے تنگ آئے ہوئے اندونیشیا کا غیض وغضب بھڑک اٹھا، عوام جو کشمکشِ روزگار کے باعث اپنی تنگدستی سے مقابلہ آرا تھے اور اس مقابلہ آرائی میں دنیا بھر کے جھمیلے بھولے ہوئے تھے، اک دم چونک پڑے کیونکہ یہ مذہب کا معاملہ تھا اور مذہب کا جوش بھی عوام ہی میں زیادہ ہوتا ہے، اگرچہ اندونیشیا کے عوام اس وقت تک بے علم بھی تھے، مفلوک الحال بھی تھے، اور احساسِ فروتری کا شکار بھی تھے، مگر وہ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ ان سے اس تین سو سال کے طویل زمانہ میں سب کچھ چھینا جا چکا ہے، نہ دولت ہی اب ان کے پاس رہی، اور نہ وطن کی خود مختاری اور علم وفن، لے دے کے صرف "بین الجزائری" اتحاد کا ایک سہارا یعنی صرف "مذہبِ اسلام" باقی رہ گیا ہے سو وہ بھی اب سیاست کے دباؤ سے ڈھایا جا رہا ہے۔

چنانچہ وہ تمام صاحبِ نصاب اور صاحبِ علم جو حج اور تحصیل علم کی غرض سے نواحِ عرب اور اطرافِ مصر وشام جاکر وہاں سے لوٹ لوٹ کر واپس وطن کو آرہے تھے یا وطن ہی میں موجود تھے، اس واقعہ (نئے اعلان) سے اک دم غضبناک ہوگئے اور اِدھر اُدھر مسجدوں میں، یا خانقاہوں، یا مدرسوں اور مکتبوں میں جہاں جہاں بھی انھیں مسلمانوں کے اجتماع سے دوچار ہونے کا موقع ملتا عوام کو اس خطرہ

سیاسی سے آگاہ کرتے اور دبی دبی آواز میں اس کے عواقب کو بھی واضح کرتے۔ اس طرح حکومتِ وقت کی مذہبی پالیسی کا ایک نیا اعلان ایک غیر معمولی واقعہ اور اہم ترین حادثہ بن گیا، جس نے مصیبت اور دکھڑوں کی تکان سے غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو ایک نئے دور کا آغاز کرنے پر چونکا دیا ورنہ شاید اندونیشیا غفلت ہی میں سوتا رہتا اگرچہ حکومت اپنی اس تدبیر سے ان پر ہمیشہ ہمیشہ کی غلامی کا جال بچھا رہی تھی، اور اپنی سیادت کو مضبوط و مستحکم تر کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی مگر یہی چیز خوش قسمتی سے اہلِ اندونیشیا کے لئے ایک واقعۂ عظیم بنکر نشاۃِ ثانیہ کی رحمت بن گئی، اسی مذہبی جذبہ نے ان کو ایک مقام اور ایک پلیٹ فارم پر اکھٹا بھی کر دیا ورنہ اس کے علاوہ تنظیم کی ان کے لئے کوئی صورت اور دوسری تھی بھی نہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی جذبہ تھا جس نے تین سو چون سال پہلے بھی ایک مرتبہ انھیں نشاۃِ اولیٰ بخشی تھی۔ مگر جو کچھ کوششیں اس سلسلہ میں جاری تھیں وہ تمامتر زبانی باتوں یا یاددہانیوں، اور قیل وقال ہی پر مبنی تھیں، ٹھوس اور منظم نہ تھیں، اور ظاہر ہے کہ کوئی نتیجہ خیز کامیابی بغیر تنظیم اور ٹھوس کام کے بروئے کار نہیں آسکتی اور نہ سالہا سال کا منظم طور سے پیدا کیا ہوا جمود و قنوط ہی دور ہو سکتا ہے، کوئی تنظیم اور کوئی ٹھوس کام بغیر تعلیم کی اشاعت کے ذرا مشکل ہی سے کامیاب ہوتا ہے۔

چنانچہ اندونیشی قوم کے ایک مردِ ہوشیار "ڈاکٹر واحیدین"[1] نے جنھیں مدتوں

---

[1] ڈاکٹر واحیدین سُوڈِیرو ہوسوڈو: آپ اندونیشیا کی قومی بیداری اور تحریکِ آزادی کے سب سے پہلے علمبردار ہیں۔ ملک کی قومی سیاست میں نشاۃِ ثانیہ کا آغاز بھی آپ ہی نے کیا تھا، آپ ہی وہ سب سے پہلے شخص ہیں

ولندیزیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے باعث نفسیاتی طور پر مستقبل کے خطرات کا شدید احساس ہو چکا تھا، اور جو مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے علوم سے بھی بہرہ مند تھے۔ پھر فطری طور پر اعلیٰ قسم کے وقت شناس، اور دانا و فرزانہ بھی تھے احساس کیا کہ اگر اہلِ انڈونیشیا نے جلد از جلد جدید طریقۂ تعلیم سے استفادہ نہ کیا تو ان کا وجود بھی خطرہ میں پڑ جائے گا اور عام فقدانِ تعلیمِ عصر کے سبب وہ مغرب کی سیاست کے رُخ کو بھی پہچاننے کے قابل نہ بن سکیں گے۔ لہٰذا انھوں نے ۱۹۰۷ء میں تمام جاوا میں اپنی قوم کے عوام تک اپنے تعلیمی احساسات کو پہنچانے کی غرض سے ایک عام دورا

---

جنھوں نے انڈونیشیا کی سب سے پہلی تحریک "بودی اُدتومو" کی سرپرستی کی اور قوم میں برتری کا شعور پیدا کیا۔ آپ کی ولادت ۱۸۵۷ء میں شہر جوگ جکارتا سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر "گننگ میراپی" (کوہ میراپی) کے سرے پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں "ماتے" کے ایک رئیس اور ممتاز خاندان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی آپ نے اسی گاؤں کے ایک پرائمری مدرسہ میں حاصل کی، اور ثانوی تعلیم کی تکمیل کے لئے جوگ جکارتا گئے اور پھر میڈیکل کا نصاب "بٹاویہ" (موجودہ جکارتا) کے میڈیکل اسکول میں مکمل کیا اور ڈاکٹر کے لقب سے ملقب ہوئے۔ تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ آپ شروع ہی سے نہایت ذہین، طبع شگفتہ رو، شگفتہ مزاج، خوش کلام اور خوش مذاق تھے اور اپنی جماعت میں بھی اول رہتے تھے انڈونیشیا کی سیاسی تاریخ میں عہدِ ولندیزی کا یہ نہایت ہی تاریک دور تھا جبکہ انڈونیشیا کی ممتاز اور بہادر قوم ولندیزیوں کے تین سو سال کے مستقل جبر و تعدی کی وجہ سے افلاس و جہالت، بربادی اور ذلت کے انتہائی قعر میں جا پہنچی تھی، نہ تعلیم عام تھی، اور نہ مدارس برائے اہلِ ملک قایم تھے، یا تو صرف گرجا گھروں میں تعلیم ہوتی تھی اور یا پھر چند خاص خاص مدارس تھے جہاں داخلہ کا موقع بھی بمشکل ملتا تھا، صرف امرا و یا با رسوخ لوگ ہی اپنے بچوں کو وہاں پڑھوا سکتے تھے، چونکہ والدین بھی خوش قسمتی سے ممتاز گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا انھیں بھی سوئے اتفاق سے یہ موقع مل گیا ورنہ وہ بھی

بھی کیا اور جا بجا جلسوں کے انعقاد کے ذریعۂ لوگوں کو تحصیل علم کی طرف توجہ بھی دلائی عوام کے احساسِ فروتری کے خلاف بھی تقریریں کیں، اور جب لوٹ کر واپس بٹاویہ (جکارتا) آئے تو میڈیکل اسکول کے چند طلبار پر قومی تعلیم کی تحریک کو شروع کرنے پہ زور بھی دیا۔ ایک عرصہ تک تو یہ معاملہ اسی طرح گو مگو کے عالم میں پڑا رہا مگر بالآخر کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر موصوف کے احساسات سے متاثر ہو کر ایک جوشیلے اور ہوشیار قسم کے نوجوان طالبعلم "سوتومو" نے جو میڈیکل اسکول میں اپنی طبّاعی، ذہانت اور ہوشیاری کے باعث غیر معمولی وقار اور رہر دلعزیزی کا حامل تھا اپنے چند ساتھیوں کو

---

اپنے دیگر اہل وطن کی طرح جہالت کا شکار ہو کر ترقیات سے محروم رہ جاتے، پرائمری تعلیم ہی کے دوران میں ان کے ذہن میں یہ بات اتار دی گئی تھی کہ اگر انھوں نے تعلیم کے نتائج میں نمایاں اور ممتاز کامیابی حاصل نہ کی تو پھر چرچ اسکول میں ان کا داخلہ نہ ہوگا لہٰذا شب و روز ایک کر کے واحیدین نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے اور یورپینوں کے مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی داخلہ کے بعد امتیاز حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا حتیٰ کہ آخری امتحان میں سب سے ممتاز رہے، جس کے نتیجہ کے طور پر خود ولندیزی عمالان مدرسہ نے انھیں سرکاری میڈیکل اسکول میں داخل کروا دیا، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اہل اندونیشیا میں سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی اعلیٰ محنت اور کامیابی سے یورپین اسکول میں داخلہ لیا اور اس کے نتائج میں ایک شاندار ریکارڈ قایم کیا۔

طالبعلمی کے زمانہ ہی سے واحیدین کا دل اپنی قوم کی بدحالی اور بے علمی پر کڑھتا تھا، وہ ولندیزیوں کے برتے اور گرے ہوئے برتاؤ سے ہمیشہ دل ہی دل میں جلتے اور سوچتے رہتے تھے کہ جب تعلیم سے فارغ ہوں گے تو قوم کو سب سے پہلے حصولِ علم کی طرف رجوع کریں گے، اور گذر اوقات کے لئے طبابت کا آزاد پیشہ اختیار کر لیں گے۔ کیونکہ بغیر علم کے نہ کوئی قوم انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور نہ اپنا معیار بلند کر سکتی ہے، دُنیاوی اور اُخروی ساری ترقیاں علم و کمال

اکھٹا کر کے ملک کی سب سے پہلی انجمن "بُودِیْ اُدتُوْمُو" کا سنگِ بنیاد رکھ دیا اور اس طرح قوم میں "نشاۃِ ثانیہ" کا آغاز ہو گیا۔

اس تحریک کا مقصد صرف تعلیم پھیلانا اور تعلیم کے ذریعہ شعورِ عامہ کو بیدار کرنا تھا، سیاست یا اور کوئی دوسری شق اس کے مقاصد میں شامل نہیں تھی۔ اس لئے کہ سیاست کو مقصد بنانے میں حکومتِ وقت سے ٹکراؤ ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اس وقت حکومت سے ٹکراؤ لینا بالکل بے معنی اور فضول تھا اور مصلحت کے بھی خلاف تھا کیونکہ انکی قوم میں ابھی اس ٹکر کو جھیلنے کے لئے سکت نہ تھی، واجیدین اور رسو تومو دونوں ہی پر موقوف ہیں۔

غرض فارغ التحصیل ہونے کے بعد ڈاکٹر واجیدین نے سب سے پہلے تو اپنی گذر اوقات کا ذریعہ ڈھونڈا، یعنی طبابت کا نجی پیشہ اختیار کیا اور اعلیٰ سے اعلیٰ رسوخ حاصل کرنے کے لئے جس کی خدمت وطن کے لئے از حد ضرورت تھی، اپنی شب و روز کی پر اخلاص اور نمایاں کامیابی سے کوشش کی، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ملک کے ممتاز ترین ڈاکٹر شمار کئے جانے لگے حتیٰ کہ پھر یہ کیفیت ہو گئی کہ ان کے اہل وطن کے علاوہ خود بڑے بڑے ولندیزی عمال حکومت بھی خطرناک قسم کے امراض میں انہی سے رجوع کرنے لگے، جب انسان خدمتِ نوعِ انسانی اور خدمتِ اہلِ وطن کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے تو کارپردازانِ قضا و قدر بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اسے مقبولِ خاص و عام بنا دیتے ہیں، واجیدین کے دل میں درد تھا، سوز تھا، اہلِ وطن کو عروج پر پہنچانے کا احساس تھا لہٰذا وہ مقبول سے مقبول تر ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ پھر رسوخ اسقدر بڑھا کہ خود ولندیزی افسران بھی جو انڈونیشیوں کو اپنی رعایا سمجھنے کے باعث حقارت سے دیکھتے تھے، ان کی سفارشات ماننے لگے، اور ان کا احترام کرنے لگے، دعوتوں، مجلسوں اور سرکاری تقاریب میں ان کی شرکت اہم سمجھی جانے لگی، بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں ان کی شہرت اور قدر و عظمت کا یہ عالم تھا کہ کیا انڈونیشی اور کیا ولندیزی سب ہی ان کا

اس چیز کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جب قوم جدید طرزِ تعلیم سے آگاہ ہو جائے گی تو فریب سیاست فرنگ کو سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا چلا جائے گا اور پھر یہی احساس و شعور تنظیم کے اعلیٰ مراتب طے کر کے دردِ ملت کا درماں بن سکے گا۔ یعنی ولندیزیوں سے آزادی دلا سکے گا۔

## قومی پریس کا اجرا

یہ درحقیقت ایک نہایت ہی عاقلانہ کارگذاری تھی۔ جس نے اپنے تدریجی اثرات سے رفتہ رفتہ ساری قوم میں فہو المطلوب احساس پیدا کر دیا اور تنظیم کی طرف بھی عوام کو رجوع کر دیا۔ غرض سوتومو اور واحیدین دونوں اپنے جوشیلے کارکنوں کے ذریعہ اس تحریک کی اشاعت میں

---

نام ادب سے لیتے اور غائبانہ طور پر تعریفوں کا پل باندھ دیتے، اس بلندی اور کمال پر پہنچا ہوا صاحبِ رسوخ آدمی اپنے ذاتی نفع کے لئے اگر چاہتا تو کیا کچھ حاصل نہ کر لیتا مگر واحیدین نے یہ عظمت شب و روز کی کوشش سے محض قوم کی خدمت کے لئے راہیں نکالنے کے لئے حاصل کی تھی اس کے ذریعہ گھر بھرنا مقصود نہ تھا، بلکہ اپنے اہل وطن کے لئے بڑا کام انجام دینا مدِ نظر تھا، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ولندیزی گھرانوں کی عام رہائش اور ذہنیت کا مطالعہ کرنا اور اس مطالعہ کے ذریعہ سے اپنی قوم کے معیار کو اٹھانے کے لئے تدبیریں سوچنا تھا۔

بالآخر ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ولندیزی، افسروں سے ملاقاتیں کر کے دیہات سدھار اور ترقیاتِ تعلیم کے لئے باقاعدہ مدارس کے قیام کی سفارشیں کیں لیکن چونکہ یہ امر ولندیزیوں کی پالیسی کے خلاف تھا لہذا کوئی پذیرائی نہ ہوئی، اور واحیدین مایوس ہو گئے، چنانچہ آپ نے ایک رسالہ " ماٰلنا دُومیلہ " (اطلاعات) جاری کیا اور عوام کی حالت کا جائزہ لینے اور ان میں اس رسالہ کو تقسیم کرنے کے لئے اسی سال پورے جاوا کا سفر بھی کیا۔ ہر مقام پر چھوٹے چھوٹے جلسے کئے اور عوام کو مجتمع کر کے تعلیم کی اہمیت اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن سالہاسال کی تعدی کے باعث قوم میں احساسِ کمتری اس درجہ پیدا ہو چکا تھا کہ لوگوں نے واحیدین کی باتوں کو غور سے نہ سنا اور نہ ان کا خیر مقدم کیا

لگے رہے اور بستی بستی اسکا تشاغب کرتے رہے۔ بالآخر اسی زمانہ میں قومی تحریک کے کاموں کو زیادہ فروغ دینے کے لئے پریس کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ چنانچہ سب سے پہلے "الن دُوْ مِیڈ (اطلاعات) کے عنوان سے دیہات سدہار کے موضوع پر واحیدین نے ایک رسالہ شائع کیا اور تمام دیہاتوں میں اسے تقسیم کیا، تاکہ نفسیاتی حیثیت سے دیہات کے باشندوں اور ان کے استادوں پر اصلاح کی کارگذاریوں کا صحیح اور خوشگوار اثر منبطق کیا جا سکے پھر رفتہ رفتہ ماہانہ رسالے بھی شائع ہوتے چلے گئے۔ (جن کی تفصیلات آگے بیان کی جائیں گیں) اور اسی طرح دو سال کے مختصر سے عرصہ میں اس انجمن نے ترقی

---

افلاس اسقدر عام تھا کہ لوگ روزی کمانا تعلیم کی نسبت زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔

آخر الامر ۱۹۰۷ء کے اواخر میں رعکارتا، واپس لوٹ کر میڈیکل اسکول کے چند طلبار مثلاً سوتو موسوراجی، محمد صالح، اور سودارنو وغیرہ کو اکھٹا کر کے ایک کلب گھر قایم کرنے کی طرف توجہ دلائی، سوتومو، چونکہ سب سے زیادہ ہوشیار طالبعلم تھے لہذا انھوں نے اس کلب گھر کے قیام کا اقدام کیا اور اپنی مستندانہ درخواست سے ڈاکٹر موصوف ہی کو اسکا پہلا صدر منتخب کیا اور بودی اوتومو، (نئی علم کی روشنی) اس انجمن کا نام رکھا۔ یہ انجمن ۲۰ رمئی ۱۹۰۸ء کو (بقول کتاب بعنوان ڈاکٹر سوتومو صفحہ ۲۶۔ مطبوعہ جکارتا بزبان اندونیشی ۱۹۵۱ء) قایم کی گئی تھی موجودہ اندونیشیا کی تاریخ سیاست میں یہ سب سے پہلی انجمن تھی۔ اس کے مقاصد بھی اس وقت خصوصیت کے ساتھ یہ تھے مثلاً:۔

(۱) ملک سے جہالت کو دور کرنا۔ (۲) دیہاتیوں میں گورو دیسا" (دیہاتی استاد) کا انتظام کرنا۔ (۳) قدیم شکستہ مدارس کی مرمت کرانا۔ (۴) عورتوں کو تعلیم کی طرف رجوع کرنا۔ (۵) اعلیٰ اور ممتاز کامیابی حاصل کرنے والے ذہین طلبار کو یورپ اور دیگر ممالک کی اعلیٰ درسگاہوں میں مزید تعلیم کے لئے بھجوانا۔ (۶) مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر جلسے کر کے عوام کے خیالات میں تعلیمی رجحان پیدا کرنا۔ (۷) قومی خدمت کا احساس پیدا کرنا۔ اور (۸) عوام کے دل سے

کر کے اسقدر فروغ پالیا کہ آس پاس کے تمام مقامات میں اس کی کم و بیش چالیس شاخیں بھی کھل گیئں اور دس ہزار کے قریب امرا اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ اس کے رکن بھی بن گئے۔

**سنہ ۱۹۰۸ء کا اعلان**

بہر حال ابھی اس انجمن (بُودِیْ اُوتُومُو) کو قایم ہوئے کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ پھر دوسری بار سنہ ۱۹۰۸ء میں ہالینڈ کے تاج شاہی نے اپنے سنہ ۱۹۰۱ء والے اعلان (تبلیغ و اشاعتِ مسیحیت) کا اعادہ کیا اور اپنے مشن کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ معاونت کرنے کا وعدہ بھی کیا بلکہ عملی طور پر شدید قسم کے

احساسِ کمتری اور فرو تری کو دور کرنا۔

چنانچہ پہلی بار اس انجمن کا عام جلسہ ۵ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ء کو "ماترم" کے مقام پر منعقد کیا اور اس جلسہ میں عوام سے رکنیت اختیار کرنے کی اپیل کی نیز جا بجا دیہاتوں میں اس کی شاخیں کھولنے پر بھی زور دیا۔

غرض ڈاکٹر موصوف کی شب و روز کی محنت سے نوجوان طبقہ اک دم پستی سے ابھر آیا ہر شخص اپنی قوم کی کمزوریوں کو محسوس کرنے لگا، حصولِ تعلیم کی طرف سب کی توجہ منعطف ہو گئی اور ہر چھوٹا بڑا اپنے قومی مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھنے لگا اور مغربی انداز کے مدرسے بھی کھولے جانے لگے۔

چونکہ قوم مفلس تھی اس لئے آپ نے چندا کرنا تو فی الحال موقوف کر دیا اور گھوڑدوڑ اور لاٹری سسٹم کا طریقہ جاری کیا اسی طرح جا بجا گانے بجانے کے تفریحی پروگرام بھی شروع کئے۔ مگر ولندیزیوں نے اجازت نہ دے کر کامیاب نہ ہونے دیا بالآخر "یاکو عالم" اور اس کے دو مشیروں کے ذریعہ خفیہ طریقہ سے آپ روپیہ جمع کرتے رہے اور قومی کام نکالتے رہے سنہ ۱۹۱۳ء میں ولندیزیوں کی قانونی بندشوں کے باعث "بودی اوتومو" کمزور پڑ گئی تو آپ نے پھر دوسری تحریک "دَرمادارا" کے عنوان سے جاری کی اور ایک رسالہ بھی "پرخندرا" کے عنوان سے شایع کیا۔

اقدامات بھی شروع کردیئے ۔ لہذا مذہبی طبقہ کے لوگ بھی اب کھلّم کھلّا اپنے مذہب کی مدافعت کے جوش میں میدانِ عمل میں نکل آئے ۔

## مذہبی تحریکات کا آغاز

اور سولو (سُراکرتا) کے مقام پر ایک مشہور سوداگر "حاجی ثمن ہودی" نے ۱۹۱۱ء میں "شارکیت دگنگ اسلام" (انجمنِ سوداگرانِ اسلام) قایم کی ، جسکا بنیادی نصب العین حفاظتِ دین تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ عام تجارتی اور اقتصادی گراوٹ کو بھی دور کرنا تھا ۔ کیونکہ اس وقت تجارت کی عام کیفیت یہ تھی کہ درآمدی اور برآمدی تجارت پر تو اہلِ ہالینڈ چھائے ہوئے تھے ۔

---

اور اپنے قومی مشن کو برابر جاری رکھا حتیٰ کہ ۱۹۱۵ء میں مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر اندونیشی ، 'واحیدین' کو اپنا رہنما تصور کرتا تھا ، ادھر واحیدین کی بھی یہ حالت تھی کہ ساری عمر اپنی قوم کو پستی سے نکال کر بلندی پر لیجانے میں صرف کردی ، یہاں تک کہ شب و روز کے کام کی وجہ سے پھر صحت بھی بگڑ گئی ۔ بالآخر ۲۶ مئی ۱۹۱۷ء کو ' جوگ جکارتا ' کے مقام پر اس دارفانی کو الوداع کہہ گئے ساری قوم ان کی جدائی پر سوگوار تھی ، کیا محکوم اور کیا حکمراں سب ہی اس ہیرو کے رنج میں ماتم کناں تھے ، مخلص ، سچے اور باکمال لوگ اسی طرح اپنے پیچھے رلانے والی یاد چھوڑ جاتے ہیں ، اور اپنے شاندار کارناموں کے باعث لافانی ہو جاتے ہیں ۔ ان کی موت کے بعد بھی قوم ان سے اسی طرح مستفیض ہوتی رہتی ہے ۔ اگرچہ واحیدین نے اپنی قوم کی خدمت کے لئے سب کچھ تج دیا تھا ، نہ کوئی ذاتی منافع حاصل کیا اور نہ کوئی بلند منصب پایا مگر قوم کو آزادی کی راہ دکھا گئے ۔ چنانچہ آج کا آزاد اندونیشیا اس مردِ بزرگ کو خراجِ تحسین ادا کرتا ہے ، قوم اس کے نام پر مرتی ہے ۔

ایک اندونیشی مصنف نے لکھا ہے کہ باوجود اس قدر ممتاز ، قابل اور مشہور ترین انسان ہونے کے ڈاکٹر واحیدین ، میں ذرہ برابر غرور نہ تھا ، بڑے سچے مسلمان تھے ، قوم کے غم میں ہروقت ڈوبے رہتے تھے ۔ جب کسی سے ملتے تو نہایت ہی خنداں پیشانی اور انکسار کے ساتھ بات کرتے ، کبھی یہ نہ سمجھتے کہ میں بڑا ہوں اور یہ چھوٹا ہے بلکہ وہ ہر نوجوان کو اپنے

اور ملک کی قدیم تجارت میں باٹک کے کاروبار کو چینی باشندوں نے خراب کر دیا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ ملک کا معمولی سا ذریعۂ گذر اوقات بھی قریب قریب ختم سا ہو چلا تھا جس سے مقامی صناعوں میں بھی بدحالی پیدا ہو گئی۔

غرض آس پاس کے مقامات پر جلسے بھی کئے گئے اور جلوس بھی نکالے گئے۔ یہانتک کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک کے بھی کافی لوگ طرفدار ہو گئے مگر یہ سب کچھ محض جاوا میں ہو رہا تھا جہاں کہ نوّے فیصدی سے زیادہ آبادی اہلِ اسلام تھی۔ قریب کے ہندو آبادی والے مرکز یعنی جزیرۂ بالی میں بھی جب مشن نے اپنا عمل شروع کیا

---

سے بڑا سمجھتے اور یہ کہا کرتے کہ تم کل کے اندونیشیا کی امید ہو اور واجب الاحترام ہو۔

## ڈاکٹر ریڈن سوتومو

ڈاکٹر واحیدین کے دستِ راست اور پہلی قومی تحریک بودی اوتومو، کے بانی مبانی ہیں۔ آپ بھی (جدید) اندونیشیا کی نشاۃِ ثانیہ میں ایک جلیل القدر رہنما گذرے ہیں۔ ضلع نگنجُک کے ایک نہایت ہی چھوٹے اور غیر معروف سے گاؤں "نگویا"، کے مقام پر ۳۰ رجولائی ۱۸۸۸ء کو اپنے مشہور باپ اور گاؤں کے ممتاز ترین شخص "ریڈن سواجی"، کے گھر پیدا ہوئے اور اپنے والدین کی تمام اولادوں میں سب سے بڑے تھے، گھر کا ماحول نہایت ہی شاندار، شائستہ، علمی ادبی اور مذہبی تھا۔ ریڈن سواجی، (ڈاکٹر موصوف کے باپ) پکے دیندار، مسلمان دوست اور خلیق شخص تھے اس لئے 'سوتومو، کی تربیت کی طرف بھی خاص توجہ دیتے تھے، چونکہ گاؤں بہت چھوٹا تھا اور تعلیم کے ذرائع بہت محدود تھے لہذا 'سواجی، نے اپنے بیٹے کو دور کے ایک گاؤں 'نگیپی، میں اپنے سسرال بھجوا دیا، چنانچہ 'سوتومو، نے قرآن مجید اور دیگر ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد ثانوی تعلیم کے لئے 'دی پولو' بھیجدئے گئے، وہیں ولندیزی زبان بھی سیکھی، پھر جکارتا کے میڈیکل اسکول میں میڈیکل کی تکمیل کی۔

ابھی طالبعلم ہی تھے کہ ملک کے ممتاز ڈاکٹر واحیدین سے ان کی ملاقات ہو گئی۔

تو وہاں بھی اسی قسم کا ردِ عمل شروع ہو گیا۔ چنانچہ "بُودِی اُوتُومو" کے قیام کے زمانہ ہی میں یعنی ۱۹۰۸ء میں اس جزیرہ کے ہندو باشندے بھی اپنی مذہبی تحریک میں لگ گئے لیکن نہ اب ان کی کسی دوسری جگہ کوئی خاص تعداد تھی اور نہ مذہبی مساوات کا کوئی شائبہ ہی باقی رہا تھا لہٰذا ان کی تحریک صرف علمی تحریک ہو کر رہ گئی یعنی یہ کہ قدیم ہندوانی عہد کے تمام قلمی نسخے شائع کرنا اور ان کو محفوظ کر کے اپنی مذہبی روایت کو برقرار رکھنا وغیرہ تاکہ ہندو عوام ولندیزی مشن کی سیاسی مذہبیت سے باخبر ہو جائیں اور اپنے قدیم کلچر پر پابند رہیں چنانچہ اس غرض کے پورا کرنے کے سلسلہ میں انھوں نے ایک

---

واحیدین جیسا کہ لکھا جا چکا ہے تعلیم کے ذریعہ ملک اور قوم میں انقلاب لانا چاہتے تھے لہٰذا مدت سے اس بات کے خواہشمند تھے کہ چند قوم کے نوجوان اگر انھیں میسر آ جائیں تو وہ قومی تعلیم کی تحریک کا آغاز کریں، سوتومو، اور ان کے چند رفقاء میں یہ انھیں آثار نظر آئے چنانچہ وقتاً فوقتاً اپنی ملاقاتوں میں وہ ان نوجوان طلباء پر قومی تعلیم کے احیاء اور عام اشاعت علم کی ضرورتوں پر زور دیتے رہتے تھے جسکا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ایک روز یعنی ۲۰ مئی ۱۹۰۸ء کو سوتومو نے 'بودی اوتومو' کے عنوان سے قومی بیداری کی سب سے پہلی تحریک کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔
اور ڈاکٹر موصوف ہی کو اسکا سب سے پہلا صدر بنایا اور خود معتمد علیہ ہو گئے، نہایت جوشیلے اول درجہ کے قوم پسند اور اسلام کی روایاتِ دیرینہ کے بڑے حامی تھے لہٰذا ڈاکٹر موصوف کے ساتھ مل کر 'بودی اوتومو' کی کامیابی پر وقف ہو گئے اور شب و روز نہایت ہی والہانہ انداز میں اس کے لئے کام کرنے لگے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے ۲۳ سال تھی چونکہ تحریک سیاسی نہ تھی لہٰذا حکومت (ولندیزی سامراج) نے بھی شروع میں اس کو درخورِ اعتنا نہ جانا، کام جوش کے ساتھ ہوتا رہا۔ چونکہ ولندیزیوں میں ڈاکٹر واحیدین کا بڑا اثر و رسوخ تھا لہٰذا ان کی مساعی سے 'سوتومو' کو بھی سرکاری ہسپتال میں ملازمت کا موقع مل گیا، پہلے وہ طوبان میں پھر لبُوک پین میں معمولی قسم کے ڈاکٹر کے طور پر کام کرتے رہے چونکہ ڈاکٹر کو مریضوں کے دیکھنے کے

خاص تحریک شروع کی جسکا نام "بالی پُستکا" رکھا۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ہی پھر اس تحریک کو ولندیزیوں نے اپنا ایک دوسرا اور سیاسی اشغلہ چلنے کے لئے اور مسلمان عوام میں لادینی پیدا کرنے کے لئے خود اپنی سرپرستی میں لے لیا اور جابجا مقامات پر اسکی شاخیں بھی کھلوادیں۔

بہرحال اوبہرجاوا میں "شارِیکت دگنگ اسلام" کی کارفرمائیاں برابر جاری تھیں، کہ ۱۹۱۲ء میں تین بڑے اور گرم جوش ارکان کا ایک وفد اس کے نشاغیب عمومی کے لئے مشہور تجارتی شہر "سُرابایا" میں بھی وارد ہوا۔ جو تجارتی مرکز ہونے کے علاوہ قدیم علم وفن کا بھی بڑا مرکز تھا، اور مذہبی شعور و احساس کے لئے بھی خاصی شہرت رکھتا تھا،

---

سلسلہ میں عوام کے ساتھ زیادہ واسطہ رہتا ہے لہٰذا سوتومو، فرصت کے اوقات میں اپنی اسی انجمن کی اشاعت کرتے رہتے اور قومی بیداری کے خیالات لوگوں میں پھیلاتے رہتے۔ اس طرح کچھ ہی عرصہ میں ان مقامات پر بھی بودی اوتومو، کی رکنیت کافی ہوگئی، پھر ۱۹۱۷ء میں جب وہ "بلورا" کے ہسپتال میں پہنچے تو قوم کا ایک نہایت ہردلعزیز اور اہم ترین فرد شمار کئے جاتے تھے، ولندیزی حلقہ میں بھی ان کی بڑی وقعت تھی، بالآخر ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے یوروپ (ہالینڈ) گئے گویا یہ سب سے پہلے اندونیشی طالبعلم تھے جو یوروپ (ہالینڈ) پہنچے اور ۱۹۲۳ء تک میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے رہے، پھر ڈاکٹر آف میڈیسن کی سند لے کر وطن کو لوٹ آئے۔

سوتومو، دراصل بہت ہی بلند قسم کے انقلابی انسان تھے ولایت جانے سے قبل بھی انھوں نے ملک میں بڑے بڑے کام کئے تھے، ۱۹۲۰ء میں سرابایا کے مقام پر اسٹیڈی کلب" یعنی دارالمطالعہ کھولا جو سب سے پہلی قومی لائبریری کی حیثیت رکھتا تھا اور جو ۱۹۳۰ء میں "پرساتوان بنگ سا اندونیشیا" (یعنی تحریکِ قومیت اندونیشیا) کے قالب میں ڈھل گیا اور اسی نام سے موسوم ہوا، اور خود ہی اس کے پہلے صدر بھی چنے گئے، اس تحریک کا پروگرام عوام میں عام قومی احساس اور قومی برتری کا نظریہ پھیلانا تھا چنانچہ وفورِ جوش میں آنکر اب آپنے ولندیزیوں کو برملا کہنا شروع کردیا۔ اور قوم و مذہب کا خطرہ میں پڑنا، معاشی گراوٹ، اور اقتصادی کمزوری کی عام

اور آیندہ کے بننے والے عظیم ترین رہنما اور مشہور صحافی " حاجی عمر سعید چکرو آمنوتو" کا دارالقیام بھی تھا کیونکہ حاجی موصوف اس وقت اسی شہر کے ایک شکر کے کارخانہ میں ملازم تھے اور دفع الوقتی کے طور پر ولندیزی اخباروں کی نامہ نگاری کا کام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ یہ وفد ان سے ملا ان پر قوم کی فوری ضروریات اور اس انجمن کی اہمیت پر تبادلِ خیال ہوا۔ آخر حاجی موصوف ان کے ہم خیال ہوگئے اور سُرابایا میں قائم کی جانے والی شاخ کے صدر بھی منتخب ہو گئے، ان کا اس انجمن میں شامل ہونا تھا کہ اک دم اس کو فروغ ہوتا چلا گیا۔

---

کیفیت بھی واضح کرنی شروع کر دی لہذا ولندیزی حکومت نے اسی سال آپ کو محبوس کر دیا اور بڑی بڑی سزائیں دیں، قوم کے دیوانے، اور شمع ہدایت کے پروانے حق و انصاف کے مقابلہ میں ظالم اور صاحبِ استبداد لوگوں کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ جوش وخروش میں آکر طوافِ عمل کرتے ہوئے پروانہ کی طرح قوم کی شمع پر نثار ہو جاتے ہیں اور محبت کی آگ سے متنور ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چمک جاتے ہیں۔ وفاداری اور ایثار، محبت اور اخلاص کی یادگار دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں، آنے والی نسلیں اسی یادگار سے زندگی پاتی ہیں۔ اور زندگی کے خطرناک موڑ پر واقعات و حوادث کی ٹکر سے سنبھل جاتی ہیں، سوتوموبھی شمع ملّی کے ایک ایسے ہی پروانے تھے قوم کو روشن کرنے کے خاطر ہر وقت ظلم واستبداد کی آگ میں کودنے کو تیار رہتے تھے، مسلمان کے لئے یہی ایک بڑی ابراہیمی سنت ہے، بہرکیف جب جیل سے رہائی ہوئی تو آپ نے قومی معاشیات کو درست کرنے کی طرف توجہ دی اور مشہور تجارتی مرکز "سرابایا" کے مقام پر سب سے پہلا قومی بینک " بینک نیشنل اندونیشیا" کے عنوان سے جاری کیا اور اس طرح اپنی قوم کے لئے تجارت کی بہبودی کی شاہراہ کھولدی اور بڑھتی ہوئی ضرورتو کے ماتحت ۱۹۳۵ء میں (بودی اوتوموا اور پرساتوان بنگ سا اندونیشیا کو یک کرکے "پیرٹا اندونیشیا رایا" (پرندرا) کی تاسیس کی، کام تا ہنوز نامکمل تھا کہ اک دم فرشتۂ موت نے

## سب سے پہلا قومی اخبار

کیونکہ عمر سعید اعلیٰ قسم کے مدبّر، بلند پایہ مقرر اور بہترین قسم کے اہلِ قلم تھے۔ انھوں نے اسی سال اپنی قوم کا سب سے پہلا اخبار بھی "سُرُوْتُوسُو" کے عنوان سے اپنی ہی ادارت میں جاری کیا جس میں اسلام کے مختلف موضوعات پر شاندار قسم کے مقالے چھپتے تھے اور قوم کو آنے والے خطرات سے بھی باخبر کیا جاتا تھا، حکومتِ وقت پر بھی دبی دبی آواز میں باندازِ اصلاح خوردہ گیری کی جاتی تھی۔ مگر یہ اخبار کچھ ہی عرصہ چل سکا۔ کیونکہ اگست ۱۹۱۲ء کو انجمن کے ساتھ ساتھ یہ بھی خلافِ قانون قرار دیدیا گیا۔

---

ھ آدبایا اور اس طرح آپ ۱۹۳۶ء میں خدا کے پیارے ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق"

## کیائی حاجی احمد دہلانؒ

اندونیشیا کے تعلیمی رہنما اسلام کے بڑے خادم اور اندونیشی قومی انقلاب کے نہایت ہی محترم اور بزرگ زعیم عالم دین، صوفی منش اور باثر سیاسی رہنما اور ملک کی سب سے بڑی تعلیمی، مذہبی اور ثقافتی تحریک "محمدیہ" کے بانی گذرے ہیں، خاندانی ثروت اور روایات کی حیثیت سے بھی بڑے ممتاز تھے، آپ کے مورثینِ اعلیٰ قدیم سلاطینِ جکارتا کے عہد سے مذہبی علما اور مبلغین چلے آتے تھے چنانچہ آپ کو بھی یہ اوصاف بزرگوں سے ورثہ میں ملے۔

آپ کی ولادت ۱۸۶۹ء میں شہر جکارتا کے حوالی میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی جہاں آپ کا خاندان دیہاتی امارت پر فائز تھا۔ بچپن میں آپ کا نام محمد درویش (یعنی محمد درویش) رکھا گیا مگر عہدِ شباب میں تحصیلِ علم کرنے کے بعد بقصدِ تکمیلِ علوم دینیہ اور بعزم زیارتِ بیت اللہ آپ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو جاوائی رسم اور روایت کے مطابق حج کرنے کے بعد آپ کا نام بھی اصلی نام سے بدل کر حاجی احمد دہلان، ہوگیا اور چونکہ کیائی قدیم عہد سلاطین سے خاندانی امتیاز تھا لہٰذا آپ "کیائی حاجی احمد دہلان" کے نام سے مشہور ہوئے، اور ملک

## سب سے پہلی خالص مسلم تحریک کا آغاز

اس طرح "شاریکت دگنگ اسلام" کے ختم کیے جانے کے بعد ستمبر ۱۹۱۲ء کو حاجی موصوف نے پھر دوبارہ اس کے بنیادی اصول پر نظر ثانی کی اور جدہ کے ولندیزی قونصل خانہ سے لوٹ کر وطن کو آئے ہوئے نوجوان عالم، حاجی آگوس سلیم، کی معیت میں اسکا نام بدل کر "شاریکت اسلام" کے عنوان سے دوبارہ اس کی تجدید کی۔ اور ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو سُرابایا کے مقام پر ایک عظیم کانفرنس کا انعقاد کر کے عوام سے اس میں شرکت کی اپیل کی۔ اور اپنا ایک

---

کی قومی تاریخ میں اب تک آپ اسی نام سے مشہور رہیں۔

حاجی صاحب موصوف نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے "پسنترانْ" ہی میں حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے مکہ مکرمہ گئے۔ جو اس زمانہ میں سلاطینِ عثمانیہ ترکیہ، کی فیاضیوں کے باعث اسلام کے مذہبی علوم کا بڑا مرکز تھا، اور جہاں بڑے بڑے علمائے متبحّرین حرم میں درس دیتے تھے، چنانچہ حاجی صاحب موصوف بھی اس مدرسہ میں جاکر داخل ہو گئے اور چند سال کے مسلسل قیام میں عربی زبان، عربی ادب، فلسفہ، فقہ، منطق، تصوف، تاریخ، حدیث اور علم القرآن کی تکمیل کرتے رہے، قدرت نے سوز و گدازِ قلبی کے علاوہ دماغ بھی بڑا اعلیٰ قسم کا عطا فرمایا تھا چنانچہ بہت جلد عالم و فاضل ہو گئے اور حرم کے علمائے کبار سے سند حاصل کر کے اپنے وطن کو چلے آئے۔ واقعہ نگاروں کا بیان ہے کہ حاجی احمد دہلان اس وقت اپنے ملک کے سب سے بڑے عالم تھے۔

عالم بڑا ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ سب سے بڑا انسانی شرف قوم، وطن، مذہب اور علم کا سچا خدمت گذار ہونا ہے بڑے ہو کر بھی جو دین اور قوم کے کام نہیں آتے ان کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہے، سچی بڑائی سچی خدمت گذاری میں پنہاں ہے، احمد دہلان، انڈونیشیا کے سچے خدمت گذار تھے، انھوں نے وطن میں لوٹ کر اپنی بڑائی سے

نیا اخبار بھی "اُوتوسان ہِندِیا" (سفیرِ اندونیشیا) کے نام سے جاری کیا۔ جس کا نصب العین محض قومی بیداری اور مذہبی تحفظ تھا۔

## شہر باندُونگ میں اندونیشی قومیت کی پہلی تحریک

اسی دوران میں شہر باندونگ میں جو ثانوی تعلیم کا بڑا مرکز تھا اور جہاں مغربی تعلیم کے واقفین بھی زیادہ رہتے تھے اور جن میں اکثر لوگ عیسائی تھے، اشتراکیت اسلام سے متاثر ہو کر ایک ایسی تحریک کی اساس قایم کرنے پر غور کرنے لگے کہ جو مذہبی نہ ہو مگر سیاسی ہو اور اس میں دوسری ملت

---

دل خوش نہیں کیا، اپنے گھر بار کو نہیں بھرا، کوئی بڑا منصب حاصل کر کے دولت کا انبار نہیں لگایا بلکہ ہر ہر لمحہ وقفِ قوم ہو کر اپنی خدمت گذاری سے اپنے اہل وطن کو سروری اور سرداری کے دروازہ پر کھڑا کر دیا یہی دراصل بڑوں کی بڑائی کا کام ہے۔

غرض حاجی احمد دہالان وطن میں آئے اور کچھ عرصہ تک والد مرحوم کی جگہ منصب خطابت پر فائز رہے پھر ایک مدرسہ کھول کر بیٹھ گئے، اعلیٰ قسم کے مقرر تھے، خدا نے زبان میں زور اور بیان میں اثر رکھا تھا لہذا بہت جلد مقبول خاص و عام ہو گئے، مدرسہ بھی آپکی غیر معمولی توجہ سے بہت زیادہ وقیع اور نام آور ہو گیا حتیٰ کہ دور و دراز کے جزائر سے بھی تشنہ کامانِ علم آن آنکر آپ کے اس سرچشمہ پر سیراب ہونے لگے، مدرسہ کی کیفیت یہ تھی کہ طلبار کو پڑھایا بھی جاتا تھا اور ان کو ضروریات تعلیم کی چیزیں بھی مفت بہم پہنچائی جاتی تھیں کچھ زمانہ تک تو خود ہی مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے مگر جب کام بڑھنے لگا تو یہ کچھ علمائے عرب کو بلالیا اور کچھ اپنے شاگردوں ہی میں سے انتخاب کر کے ممتاز طلبار کو خدمات پر مامور کر دیا اور مصارف اٹھانے کے لئے اپنی ذاتی تجارت شروع کر دی، اور جکارتا میں ایک اعلیٰ قسم کی فرم کھول کر تاجر بن گئے، پھر رفتہ رفتہ اس کی شاخیں سرابایا، میڈان، اور دیگر مقامات پر بھی قایم کر دیں اس طرح آزاد پیشہ اختیار کرنے کے بعد اب اپنا بیشتر

کے لوگ بھی شامل ہوکر قومی آواز بلند کرسکیں، چنانچہ ایک مشہور عیسائی رہنما ڈاکٹر ڈاؤس ڈیکر (جو بعد میں اسلام لاکر "سیتیا بودی" کے نام سے مشہور ہوئے) نے اپنے چند احباب مثلاً ڈاکٹر چیپٹو منگن کوسومو، اور سوواردی سوریانگرت (جو بعد میں مسلمان ہوکر "کی حجر دیونتارا کہلائے") کے اتحاد سے (indische Partiji) (انڈیز پارٹی) کے نام سے ایک خالص سیاسی اور عام قومی انجمن قائم کی، ورنہ مدت سے آدمیوں کو اس کا رکن بنایا اس طرح بیداری کی آواز مذہبی تحفظ کے عنوان سے شروع ہوکر اب رفتہ رفتہ ملک کے مطالبۂ اصلاح اور حصولِ مراعات کی طرف منجر ہوگئی اور ۱۹۱۳ء میں اس

---

وقت قوم کی تعلیمات پر لگادیا۔ طبیعت میں چونکہ انقلاب پیدائشی طور پر موجود تھا لہذا تجارت کی غرض سے جہاں بھی جاتے عوام میں انقلاب پیدا کر دیتے۔ اس طرح اک مدت تک عمل کرتے رہے، ادھر مدرسہ بھی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔

دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو دولتمند ہونے کے ساتھ ساتھ بے پایان علم بھی رکھتے ہوں اور پھر صحیح معنی میں سچے قسم کے خدمتگذار بھی ہوں، اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ دولتمند ہوتے ہیں لیکن دل کے بڑے خسیس اور طبیعت کے بڑے سخت ہوتے ہیں، منافع خوری کی عادتوں کے باعث زمانہ ساز، فریبی اور خود غرض بن جاتے ہیں، عالم ہوتے ہیں لیکن غرورِ علم کے باعث عوام کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتے، اور نہ علم ہی ان کی بدولت صحیح مقام پاتا ہے، اول درجہ کے ڈرپوک کم ہمت اور لالچی ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے نظر تنگ اور خیال محدود ہوجاتا ہے، چنانچہ پھر قوم میں ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہوجاتا ہے۔

لیکن احمد دہلان ان سب معائب سے بالا تھے بلکہ وہ اپنی قوم کے لئے ایک نمونہ تھے، علم حاصل کیا تو قوم کو عالم بنادیا، دولت کمائی تو صرفِ وطن کردی، شہرت پائی تو ملک کے نام پر چار چاند لگادئے چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ان کا مدرسہ اندونیشیا کی سب سے بڑی درسگاہ تھی، ہزارہا مسلمان کمالِ علم وفضل سے متصف ہوکر خدمتِ وطن کے لئے پورے

جماعت نے بھی کافی عروج حاصل کرلیا۔ یہاں تک کہ پھر ولندیزیوں نے اس کو بھی خلاف قانون قرار دے کر ختم کر دیا۔ مگر جوشش کافی پھیل چکا تھا اور عوام اپنی بیداری کے مقصد کو اچھی طرح جان چکے تھے لہذا اس سال انھوں نے پھر اس کی تجدید کی اور ذرا کچھ ہلکے اشتداد کے ساتھ اسے (Partiji Insulinde) کے ایک دوسرے نام سے موسوم کیا جو آگے چل کر (Nasional Indische Partiji) این۔آئی۔پی (N.I.P.) کہلائی جانے لگی۔

## شارِیکت اسلام کا سیاسی نصبُ العین

اس امتداد میں شاریکت چار دانگِ ملک میں چلے گئے۔ اور جگہ جگہ انھوں نے اسی نمونہ پر اپنے مدارس کھول دئے۔ ایک جاہل رکھی ہوئی قوم کچھ ہی عرصہ میں عالم بن گئی اور انقلاب وطن کو سمجھنے کی اہل ہو گئی

چنانچہ اس کے بعد حاجی صاحب موصوف نے قوم کے فطرات، صدقات اور ذکوٰۃ کے صحیح طور پر وصول کرنے اور انھیں تعلیم اور دیگر قومی ضروریات پر خرچ کرنے کے لئے "محمدیہ" کے نام سے ایک بڑی انجمن قایم کی اور جگہ جگہ پھر کر مسلمانوں کی توجہ کو اس کی اہمیت کی طرف متعطف کر دیا، اس طرح تھوڑے ہی زمانہ میں ایک رقم خطیر جمع ہوگئی، جدید تعلیم کے مدارس بھی اس انجمن کے ماتحت کھولے جانے لگے، ٹریننگ اسکول بھی قایم ہوگئے، قومی رضاکاروں کی تربیت کا بھی بندوبست کیا گیا اس طرح پوری قوم جدید و قدیم ہر طرز کی ایک زندہ تحریک سے ہم کنار ہوگئی اور سرعت کے ساتھ منزلِ ترقی کی طرف گامزن ہونے لگی، ولندیزی حکومت بھی اب اس تحریک کو اپنے مقاصد کے خلاف سمجھکر شبہات کی نگاہ سے دیکھنے لگی مگر حاجی دہالان کے قبول عام کے پیش نظر ساکت و صامت تھے بلکہ حیران تھی بالآخر انھوں نے اپنے ہرزہ سرا لوگ جمع کئے جو حاجی دہالان کے خلاف اُٹھتے بیٹھتے پروپیگنڈہ کرتے پھرتے تھے بلکہ بعض بعض دفعہ انھیں تہدید آمیز خطوط بھی بھیجتے تھے، اور قتل کی دھمکیاں بھی دیتے تھے، طرح طرح کے انہام بھی

اسلام بھی عنفوانِ شباب کی منزلوں سے گذر کر ایک زبردست تشاغُب، ایک عظیم بیداری، اور ایک شاندار قومی تمدن کی تعمیر میں مصروفِ کار تھی، ۱۹۱۲ء کی سُرابایا والی کانفرنس ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ حکومت نے اس کے جوشیلے صدر، حاجی عمر سعید کو سیاسی نظریہ اختیار کرنے کے باعث گرفتار کر لیا اور نظر بند کر دیا۔ اور اسی طرح انکے اخبار اوتوسان ہندیا، کو بھی ختم کر دیا۔ جب حاجی عمر سعید جیل چلے گئے تو حاجی آگوس سلیم جن کی عمر اس وقت تقریباً ۲۹ سال تھی اور جو مختلف زبانوں کے بھی بڑے ماہر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ عالم اور خوش بیان مقرر بھی تھے ان کی قایم مقامی کے لئے میدان میں نکل آئے اور درشاریکت اسلام، کے خود مختار رہنما بن گئے، انھوں نے بھی حاجی عمر سعید

---

ان کے خلاف تراشے جاتے تھے، مگر حاجی دہالان جن کے دل میں اپنی قوم کو بلند دیکھنے کا صحیح احساس، اور خدمتِ وطن کا بے پناہ جذبہ تھا اپنی دُھن کو نہ چھوڑا، بلکہ زندگی کے کسی وقت بھی اچانک طور پر ختم ہو جانے کے احساس نے اپنے عمل کو اور بھی زیادہ شدید کر دیا اور اب رات اور دن کام میں لگے رہنے لگے جس کے باعث صحت بہت جلد بگڑ گئی۔ مگر ملک کے ہر بڑے ضلع اور شہر میں محمدیہ کے مدرسے اور ہائی اسکول اسقدر کھلوا دئیے کہ اب ان کی قوم تعلیم کی اس قلت کی تلافی کرنے کے قابل ہو گئی جو ولندیزیوں نے عمداً پیدا کر دی تھی، اور ہر طرف جدید انڈونیشیا کے معمار کثرت کے ساتھ دکھائی دینے لگے، یہ دراصل حاجی احمد دہالان کا وہ بڑا قومی احسان تھا کہ جس کے بارگراں سے ان کی قوم کی گردن ہمیشہ جھکی رہے گی:-

غرض ۲۳ر فروری ۱۹۲۳ء کو داغِ مفارقت دے کر: اسلامی ہیرو جنت الفردوس میں جا پہنچا، آج تک انڈونیشیا کی قوم اس کے مبارک نام پر عقیدت کے پھول برساتی ہے۔

کی عدم موجودگی میں اس مذہبی تحریک پر جواب خالصتاً اسلامی سیاست کی علمبردار بن چکی تھی غیر معمولی اثر ڈالا۔ اور اس اثر کو زیادہ سے زیادہ استوار کرنے کے لئے ایک اخبار بھی بٹاویا سیتی نیوز بلیڈ، (بٹاویہ کی خبریں) کے عنوان سے جاری کیا۔

## مدرسہ محمدیہ کی تاسیس

ادہر دوسری طرف ملک کے مشہور عالم، حاجی احمد دہلان نے جکارتا کے قریب مذہبی تعلیم کا ایک بڑا مدرسہ (۱۹۱۲ء) قایم کر کے تعلیمی انقلاب کی تاسیس کی اور اپنے ہزارہا فارغ التحصیل طلبا ء کے ذریعہ ملک کی انقلابی مساعی کو فروغ بخشا رفتہ رفتہ یہی مدرسہ ملک کی سب سے بڑی تعلیمی تحریک محمدیہ

## حاجی عمر سعید چکرو آمنوتو

قائدین اندونیشیا کے رہنما، اور ملک کی سب سے پہلی اسلامی اور سیاسی تحریک "شارکیت دگنگ اسلام" کے پرجوش کارکن، فاضل بے بدل، مدبر بے مثل، صدر رصدر نشینان مسند سیاست، استاد اساتذہ علم وحکمت، اسلام کے جانباز سپاہی، جن کی بےمثل قربانیوں، اور یادگار رخوں فشانیوں سے آج ملت اندونیشیا کا چمن شاداب ہے۔ حاجی عمر سعید چکرو آمنوتو، تھے جن کی روح پر فتوح پر خدا کی ہزار بار رحمتیں نازل ہوں۔ اگر انھیں اندونیشیا کا "محمد علی جوہر" کہہ دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا، کیونکہ وہ بھی اس ملک کی تاریخ سیاست میں ایک ایسے ہی جلیل القدر رہنما گذرے ہیں، جو علم وکمال اور تدبر میں یگانۂ روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ قسم کے صحافی بھی تھے، بلند پایہ مصنف بھی تھے، شعلہ بیان شاعر بھی تھے، سحر طراز مقرر بھی تھے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے وفا کیش سپاہی، قوم کے مخلص ترین رہنما، بےلوث، بےغرض، اولوالعزم، باحوصلہ، دلیر اور بےباک انسان تھے۔ کہ

کا خاص مرکز بن گیا۔ اس تحریک نے بھی آگے چل کر ملک کی جہالت کو دور کرنے اور ذوق علم و ادب پیدا کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ انجمن بھی اپنی حیثیت میں بالکل اسی طرح کی تھی جس طرح متحدہ ہندوستان میں "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس یا لاہور کی انجمن حمایت الاسلام" وغیرہ۔

## سوشلسٹ تحریک کا آغاز

اسی دوران میں کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ چند وہ ولندیزی باشندے جو جاوا اور سماترا کے بعض سرکاری مدارس میں معلم تھے یا کسی سرکاری مناصب پر مامور تھے اور سوشلسٹ قسم کے نظریات بھی رکھتے تھے، اس ملک میں بھی اشتراکیت اور سوشلزم کا نظریہ پھیلانے لگے چنانچہ انکی تربیت یا صحبتوں میں رہنے والے اندونیشی نوجوان بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے

---

جنھوں نے اپنے گردہ تلامذہ میں سوکارنو، جیسی بے مثال شخصیت بطور یادگار چھوڑی ہے۔ جس پر آج اندونیشیا کی تاریخ فخر و مباہات کرتی ہے۔

ایسی بلند اور بے لوث شخصیتیں کبھی کبھی قوموں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر جب بھی کبھی پیدا ہو جاتی ہیں ملک، قوم اور وطن کو اپنی زرّین روایات سے مالا مال کر دیتی ہیں، اور آنے والی نسلوں کے لئے اپنی رہنمائی کی ایک شاندار مثال چھوڑ جاتی ہیں۔ چکرو آمنوتو کی زندگی بھی اندونیشیا کے عہد غلامی کی ہنگامہ آرائیوں میں راہنمائی کی ایک ایسی ہی زرّین مثال ہے۔ جو نہ کبھی بھولی جاسکتی ہے اور نہ بھلائی جاسکتی ہے، بلکہ اس ملک کی روح آزادی کی لوح قلب پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہے۔

وہ ۱۸۸۳ء میں ضلع میڈیون (وسطی جاوا) کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک نہایت ہی معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے دادا کسی زمانہ میں رینا رد گو، کے گورنر اور والد ڈ، نا حاکم (ہاتدہ) چکے تھے۔ خاندان کا ماحول شائستگی، وقار اور علم و ادب کا گھوارہ تھا، اس لئے ان کی ابتدائی تربیت بھی نہایت ہی عمدہ طریقہ سے کی گئی، جب سن شعور کو پہنچے تو ملکی رسم و رواج کے مطابق مذہبی مدرسہ میں تعلیم کے لئے بھجوائے گئے، مگر طبیعت میں اسلامی تربیت اور گھر کے

اور رفتہ رفتہ یہ نظریہ کافی زور وشور کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ اور یہاں کی قومی سیاست کا ایک جزو بن گیا۔ چنانچہ سب سے پہلا شخص جس نے اس نظریہ کے ماتحت سوشلزم کی تحریک کا آغاز کیا وہ "اِسنیف لائٹ" (Sneevliet) تھا جس نے ۱۹۱۴ء میں اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ شہر "سیمارانگ" میں (Indische Social Democratische Vereniging) (شرق الہند کی سماجی اور دستوری انجمن) قایم کی اور اسکا اثر مسلمان عوام میں پہنچانیکی تجسس کرنے لگا۔ چنانچہ اسکی انجمن کے چند اندونیشی نوجوان کارکن مثلاً سیماعون، عالمین، وار دسونو وغیرہ بھی اس کے اشاروں پر "شارکیت اسلام" میں شامل ہو گئے تاکہ اس کے اراکین پر بھی سوشلزم کے خیالات کا اثر ڈال سکیں۔

---

مذہبی ماحول نے شروع ہی سے انقلاب پیدا کر دیا تھا، لہذا غیر ملکی سامراجی اساتذہ کے اہانت آمیز برتاؤ سے اک دم جوالا مکھی کی طرح ایک دو حادثہ کے بعد پھٹ پڑا اور مشعلۂ آزادی بنکر دائرہ طلبا میں پھیل گیا، مدرسہ کے اساتذہ جو عام طور پر تنگ نظر قسم کے عیسائی تھے آپ کے خلاف ہو گئے اور آپ کو مدرسہ سے خارج کر دیا، چنانچہ مدتوں مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ اور بالآخر شہر مینگ لانگ بھیجدئے گئے اور بڑی مشکلوں کے بعد وہاں کے او۔ ایس وی اسکول میں داخل ہوئے۔ اور ۱۹۰۲ء میں اسکا مجوزہ نصاب مکمل کیا۔

اس مدرسہ کی تعلیم کو ختم کرنے کے بعد قومی خدمت کے جذبات سے سرشار ہو کر صحافی کا پیشہ اختیار کرنا تجویز کیا جو اس وقت تک مسلمانوں میں عام عدم توجہی کے باعث ایک نئی سی چیز کے مترادف تھا، اور انقلابِ فکر و نظر کی آفرینی کے لئے واحد ذریعہ تھا۔ چنانچہ بگاوری پہنچے اور اخبار نویسوں میں شامل ہو گئے اخبار نویسی کی ضروری باتیں تو سب سیکھ لیں مگر اب اخبار جاری کرنے کے لئے سرمایہ درکار تھا اور اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ کسی بڑے شہر میں پہنچیں اور وہاں کی فرم میں ملازم ہو جائیں۔ پس سرابایا

## پہلی جنگِ عظیم اور دیگر عالمی مسائلِ سیاسی کا عام اثر

اسی زمانہ میں ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا اور پوری دنیا میں ایک سیاسی ہلچل اور ایک انقلابی رستخیز شروع ہوگئی۔ اگرچہ اس لڑائی کا بڑا میدان یورپ تھا اور لڑنے والی قومیں بھی عموماً سب یورپنی تھیں۔ مگر ان کی یہ لڑائی اور اس لڑائی کے مقاصد اور ان مقاصد کے نتائج کا اثر ان ممالک پر بھی ناگزیر تھا جو ان اقوام میں سے بعض کی نوآبادیات تھے یا ان کے جزوِ استعمار سمجھے جاتے تھے، پھر کچھ اتفاق بھی ایسا ہوا تھا کہ دلندیزی اہلِ جنگ کے اس گروہ میں شامل تھے جو ترکوں کے خلاف نبرد آزما تھا، اور ترک چونکہ مسلمان تھے لہذا اہلِ اندونیشیا کا ان کے ساتھ ہمدردی کرنا ایک نفسیاتی حیثیت رکھتا تھا، پھر

---

پہنچے اور ایک فرم میں بحیثیت محرر نوکر ہوگئے اور تین سال (یعنی ۱۹۱۰ء تک روپیہ کماتے رہے اور جمع کرتے رہے اسی اثنا میں مشہور اخبار Bintang Surabaja کے نامہ نگار بھی ہوگئے۔ چونکہ تعلیم تاہنوز نامکمل تھی لہذا نجی طور پر اس کی تکمیل بھی کرتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک شکر کے کارخانہ میں جب اچھی جگہ مل گئی تو ان سب کاموں کو چھوڑ کر یکسو ہوگئے۔

اندونیشیا کی تاریخ انقلاب کا یہی وہ سال ہے کہ جب "سولو" کے مقام پر ملک کے ایک مشہور سوداگر اور عالم حاجی ثمن ہودی نے "شاریکت دگنگ اسلام" کے نام سے سب سے پہلی مذہبی اور سیاسی تحریک کا آغاز کیا تھا، وہ اس انجمن کی دعوت کے سلسلہ میں سرابایا بھی آئے تھے اور آپ سے بھی ملاقی ہوئے تھے، چنانچہ آپ کو بھی اس میں شرکت کے لئے مدعو کیا اور اس کے شعبۂ نوجوانان کا صدر مقرر کر دیا۔

## بغیر شکر کی چارہ

یہ وہ زمانہ تھا کہ اندونیشیا کا اسلام سخت ترین آشوب میں مبتلا تھا، مسلمان نہایت درجہ اقتصادی، سیاسی، معاشی، علمی اور ثقافتی ہر حیثیت سے بری طرح مجروح کئے جا چکے تھے، حکومت وقت نے ایک

قریب قریب دنیا میں ہر طرف ہی انقلاب کی آواز بلند تھی۔ مثلاً اہلِ چین کو ڈاکٹر سنیات سن کی قیادت میں چینی شہنشاہیت کو ختم کر کے قومی جمہوریت قایم کئے ہوئے تھوڑا عرصہ گذرا تھا۔ ہندوستان میں قومی بیداری کا انقلاب شباب پر تھا، مشرق کے اور دیگر حصے بھی اسی طرح انقلاب کی روش پر گامزن تھے، لہذا ان سب کا اثر اندونیشیا کے دل و دماغ پر بھی پڑتا ناگزیر بلکہ امرِ یقینی تھا۔ اور ولندیزی کار پردازان حکومت بھی اب اندونیشیا کی نشاۃِ ثانیہ کے مآثر سے ان تمام چیزوں کو بخوبی پہچانتے تھے ادھر حاجی عمر سعید بھی اب جیل سے آچکے تھے۔ اور شاریکت اسلام، کی قبولیت بھی قوم میں عام ہو چکی تھی، اور نظریات بھی مذہبیات کے دوش بدوش پورے طور پر سیاسی بن چکے تھے۔

---

ایسا ابتذال پیدا کر دیا تھا کہ پوری قوم ماسوا چند افراد اور گھرانوں کے کشمکش روزگار کا شکار ہو کر قلی بن گئی تھی، اور قلی کا کام بھی انھیں میسر نہ تھا، عیسائی پادری گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے تھے اور مفلوک الحال مسلمانوں کو عیسائی بن جانے پر مجبور کرتے تھے مگر واہ رے غیرتِ قوم تباہ ہو جانا، اور غریب ہو جانا گوارا کر لیا مگر اپنی حمیتِ دینی پر آنچ نہ آنے دی۔ چنانچہ جب ولندیزی حکومت نے یہ دیکھا کہ یہ حربہ بھی سالہائے دراز کی تعدی کے باوجود کارگر نہ ہوا تو بالآخر ۱۹۰۱ء میں عیسائیت کی ترجیحات کے سلسلہ میں ہالینڈ کے تاج شاہی کی طرف سے تبلیغ نصرانیت کو بڑے پیمانہ پر جاری کرنے کے سلسلہ میں اعلان ہوا اور پھر ۱۹۰۸ء میں پوری ولندیزی قوم نے اپنے ملک میں اس غرض کے لئے ایک فنڈ کھولا اور اس فنڈ کو تقویت دینے کے لئے یہ طے کیا کہ تمام اہل ہالینڈ ہر اتوار کو بغیر شکر کی چار پیا کریں گے اور اس شکر کی قیمت کا تخمینہ کر کے مشن کے فنڈ میں جمع کرتے رہیں گے اس طرح تین سال کی مدت میں لاکھوں پونڈ کی ایک خطیر رقم جمع کر لی اور اس رقم سے باقاعدہ پر جوش پادریوں کے مشن اس نواح کو بھیجنے شروع کر دیئے۔ تاکہ بہت تھوڑے وقت میں اس مسلمان اکثریت کے ملک کو عیسائی

**فلکسراد کا قیام**

اور پورے ملک کا ایک عام مطالبہ تھا کہ اہلِ ملک کو نفاذ اصلاحات کے ذریعہ مراعات دی جائیں، اسمبلیاں بنائی جائیں اور عوام کو ان میں نمایندگی دی جائے، تعلیمِ اعلیٰ کا بھی اجرئی کیا جائے۔ اہلِ ملک کی معاشی حالت کو بھی صحتمند بنایا جائے وغیرہ وغیرہ۔

بالآخر ہالینڈ نے یوروپ میں اہلِ روس کے ۱۹۱۷ء والے طوفان رستخیز اور مشرقِ وسطیٰ ت اہلِ اسلام کے اُٹھتے ہوئے نئے انقلاب کو دیکھکر یہ طے کیا کہ وہ ایک اسمبلی قایم کریں گے اور اہلِ ملک کو اس میں نمایندگی کا موقع دیں گے۔ آخرالامر ۱۹۱۸ء کے اوائل میں انھوں نے اپنے اس اعلان کو عمل جامہ پہنایا اور ایک عام نمایندہ مجلس "فلکسراد" (Volkasraad) کے عنوان سے

---

بناکر اپنے مستقل قبضہ کے لئے بالکل بے خطر کرلیں یہ اسلام کے خلاف ایک بڑی گہری سازش تھی چنانچہ اسی سازش سے باخبر ہوکر "سولو" کے مقام پر شاریکت دگنگ اسلام (انجمن سوداگران اسلام) کے نام سے حاجی سمن ہودی نے یہ مشہور انجمن قایم کی جس کا مقصد سیاسی نہ تھا بلکہ صرف حفاظت اسلام تھا اور عوام میں مذہبی تقاریب کے انعقاد کے ذریعہ دینی بیداری پیدا کرنا مقصود تھا، تاکہ مسلمان فتنہ سامان پادریوں سے باخبر ہوکر اپنے تمدن کی حفاظت کرسکیں

**شاریکت اسلام**

"حاجی چکرو آمنوتو، جو اسلام کا ایک جوشیلہ نوجوان تھا، ان حالات سے باخبر ہوکر اک دم میدان میں نکل آیا اور ملک و مذہب کے تحفظ کا پیمان باندہ کر آمادۂ خدمت ہوگیا۔ ایک سال بعد ہی چکرو آمنوتو نے اس انجمن کا نام "شاریکت اسلام" (اتحاد اسلام) کر دیا اور پورے پورے جوش کے ساتھ سارے ملک میں اس کے مقاصد کی اشاعت شروع کردی اور ایک اخبار بھی "سروتوموٗ" کے نام سے جاری کیا۔ چونکہ یہ تمام امور ولندیزی حکومت کے منصوبوں کے خلاف تھے لہذا ۱۰ راگست ۱۹۱۲ء کو حکومت نے اس انجمن کو خلاف قانون قرار دیدیا اور

قایم کردی اور ملک کی مختلف بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کو بھی اپنے نمایندے بھیجنے کا اعلان کیا (حالانکہ کبھی بھی اس میں قومی نمایندے نہ پہنچ سکے بلکہ جو لوگ بھی پہنچتے رہے وہ کچھ اس حکمت سے انتخاب میں آتے رہے کہ گویا وہ بالفاظ دیگر انہی کے خود منتخبہ ہوتے تھے۔ (بقول میرے ایک اندونیشی کرم فرما کے)۔

غرض اب اس مجلس نمایندۂ عوام" (یعنی فلکسراد) کے اجلاس ولندیزی حکومت کے سربراہِ اعلیٰ یعنی گورنر جنرل کی صدارت میں منعقد ہونے لگے، اور قومی مسائل بھی زیر بحث آنے لگے۔ چنانچہ ۱۸ رنومبر ۱۹۱۸ء کو جو اسکا تاریخی اجلاس منعقد ہوا، نہایت ہی گرم جوشی کے ساتھ چند قومی مطالبات کو بروئے کار لایا گیا مثلاً یہ کہ ولندیزی زبان کے ساتھ ساتھ ملک کی مشترکہ قومی زبان اندونیشی کو بھی اس مجلس کی کارکردگی میں

---

اس کے اراکین اور منصبداروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں، اخبار بھی ضبط کر لیا اور "چکرو آمنوتو" کو بھی حراست میں لے لیا۔ واقعہ نگاروں کا بیان ہے کہ جیل میں بند کرنے کے بعد حکومت وقت نے "آمنوتو" کو ایسی تکلیف دہ اور شدید قسم کی سزائیں دیں کہ ان کے تصورات انصاف کا دل دہل جاتا ہے اور شرافت وانسانیت کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر قوم کے بہادر سپاہی بھی ایسے ہی ہنگاموں میں پہچانے جاتے ہیں۔ ایمان کی جانچ کے بھی یہی موقعے ہوتے ہیں۔

غرض چکرو آمنوتو جیل میں چلے گئے مگر ساری قوم میں ایک حرارت، ایک جذبہ، اور ایک جوش بیداری پیدا ہو گیا، بالآخر حکومت بھی عوام کے اس جوش و خروش سے کانپ اٹھی اور چکرو آمنوتو کو رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد ہی ۲۳ رجنوری ۱۹۱۳ء کو "چکرو آمنوتو" نے سرابایا کے مقام پر اس انجمن کا ایک عام اور عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، اور سوتے ہوئے مسلمانوں کو شانے جھنجوڑ جھنجوڑ کر غفلت سے چونکا دیا۔ تعلیم کی اشاعت اور تنظیم پر ایسی بصیرت افروز (بقول ایک اندونیشی سوانح نگار) تقریر کی کہ ساری قوم اکدم ہوش میں آگئی اور انھیں اپنے ملک کا سب سے بڑا رہنما سمجھنے لگی۔ تعلیم کے سلسلہ میں یہ کیا کہ خود اپنا ایک اسکول کھولا

شامل کیا جائے، اور ملک کی "خود انتظامیہ" حکومت قایم کی جائے اور گورنمنٹ ایکٹ میں بھی ترمیم کی جائے اس وقت اس ملک (نیدر لینڈس ڈچ ایسٹ انڈیز) کا گورنر جنرل "کاؤنٹ فان لیمبرغ اسٹی روم" (Count van Limburg Stirum) تھا جو نہایت ہی چالاک اور ہوشیار قسم کا آدمی تھا۔ معاملات کی نزاکت کا اندازہ کر کے فوراً اس امر پر تیار ہوگیا کہ وہ اہل انڈونیشیا کے واجبی مطالبات پورا کرانے میں حتی الوسع مدد دے گا اور اپنی سفارشات مرکزی حکومت کو لکھ بھیجے گا جو حالانکہ اس نے اس جوش و خروش کے فرد ہو جانے کے بعد کبھی نہ کیا اور ان سب باتوں کو نذر نسیاں کر دیا۔

**عدم تعاون اور اشتراکیت** ادھر جنگ کے مابعد اثرات، دنیا

---

اور آس پاس کے چھوٹے دیہاتوں کے طلباء کی رہائش کے لئے دار الاقامہ بھی قایم کیا۔

**سوکارنو کی تربیت** چنانچہ اس دار الاقامہ میں ملک کے ہونہار ترین طالب علم اور آیندہ کے سب سے بڑے رہنما "سوکارنو" نے بھی تربیت حاصل کی تھی اور جکرو آمنوتو سے رموز قیادت، اسرار صحافت، اور آداب خطابت سیکھے تھے۔

**اوتوسان ہندیا کا اجرا** اسی سال (۱۹۱۳ء) میں آپ نے مشہور رسالہ "اوتوسان ہندیا" جاری کیا جس میں اسلامی تاریخ، قومی ثقافت، اور فلسفہ تمدن پر جوشیلے اور شاندار قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے، انڈونیشیا کی تاریخ میں اس مجلّہ کی بھی وہی ادبی حیثیت ہے جو سرسید مرحوم کے مشہور رسالے تہذیب الاخلاق نے کسی زمانہ میں ہندوستان میں حاصل کی تھی۔

**فلکسُر اُد** غرض جکرو آمنوتو کی مقناطیسی شخصیت کے اثر سے یہ جماعت

کی عام اقتصادی گراوٹ اور حکومت کی سخت گیر پالیسی کے سبب اندونیشیا کے عوام کی حالت بھی روز بروز ابتر ہوتی جارہی تھی۔ خصوصاً مزدور تو بہت ہی ہیجان و اضطراب میں مبتلا تھے لہٰذا وہ جگہ جگہ حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے لگے، بالآخر انھوں نے ختم شدہ جماعت (I.S.D.V.) کی پھر دوبارہ تجدید کی اور اب کے بار اس کا نام " پرسارِکتان کمیونس اندونیشیا" (Persarekatan Komunis Indonesia) یعنی "اندونیشیا کی کمیونسٹ جماعت" رکھا اور مشہور اشتراکی رہنما مثلاً موسو، عالمین، دارسونو، سیماعون اور رڈنکیر کی رہنمائی میں عدم تعاون، کی تحریک کا آغاز کردیا، یہ رہنما چونکہ اس وقت تک "شاریکت اسلام" کے بھی رکن تھے لہٰذا ان کی اس پالیسی پر "شاریکت اسلام" کے رہنما بگڑ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ان لوگوں نے "شاریکت اسلام" کے خلاف

* کچھ ہی عرصہ میں سارے ملک کی نمایندہ جماعت بن گئی اور عوام کے مطالبۂ اصلاح کے ماتحت جب ولندیزی حکومت نے ۱۹۱۸ء میں "فلکسراد" کے نام سے ایک اسمبلی قایم کی تو آپ نے بھی اپنی جماعت کی طرف سے اس میں نمایندہ بھجوایا۔

## اتحاد بین الاسلام کی تحریک

اسی زمانہ میں خلافت ترکی کی طرف سے "انور پاشا" نے، اتحاد بین الاسلام کے نام سے یوروپ میں ایک زبردست تحریک کا آغاز کیا تھا اور ہندوستان مولانا محمد علی کی بدولت جوش آزادی میں سرشار تھا، اسی طرح بدھ چین میں "سن یاٹ سن" نے انقلاب پیدا کرکے جمہوریہ کے قیام سے ایک نئی چینی زندگی شروع کی تھی، لہٰذا اندونیشیا کے رہنما بھی ان چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بالآخر چکروآمنوتو بھی اک دم "اتحاد اسلامی" کے ایک بڑے زعیم بنکر میدان میں نکل آئے اور پورے اندونیشیا کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے مساعی ہوئے۔ اس سلسلہ میں آپ نے "سرابایا" کے مقام پر ۱۹۲۲ء میں "کانگریس الاسلام ہندیا" کے نام سے پورے مسلم اندونیشیا کا ایک نمایندہ جلسہ منعقد کیا اور ہر جگہ ایسے دار المطالعے بھی کھلوادئے جہاں ان کا شایع کیا ہوا لٹریچر پڑھا

بھی آوازیں بلند کرنی شروع کردیں۔

اتفاق سے اب مشہور کمیونسٹ لیڈر "تانَ ملکَا" بھی جو ۱۹۲۰ء میں یوروپ سے لوٹ کر آچکا تھا، اس عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہوگیا۔ اور مسلّم الثبوت کمیونسٹ رہنما بن گیا، اس کی تحریک سے "شارکیت اسلام" میں بھی نفاق واقع ہوگیا اور اس طرح یہ پوری انجمن دو حصوں میں بنٹ گئی حکومت بھی کمیونسٹ کے خلاف سختیاں کرنے لگی۔ حتیٰ کہ تان ملکا اور اس کے ساتھی بھی جلاوطن کردئے گئے۔

## کانگریس الاسلام ہندیا کا انعقاد

ادہر اب چار سال اسی طرح لیت ولعل میں گذرتے رہے اور اہل ملک کے صبر وثبات میں بھی اضمحلال واقع ہوتا رہا کہ اسی زمانہ (۱۹۲۲ء) میں حاجی عمر سعید نے پورے

---

جاتا تھا۔ اس طرح ان کی قوم میں ایک زبردست بیداری اور جذبۂ حریت پیدا ہوگیا۔ اس جذبہ کو باقاعدہ علمی جامہ پہنانے کے لئے چار سال بعد پھر دوبارہ ۱۹۲۶ء میں "الاسلام کانگریس" کا اجلاس بلایا۔

## سفر مکۂ مکرمہ

کیونکہ اسی سال جدہ میں تمام عالم اسلامی کی ایک بین الاسلامی کانفرنس "موتمر عالم اسلامی" کے نام سے سلطان ابن سعود والئ نجد وحجاز کی صدارت میں منعقد ہونے والی تھی۔ اور اس موتمر میں اندونیشیا کی طرف سے بھی قابل اور لایق مندوبین کو بھیجنے کا سوال درپیش تھا۔ چنانچہ سرابایا میں اس انتخاب کرنے والی کانگریس کا جلسہ منعقد ہوا اور پورے ملک کے نمایندے جمع ہوئے آخر اس اجلاس نے آپ کو اور مشرقی جاوا کے مشہور عالم کیائی حاجی منصور رکو، موتمر عالم اسلامی میں اندونیشی مندوبین کی حیثیت سے بھیجنا منظور کیا اندونیشیا میں اس وقت یہ وہ دور تھا کہ اب ملک میں حاجی احمد دہالان کی محمدیہ کی تعلیمی تحریک کی وجہ سے بھی ایک بڑی تعلیمی بیداری پیدا ہوچکی تھی۔ بالآخر آپ حجاز پہنچے، جلسہ میں شرکت کی ہندوستانی مندوبین مولینا محمد علی جوہرؔ اور ان کے رُفقار سے بھی ملاقات ہوئی، مصر وشام کے دیگر نمایندوں سے بھی تبادلۂ خیالات کا اتفاق ہوا، جلسہ ختم ہوگیا اور آپ حج کو چلے گئے۔

ملک کو متحد و متفق کرنے اور طلب مطالبات کے لئے ایک فرنٹ قایم کرنے کے لئے تمام جزائر کی ایک عام کانفرنس بلائی جو مقامی اصطلاح میں "کانگریس الاسلام ہندیا" کہلاتی ہے، چنانچہ سوانح نگار کا بیان ہے کہ قومی بیداری کے بعد اس عہد نشاۃِ ثانیہ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سارا ملک مقصدِ واحد کے لئے ایک جھنڈے تلے جمع ہوا اور قوم کے متعدد مطالبات کو منوانے کے لئے ایک آواز ہو گیا۔

## طلبائے انڈونیشیا کی گرمجوشی

اب ملک کی عام بیداری خواص و عام سے نکل کر طلبا کے دل و دماغ پر بھی اثر انداز ہونے لگی، سوکارنو، حتا، سکیمان، سوبارجو، یہ سب لوگ جو آیندہ کے بڑے بننے والے رہنما تھے سب زیرِ تعلیم تھے لہٰذا سماترا اور جاوا کے مدارس میں ان سب نے اپنے اپنے

---

اور اپنا نام بھی روایات کے مطابق عمر سعید رکھا، اور حاجی عمر سعید چکرو آمنوتو کہلانے لگے۔

حجاز سے جب واپس لوٹے تو انڈونیشیا میں موتمر عالم اسلامی کی ایک شاخ "موتمرِ عالم اسلامی ہندیہ شرقیہ" کے نام سے جاری کردی، چونکہ مقامی مدارس میں بھی "یانگ جاوا ین بونڈ" اور "یانگ سماترا نین" بونڈ مدت سے آپ ہی کے اشاروں سے قایم کی جاکر برسرِ عمل تھیں لہٰذا اب ہر طرف قومی سیاست کا ایک بڑا جال پھیل گیا، اور ساری قوم میں "نشاۃِ ثانیہ" پیدا ہو گئی۔ سوکارنو بانڈونگ میں انجینری کالج کے طالب علم تھے اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ طلباء کو بیدار کرنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ یوروپ (ہالینڈ) میں بھی آپکے شاگردوں نے سیاسی تحریک شروع کی تھی۔ (بحوالہ انڈونیشی مقالہ بعنوان "چکرو آمنوتو")۔

مقام پر طلبار کی انجمن "ینگ جاوانین باؤنڈ"، اور "ینگ سماترا نین باؤنڈ"، قایم کیں اوران انجمنوں کے اجلاس میں تحریر و تقریر کے ملک کو بڑھانے پر کافی زور دیا، اور مدارس کی بخی تنظیم میں بھی کافی حصہ لیا۔ اس طرح اندرونِ ملک میں طلبار کی کارکردگیوں کا ایک انقلابی سلسلہ برابر جاری رہا۔

"بُودِ یُ اُوتُومو" کی سب سے پہلی تعلیمی تحریک کے قائدین کی مساعی سے ملک کے صاحب ثروت خاندانوں کے ہونہار بچے بھی اب ولایت (ہالینڈ) کو پڑھنے کے لئے جانے لگے، چنانچہ سب سے پہلے وہ لوگ تھے جو "سوتومو" کے ساتھ ہالینڈ میں پہنچے تھے اور وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جاکر داخل ہوئے تھے۔ لہذا ان طلبار نے وہاں پہنچکر بھی اپنی قومی تحریکات کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا۔ اور اپنی سب سے

## حاجی موصوف کے عادات خصائل اور کردار

چنانچہ حاجی موصوف کے عادات و خصائل اور عام کردار کے بارے میں میری یہ معلومات خود ایک اندونیشی دوست ہی کی مرہون منت ہیں چنانچہ انکے بیان کے مطابق حاجی موصوف کے کردار کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ اوّل درجہ کے راست باز، اسلام نثار، وفا شعار، اولوالعزم اور بالکل نڈر قسم کے آدمی تھے۔ ان کے دل میں اپنے وطن اور اہل وطن اور پورے عالم اسلامی کا درد قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا مسلمان کسی ملک کا بھی ہو، وہ سے فی الشل اپنا ہموطن کر سمجھتے۔ مسلم ممالک میں سو جب کسی ملک کی کسی قسم کی بھی مصیبت کا حال سن پاتے تو بے چین ہو جاتے، عرب کے حالات سے انھیں خاص دلچسپی تھی، برصغیر ہند کے مسلمانوں کے ساتھ بھی انھیں اسی قسم کا تعلق خاطر تھا۔ اسلام اور اہل اسلام کی خدمت کو وہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ جس نوجوان میں یہ اوصاف دیکھ پاتے اسکی ہمت افزائی کرتے۔ بلکہ اسے دل و جان سے عزیز رکھتے۔ اور جو نوجوان اس جادہ مستقیم سے برگشتہ دکھائی دیتا۔ اس سے کنارہ کش ہو جاتے۔

## شاریکت اسلام کی تقسیم

چنانچہ ۱۹۲۰ء میں "حاجی عمر سعید چکرو آمنوتو" نے جب یہ دیکھا کہ شاریکت اسلام کے کچھ نوجوان رکن مثلاً "تان ملکا، عالمین، دارسونو، وغیرہ کمیونسٹ ہوگئے ہیں اور وہ ایک جداگانہ پلیٹ فارم

پہلی تحریک "نوتوسوروتو" (Notosoroto) کی قیادت میں "پَرہِمپُولاَن ہِندیا"
کے عنوان سے جاری کی جس کا مقصد محض طلبائے اندونیشیا کی مدد کرنا، ان کے ٹھہرنے
قیام کرنے، کھانے پینے، اور تعلیمی ضرورتوں کے سلسلے میں دیکھ بھال اور مدد کرنا وغیرہ تھا
چنانچہ اس کی حیثیت ایک کلب سے زیادہ نہ تھی۔ اس انجمن نے اپنے ملک کے حالات کو
بروئے کار لانے کے لئے ایک رسالہ بھی "ہِندیا پُوتیرا" کے نام سے جاری کیا تھا۔
مگر ۱۹۲۲ء میں مشہور طالبعلم "احمد سوبارجو" کی قیادت میں اسکا نام بھی
بدل کر "پَرہِمپُونان اندونیشیا" (انجمن طلبائے اندونیشیا) کیا گیا اور اسی طرح ماہانہ
نکلتے رہنے والے رسالہ کا نام بھی بدل کر "اندونیشیا مُردیکا" کیا گیا (جس کے مدیر
۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر محمد حتیٰ تھے) اسی انجمن کے ایک اجلاس میں احمد سوبارجو نے اپنے

---

چاہتے ہیں تو آپ نے ان کے ہمخیالوں کے اخراج کے بعد اپنی جماعت الگ کرلی کیونکہ آپ کے
خیالات خالصتاً اسلامی تھے، ملک کے نامور عالم حاجی آگوس سلیم بھی آپ کے ہمراہ تھے اور ایک
مشہور اخبار "فجر ایشیا" نکالتے تھے، غرض شارکیت اسلام کا ایک حصہ "کمیونسٹ پارٹی" کی
صورت میں الگ ہوگیا اور دوسرا حصہ آپ کے ساتھ رہا جس کا نام اب بدل کر آپ نے
"پارٹائی شرکیت اسلام" کر دیا۔ جس کو ۱۹۲۳ء میں آپ کے ایک نوجوان شاگرد اور رکن
"سوکیمان" نے "پارٹائی اسلام اندونیشیا" کرکے پارہ پارہ کر دیا۔ مگر یہ پارٹائی، زیادہ عرصہ
تک قائم نہ رہ سکی۔

**وفات** ۲۰ رمئی ۱۹۳۴ء کو جکرو آمنو تو روزگار نامساعد کے ہاتھوں مصیبتیں جھیلتے
رہنے، اور شب و روز قوم کا کام کرتے رہنے کے باعث اک دم بیمار
پڑگئے، مرض کچھ ایسا شدید تھا کہ جس کے باعث صحت روز بروز بگڑتی چلی گئی، چار ماہ اور
کچھ دن تک اسی طرح مرض میں مبتلا رہ کر، ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کو اس دار فانی سے رخصت
ہوگئے۔ اِنّا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ملک کے لئے بجائے 'نیدرلینڈس ڈچ ایسٹ انڈیز' کے 'اندونیشیا کا نام تجویز کیا تھا جو رفتہ رفتہ قومی زبان اور ملک کے نام کے لئے استعمال میں عام ہو گیا۔ غرض اس انجمن نے بھی یورپ کے مختلف ممالک میں اپنے مندوبین بھجوا کر غیر معمولی اثر ڈالا۔ (اس کی تفصیلات دوسری جلد میں محمد حتا اور سوبارجو کے حالات میں بیان کی جائیں گی) اور خود ہالینڈ کے سیاسی حلقوں کے نظریات میں بھی تغیر پیدا کیا۔

اسی طرح وہ طلبا ر بھی جو قاہرہ، دمشق اور مکہ مکرمہ میں زیر تعلیم تھے "اتحادِ بین الاسلام" کی اٹھتی ہوئی تحریک کے رکن بن گئے تھے اور انھوں نے بھی اپنے ملک کی نمایندگی میں غیر معمولی اثر اندازی کی۔

غرض اب یوروپ سے لوٹ کر آتے والے طلبار نے اپنے ملک کی سیاست

---

سارے ملک میں آپ کا ماتم کیا گیا، اسکول اور دفاتر بھی بند کر دیے گئے سوانح نگار لکھتا ہے کہ تمام ملک میں اور اسی طرح حجاز، مدینہ طیبہ، مصر، شام اور بیت المقدس وغیرہ میں سب جگہ آپ کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی، ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے تعزیت کے جلسے منعقد کئے اس طرح ایک عظیم الشان ہیرو، ایک جلیل القدر مدبر اندونیشیا سے چھن گیا مگر اپنے بعد اپنی قوم کی قیادت کے لئے سوکارنو، جیسا عالی مرتبت شاگرد چھوڑ گیا، جو آج اس ملک کا سب سے بڑا اور عظیم ترین رہنما ہے، اور ہر طرح سے اپنے استاد کی زرین روایات کا حامل ہے۔ لوگ پیدا ہوتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے، انقلاب بھی آتا رہے گا اور زمانہ بھی بدلتا رہے گا مگر اندونیشیا کی قوم اپنے اس سب سے پہلے جلیل القدر اور عظیم الشان ہیرو کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ ان کی یاد ان کی قوم کے دلوں میں اسی طرح زندہ رہے گی۔ سچ ہے جو دین وملت کے خاطر تن من دھن، اور صحت وجان سب کچھ لٹا دیتے ہیں، وہ مرتے نہیں زندہ رہتے ہیں، بلکہ مرنے کے بعد اور زیادہ یاد آنے کے لائق بنجاتے ہیں اور محبت میں قوم کو عقیدت کے آنسو رلاتے ہیں، عمر سعید جکروآمنو تو بھی اسی طرح ہمیشہ زندہ رہیں گے

میں بھی غیر معمولی طور پر حصہ لینا شروع کیا۔ اور جگہ جگہ " دارالمطالعہ "، " اسٹیڈی کلب کے نام سے کھولدئے۔ چنانچہ اسی سلسلہ کا سب سے پہلا دارالمطالعہ سُرابایا کے مقام پر سنہ ۱۹۲۰ء میں اسٹیڈی کلب کے نام سے کھولا گیا جو سب سے پہلی قومی لائبریری کی حیثیت رکھتا ہے اس کے مؤسس بھی ڈاکٹر سوتومو تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سنہ ۱۹۲۳ء میں ادارۂ اہلِ علم " (League of Intellectuals) قایم کیا جہاں متعدد یورپین زبانیں اہلِ ذوق کو سکھائی جاتی تھیں۔ پھر اس کے اتباع میں سُراکرتا، اور باندونگ کے مقام پر بھی ایسے کلب قایم ہوتے چلے گئے دسوتومو، کا کلب سب سے بڑا تھا، رہائش کا انتظام اور دیگر ضروری سامان بھی اہلِ ذوق کو مہیا کیا گیا تھا۔

**محمد حُسنی تھمرِنؒ**

اندونیشیا کی تاریخ نشاۃِ ثانیہ میں یہ مردِ بزرگ بھی ایک بڑی شخصیت گذرے ہیں۔ تدبّرِ سیاست، دوربینی اور حب الوطنی میں اپنے اہلِ وطن کے درمیان ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے اور چکرو آمنوتو کے بعد ملک کے بڑے اور صاحب اثر رہنما سمجھے جاتے تھے۔ آپ بٹاویہ (جکارتا) کے باشندے، اور ایک نہایت ہی خوشحال اور معتبر خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کی ولادت ۱۶ فروری سنہ ۱۸۹۴ء کو ایک " وڈانا " (پٹواری) کے گھر ہوئی ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ قسم کی تعلیم تک تمام مدارج اسی شہر کی درس گاہوں میں طے کئے۔ اور فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء سے جکارتا کی مختلف فرموں میں کلرک کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ایک مدت تک اسی طرح گذر اوقات کرتے رہے۔ پھر چند سال کے بعد ملکی سیاست میں بھی حصہ لینے لگے، یہ وہ زمانہ تھا کہ اندونیشیا کی در و دیوار سوتومو، واحیدین، حاجی دہلان، چکرو آمنوتو، ثمن ہودی، آگو سلیم، اور کیائی منصور وغیرہ کے نعرہ ہائے بیداری سے گونجی ہوئی تھیں، اور عوام میں تنازع للبقا کا عام احساس پیدا ہو چکا تھا، چکرو آمنوتو، کی آتشِ محبت نے سماترا، جاوا،

## پہلا نیشنل بینک

اسی زمانہ میں 'سوتومو' نے اپنی قوم کا سب سے پہلا بینک بھی پندرہ لاکھ کے سرمایہ سے اسی مقام (سرابایا میں) پر کھولا۔ تاکہ اس کے ذریعہ قوم میں 'بچت' کا جذبہ پیدا کیا جا سکے۔ اور آیندہ کی نسلیں اس کے ذریعہ تعلیمی اور دیگر مفاد میں مدد پا سکیں وغیرہ اس کے ساتھ ساتھ ہی انھوں نے "کمیٹی پَرسَاتوَاَن اندونیشیا" (انجمن اتحادِ اندونیشیا) بھی قایم کی جو آگے چل کر ۱۹۳۰ء میں 'بُودِی اُوتومو' کے امتزاج سے 'پَرسَاتوَاَن بَنگ سَا اندونیشیا' (یعنی انجمن اتحادِ ملّتِ اندونیشیا) کے نام سے معنون کی گئی۔

## اشتراکیوں کے ساتھ سختیاں

غرض اب ۱۹۲۵ء ختم ہوکر ۱۹۲۶ء شروع ہو رہا تھا کہ اک دم اشتراکیوں نے اپنے

---

بورنیو، سلیبس، اور مالو کو غرض ہر جزیرہ کے صاحب درد اور صاحب احساس برناؤ بیر کو پھونک دیا تھا اور وطن اور اسلام کے نام پر نثار ہو جانے کے پینترے سکھا دیے تھے، مدارس کے طالبعلم بھی اسی طرح متاثر تھے تو فرموں میں کام کرنے والے کلرک بھی اسی طرح خدمت وطن کے جذبہ سے گرمائے ہوئے تھے، ہر شخص کو ملک کی برتری کا احساس ہو چلا تھا، چنانچہ حُسنی تمرن بھی انہی نوجوانوں میں سے تھے جنھیں چکرو آمنوتو کی نگاہِ التفات اور اخلاص آفریں توجہ نے کام کا آدمی بنا کر کیمیا کر دیا تھا۔

اتفاق سے ولندیزی سامراج نے اہل ملک کے بڑھتے ہوئے مطالبات افزونیٔ تعلیم و اصلاح کے پیش نظر "فلکسراد" (نمایندہ اسمبلی) قایم کی تو آپ بھی اس کے نمایندہ کے طور پر منتخب کر کے بھیجے گئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے لوکو برگو ماسٹر" (میئر) درجہ دوم کے بنائے گئے اس کے بعد جب ختم مدت کے بعد دوبارہ انتخاب کا وقت آیا تو بھی آپ ہی کو چنا گیا حتیٰ کہ پھر درجہ اول کے برگو ماسٹر ہو گئے۔ ۱۹۲۷ء میں وہ 'گورنر جنرل' کی اسمبلی کے بھی رکن تھے، اسی سال انھوں نے شہر بٹاویہ کی انجمن "قوم بٹادی" کی صدارت کا منصب بھی حاصل کیا، یہ گویا

رہنماؤں کے جلا وطن کر دئے جانے کے باعث ایک عظیم الشان احتجاج بلکہ شدید انہراج جکارتا اور اس کے آس پاس کی مضافات میں پیدا کر دیا کہ ولندیزی حکومت بھی بھونچکا رہ گئی، بالآخر اس کے کارندوں نے یہ سوچا کہ انھیں پوری پوری قوت کے ساتھ دبانا چاہئے۔

**کالا پانی**

لہذا ان کے سینکڑوں خاندانوں کو پکڑ پکڑ کر جیل میں ٹھوسنا شروع کر دیا اور پھر مقامی جیلوں سے نکال کر جہازوں میں بھر بھر کر نیوگنی کے ایک غیر آباد ترین مقام "بُووَن ڈِی گُل" میں پہنچا دیا جہاں سوائے خراب اور غیر آباد جنگل کے کچھ نہ تھا اور آب و ہوا بھی نہایت ہی مضر صحت تھی، لہذا سینکڑوں ہی آدمی وہاں جانے کے ساتھ ہی مر گئے اور ان کے خاندان بھی تباہ و برباد ہو گئے، اہل اِندو نیشیا

---

ان کی شہرت کا انتہائی زمانہ عروج تھا، اسی زمانہ میں ان کی ملاقاتیں چکرو آمنوتو کے مشہور شاگرد اور آیندہ کے سب سے بڑے رہنما "سوکارنو" سے بھی ہونے لگیں جو تکمیلِ علم کے ساتھ ساتھ اب سیاست کے کھلے میدانوں میں آ رہے تھے،

اُس عہد کا ایک اندونیشی مبصّر لکھتا ہے کہ "فلکسراد" کے تمام اندونیشی نمایندوں میں صرف حُسنی تھمرن ہی ایک ایسے شخص تھے جن کی عوام اور خواص سب تعظیم کرتے تھے۔ بلکہ آپ کا اثر پوری سوسائٹی پر اس درجہ حاوی تھا کہ کوئی بھی جلسہ ہوتا آپ کو ضرور بلایا جاتا اور صدارت کے لئے تجویز کیا جاتا۔ جلسہ پر کنٹرول رکھنا، صدارتی خطبہ پڑھنا آپ کے لئے مسلّم ہو چکا تھا۔

بہر حال آپ نے "فِکسی نیشنل" کے عنوان سے ایک سیاسی انجمن کی بھی تاسیس کی جو اپنے اثر و استیلا کے اعتبار سے ملک کی چوتھی سیاسی جماعت شمار کی جاتی تھی۔

عدم تعاون کی تحریک کے دور میں (جس کا آغاز سیاست کے میدانوں میں نئے طور پر اترنے والے نوجوان مدبّر اور رہنما "سوکارنو" نے کیا تھا) اس انجمن نے بھی مقاطعۂ معاشرتی کے مظاہروں میں بڑا کام کیا چنانچہ سوکارنو، کو پہلی بار جب قید کیا گیا تو اس وقت وہ

میں یہ مقام "کالا پانی"، کہلاتا ہے۔ اس طرح اشتراکیوں کی سیاسی تحریک بھی بزور دبا کر بالکل کچل دی گئی بلکہ بہت زمانہ تک کے لیے ختم کر دی گئی۔

## تمان سسوا کا عروج

اسی زمانہ میں مشہور ماہر تعلیم "کی حجر دیونتارا"، کی سنہ ۱۹۲۲ء میں جوگ جکارتا کے مقام پر قایم کی ہوئی علمی اور ادبی تحریک 'تمان سسوا' (دبستانِ اطفال) کا بھی عروج ہوا۔ تحریکِ محمدیہ کی طرح اس کے بھی بڑے بڑے اسکول دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں سب جگہ قایم تھے۔ جن میں ملک کے بچوں کو مفت تعلیم دیے جانے کا کافی اہتمام تھا، اس کے مدارس میں متداول اصول پر ہر قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور تعلیم کے علاوہ صنعت وحرفت پر بھی زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح "دیونتارا" بھی اس وقت

---

حسنی تھمرن کے مکان پر ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات میں مصروف تھے۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں جب 'اندونیشیا رایا'، (پریندرا) کی جماعت قایم ہوئی تو وہ اس کے بھی صدر منتخب کیے گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حاجی چکرو آمنوتو، انتقال فرما چکے تھے۔ اور ملک وقوم کی ہنگامہ خیز اور پر آلام قیادت کا بار اپنے شاگردوں کے دوش پر چھوڑ گئے تھے۔ لہٰذا اب "سوکارنو" کا دورِ سیاست شروع ہو رہا تھا، جیل جانا، ملک کو آزاد کرانا، قربانی دینا اور قربان ہو جانا وغیرہ صدائیں 'سوکارنو' کی ہمنوائی میں یورپ سے لوٹ کر آئے ہوئے نوجوان انڈونیشی طلبا، محمد حتیٰ، سیکمان، سوبارجو، اور شہریر وغیرہ کا بھی نعرۂ آزادی بن کر فضا میں گونج رہی تھی، ہر طرف ایک تڑپ تھی، سراسیمگی تھی اور ہیجان تھا، چنانچہ اس وقت صلاح کار کے طور پر ان نوجوانوں کے سربراہ تھمرن ہی چکرو آمنوتو کے فرائض انجام دے رہے تھے اور دوسری طرف آگوسلیم کی سلیم المزاجی اور اوراق صحافت کے ذریعہ مذہب کے عنوان سے توازن اور استقلال قائم کیے ہوئے تھی۔

غرض تھمرن کو سنہ ۱۹۳۷ء میں "پسندان پارٹائی" کا بھی سرپرست بنایا گیا جو شہر

ملک کے بڑے رہنما تھے اور تمدن پر غیر معمولی اثر ڈال رہے تھے۔

## موتمر عالم اسلامی اور انڈونیشیا

ادھر اشتراکیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم سے سارا ملک غم و غصہ میں بیٹھا ہوا تھا کیونکہ بہر حال یہ اشتراکی بھی انڈونیشی قوم کے فرد تھے اور کم از کم اس وقت تو ان کا سارا کچھ ردِ عمل ولندیزی حکومت کے مظالم کے خلاف تھا اور آزادی اور خود اختیار حکومت ہی ان کا بھی نصب العین تھا لہٰذا سارے ملک میں خشونت پھیل گئی

اتفاق سے اسی زمانہ (سنہ ۱۹۲۶ء) میں سعودی عرب کے سلطان ابن سعود نے جس کی حکومت کو قایم ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا پورے عالم اسلامی کے نمائندوں سے گفتگوے سیاست اور تبادلۂ خیالات کرنے کیلئے "جدہ" کے مقام پر مشہور ہندوستانی رہنما اور صحافی

---

(باندونگ) میں اسی سال قایم کی گئی تھی اور سنہ ۱۹۲۹ء میں یہ کانگریس رعیت انڈونیشیا" کیمونسٹ پارٹی) کے قیام کے سلسلہ میں اس کے بانی "ابی کسنو جکر وسوموسو" اور اس کے ارکین ایسر شریف الدین اور ڈاکٹر غنی کے بھی ہمنوا تھے، "ڈاکٹر سوتوموکے بعد ان کی جماعت پرندرا میں بھی ان کی حیثیت سب سے ممتاز تھی، سنہ ۱۹۴۱ء میں ولندیزیوں نے شبہات کی بنا پر ان کے گھر کی تلاشی لی اور قید بھی کیا، ۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کو درد گردہ کے شدید دورہ کے باعث انتقال فرما گئے، سارے ملک میں جیساکہ بعض مبصرین کا بیان ہے آپ کا سوگ منایا گیا، مدارس اور دفاتر بند کر دیے گئے حکومت وقت نے بھی اپنا سرکاری جھنڈا آپ کے سوگ میں سرنگوں کردیا پندرہ ہزار کے لگ بھگ آدمی آپ کے جلوس جنازہ میں شامل تھے، کریت کے مقام پر دفنایا گیا

## تان ملکا

یہ بھی بہت مشہور رہنما گذرا ہے، اگرچہ یہ بعد میں اشتراکی (کمیونسٹ) ہو گیا تھا۔ اور پھر آخر عمر تک کمیونسٹ ہی رہا مگر چونکہ عہد نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں اس کی بہت اہمیت ہے لہٰذا اس کے حالات بھی اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی اشارت سے ایک بڑا جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا اور ہر مسلم ملک سے مندوبین کو آنے اور اس میں شرکت کرنے کی دعوت دی ۔ چنانچہ حاجی عمر سعید کو بھی یہ دعوت نامہ موصول ہوا ۔ بالآخر حاجی موصوف نے سرابایا کے مقام پر مندوبین کے انتخاب کے لئے پورے ملک کی شارکیت اسلام کے چیدہ چیدہ نمایندوں کا ایک اجلاس "کانگریس الاسلام ہندیا" ہی کے نام سے منعقد کیا اور بالآخر حاجی منصور کے ساتھ خود ہی مندوب کی حیثیت سے منتخب ہو کر اندونیشیا کی نمایندگی کے لئے جدہ روانہ ہوئے اور وہاں پہنچکر نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ اپنے ملک کے مسائل آزادی اور اہل ملک کی قربانیوں کا ذکر کیا اور اندونیشیا کو تمام ممالک کے مندوبین کے ساتھ متعارف کیا سنہ ۱۹۲۶ء میں جب واپس وطن کو لوٹ کر آئے تو

وہ سماترا کے ایک نہایت ہی ممتاز قسم کے اسلامی گھرانے میں سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا بچپن کا نام بھی ابراہیم تھا ، تعلیم بھی ابتدا میں اسلامی حاصل کی ، مگر عہد شباب میں پہنچکر وہ عیسائیوں کے مشن اسکول میں داخل ہو گیا اس کے بعد پھر سنہ ۱۹۱۳ء میں "بوکت تنگی" کے ٹرنینگ اسکول سے مستند ٹیچر ہونے کی سند حاصل کی ۔ اسی اسکول میں اس کی ایک ولندیزی استاد "خی ہوَرانوما" سے دوستی ہو گئی جس نے اسے اسی سال سفارش کر کے ہالینڈ بھجوا دیا اور امسٹرڈم کے ٹرنینگ کالج میں داخل کروا دیا ۔ سات سال تک یہ وہاں پڑھتا رہا ، اور سنہ ۱۹۲۰ء میں فن تعلیمات کی تکمیل کر کے وطن لوٹا ، اور ایک سرکاری اسکول میں مدرس ہو گیا ، چونکہ ولندیزیوں کا برتاؤ اندونیشی طلباء اور اساتذہ کے ساتھ خوشگوار نہ تھا اس لئے وہ ترک وطن کر کے میڈان (سماترا) سے جاوا چلا آیا ، کچھ عرصہ حکیر و آمنوتو کے ساتھ رہا پھر اشتراکی ہو گیا اور ایک اسکول بھی کھول لیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر "سیمارانگ" چلا آیا جہاں سیماؤن ۔ عالمین ، دارسونو وغیرہ اشتراکی نوجوان رہتے تھے اور ان کے ساتھ مل کر کمیونسٹ پارٹی کی تاسیس بھی کی ۔ ولندیزیوں نے بالآخر سنہ ۱۹۲۲ء میں اسے قید کر دیا مگر پھر اس شرط پر چھوڑ بھی دیا ۔

اس کی ایک شاخ اندونیشیا میں بھی قایم کی اور اس طرح پورے عالمِ اسلامی سے اندونیشیا کو روشناس کرادیا۔ اسی سال حاجی آگوسلیم کی معیت میں مشہور اخبار "دی فجر ایشیا" بھی جاری کیا جس میں اندونیشیا اور پورے عالمِ اسلامی پر مقالے چھپتے تھے۔ ان کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ اخبار کا انداز مقالہ نگاری سلامت روی پر مشتمل تھا، مگر قوم کو تمدّن اسلام کے احیاء پر ضرور ابھارا جاتا تھا، تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور عام اتحادِ ملّی پر بھی زور دیا جاتا تھا، اس طرح اس اخبار نے بھی اندونیشیا کے انقلاب کی پرورش میں بڑا اور نمایاں کام کیا ہے۔

**وطنیّت اور انقلاب** غرض ان تمام متعدد قسم کی سیاسی سرگرمیوں اور تحریکات کے باعث اندونیشیا اب عمومیت کے ساتھ خوابِ غفلت

---

کہ وہ اندونیشیا چھوڑ کر ہالینڈ چلا جائے گا۔ چنانچہ وہ ہالینڈ چلا گیا اور اپنا نام ابراہیم سے بدل کر، "تان ملکا" کر لیا۔ ہالینڈ میں اس وقت کچھ اندونیشی طلبا بھی زیر تعلیم تھے، کچھ عرصہ ان میں شامل رہا۔ یہاں تک کہ "پرہیم پونان اندونیشیا" کے نام سے طلبا کی پرانی تحریک کو دوبارہ زندہ کیا۔ اور "ہندیا پوتیرا" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا جو بعد میں محمد حتیٰ کے ہالینڈ پہنچ جانے اور ان کی ادارت میں آجانے کے بعد "اندونیشیا مردیکا" کے نام سے جاری رہا۔

غرض کچھ عرصہ ہالینڈ میں رہ کر وہ چین چلا گیا، اور وہاں سے گھومتا ہوا روس جا پہنچا جو کمیونسٹوں کا اصلی وطن تھا۔ اور لینن، کی انقلاب آفرینیوں کا مرکز بنا ہوا تھا، پٹروگراڈ کے مقام پر اشتراکی کانفرنس میں بھی شریک ہوا۔ اور مشرق میں اہل مغرب کے مظالم کے عنوان پر تقریر بھی کی، اس کے بعد کینٹن آیا اور چین کے اشتراکی رہنماؤں کے ہاں مہمان رہ کر ۱۹۲۵ء میں کبھی بینکاک، کبھی سیام اور سینگاپور وغیرہ شہروں میں پھرتا رہا اور اشتراکیوں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا۔ وہیں اس نے اپنی مشہور کتاب "مینوری ری پبلک اندونیشیا" تصنیف کی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ وطن میں واپس لوٹ آیا۔ اور چند خاص جوشیلے نوجوان مثلاً جمال الدین تمیم،

سے بیدار ہو چکا تھا، "شارکیت اسلام" اور اس کے بڑے بڑے رہنما خصوصاً حاجی عمر سعید چکرو آمنوتو حاجی آگوسلیم اور حاجی منصور وغیرہ کی غیر معمولی قربانیوں اور جدوجہد سے پورے جزائری ملک کے مسلمان ایک پرچم تلے جمع ہو چکے تھے، ہر طرف اسلامی حب الوطنی، اسلامی ثقافت، اسلامی تہذیب اور اتحاد بین الاسلامی کا کافی رنگ ساری قوم پر چڑھ چکا تھا کہ اک دم اس وقت (سنہ ۱۹۲۶ء) کے اشتراکی انقلاب اور ان کے ساتھ حکومت کے غیر معمولی مظالم نے پورے ملک کے مختلف العقاید گروہ میں ایک عام بےچینی، اور اضطراب پیدا کر دیا اور ولندیزی حکومت کے خلاف نفرت کی ایک عام لہر سی دوڑ گئی۔ مسلمان، ہندو بدھ، چینی، اور عیسائی تمام طبقات کے اندونیشی قوم کے باہمی اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے، یہ وہ وقت تھا کہ اندونیشی قوم کے

---

اور سبقت وغیرہ سے مل کر ایک دوسری پارٹی "پارٹائی ری پبلک اندونیشیا" قایم کی جو انقلاب پرور کیونسٹ جماعت تھی لہٰذا ڈچ گورنمنٹ نے اس کے ساتھیوں کو قید کر لیا اور بعبور دریائے شور کی سزا دی، تان ملکا موقع پا کر چپ چاپ سے نکل گیا اور فلیپائن کے جزائر میں جا پہنچا جو اس وقت امریکنوں کے زیر اقتدار تھا۔ اور وہاں کے اشتراکی رہنما عثمینہ اور دارد وغیرہ سے وابستہ ہو گیا۔ اور ایک انقلاب برپا کرنے پر شب و روز ان کے شریک رہا، چنانچہ انگریزی، امریکی اور ولندیزی متحدہ پولس اس کے پیچھے لگ گئی لہٰذا وہ یہاں سے بھی ایک رات چپ چاپ نکل بھاگا اور چین جا پہنچا جہاں کچھ لوگ اس کے دوست تھے مگر چینی حکومت بھی انگریز، امریکن اور ولندیزیوں کے اشاروں پر اس کے خلاف ہو گئی آخر سنہ ۱۹۲۲ء میں اس نے اپنا نام تان ملکا سے بدل کر "تاں مین کا" رکھ لیا اور مدتوں ادہر ادہر گھومتا رہا۔ اس وقت اس کی حالت یہ تھی کہ وہ عالمگیر جلاوطنی کی کیفیت میں مبتلا تھا کوئی ملک بھی اس کو قبول کرنے اور پناہ دینے کے لئے آمادہ نہ تھا۔

بلآخر وہ شنگھائی سے ہونکانگ ہوتا ہوا اپنی ترکیبوں سے داموری، کے

آیندہ بننے والے سب سے بڑے سیاسی رہنما "سوکارنو" بھی بانڈونگ کے انجینئرنگ کالج سے تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہو چکے تھے، اور علمی و ادبی حیثیت سے بھی پورے جاوا بلکہ بیرونِ جاوا میں بھی ایک مقرر، اور ایک بلند پایہ مقالہ نگار کے طور پر بہت زیادہ ہردلعزیز تھے، ایک دم میدانِ سیاست میں نکل آئے ان پر عملی طور سے چین کے مشہور رہنما، "سَنْ یاتْ سَنْ" کا بھی بڑا اثر طاری تھا، وہ ملکی سیاست میں وطنیت کے نظریہ کے بھی بڑے حامی تھے اور یہ غالباً مابعد از جنگ کے یوروپینی فلسفہ کا اثر تھا پھر چونکہ تربیت زیادہ تر حاجی عمر سعید چکرو آمنوتو، کی آغوشِ علمی میں پائی تھی لہٰذا اسلامی سربلندی کا جذبہ بھی دل پر مستولی تھا اس کے علاوہ زبان میں زور بیان میں تاثیر اور تحریر میں غیر معمولی ربط کے ساتھ ساتھ اپنے مخاطب کو متاثر کرنے کی اعلیٰ صلاحیت بھی

---

مقام پر جا پہنچا اور وہاں پر بھیس بدل کر رہتا رہا کہ اتفاق سے جنگِ عالمگیر دوم چھڑ گئی، اور جاپانی ادھر آ پہنچے، کہیں اس پر بھی ان کی نظر پڑ گئی، ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا کہ سینگاپور سے انگریز بھاگ نکلے چنانچہ یہ بھی جاپانیوں کے خوف سے اموری سے نکل کر سینگاپور چلا آیا۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ ولندیزی بھی لڑائی میں ہار گئے ہیں اور اندونیشیا سے بھاگ کر آسٹریلیا جا پہنچے ہیں تو اب یہ بھی اپنے وطن کو لوٹا مگر راستہ میں جہاز کا کوئی انتظام نہ تھا تمام سمندر بحری سرنگوں کے باعث خطرہ سے گھرے ہوئے تھے بالآخر ماہیگیروں کی کشتی میں بیٹھ کر سماترا کے ساحل پر جامبی کے مقام پر جا پہنچا۔ اور کچھ دن ساحل پر مزدوروں کے بھیس میں قلی کا کام کرتا رہا تاکہ کوئی اسے پہچانے نہیں، پھر جب حالات کا صحیح اندازہ ہو گیا تو جاوا چلا آیا۔

جاوا میں اس وقت (جاپان) کی حکومت تھی، چاروں طرف ظلم و ستم کی آگ پھیلی ہوئی تھی، اور اندونیشی لوگ سخت آزمائش میں مبتلا تھے۔ چنانچہ تان ملکا نے اپنے پرانے ساتھیوں سے مل کر اب جگہ جگہ ان کے خلاف مظاہرے کرنے شروع کئے اور مزدوروں اور کسانوں کو ساتھ ملا کر برابر ان کے ظلم و تعدی کے خلاف تحریکیں جاری

قدرت نے بدرجہ اتم عطا کی تھیں لہذا بانڈونگ کے ہر خاص وعام کی نظر ان پر پڑنے لگی اور بالآخر اسی سال بانڈونگ کے نوجوانوں نے انھیں اپنے کلب کا صدر چن لیا اور سیاست کی باگ ڈور انھیں سونپ دی۔

## سوکارنو اور ملک کا قومی انقلاب

اس طرح سوکارنو کے ملک کی عام قومی سیاست میں قدم فرسا ہونے سے، وطینت، کی تحریک میں ایک زبردست انقلاب آگیا، بقول بعض بصرین اور مصنفین۔ گویا جس طرح آگ پر پٹرول چھڑکنے سے شعلوں میں اشتعال ہو جاتی ہے۔ انسان جذبات میں ڈوبنے لگتا تھا، غرض سوکارنو نے اس سال عدم تعاون کی عام تحریک میں حصہ لیا اور اپنی قوم کے نوجوانوں کو بھی اس امر پر کاربند ہونے کی رکھیں۔ اتفاق سے ۱۹۴۵ء میں جب جاپانی اس ملک سے بھاگ گئے سوکارنو اور محمد حتی نے اعلان آزادی کر دیا۔ تو یہ بھی جمہوریہ کے ساتھ شامل تھا۔ مگر چونکہ اول درجہ کا کمیونسٹ تھا لہذا حزب اختلاف کا رہنما بن گیا اور ۱۹۴۹ء تک اس جماعت کی قیادت کرتا رہا۔ اسی دوران میں اس نے کئی اخبار مثلاً رینچانا، اکاتونگ، میدلونگ وغیرہ بھی جاری کئے۔

جب میڈیون کے مقام پر عیسائی ہو جانے والے امیر شریف الدین اور اس کے کمیونسٹ ساتھیوں نے جمہوریہ کے خلاف بغاوت کر کے کمیونسٹ حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی اس میں ان کا شریکِ حال تھا لہذا وہ بھی باغیوں کے ساتھ اس مقام پر مارا گیا۔

## اور دیگر قائدین

ان مشاہیر کے علاوہ بقیہ دیگر قائدین مثلاً سوکارنو، حتی، حاجی آگوسیلم، سکیمان، شہریار اور محمد نصیر وغیرہ کے حالات جنھوں نے قیام جمہوریہ کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے لہذا اس بیان کو اب اسی منزل پر ختم کیا جاتا ہے۔

ہدایت کی۔ اور رفتہ رفتہ قوم کے تمام عناصر کو 'وطنیت' کی ترکیب سے سیاست کے خمیر میں شامل کر لیا۔ جس کا نصب العین مطالباتِ اصلاحات نہ تھا بلکہ پورے ملک کا حصولِ حکومتِ خود اختیاری تھا۔

اسی زمانہ (جولائی ۱۹۲۷ء) میں بانڈونگ ہی کے شہر میں چند دیگر نوجوان مثلاً ڈاکٹر چپٹو، ڈاکٹر اسحاق چکروہادی سُوریو، ڈاکٹر بُدیُیارتی اور ڈاکٹر سُونارِیو وغیرہ نے تمام عناصرِ قومی کے متحدہ محاذ سے ایک بڑی قومی سیاسی انجمن، "پُرسارِیکَتانِ اندونیشیا"، "پی۔ این۔ آئی" (یعنی انجمنِ ملّتِ اندونیشیا) قایم کی جس کا نام ایک سال کے بعد ہی یعنی مئی ۱۹۲۸ء میں "پارٹائی نیشنل اندونیشیا"، کر کے قومی سیاست کا ایک نیا قومی نصب العین مقرر کیا یعنی یہ کہ ملک آزاد کیا جائے، اور قومی خود مختاری بحال کی جائے، اس کی صدارت کا منصب بھی، 'سوکارنو' ہی کے تفویض کیا گیا اس طرح سب سے پہلی وطنی تحریک قایم کی گئی اور اس کے پہلے صدر بھی سوکارنو ہی مقرر کیے گئے۔

## پہلی وطنی تحریک کا عام اجلاس اور قومی ترانہ اور جھنڈے کا رواج

غرض بانڈونگ کے مقام پر اس پہلی قومی اور وطنی تحریک کا 'سوکارنو' کی صدارت میں اسی ماہ مئی ۱۹۲۸ء میں پہلا اجلاس منعقد ہوا اور افتتاح کے طور پر "سانگ دِی وِی وانا"[۱] (Sang Dwiwana) یعنی 'دُو رنگا جھنڈا' لہرایا گیا جو آج

---

[۱] سانگ دِی وِی وانا اندونیشیا کے قومی جھنڈے کا نام ہے جس کے معنی "دو رنگے" جھنڈے کے ہیں۔ یہ جھنڈا جیسا کہ ہندو

اندونیشیا کا قومی پرچم ہے (یاد رکھنا چاہئے کہ بعد میں اس جھنڈہ کا لہرانا بھی حکومت ولندیزی نے قانوناً جرم قرار دیدیا تھا) اسی سال اس جھنڈہ کو سرابایا، کے مقام پر منعقد ہونے والی طلبار کی کانگریس نے بھی اسی طرح لہرایا تھا اور دجکارتا، کے شہر میں یہ جھنڈا پہلی بار ۱۹۲۹ء میں لہرایا گیا۔ اور اس کے لہرانے والے وہاں بھی طلبا ہی تھے پھر تو رفتہ رفتہ یہ ایک قومی نشان بن گیا اور یہ رسم پڑگئی کہ ہر اجلاس کا اسی جھنڈے

---

عہد کے باب میں گذر چکا ہے مجاپائت عہد کی یادگار ہے اور قدیم قومی نشان ہے (Mimbar Indonesia) مطبوعہ اگست ۱۹۴۸ء میں اس کے دونوں رنگ (یعنی سرخ و سفید پر) فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے اندونیشی نقطہ نظر کی اس طرح صراحت کی گئی ہے :-

"اہل اندونیشا کے نزدیک سرخ رنگ، خون کی علامت ہے جو جسم انسانی کی پرورش اور نشوونما کا خاص سرچشمہ ہے یعنی گوشت و پوست اسی سے پرورش پاتے اور جسم کو ارتقائی منزلوں سے گذرنے کی صلاحیت بخشتے ہیں۔ گویا بوسعتِ معنی سرخ رنگ سے مراد جسم انسانی ہے اور سفید رنگ (نور)، یعنی روح کی علامت ہے، اور دونوں کے امتزاج سے جسم و روح کا امتزاج مراد ہے جو پورے عالم انسانی کی فطرتِ عام پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اس کا بالفاظ دیگر یہ مطلب ہوا کہ یہ "انسانیت" کا نشان ہے۔

جہاں تک عصر حاضر میں اس نشان کو بطور پرچم یا علم کے اہل اندونیشیا کے درمیان اختیار کئے جانے کی تاریخ کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سب سے پہلے ہالینڈ کے دارالحکومت امسٹرڈم میں اپنی مجلس "پرہمپونان" کا سالانہ اجلاس کرتے ہوئے ۱۹۲۲ء میں ان طلبائے نے لہرایا تھا جو تکمیل علم کے خاطر اندونیشیا سے ہالینڈ گئے ہوئے تھے، اس پرچم کا سب سے پہلا لہرانے والا اندونیشی احمد سوبارجو، مشہور طالبعلم تھا اور عصر حاضر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہ پرچم قومی نشان کے طور پر لہرایا گیا اس وقت جیسا کہ بعض روایات سے پتہ چلا ہے اس پرچم میں "دبنتنگ" (جنگلی بیل) کا سر بھی منڈا ہوا تھا جو بعد میں تحریف کر دیا گیا۔ اور صرف سرخ و سفید، نشان ہی رہنے دیا گیا"

کی کشائی سے افتتاح ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں مشہور قومی ترانہ (جس کا نظم کرنے والا شاعر سواجی مپیرات مان "گندرا ہے) کا بھی رواج ہوا۔

## ایک قوم، ایک زبان اور ایک ملک کا مطالبہ

ادھر سوکارنو کے زمانۂ طالبعلمی ہی سے طلباء میں وہ انقلاب رونما ہو چکا تھا جو اب بتدریج منصۂ شہود پر آ کر ایک زبردست قومی ہلچل کا موجب بننے کا منتظر تھا ادھر ولندیزیوں کے رویہ کا قوم پرستوں کے خلاف روز بروز شدید ہونا تھا کہ اک دم ملک کے طلبا بھی بگڑ بیٹھے اور ان کی وہ تمام جماعتیں جو "جاوانین یونڈ" "سماترین بونڈ" "سُلاویسی بونڈ" کے عنوان سے قایم تھیں متحد ہو کر ایک محاذ پر اکھٹی ہوگئیں، اور متحدہ محاذ سے انھوں نے ۱۹۲۸ء میں سُرابایا کے مقام پر ایک وفاقیہ کانگریس بعنوان "پرساتوان پیوکا اندونیشیا" کے انعقاد کے ذریعہ "ایک ملک، ایک قوم اور ایک زبان[لہ]" کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ولندیزی کب اس کو ماننے والے تھے، اک دم اس فیصلہ سے بھڑک اٹھے اور

---

**لہ قومی زبان کا مسئلہ**

اس وقت تک ملک کی کوئی واحد اور مشترکہ زبان نہ تھی بلکہ تمام جزائر میں مختلف حلقوں اور علاقوں کی مختلف زبانیں رائج تھیں، اور ان کی تعداد بھی کم و بیش ۲۵۰ تک پہنچتی تھی۔ مگر ان زبانوں میں چند زبانیں ایسی بھی تھیں کہ جو اپنا ایک مخصوص رسم الخط رکھتی تھیں مثلاً جاوائی، سنڈائی، مدورائی، منگ کباؤئی، آچیائی، بوگینی، بالینی، ملائی، بنجر ماسینی، اور تُورجائی وغیرہ وغیرہ مگر ان سب کا ماخذ و مخرج لسانی حیثیت سے ملائی، تھا جو سماترا اور ملایا جزیرہ نما میں سنہ ۱۵۲۰ء سے عربی رسم الخط میں لکھی اور پڑھی جاتی تھی اور اسلام کے علم و ادب سے بہت زیادہ متاثر تھی، جاوائی زبان اگرچہ پورے سات سوا سات کروڑ انسانوں میں سے تقریباً ساڑھے چار یا پانچ کروڑ

دھڑا دھڑ نوجوان رہنماؤں کو سزائیں دینا شروع کردیں ۔ بلکہ جھنڈہ، ترانہ اور ملک کے نام کی طرح زبان کے لئے بھی "اندونیشی زبان" کا نام خلافِ قانون قرار دیدیا مگر قوم کے نوجوان جن کا اب متفقہ رہنما سوکارنو، تھا بلکہ جواب بُنگ کارنو، (یعنی بھائی جان) بن گیا تھا، بھلا کب ان بندشوں کی پرواہ کرنے والے تھے، زبان کا مسئلہ طے ہوتے ہی سب متفق ہوکر سوکارنو کی قیادت میں آگئے، اور اس طرح سوکارنو،

---

انسانوں کی زبان تھی مگر اپنے قدیم سنسکرتی اور کادی رسم الخط کے باعث بجز جاوا کے دیگر جزائر میں نہ عمومیت سے سمجھی جاتی تھی اور نہ بولی جاتی تھی ۔ لہٰذا اس وقت اندونیشی قوم کے سامنے انتخاب زبان کا بھی ایک بڑا اور اہم مسئلہ درپیش تھا ۔ مطالبہ تو آسان تھا مگر اس مطالبہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا کہ کس زبان کو واحد اور مشترکہ قومی زبان کے طور پر اختیار کیا جائے اس قوم کے نوجوان نہایت ہی دانا اور دور اندیش تھے انھوں نے محدود اکثریت اور اس محدود اکثریت کی زبان کی پرواہ نہ کی بلکہ یہ غور کیا کہ کس زبان میں عمومیت زیادہ ہے، اور کونسی زبان اپنے اشتقاق اور صلاحیت کے اعتبار سے تمام دوسری زبانوں کو بھی اپنے اندر تحلیل کرسکتی ہے پھر سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ عام فہم اور علمی بننے کی بھی قوت رکھتی ہے، اور رسم الخط کے اعتبار سے بھی سہل الاستعمال ہو پھر ساتھ کے ساتھ تمدن اور مذہب کے قیمتی قیمتی ذخائر پر بھی مشتمل ہو، اور غیظ و غضب اور جوش و ترحم، وغیرہ کی ہر فطری کیفیت کی بھی صحیح طور پر اپنے الفاظ کے ذریعہ ترجمانی کرسکے ۔

چنانچہ بہت غور و خوض کیا گیا اور بالآخر جاوی زبان کو جو حالانکہ ان جاوی نوجوانوں کی خود صوبائی اور وطنی زبان تھی اور زبان بھی محدود مقام کی اکثریت کی زبان تھی نظر انداز کردیا گیا اور اس کی جگہ سماترا کی اس ملائی زبان کو انتخاب میں لایا گیا جو سینکڑوں سال سے سارے ملک کی تجارتی زبان کے طور پر رائج ہونے کی وجہ سے ہر بندرگاہ، اور ہر جزیرہ میں سمجھی اور بولی جاتی تھی اور ان تمام متذکرہ خواص کی حامل تھی، اسی کو قومی زبان قرار دیا گیا اور اس کو ہر اندونیشی زبان کے الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی صورت میں متشکل کرکے "اندونیشی زبان"

کی قومی جماعت اندونیشیا کی سب سے بڑی اور واحد نمایندہ سیاسی جماعت بن گئی، جسکا مسلک جلسے کرنا، جلوس نکالنا، اور آزادیٔ وطن کے مطالبات کے لئے ہر شدنی کا پوری پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرنا اور قوم کو علم و فن کی ترغیب دلانا تھا، یہانتک کہ انھیں ۱۹۲۹ء میں قید کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔

سوکارنو کے جیل جانے کے بعد ان کی جماعت بھی اشتراکیت کے اشغلے کے

---

کا نام دیا گیا۔ اس کے رائج کرنے والے حالانکہ خود جاوائی لوگ تھے مگر وہ بڑے دانا اور عقلمند تھے ان کے سامنے ملک کی آزادی اور قومی ترقی کا نصب العین تھا، صوبائی اور مقامی تعصب نہ تھا، اگر ہوتا تو وہ اپنی زبان کو بروئے کار لاتے مگر پھر ملک میں نہ سالمیت پیدا ہوتی اور نہ جذبۂ اخوت بڑھتا، سنسکرتی رسم الخط میں لکھی جانے والی فرسودہ زبان کو اختیار کر کے ہزاروں سال پیچھے جا پڑتے اور اب آج آزاد بھی نہ ہوتے۔ ان کے اس بڑے اور دانشمندانہ اقدام نے انھیں متحد کر دیا اور ایک اور مشترکہ مفاد کے لئے کمر بستہ کر دیا۔

تاریخی حیثیت سے اس زبان کو قومی زبان کے طور پر رواج دینے کا پہلا تصفیہ شہر "سُرابایا" کے مقام پر منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں کیا گیا تھا جو طلبا نے ۱۹۲۸ء میں "پُرساتوان پمودا اندونیشیا" (انجمن نوجوانانِ اندونیشیا) کے عنوان سے سارے ملک کے نمایندوں کو اکھٹا کر کے منعقد کی تھی، یہ کانفرنس ختم ہوئی اور اندونیشی زبان تمام جزائر میں قومی زبان کے عنوان سے تقریر و تحریر میں بھی استعمال ہونے لگی حتیٰ کہ پھر اس کے ایک سال بعد اس ملی جلی مشترکہ "اندونیشی قومی زبان" میں (۱۹۲۹ء) سب سے پہلا ناول بھی بطور تجربہ ایک مشہور قوم پرست ادیب "تقدیر علی شاہانہ" نے تصنیف کیا، جو نہایت کامیاب رہا اور مقبول بھی ہوا، (بقول ایک اندونیشی مصنّف) اسی کتاب کے شائع ہونے کے بعد سے اندونیشی ادیب اندونیشی نثر لکھنے لگے بلکہ شعر بھی کہنے لگے حتیٰ کہ پھر اسی مصنّف نے ۱۹۳۳ء میں اپنا سب سے پہلا ناول "پَنْد گنگا بارُو" (Pundgangga Baru) شائع کیا جس نے اندونیشی ناول نگاری میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا بلکہ آیندہ کے مصنّفین کے لئے کامیاب

ڈاکٹر بنکر اندونیشیا لوٹ آئے اور بانڈونگ پہنچے، اہل بانڈونگ نے فوراً ہی ابنی
اس نئی تحریک کی زمام ان کے حوالے کردی۔ انہی دنوں "سوتن شہریر" (جنھیں ہندو
پاکستان کے اکثر اخبار غلطی سے سلطان شہریار لکھتے رہے ہیں) بھی ہالینڈ سے بلا تکمیل واپس
آکر ان کے شریکِ سیاست ہو گئے۔

دنیائے معاشیات میں اس وقت جاپان کے نظام معاشی کی بڑی دھوم مچی ہوئی
تھی اور ہر ملک کے محققینِ معاشیات اس امر کے خواہشمند تھے کہ وہ جاپان پہنچیں تاکہ
وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کریں اور اگر کوئی اچھی چیز پائیں تو اپنے ملک کی تجارت
وحرفت میں بھی اسے رواج دیں، چنانچہ محمد حتیٰ اسی پروگرام کے ماتحت عازمِ جاپان ہوئے
اور تقریباً دو سال تک دیارِ جاپان کی سیاحت میں مصروف رہے، ادھر "شہریر" ملک
کی تعلیمِ عامہ کے سلسلہ میں حکومتِ وقت سے مطالبات کرتے رہے، اور اسی موضوع
پر انھوں نے انقلابی پیرایہ میں ایک کتاب لکھی، ۲۵ر فروری ۱۹۳۴ء کو جیسے ہی
حتیٰ جاپان سے لوٹ کر اندونیشیا آئے مشتبہ قرار دے کر گرفتار کر لئے گئے ادھر شہریر
کو بھی قید کر لیا گیا، محمد حتیٰ پر باقاعدہ مقدمہ چلتا رہا مگر شہریر کو بلا کسی مقدمہ ہی
کے جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں سوکارنو نے جیل سے آنے کے بعد اپنا وہ کتابچہ
تصنیف کیا جو اندونیشیا کلاختان،، (یعنی اندونیشیا شکایت کرتا ہے) کے نام سے
مشہور ہے اور نہایت درجہ انقلاب انگیز ہے یہی وہ کتاب ہے جس میں ولندیزی
حکومت کے مظالم کا تفصیل کے ساتھ ذکر ملتا ہے، ابھی یہ کتاب شائع ہوئی تھی
کہ ایک دوسری مشہور کتاب اور لکھ ڈالی جس کا عنوان تھا "اندونیشیا
آزادی کے سرے پر" چنانچہ مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان دونوں کتابچوں کا

بہانہ سے خلاف قانون قرار دیدی گئی اور ادھر اہل ملک میں بیداری کے بڑھتے ہوئے شعور نے عمل اور ردّعمل، جوش اور اخلاص اس درجہ پیدا کر دیا کہ اب ان کی یک جہتی اور اتحاد کے سیلاب کو روکنا بھی حکومت کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا چنانچہ ایک مبصر لکھتا ہے کہ ولندیزی حکومت برابر تجسس میں لگی رہتی تھی اور اس کے قانونی عمل کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک جماعت کو خلاف قانون قرار دیتی کہ فوراً ہی نوجوانان انڈونیشیا دوسری انجمن کسی دوسرے نام سے ترتیب دے لیتے تھے اس طرح معطل شدہ کشمکش پھر بحال ہو جاتی تھی۔

غرض ادھر اپریل ۱۹۳۱ء کو سوکارنو کی جماعت کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور ادھر اہل بانڈونگ نے فوراً ہی ایک دوسری جماعت "پنڈی ڈی کان نیشنل انڈونیشیا" (باختصارہٗ انگریزی پی۔ این۔ آئی) غیر سیاسی نظریہ کے عنوان سے قایم کر لی۔ جس کا مقصد عوام کی اخلاقی اور تعلیمی خدمت کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا ادھر اب ڈاکٹر محمد حتیٰ بھی کچھ عرصہ کے بعد ہی (۱۹۳۲ء میں) ہالینڈ سے معاشیات کے مستند

---

تصنیف و تالیف کی شاہراہ کھولدی۔

اب رہا سوال رسم الخط کا سو یہ بھی حل کر لیا گیا اور اس کے حل کی صورت یہ رکھی کہ مذہبی مدارس میں یہ زبان عربی رسم الخط ہی میں رائج کی گئی مگر غیر مذہبی مدارس میں اس کی تحریر کے لئے رومن رسم الخط اختیار کیا گیا (جو اب اس وقت بھی سرکاری زبان کا خاص رسم الخط ہے لیکن مذہبی مدارس میں تاہنوز عربی رسم الخط سکھایا جاتا ہے)۔ اس طرح قومی زبان کا مسئلہ طے ہو گیا، قائدین نے تقریروں میں، اور مصنفین نے تحریروں میں اس زبان کو عام رواج دیکر آج دنیا کی ایک بڑی اور علمی زبان بنا دیا۔ یہی اب انڈونیشی زبان ہے اور مشرق بعید کی بہت بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔

شائع ہونا تھا کہ اک دم سارے ملک میں آزادی کی ایک برق سی دوڑ گئی اور اہل ملک نے اپنے اس نوجوان رہنما کے اشارہ پر" پارٹائی اندونیشیا " یا پارٹنڈو، کی نئی تحریک کی سرکردگی میں اپنی تنظیم از سر نو شروع کر دی۔ جاپان گئے ہوئے رہنما محمد حتیٰ کی جماعت پی۔ این۔ آئی، کے رفقائے کار کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا اس طرح ایک بار پھر منظم ہو کر، اندونیشی نوجوانوں، نے مطالبۂ قومی کو بلند کرنا شروع کیا، لکھنے والوں نے لکھا ہے، کہ اس بار سارے ملک کا مطالبہ تھا کہ اندونیشیا خالی کر دو، اہل ملک کو آزاد کرو، وغیرہ وغیرہ۔

ولندیزی حکومت جس نے اس ملک کو اپنی میراث قرار دے رکھا تھا بھلا وہ اس قسم کے جوشیلے نعروں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کر سکتی تھی؟ لہذا پورے پورے جوش و قوت کے ساتھ غیظ و غضب میں آگئی۔ اور پھر اس نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ حتیٰ بھی جو جاپان سے آنکر مقدمۂ سرکاری کا شکار بن چکے تھے، معتوب قرار دے گئے، اور اس طرح پہلے سوکارنو پھر شہریر اور پھر حتیٰ اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے بعض گرم جوش رفقا یکے بعد دیگرے بعبورِ دریائے شور بھجوائے گئے اور دس دس سال کے لئے سیاسی قیدی قرار دیدئے گئے، ان کی پارٹیاں بھی سب توڑ دی گئیں۔

اس وقت ۱۹۳۴ء کا سال رواں تھا، کہ حاجی عمر سعید بھی رحلت فرما گئے۔ اور کچھ زمانہ کے بعد سوتومو، کا بھی انتقال ہو گیا، ادہر سوکارنو، حتیٰ، اور شہریر وغیرہ لوگ بھی کالے پانی کی سزا بھگتنے کے لئے بھیجے جا چکے تھے کہ اس طرح پھر ایک بار اس ملک کی قومی سیاست میں جمود و قنوط پیدا ہوتا چلا گیا یہ زمانہ ولندیزی عہدِ سیاست، کا انتہائی دورِ تظلّم سمجھا جاتا ہے۔

جب ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر سوتومو، نے اپنی ۱۹۳۰ء میں قائم کی ہوئی نئی

جماعت "پرساتوان بنگ سا اندونیشیا" (یعنی انجمنِ اتحادِ ملّتِ اندونیشیا) کو ۱۹۰۸ء کی قایم کردہ جماعت "بودی اوتومو" کے ساتھ مخلوط کرکے 'پرندرا' (Parindra) کے نام سے تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی نصب العین کے ساتھ ایک نئی جماعت قایم کی اور اس کے قیام کے کچھ دنوں بعد وہ مرگئے تو "حُسنی ثَمرن" ہی ملک بھر میں ایک ایسے رہنما رہ گئے تھے جنھیں لوگوں نے متفق الرائے ہوکر اپنا قائد مقرر کیا اور انقلابِ سیاسی سے ہٹ کر انقلابِ اصلاح کا آغاز کیا۔ "حاجی آگو سلیم" بھی جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں ایک اخبار جاری کیا تھا، سلامت روی کی چال کے ساتھ شارکیت اسلام تحریک کی قیادت میں مصروف تھے۔ دو سال قبل ۱۹۳۳ء میں 'سُوکیمان'، جنھوں نے 'شارکیت اسلام' کے اپنے گروپ کو علیحدہ کرکے "پارٹائی اسلام اندونیشیا" قایم کرلی تھی وہ بھی اس کے ختم ہوجانے کے بعد اب سیاست سے دست بردار ہوکر گوشۂ عافیت میں بیٹھ چکے تھے۔

## قومی ادب اور شعروشاعری کی ترقی کا دور

اس طرح اک دم حکومتِ وقت کی سخت گیری اور قانونی شکنجہ آرائی کے باعث اندونیشی قومی سیاست زوال وانحطاط میں آگئی۔ اور احتجاجات ومظاہرات کا شور بھی ختم ہوگیا۔

قوموں کی عمرانی نفسیات کے ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ جب کسی ملک پر چھائی ہوئی غیر نفع بخش حکومت اپنی قانونی گرفت کے ذریعہ اپنی محکوم رعایا پر آغازِ مظالم کرتی ہے اور ان کے واجبی اور ضروری مطالبات کی آواز کو بھی بزور قوت دبانے کی کوشش کرتی ہے تو اربابِ علم وادب کا طبقہ اپنے غیر سیاسی اور محدود دائرہ علمی میں

ادبی سرگرمیوں کا آغاز کرتا ہے اور اس طرح علمی وادبی تحریکات شروع ہو جاتی ہیں، شعر وشاعری خصوصاً قومی اور انقلابی شاعری بھی فروغ پاتی ہے اور دیگر تصانیف علمی، ادبی اور مذہبی بھی ظہور میں آتی ہیں، قوم کے گرتے ہوئے مارل کو تھامنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اخلاق مذہبی کے ذریعہ کردار عوام کو سنوارا جاتا ہے اور پرانے ہیروز اور مجاہدین کے واقعات تاریخی کے زریں پس منظر سے جوش جہاد اور جوش عمل پیدا کیا جاتا ہے تاکہ سوئی ہوئی قوم کا شعور بیدار ہو کر آنے والے انقلاب عظیم کی نزاکتوں کو پہچان سکے اور مقتضائے حالات کے مطابق ساری قوم بیک آواز میدان عمل میں نکل سکے۔ یہی نشاۃ ثانیہ کے عہد علمی کا کارنامہ ہوتا ہے۔

چنانچہ جب اس حیثیت سے یہاں (اندونیشیا) کے اس عہد کی تاریخ پر بھی غور کیا جاتا ہے تو علم وادب کی اسی نوع تحریکات اور سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے، جن کے آغاز کا زمانہ ۱۹۲۵ء اور عروج کا زمانہ ہنگامۂ زوال عہد ولندیزی (۱۹۴۲ء) ہے۔ جبکہ اندونیشیا کے مجاہدین جہاد آزادی کے لئے میدان عمل میں نکلنے اور قربانیاں دینے کے لئے شعور اعلیٰ پر فائز ہو چکے تھے۔ بیدار ہو چکے تھے۔ سنبھل چکے تھے اور خاک وخون سے کھیلنے کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ اور یہ سب کچھ ثمرہ تھا بیدار شعور کا۔ جوش جہاد اسلام کا جو اس عہد نشاۃ ثانیہ ہی میں تحریکات مذہبی، سیاسی، تبلیغی اور علمی ادبی کے ذریعہ پروان چڑھا۔

---

**نوعمر مصنفین اوران کے ادب کا کردار**

چنانچہ اس دور میں اندونیشیا کے نئے نئے اور نوعمر ادیب، مصنفین اور مؤلفین منصۂ شہود پر نظر آتے ہیں جنہوں نے ان تھک کوششوں سے اپنے ملک کی نوعمر قومی زبان "بھاسا اندونیشیا" کے دامن علمی کو مالا مال کر دیا۔ اور اس میں مغرب ومشرق کے اونچے علمی کارناموں کے تراجم سے ایک تازہ روح پھونک دی، شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے، اقبال اور ٹیگور کی تصانیف کا بھی ترجمہ ہوا۔ ان مترجین میں محمد یامین، اور محمد نصیر بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ محمد نصیر نے اور بھی دیگر اسلامی عنوانات پر فلسفیانہ مضامین لکھے جو اس عہد کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہیں، حاجی آگو سلیم نے تصوف اسلام کو جدید طرز پر پیش کیا اور تقدیر، توکل اور رضائے الٰہی پر کتابیں لکھیں، محمد حتیٰ، یوسف دیبی سونو اور ہمکا نے معاشیات جدیدہ اور اسلام کے اعلیٰ معاشی نظام کی قومی اور ملی قدروں پر علمی کارنامے انجام دیئے، سنوسی پانے نے قدیم ہندوانی قصے لکھے، شعرائے اندونیشیائے جدید جن میں خصوصاً خیرالانوار، جوہانہ، امیر حمزہ اور تشریف زیادہ قابل ذکر ہیں وغیرہ نے قومی جوشیلے گیت، اسلامی جہاد، جاں بازی، سرفروشی اور طرح طرح کے مفید عنوانات سے لکھ کر ولندیزیوں کے پیدا کردہ جمود وقنوط کا طلسم توڑ دیا اور قوم میں ایک صور پھونک دیا۔ محمد نصیر نے اقبال کی بعض نظموں کا انگریزی کی راہ بھاسا اندونیشیا میں ترجمہ کیا۔ اندونیشی میں ڈکشنری بھی اسی دور میں ترتیب دی گئی۔ بورنیو، سماترا، سلاویسی اور مالوکو کے علمائے اسلام نے بھی اسلام کے مختلف عنوان پر اس جدید زبان میں تصانیف پیش کیں۔ قرآن کریم کا جدید زبان میں ترجمہ ہوا اور تفسیر لکھی گئی اس طرح یہ عہد نشاۃ ثانیہ علم وادب کے ایک خاص سانچے میں ڈھلتا رہا اور افزائش انقلاب کرتا رہا۔

## مختلف ممالک کے مبلغین اسلام

غرض پہلی جنگ عظیم کے بعد کا دور اہل انڈونیشیا کیلئے خطرناک ترین دور تھا جیسا کہ بعض مسائل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ باوصف دیگر متنوع مظالم کے اب ولندیزی حکومت نے اپنی پوری پوری توجہ اس امر پر صرف کردی کہ وہ یہاں کی اکثریت کو اپنے مذہب میں لے آئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ہم خیالوں کے ذریعہ چھائی رہے اور اپنے کالے منصوبوں کو پورا کرتی رہے مگر جیسے ہی کرچ پر جانے والوں کے ذریعہ اس گندی پالیسی کا بھانڈا پھوٹا عالم اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور یہاں کے مقامی علمائے اکابرین نے اور نیز دیگر ممالک مثلاً حضرموت حجاز مقدس اور برصغیر ہند کے مبلغین اسلام نے ولندیزیوں کی اس خطرناک سیاسی تعدی کو بے اثر کرنے کیلئے تبلیغ اسلام کا کام شروع کردیا۔ چنانچہ ہندوستان سے جو بزرگ اس خدمت اسلامی کے لئے یہاں پہنچکر سنہ ۱۹۲۱ء سے تبلیغ کا کام کرنے لگے وہ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی[۱] ہیں جنھوں نے جاوا اور سماٹرا کے اکثر علاقوں میں تبلیغ اسلام کی

---

[۱] **مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی** آپ کے حالات جنوبی افریقہ کے ایک انگریزی ماہنامہ "Muslim Digest" کے شائع کردہ مقالہ "ہزہولی نیس مولانا عبدالعلیم صدیقی" میں ایک بار نظر سے گذرے تھے ذیل کا اجمال اسی سے اقتباس ہے۔

آپ میرٹھ کے ایک مشہور خاندان صوفیائے اسلام میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر درس نظامیہ کی مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں حاصل کی، اٹاوہ ہائی اسکول سے میٹرک اور میرٹھ کالج سے بدرجہ اول بی۔ اے پاس کیا۔ ملک المشائخ زبدۃ العارفین اعلیٰحضرت مولانا شاہ احمد رضا خانصاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوکر اور خرقہ خلافت حاصل کرکے انھی کے ارشاد سے اپنے ہی خرچ پر تبلیغ اسلام کے لئے وقف ہوگئے۔ اور دنیا کے مختلف ممالک مثلاً نائیگریا، جنوبی افریقہ، سیلون، ملایا، انڈونیشیا، جنوبی چین، اور جاپان میں تبلیغ اسلام کا کام کیا۔ اور سنہ ۱۹۴۷ء تک تقریباً ۵۰ ہزار غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ہر جگہ مساجد، مدارس اور مشن قایم کئے چنانچہ سینگاپور کی سلطان مسجد، جوہور کا دارالعلوم۔ جاپان کی مسجد ٹوکیو، کولمبو کی مسجد حنفیہ، نائیگریا کا اسلامی کتب خانہ، مشن اور مسجد انھی کی کوششوں سے تعمیر ہوئے۔ سوانح نگار آگے لکھتا ہے کہ "انڈونیشیا میں موصوف نے تقریباً ۵ ہزار مظاہر پرستوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ آپ انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ فرانسیسی، جاپانی، چینی، اور ملائی زبانوں پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔ انگریزی زبان میں متعدد اسلامی کتب کے مصنف بھی ہیں جن میں مائی ڈائی لاگ وِدھ برنارڈ شا، اِلیمنٹری کلچران اسلام، مسلمز رول ان سائنٹفک ڈسکوریز معرکۃ الآرا ہیں۔ وہ بہت بڑے مقرر اور عالم ربّانی ہیں۔ قائد اعظم کے پرانے رفیق ہیں۔ سنہ ۱۹۵۱ء سے پاکستانی مبلغ کے طور پر امریکہ میں تبلیغ اسلام کررہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

---

نوٹ:۔ مگر ۲۰ اگست سنہ ۱۹۵۴ء کے اخبار انجام، کراچی کے مقالہ "شاہ عبدالعلیم صدیقی" صفحہ ۴ سے اس اندوہناک خبر کا پتہ چلا ہے کہ مولانا ۲۲ اگست سنہ ۱۹۵۴ء کو بزمانہ حج مدینہ منورہ میں رحلت فرماگئے اور جنت البقیع میں دفنائے گئے۔ اخبار مذکور لکھتا ہے کہ "دنیائے اسلام کے ایک ایسے عدیم النظیر عالم نے رحلت فرمائی ہے جس کی تبلیغی خدمات کو دنیا کبھی نہیں بھول سکتی"۔

**احمدیہ جماعت کا مشن** | ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی قادیانی جماعت کی لاہوری شاخ احمدیہ جماعت لاہور نے بھی جاوا کے شہر جوگ جکارتا میں اپنا مشن قایم کیا، اور ڈاکٹر ولی احمد[1] مرزا کو پہلا مشنری مقرر کیا جنھوں نے وہاں پہنچنے کے بعد پھر اپنا ایک اسکول بھی کھولا تھا۔

**عہد نشاۃ ثانیہ پر ایک نظر** | بہرکیف یہ عہد نشاۃ ثانیہ اندونیشیا کی تاریخ کا ایک ایسا دور گذرا ہے جس میں ہر قسم کی تحریکات تعلیمی، سیاسی، مذہبی، تبلیغی، قومی، ثقافتی اور علمی ادبی ملک کے ہر گوشہ میں سرگرم عمل نظر آتی ہیں جن کے شروع کرنے والے ڈاکٹر واحیدین اور سوتوموہیں، ترقی پر لانے والے چکرو آمنوتو اور حاجی احمد دحلان اور دیگر مبلغین اور علما ہیں، اور کمال پر پہنچا کر قوم اندونیشی میں جدوجہد آزادی کا صور پھونکنے والے ڈاکٹر سوکارنو اور محمد حتیٰ ہیں جن کے جلاوطن کردئے جانے کے بعد سنبھالنے والے ارباب علم وادب، مصنفین اور مؤلفین میں تمیں زیادہ شہرت حاجی آگوسلیم، محمد نصیر، محمد یامین، ہمکا، خیرالانوار اور آمیر حمزہ کو حاصل ہے، یہانتک کہ پھر ۱۹۳۹ء کا دور شروع ہو کر دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو جاتا ہے اور ولندیزی بصورت شکست پے منظم کہ جن کو پہنچا کر یہاں سے بوریا بدھنا گول کر کے چلے جاتے ہیں اور حالات کا رخ بھی بدل جاتا ہے، جس کی تفصیلات اب اگلے باب میں بیان کی جائیں گی۔

---

نوٹ:- ڈاکٹر سوکارنو، محمد حتیٰ، آگوسلیم اور محمد نصیر وغیرہ اکابرین عہد آزادی کی تفصیلی سوانح دوسری جلد میں بیان کیے جانے کی خاطر یہاں قصداً چھوڑ دی گئی ہیں۔ دوسری جلد میں ان پر الگ الگ باب لکھے جائیں گے۔

---

[1] **ڈاکٹر ولی احمد مرزا** | ڈاکٹر صاحب ہندوستان کے صوبہ بمبئی کے شہر پونا کے باشندہ ہیں جہاں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اور گریجویشن دکن کالج پونا سے کیا۔ موصوف کے آباؤ اجداد ایرانی ہیں جو انیسویں صدی میں موجودہ آغا خاں کے بزرگوں کے ساتھ ترک وطن کرکے ہندوستان چلے آئے تھے۔ خاندانی حیثیت سے ... مرزا تھے اور ان کی علم و ادب میں بھی کافی شہرت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو فارسی زبان اپنے خاندان سے ورثہ میں ملی ہے اور وہ بالکل ایرانی انداز میں بولتے ہیں۔ موصوف دکن کالج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر جماعت احمدیہ لاہور میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ جب آپ کی جماعت نے ۱۹۲۱ء میں جوگ جکارتا (اندونیشیا) میں اپنا مشن قائم کیا تو موصوف پہلے مشنری مقرر ہوئے اور وہاں پہنچ کر اپنا ایک مدرسہ بھی کھولا۔ موصوف کو ۱۹۳۰ء میں احمدیہ جماعت نے انگلستان کے احمدیہ مشن میں بھجوا دیا پھر اس کے بعد ہالینڈ منتقل کر دیا۔ جہاں رہ کر ڈچ زبان سیکھی اور وہاں کی یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ فتح جرمنی کے بعد انگریزی رعایا ہونے کی وجہ سے کچھ زمانہ قید و بند میں بھی گذارا جب جرمنی کو شکست ہوگئی تو موصوف رہا ہو کر ہندوستان چلے آئے اور اب ۱۹۵۲ء سے پاکستان میں جماعت احمدیہ کے مشنری ہیں گھر پر مختلف زبانیں بھی طلبا کو سکھاتے ہیں۔ حالانکہ موصوف کی مادری زبان فارسی اور گجراتی ہے مگر اردو بھی خاصی بول لیتے ہیں عربی، اندونیشی اور انگریزی کے بھی ماہر ہیں۔ طبعاً بہت منکسر المزاج ہیں اس لئے اثر و رسوخ بھی کافی رکھتے ہیں، اندونیشی سفارت خانہ کراچی کے افسران کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات کافی گہرے ہیں۔ (ڈاکٹر صاحب موصوف ... احمدیہ مشن کے ان متذکرہ بالا حالات کا ماخذ خود انہی کی ہم پہنچائی ہوئی معلومات پر مشتمل ہے۔)

# باب ششم

## دوسری جنگ عظیم

اور

## ولندیزیوں کا زوال

اندونیشیا میں ارباب علم و ادب احیائے زبان، احیائے علم اور اصلاح قوم کے کاموں میں اپنے ملک کے رہنمایان سیاسی کے جلاوطن اور مقید ہو جانے کے بعد اسی طرح گرم جوشی اور اخلاص کے ساتھ منہمک رہے اور اپنے ملک کے مزاج ترقی کے گونا گوں اخلاط کی درستی کرتے رہے کہ اک دم حالات زمانہ نے انقلاب کا ایک نیا ورق الٹا، واقعات نے پلٹا کھایا، جنگ[1] کے جھکڑ نے مغرب کی فضا پر محیط ہوکر مشرق کے آسمان سامراجیت میں بھی تغیر و تبدل کے ایک نئے قوس و قزاح کا گل کھلایا، یعنی وہ قومیں

---

[1] **یوروپ میں جنگ عظیم دوئم کا آغاز** اس لڑائی کا آغاز اگرچہ جرمنی کی فتح ڈانزک سے ہوتا ہے مگر اس کی باقاعدہ تحریک کا زمانہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کی وہ تاریخ ہے جبکہ جرمنی نے پولینڈ پر چڑھائی کر کے روس کے خلاف آغاز جنگ کیا تھا۔ پولینڈ پر حملہ ہوا اور سارے یوروپ میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے، فریقین کے ساتھی جگہ جگہ اعلان جنگ کرنے لگے، اور دھڑے بند لڑائی ہونے لگی، خصوصی فریقین دو تھے ایک اتحادی اور دوسرے محوری محوریوں میں جرمنی فریق خاص تھا اور بقیہ ممالک، مثلاً جاپان، اطالیہ، رومانیہ وغیرہ اس کے حلیف تھے اور یوروپ کے بقیہ ممالک بمعہ اپنی نوآبادیات اور ملک چین کے انگریزوں

جو یورپ میں نبرد آزما تھیں۔ اور مشرق میں بھی اپنی مستعمرات کا ایک بڑا سلسلہ رکھتی تھیں جنگ یورپ کے آثار نتائج کو مشرق پر بھی منطبق کرنے لگیں۔ اور اپنی سخت گیر بندشوں سے نت نئے شگوفے کھلانے لگیں۔ ادھر انڈونیشیا میں مئی ۱۹۳۹ء کو تمام قومی تحریکوں کا ایک وفاق "جی۔ اے۔ پی۔ آئی" یعنی (Gahoengan Partiji Indonesia) عمل میں آکر "پرندرا پارٹی" کے عنوان سے قایم ہوا اور انتہا پسندوں نے اپنا ایک جداگانہ وفاق "گیرنڈو پارٹی" کے نام سے قایم کیا جس میں چھوٹی چھوٹی

---

اور رام رکینوں کے ساتھ تھے اور اتحادی کہلاتے تھے اسی طرح نیدرلینڈس یعنی ہالینڈ بھی اتحادیوں کی صف میں شامل تھا جہاں اس وقت ملکہ ولہیلمینا حکمراں تھی۔ جنگ کے واقعات کے تعارفی خلاصہ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اب اس ملکہ کے حالات پر بھی مختصر سی روشنی ڈالدی جائے۔

سلہ ملکہ ولہیلمینا اس کا پورا نام (Wilhelmina Halena Paulinc of Orange) تھا۔ وہ ہالینڈ کے بادشاہ ولیم سوم کی پہلی بیوی کے بطن سے ۳۱ اگست ۱۸۸۰ء کو ہاگ کے مقام پر پیدا ہوئی اپنے بھائیوں کے مرجانے کے بعد صرف وہی اکیلی ہالینڈ کے تاج شاہی کی حقدار رہ گئی تھی چنانچہ اپنے باپ شاہ ولیم کی وفات کے بعد ۲۳ نومبر ۱۸۹۰ء کو بعمر دس سال نیدرلینڈس کے دستور کے مطابق حکمراں بنائی گئی اور آٹھ سال تک اپنی ماں کی اتالیقی میں تربیت پاتی رہی بالآخر ۶ ستمبر ۱۸۹۸ء کو جب وہ سن بلوغ کو پہنچی یا اٹھارہ برس کی ہوگئی تو تخت وتاج اور عنان حکومت کو خود مختارانہ طور پر سنبھالا۔ اپنے وقت کی ایک نہایت ہی رعنا اور پرشباب ملکہ تھی بیس سال کی عمر میں ۷ رفروری ۱۹۰۱ء میں اقارب خانوادۂ شاہی کے ایک نوجوان شخص "ہنیری دلادی میر" کے ساتھ منکوحہ بن گئی جو ۱۹۳۴ء میں صرف ایک لڑکی "جولیانہ" کو بطور اولاد کے چھوڑ کر راہئ ملک عدم ہوا۔

ولہیلمینا نے ستمبر ۱۹۴۸ء تک ہالینڈ میں حکومت کی اسکا دور حکومت ہالینڈ کی تاریخ میں بڑا طولانی گذرا ہے۔ ۱۰ رمئی ۱۹۴۰ء میں جب جرمنی نے ہالینڈ فتح کرلیا تو وہ اپنے داماد اور بیٹی کو بمعہ ان کے

بہت سی جماعتیں شامل تھیں حتیٰ کہ مذہبی جماعتیں بھی اس میں شامل ہوگئیں اور ایسی قومی تنظیم کو جدید مطالبات کے ساتھ پھر زندہ کر دیا ملک کی ولندیزی حکومت جو یورپ کے حالات کو بہت ہی توحش کے ساتھ دیکھ رہی تھی اس اتحاد سے اور زیادہ چونک پڑی اور اس کے خلاف امتناعی احکامات پر غور کرنے لگی۔ کہ اچانک ستمبر کا مہینہ شروع ہوگیا اور پولینڈ جنگ کے جنگل میں پھنس گیا حتیٰ کہ پھر آٹھ ماہ بعد ہی ہالینڈ کی بھی باری آگئی اور ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کو ہٹلر کی افواج نے پورے ملک ہالینڈ کو فتح کر کے اپنے قبضہ میں کر لیا ملکہ ولہیلمینا

خاندان کے اپنے ہمراہ لے کر انگلستان چلی گئی اور وہیں جا کر اس نے دوبارہ ایک جلاوطن اور نام نہاد حکومت کا دفتر کھولا۔ اور جولیانہ کو کینیڈا بھجوا دیا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب جرمنی کو شکست ہوگئی اور ہٹلر بھی لڑتا ہوا لڑائی میں مارا گیا تو اس کے قبضہ کئے ہوئے تمام یورپی ممالک آزاد کرائے گئے ہالینڈ کی بھاگی ہوئی حکومت بھی دوبارہ بحال ہوگئی۔ ملکہ ولہیلمینا لندن سے واپس ہاگ چلی آئی اور مزید تین سال یعنی ستمبر ۱۹۴۸ء تک تقریباً پچاس برس حکمراں رہ کر اپنی شہزادی جولیانہ کے حق میں تخت سے دستبردار ہوگئی۔ اب اس کی جگہ جولیانہ ہالینڈ کی حکمراں ہے۔ (ہسٹری آف ہالینڈ)

ولہیلمینا انگلستان کے حکمراں کی طرح موروثی طور پر آئینی حکمراں تھی، جو انگلستان کے دستور کے مطابق ایک باقاعدہ آئین کے ماتحت حکومت کرتی تھی۔ آئین کی رو سے ہالینڈ میں ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کی ایک نمائندہ پارلیمنٹ تھی جو اسٹیٹ جنرل کہلاتی تھی (اور اب بھی کہلاتی ہے) اس کے دو ایوان تھے (اور وہ اب بھی ہیں) یعنی ایک ایوان بالا اور دوسرا ایوان زیریں۔ پہلے ایوان کے اراکین خاندان شاہی کے امرا اور افراد تھے اور دوسرے ایوان کی رکنیت میں ہالینڈ کے تمام پیشہ ور، وکلا، علما اور علمائے مذہب وغیرہ شامل تھے، اکثریت والی جماعت برسر اقتدار آتی تھی اور اسی کے رہنما کو حکومت کا صدر یعنی وزیر اعظم بنایا جاتا تھا۔ جو اپنے اعمال میں پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ تھا اور پارلیمنٹ ملکہ یا بادشاہ کے سامنے جواب دہ تھی، نو آبادیات یعنی نیدرلینڈس ڈچ ایسٹ انڈیز (یعنی انڈونیشیا) اور دیگر ممالک کی بھی حکومت اسی ملکہ کے نام سے عمل کرتی تھی۔

بھاگ کر لندن چلی گئی اور اس طرح اس کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

یوروپ میں نیدرلینڈس کے زوال سے ان کی شرق الہند (اندونیشیا پر مسلط) حکومت بھی گھبراگئی مگر چونکہ قریب ہی انگریز ہندوستان اور آسٹریلیا میں برسراقتدار تھے لنذاان کے سہارہ پر قایم رہی۔ اور باقاعدہ اندونیشی اتحاد کے نئے رہنماؤں کے خلاف اقدام کرنے لگی۔

اس (نیدرلینڈز ڈچ ایسٹ انڈیز)۔ حکومت کا آخری گورنر جنرل اس وقت "جیرُوا فان اُسترکن بورُرخ اُستاخورُ" تھا جس نے اتحادیوں کے ساتھ ملکر "ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمان" کے مختلف اڈوں کے لئے اندونیشیا کے اکثر علاقے مثلاً سرابایا، بٹادیہ (جکارتا) چیراچاپ اور رباڈانگ وغیرہ مخصوص کردیئے تھے۔ ان علاقوں میں اتحادی افواج کے ہندوستانی، آسٹریلیائی اور امرکی سپاہی جنرل میک آرتھر اور جنرل ویول کی افسری میں مقیم تھے۔ خود ولندیزیوں کی فوجی طاقت کچھ نہ تھی۔ سینگاپور (ملایا کا خاص شہر) اس جنوبی مشرقی ایشیائی کمان کا مستقر اعلیٰ تھا اور سب سے بڑا جنگی جہازوں کا مرکز تھا۔

غرض ولندیزی گورنر جنرل داخلی امور کے اکثر جنگی شعبے ایک دوسرے ولندیزی افسر "فان موک"[1] کے سپرد کرکے خود اتحادی سپاہ کے دفاعی امور میں سرگرم ہوگیا

---

[1] فان موک: اسکا پورا نام ایچ۔ جے۔ فان موک ہے۔ یہ ان ولندیزیوں میں سے تھا جو جاوا ہی میں پیدا ہوئے تھے گویا ایک طرح سے ولندیزی اندونیشی تھا تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک مدت تک یہ اندونیشیا کے ولندیزی آبادکاروں کا رہنما بھی رہا یہانتک کہ پھر یہ امور معاشی کا ڈائرکٹر ہوگیا زمانہ جنگ میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک شرق الہند کی اس ولندیزی حکومت کا جو جاپان کے حملے سے شکست کھاکر آسٹریلیا فرار ہوگئی تھی برائے نام گورنر جنرل بھی رہا۔ کچھ عرصہ نیدرلینڈس حکومت کی وزارت نوآبادیات کا بھی سربراہ رہا۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں دوبارہ

ادہر محوری قوت کا بڑا رکن یعنی جاپان اپنے حلیف جرمنی کی ہدایت کے بموجب مشرقی ایشیائی علاقوں کی فتح کی طرف متوجہ ہوا اور "جنگ پیسفک" شروع ہوگئی۔ جاپان نے سب سے پہلے ہانگ کانگ (جو برطانیہ کا چینی مقبوضہ تھا) پر قبضہ کیا پھر اس کے بعد

---

اندونیشیا میں جاپان کے چلے جانے کے بعد گھس آنے والی ولندیزی حکومت کا گورنر[51] جنرل بھی بنایا گیا مگر ہالینڈ سے اختلاف ہو جانے کے باعث سنہ ۱۹۴۸ء میں مستعفی ہوگیا۔

## [51] ولندیزی عہد کے گورنر جنرل

| نمبر شمار | نام گورنر جنرل | مدت عہدہ |
|---|---|---|
| ۱ | پیٹر بوتھ | سنہ ۱۶۱۰-۱۶۱۴ء |
| ۲ | خیرٹ رینسٹ | سنہ ۱۴-۱۶۱۵ء |
| ۳ | لورنیس ریال | سنہ ۱۵-۱۶۱۹ء |
| ۴ | جان پیٹرزکون (پہلی بار) | سنہ ۱۹-۱۶۲۳ء |
| ۵ | پیٹرز کارپینٹرز | سنہ ۱۶۲۳-۱۶۲۷ء |
| ۶ | جان پیٹرزکون (دوسری بار) | سنہ ۲۷-۱۶۲۹ء |
| ۷ | جے کیوز اسپیکس | سنہ ۱۶۲۹-۱۶۳۲ء |
| ۸ | ہینڈرک برودر | سنہ ۱۶۳۲-۳۶ء |
| ۹ | انیتونیوفان دائی مین | سنہ ۱۶۳۶-۴۵ء |
| ۱۰ | کارنیلیس فان درلن | سنہ ۱۶۴۵-۵۰ء |
| ۱۱ | کارئیل ری نیرز | سنہ ۱۶۵۰-۵۳ء |
| ۱۲ | جان مالت سیوکرد | سنہ ۱۶۵۳-۷۸ء |
| ۱۳ | رِک لوف فان گوانس | سنہ ۱۶۷۸-۸۱ء |
| ۱۴ | کارن جانزاسپیل مان | سنہ ۱۶۸۱-۸۴ء |
| ۱۵ | جوہنیز کیمفز | سنہ ۱۶۸۴-۹۱ء |
| ۱۶ | ولیم فان اُدتھورن | سنہ ۱۶۱۹-۱۷۰۴ء |
| ۱۷ | جون فان ہورن | سنہ ۱۷۰۴-۱۷۰۹ء |
| ۱۸ | ابراہم فان ری بیک | سنہ ۱۷۰۹-۱۳ء |
| ۱۹ | کیرستونیل فان سودول | سنہ ۱۷۱۳-۱۸ء |
| ۲۰ | ہیندرک زدار دیکرون | سنہ ۱۷۱۸-۲۵ء |
| ۲۱ | میتھوز دی ہان | سنہ ۱۷۲۵-۲۹ء |
| ۲۲ | دی دمیرک ڈرفین | سنہ ۱۷۲۹-۳۲ء |
| ۲۳ | درک فان کلون | سنہ ۱۷۳۲-۳۵ء |
| ۲۴ | ابراہم پیٹرس | سنہ ۱۷۳۵-۳۷ء |
| ۲۵ | اڈریان فل کانیر | سنہ ۱۷۳۷-۴۱ء |
| ۲۶ | جوہنیز تھیدن | سنہ ۱۷۴۱-۴۲ء |
| ۲۷ | خوست ول بار | سنہ ۱۷۴۳-۵۰ء |
| ۲۸ | جیکب سومیل | سنہ ۱۷۵۰-۶۱ء |
| ۲۹ | پیتر آل | سنہ ۱۷۶۱-۷۵ء |
| ۳۰ | جیری میاس فان رِس جک | سنہ ۱۷۷۵-۷۷ء |

۲۳ر جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کو جزیرہ نیوگنی کے ایک اہم مقام "لے" پر قبضہ کیا پھر جزائر سولومن بھی جیت لئے (حوالہ کے لئے "مرکزی اطلاعات" جون سنہ ۱۹۴۵ء مطبوعہ حکومت ہند صفحہ ۶، ۷ ملاحظہ ہو) اسی سال مارچ میں جاپان نے سینگاپور پر قبضہ کیا اور اسی اثنا میں اندونیشیا

| نمبر شمار | نام گورنر جنرل | مدت عہدہ |
| --- | --- | --- |
| ۳۱ | رُی نیئر دِی کلارک | سنہ ۱۷۷۷-۸۰ء |
| ۳۲ | وِل آرنولڈ النتغ | سنہ ۱۷۸۰-۹۶ء |
| ۳۳ | پیٹر خرفان اُدفرا ایسپراتن | سنہ ۱۷۹۶-۱۸۰۱ء |
| ۳۴ | جوہنیز سِی برخ | سنہ ۱۸۰۱-۰۴ء |
| ۳۵ | ابرعوس ہیم دی سے | سنہ ۱۸۰۴-۰۸ء |
| ۳۶ | ہرم وِل دائندلس | سنہ ۱۸۰۸-۱۱ء |
| ۳۷ | جام دلیم جانس | سنہ ۱۸۱۱ء |
| ۳۸ | سَرخِلُ پی ایلیئوت خروف | سنہ ۱۸۱۱ء |
| ۳۹ | تھومس اسٹیفورر لفلیس (انگریز) | سنہ ۱۸۱۱-۱۶ء |
| ۴۰ | جی۔ اے۔ جی۔ پی۔ ایچ وی۔ ڈی کیپلن (انگریز) | سنہ ۱۸۱۶-۲۵ء |
| ۴۱ | ایچ مرخوس دی کاک | سنہ ۱۸۲۵-۳۰ء |
| ۴۲ | جے فان دین بوش | سنہ ۱۸۳۰-۳۳ء |
| ۴۳ | جے۔ باند | سنہ ۱۸۳۳-۳۶ء |
| ۴۴ | دی ارنش | سنہ ۱۸۳۶-۴۰ء |
| ۴۵ | پی مرکوس | سنہ ۱۸۴۱-۴۳ء |
| ۴۶ | جے۔ سی رِمینٹ | سنہ ۱۸۴۴-۴۵ء |
| ۴۷ | جے۔ جے رُوکوسین | سنہ ۱۸۴۵-۵۱ء |
| ۴۸ | اے۔ جے فان تُوائِسٹ | سنہ ۱۸۵۱-۵۶ء |
| ۴۹ | الیف۔ پہند | سنہ ۱۸۵۶-۶۱ء |
| ۵۰ | اے پرنس | سنہ ۱۸۶۱ء |
| ۵۱ | اِسلوٹ فان دِی بیلی | سنہ ۱۸۶۱-۶۶ء |
| ۵۲ | پیُ میئر | سنہ ۱۸۶۶-۷۲ء |
| ۵۳ | جے لُوڈون | سنہ ۱۸۷۲-۷۵ء |
| ۵۴ | جے۔ ڈبلیو۔ فان لَنسبرخ | سنہ ۱۸۷۵-۸۱ء |
| ۵۵ | ایس۔ جے کُب | سنہ ۱۸۸۱-۸۴ء |
| ۵۶ | اوفان ریس | سنہ ۱۸۸۴-۸۸ء |
| ۵۷ | سی ری نیکر ہور ڈِنک | سنہ ۱۸۸۸-۹۳ء |
| ۵۸ | سی۔ ایچ۔ اے۔ فان دردک | سنہ ۱۸۹۳-۹۸ء |
| ۵۹ | ڈبلیو رُدس بُوم | سنہ ۱۸۹۸-۱۹۰۴ء |
| ۶۰ | جے۔ بی۔ فان ہیتنز | سنہ ۱۹۰۴-۹ء |
| ۶۱ | اے۔ ڈبلیو۔ الیف آئیدن برخ | سنہ ۱۹۰۹-۱۶ء |
| ۶۲ | جے۔ پی فان لمبُرخ | سنہ ۱۹۱۶-۲۱ء |
| ۶۳ | دی فوک | سنہ ۱۹۲۱-۲۶ء |
| ۶۴ | اے۔ سی۔ دی خراف | سنہ ۱۹۲۶-۳۱ء |
| ۶۵ | جو نخنے | سنہ ۱۹۳۱-۳۶ء |
| ۶۶ | چیر وا فان استر بُورُخ | سنہ ۱۹۳۶-۴۵ء |
| ۶۷ | ایچ۔ جے۔ فان موک | سنہ ۱۹۴۲-۴۸ء (جلاوطن حکومت کا |

کے مشہور مرکزی جزیرہ 'جاوا' پر بھی ہلہ بول دیا، سب سے پہلے وہ مشرقی جاوا کی طرف متوجہ ہوئے پھر شمالی جاوا اور وسطی جاوا کی طرف بڑھے لیکن (اس لڑائی میں شریک رہنے والے مبصرین نے مجھے بتلایا 'قادری') ولندیزی کسی محاذ پر بھی جاپانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ نہ کرسکے بلکہ ہر مقام پر بلا کسی مقابلہ کے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ لڑائیاں جہاں جہاں بھی ہوئیں ان میں صرف یا تو آسٹریلین لڑتے رہے یا پھر ولندیزی فوج کے اندونیشی سپاہی مقابلہ کرتے ہوئے مرتے رہے بالآخر جاپان فتح پاتا چلا گیا، حتیٰ کہ آخری محاذ جنگ 'بانڈونگ'، اور 'چیلاچاپ' پر بھی وہ اسی طرح کامیاب ہوگیا (مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کو) ولندیزی سپاہ کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ان کے بڑے بڑے افسران جن میں خود ان کا گورنر جنرل بھی شامل تھا قید کر لئے گئے اور ان میں سے اکثر مثلاً فان موک' فرڈر پلاس اور عبدالقادر وغیرہ نے بھاگ کر آسٹریلیا میں پناہ لی اور وہاں پہنچکر ایک جلاوطن حکومت قایم کرلی۔ جاپان رفتہ رفتہ پورے اندونیشیا پر قابض ہوگیا اور ولندیزی ہار گئے اور زوال میں آگئے۔ اسطرح ہالینڈ کی ظالم ترین ولندیزی حکومت سے مظلوم اندونیشیا کو نجات مل گئی۔ سچ ہے ظالم ایک نہ ایک دن اپنے کیفر کردار کو پہنچ کر رہتا ہے اور مظلوم اپنی بیکسی اور مظلومیت کا صلہ ضرور پاتا ہے۔

اندونیشیا زندہ باد"

نوٹ:- یہ آگے کی تفصیلات اب دوسری جلد میں بیان کی جائیں گی۔

## ختم شد

(نور احمد قادری)

مصنف"



مطبع پروسس پاکستان وکٹوریہ روڈ کراچی (پاکستان)

1. Books are issued for 15 days only but may have to be recalled earlier if urgently required.
2. An over-due charge of 25 Paise per day per volume will be charged.
3. Books may be renewed on request, at the discretion of the Librarian.
4. Periodicals, Rare and Reference books may not be issued and may be consulted only in the Library.
5. Books lost, defaced or injured in any way shall have to be replaced or its double price shall be paid by the borrower.

*Help to keep this book fresh, clean & moving*